عزیزانِ من… السّلامُ علیکم!

ذرا دیر سے سہی لیکن اب کیمروں کا رخ بنوں اور ڈیرا غازی خان کے قرب وجوار کے ان میدانوں کی طرف ہوگیا ہے جہاں ہماری اپنی مائیں، بہنیں اور بیٹیاں اپنے ہر عمر کے بچوں کے ساتھ کارواں در کارواں چلی آرہی ہیں… ہر گھرانے کے ساتھ مرد بھی ہیں اور سب خستہ وشکستہ… تادمِ تحریر 450,681 گھر بدر رجسٹر کیے جاچکے ہیں… جبکہ حالات کے تحت نقل مکانی کرنے والوں کی یہ تعداد چھ لاکھ تک پہنچنے کا امکان ہے… یہ بہت بڑی تعداد ہے… فوج اور مرکزی وصوبائی حکومتوں کے وسائل متحرک ہیں جو ناکافی ہیں… رمضان شریف کے ماہِ مقدس میں اور پھر آنے والی عید سعید پر ہمیں من حیث القوم ان سے تعاون کے لیے کمر کس لینی ہوگی، انفرادی اور اجتماعی سطح پر ان کی بھوک پیاس اور دکھ سکھ کا خیال رکھنا ہوگا… ان کے لیے جو کچھ کیا جائے گا وہ ان پر احسان نہیں، ہم پر ان کا حق ہوگا… انہوں نے پُرامن اور بہتر پاکستان کی امید میں اپنا گھر بار، مال مویشی اور فصلیں چھوڑ کر قدم باہر نکالے ہیں۔ ان میں امیر وغریب سب ایک ہی صف میں اور تپتے سورج کے نیچے ایک جیسے خیموں میں پناہ گزیں ہیں اور دردناک حالات سے دوچار ہیں۔ ان کی ان کے گھروں میں عزت وآبرو کے ساتھ واپسی تک بہترین دیکھ بھال ہمارا قومی اور مذہبی فریضہ ہے… آیئے! رمضان کی ان مبارک اور انعامی والہامی ساعتوں میں ہم عہد کریں کہ ہم اپنے ضرورت مند پاکستانی اور مسلمان بھائیوں، بہنوں کا پورا پورا خیال رکھیں گے… اس ماہِ مقدس میں ربّ العزت اپنے بندوں پر رحمتوں اور انعامات کی بے مثال بارش کرتا ہے، انہیں نوازتا ہے جو اس کے بندوں سے عاجزی کے ساتھ محبت کرتے ہیں… اللہ تعالیٰ اس دریائے رحمت وبرکت سے ہمیں پوری طرح سیراب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! اب رخ اس محفل کا جہاں قیامت کے سے نامے ہم سب کے منتظر ہیں۔

حافظ آباد سے افتخار احمد تارڑ اور حسن سردار رانا کی ملی جلی رائے۔ ’’جون کا شمارہ 4 تاریخ کو ملا۔ سرورق کی تعریف کروں تو تحریر لمبی ہوجائے گی۔ بہرکیف خوب صورت تھا۔ آج کل کی نوجوان نسل کا یہ المیہ ہے کہ اپنے بزرگوں کی خدمت اور قدر نہیں کرتی حالانکہ بزرگوں کے تجربات ہم نوجوان نسل کے لیے راہنمائی کا ذریعہ ہیں۔ دیوانے کہانی میں نور جیسی محنتی اور محبت کرنے والی ماں کی قدر نہ کر کے اس کی اولاد نے معاشرے کے نوجوانوں کو ایک سبق دیا اور سہیل احمد کے بہن بھائیوں نے بڑے بھائی کے احسانوں کو فراموش کر کے رشتوں کی دھجیاں بکھیر دیں۔ ڈاکٹر کیشن جیسے مردہ ضمیر آدمی کا اس معاشرے کے لیے عبرت ناک انجام ایک سبق ہے۔ مریم کے خان نے کرداروں کو خوب صورت انداز میں پیش کیا۔ رسم دغا محترمہ اسما قادری نے اغوا برائے تاوان جیسے موضوع پر ایک خوب صورت کہانی پیش کی جس کا انجام خوب صورت تھا۔ بھیانک چال بھی خوب صورت کہانی تھی۔ فرض شناس پولیس افسر دانیال کا کردار بے شک ہمارے پولیس ڈپارٹمنٹ کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ بچوں کی تربیت کے لحاظ سے بھی کہانی پُراثر تھی۔ اس کے بعد آتے ہیں سلسلے وار کہانیوں کی طرف۔ جواری بہت اچھی جارہی ہے۔ آج کل کے جعلی پیر اور ان کی غلط کاریاں بڑے خوب صورت انداز میں پیش کی گئی ہیں کہ کس طرح ان لوگوں نے ڈھونگ رچا رکھے ہیں اور مریدوں کو کیسے کیسے ٹارچر کرتے ہیں۔ بہت اچھوتا انداز ہے۔ آوارہ گردی ہوجائے یعنی کچھ ذکر آوارہ گرد کا۔ جناب عبدالرب بھٹی نے نیا موضوع دیا ہے اطفال گھر سے کینگسٹر تک۔ دو قسطوں میں تو کرداروں کا اسٹارٹ ہے آگے امید ہے کہانی اور دلچسپ ہوجائے گی۔ ویسے مسافر کی طرح تھوڑا سرائیکی علاقہ اور چندو ماسی کی طرح وہی بیگم صاحبہ کا گینگ اور بیگم صاحبہ کا شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہوجانا اس سسپنس میں ضرور کوئی راز ہے، قارئین کو اپنے سحر میں جکڑ رہی ہے۔ ویسے عبدالرب بھٹی نے پڑوسی ملک کے پروڈیوسر کی طرح ہیرو ہیروئن بالکل ینگ رکھے ہیں۔ یہ بھی ایک نیا ٹرینڈ ہے مجموعی طور پر سارے کردار اچھے ہیں۔ جیسے اس قسط میں ایم این اے اور چنی بائی آگے چل کر کہانی کو دلچسپ اور چار چاند لگادیں گے۔ اس کے ساتھ اجازت چاہوں گا امید ہے میرا تبصرہ شامل کر کے شکریے کا موقع دیں گے۔‘‘

نیول کالونی ڈالمیاں، کراچی سے انعم ریاض کی پسندیدگی ’’جاسوسی کا سرورق تجسس کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا۔ فون پر بات کرتے ہوئے شخص کی رازدارانہ گفتگو اس لمبی گردن والی کے متعلق ہوگی جو نیچے کسی غیر مرئی چیز کو دیکھے جارہی تھی۔ چینی نکتہ چینی میں تمام دوستوں کو خلوص بھرا اسلام۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ایچ اقبال کی بھیانک چال پڑھی۔ کیا کوئی ماں اس طرح بھی کرسکتی ہے جس طرح نرگس زماں نے کیا؟ دوسرے نمبر پر جواری پڑھی۔ اس قسط میں شاہینہ کی حرکتوں سے لگتا ہے کہ سلیم کو مجبوراً ایک نہ ایک دن شاہینہ کی محبت میں گرفتار ہونا پڑے گا۔ سرورق کی پہلی کہانی مریم کے خان کی زیادہ دلچسپی لیے ہوئے تھی جبکہ سرورق کی دوسری کہانی اچھی نہیں تھی۔ روبینہ رشید کی کہانی میں ہونے والے گیم کے اصول وضوابط پڑھ کر ہم حیران رہ گئے۔ باقی کہانیوں میں بشریٰ امجد کی مہنگی بھول اور ماہ نور کی لب گور زیادہ پسند آئی۔‘‘

ننکانہ صاحب سے ایم افضل کھرل کی تعزیت ’’آج پہلی مرتبہ اس محبت بھری بزم چینی نکتہ چینی میں شرکت کرنے کی جسارت کررہا ہوں۔ امید ہے مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ (یقیناً) ماہ جون کا میگزین تین جون کو موصول ہوا۔ ٹائٹل گرل کی آنکھوں میں محبت چھلک رہی تھی۔ اوپر کونے میں شکیل کاظمی تصویر العین کو کال کر کے انفارمیشن دے رہے تھے کہ جون کا جاسوسی بازار میں آگیا ہے اور دائیں طرف محمد صفدر معاویہ ان کی جاسوسی کر کے لبوں پر پھیکی سی مسکان لیے دیکھ رہے تھے۔ تبصروں میں بشریٰ افضل، محمد جاوید مرزا، ماہا ایمان، محمد شاہان سعید، محمد قدرت اللہ نیازی اور زویا اعجاز کے

تبصرے بہت خوب لگے۔ کہانیوں کا آغاز عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد سے کیا۔ شہزاد عرف شہزی نے حالات کا مقابلہ خوب ہمت کے ساتھ کیا۔ انسپکٹر روشن خان خود قانون کے شکنجے میں چل بسا اور گگل خان بے موت مرا گیا (مارا گیا) اب شفقت راجانہ جانے کیا سلوک کرتا ہے۔ رسم وفا اسما قادری کی بہت خوب صورت تحریر تھی۔ باقی ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ آخر میں جناب انجم جمیل کی وفات کا پڑھ کر دلی افسوس ہوا ہے۔ ہم سب پسماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ پاک مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے، آمین۔''

نوشہرہ سے محمد جاوید مرزا کی ہدایت ''شمارہ 2 جون کو ہاتھ میں تھا۔ بے حد خوشی ہوئی۔ سرورق پر ذاکر صاحب ہمارے شوق و بے صبری پر خندہ زن نظر آئے۔ فہرست کے انگلیوں کی پوروں پر دھرے گلدستے سے ہوتے ہوئے دوستوں کی محفل میں داخل ہوئے جہاں نکتہ چینیاں کم اور نوک جھوک زیادہ [illegible] تمام دوستوں کا جنہوں نے ناچیز کا تذکرہ اپنے خطوط میں کیا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ آوارہ گرد پہلے نمبر پر آ گئی ہے۔ اگلے ماہ سے پہلی ترجیح آوارہ گرد [illegible] ایچ اقبال کی بھیا تک چال خاصی دلچسپ تھی۔ بشریٰ احمد کی مہنگی بھول روایتی ہونے پر بھی سبق آموز تحریر تھی۔ عمار آزاد کی مینڈک باز کا عنوان غیر [illegible] انجام پسند نہیں آیا۔ روبینہ رشید کی کاوش کا نٹریکٹ ایک بالکل مختلف اور نئے خیال کی حامل تحریر تھی۔ اگرچہ کہانی کا پلاٹ دل کو مجروح کر دینے [illegible] قاتل کی انوکھی کہانی تھی جو ایک کی سزا سب کو دے رہا ہے۔ جمال دستی کی انتقام حسب سابق اچھی تحریر تھی۔ [illegible] انتقام کا انجام [illegible] بڑا آدمی منظر امام کی پُرلطف کہانی تھی لیکن موجودہ دور کی نہیں۔ مریم کے خان کی سرورق کی کہانی [illegible] اچھی تحریر تھی۔ اوور ڈرز میں رشتوں کی بے توقیری کی عبرت اثر داستان تھی۔ اسما قادری نے بھی سرورق سے انصاف [illegible] اور آخر میں چند گزارشات۔ رسالے کے معیار پر تھوڑی مزید محنت کی ضرورت ہے۔ اگرچہ ایک ماہ میں چار پرچے [illegible] کی ضرورت ہے۔ سرگزشت اور جاسوسی کے درمیان وقفہ تھوڑا ہے جس کی وجہ سے سرگزشت [illegible] 10 تاریخ [illegible] تو بہتر ہوگا۔ زیادہ کاٹ چھانٹ کی زحمت سے بچانے کے لیے خط کو مختصر کر دیا ہے۔''

[illegible] قدرت اللہ نیازی، تصویر العین، ماہا ایمان، شکیل [illegible] کہانیوں کی شروعات آوارہ گرد سے کی۔ بہت زبردست تحریر تھی۔ بور ہونے کا احساس ایک لمحے کو بھی [illegible] بے وفا اور مطلبی عورت نے دانیال کا ساتھ دے کے بس یہی کام اچھا کیا چاہے اپنے مطلب کے لیے [illegible] پاکستانی عوام اور لیڈروں پر خوب چوٹ ہے۔ اب باری ہے جواری کی، بہت خوش ہو کر شروع کی تھی مگر اب کیا [illegible] اندر تیج زیادہ اور ایکشن کم ہوتا ہے اس طرح جواری، کہانی کم اور خیالات زیادہ ہیں۔ میرے خیال میں اس کا نام [illegible] ہونا چاہیے۔''

کبیر عباسی عرف شہزادہ کوہسار مری کی چہچہاہٹیں ''ٹائٹل بس ٹھیک ہی تھا۔ فہرست کا انفرادیت لیے ہوئے ڈیزائن ہماری پسندیدگی کے معیار پر پورا اترنے میں کامیاب رہا۔ نورالہدیٰ کی واپسی خوش گوار ثابت ہوئی۔ مسٹرا یہ ایک اتفاق ہے کہ جب آپ آئیں تو ہم بلیک لسٹ میں تشریف فرما تھے ورنہ اب تو اکثر ہم پر خصوصی نظر کرم کرتے ہوئے ہمارے زیادہ تر تبصرے شائع کر دیتے ہیں۔ (ہاں آپ ٹرک بھر کر برف بھیجتے ہیں نا) ساگر کھوکھرا پاکیزہ تو پاکیزہ بہنوں کے لیے ہے بشریٰ افضل بھی کہانیوں کے خلاصے کے ساتھ براجمان تھیں۔ محکمۂ ڈاک کی ستائی ہوئی صبا گل سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ کبیر عباسی کا تبصرہ، تبصرہ کم حسابی گوشوارہ زیادہ لگا اور وہ بھی کافی بے ربط۔ تصویر العین، اکبر شاہ کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ یقیناً عمر کا تقاضا ہے لیکن وجہ ان کی عمر رسیدگی نہیں بلکہ ان کی بالی عمر ہے ابھی وہ صرف پندرہ سال کے ہیں۔ افتخار اعوان آپ کا دل تو پاگل معلوم ہوتا ہے جو آتی اوٹ پٹانگ سی ٹائٹل گرلز کو دیکھ کر مچل جاتا ہے۔ ماہا ایمان! آپ کا شکریہ کہ آپ نے ہمارا مان رکھا۔ مظہر سلیم! ہم تو چاہتے ہیں کہ آپ کو ایک بار پھر شرفِ ملاقات بخش کر آپ کی قیمتی ترین یادوں کے خزانے میں مزید اضافہ کریں مگر آپ ہیں کہ ٹالے ہی جا رہے ہیں۔ اکبر شاہ نے ایک بار پھر خوب صورت الفاظ کے ذریعے ہمارے دل کی پسندیدگی کے گوشے تک رسائی حاصل کر لی۔ ادریس احمد خوش رہا کریں۔ یقیناً اللہ کی اس میں بھی کوئی بہتری ہوگی۔ کاظمی صاحب! جاسوسی کے قارئین کو خوش ذوق اور ذہین وغیرہ کہہ کر ہماری تعریف کی اس کا شکریہ۔ آوارہ گرد کی دوسری قسط پڑھ کر جو بھی تھوڑے بہت ریمارکس ڈاکٹر صاحب اور پہلی قسط کو دیے تھے وہ واپس لینے پر مجبور ہو گئے۔ اس قسط میں تو ڈاکٹر صاحب نے کمال کر دیا ایکشن، جذبات، رومانس اور سسپنس سے مزین یہ قسط بہت پسند آئی۔ مختاری بیگم یقیناً شہزی کی ماں ہیں۔ جواری میں احمد اقبال نے بہت مایوس کیا۔ انتہائی کمزور کردار نگاری اور گھسے پٹے واقعات اور مزاح کی کمی کی وجہ سے بہت بوریت ہوئی۔ سرورق کے رنگ دونوں ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ اسما قادری سے گزارش ہے کہ پرل گروپ کو جلدی سے منظرِ عام پر لے آئیں۔ ایچ اقبال کی بھیانک چال نے آغاز میں اپنے سحر میں جکڑ لیا گو کہ ہم آہستہ آہستہ اس سحر سے نکلتے چلے گئے اس کے باوجود مجموعی طور پر تحریر پسند آئی۔ مختصر تحریروں میں روبینہ رشید کی کانٹریکٹ اس شمارے کی سب سے خاص تحریر رہی۔ اس شمارے کی واحد مزاحیہ تحریر بڑا آدمی پڑھ کر دل گارڈن گارڈن ہو گیا۔ تنویر ریاض کی نقب زن منفرد ڈاکے کی حامل رہی، پسند آئی۔ کلر میں کافی بہتر رہیں۔ شاہد صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' (ابھی تک سنبھلی نہیں ہے)

ضلع اٹک سے سعدیہ بخاری کی انتہائی محنت ''جون کے جاسوسی کا ٹائٹل کافی منفرد لگا۔ خصوصاً سرورق کی حسینہ بہت خوب صورت لگی لیکن اس کے سر پر صنفِ کرخت کو بٹھانا بہت برا لگا۔ چینی نکتہ چینی میں ایڈیٹر حسب معمول سیاست دانوں کی بے حسی اور مہنگائی کو موضوع بنائے ہوئے ہیں، آگے رمضان المبارک قریب ہے ابھی سے روتا ہے کیا' آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟ صبا گل یہ بتاؤ عقل بڑی کہ بھینس ہگاواچی گان ایک خودساختہ تحقیق ہے۔ آپ نے

اسے سچ مچ چینی خاتون سمجھ لیا؟ شرمندہ کروا دیا ہمیں۔ انجم بھائی سلسلے وار کہانیوں پر آپ کی رائے سے میں 100 فیصد تک متفق ہوں۔ کبیر عباسی! آپ کہیں اکاؤنٹنٹ تو نہیں؟ جب دیکھو کہانیوں کو نمبر دے رہے ہوتے ہو آپ کے تبصرے کو میں 60 پرسنٹ نمبر دیتی ہوں۔ ماہا ایمان! بہت شکریہ آپ نے ہماری فرمائش پوری کی اب آتی رہیے گا۔ قدرت اللہ نیازی برادر! خواتین کے غیاب پر پریشان دکھائی دے رہے ہیں، اتنی کمیاں محسوس نہ کریں کہیں آپ خود وٹامن کی کمی کا شکار نہ ہو جائیں۔ شکیل کاظمی! آپ کے خط کا ابتدائیہ ہمیشہ خوشامد پر ہی کیوں ہوتا ہے؟ تبصروں میں زویا اعجاز، افتخار اعوان، انجم جرال، کبیر عباسی کے تبصرے پسند آئے۔ نکتہ چینی کے بعد اب کہانیوں پر اپنی ماہرانہ رائے پیش کرتی ہوں۔ ابتدائی صفحات پر ایچ اقبال کی بھیانک چال نے کچھ خاص متاثر نہ کیا۔ واقعات کو فلمی انداز میں پیش کیا گیا۔ کسی زمانے میں ابتدائی کہانی ایک شاہکار ہوتی تھی خاص طور سے مغرب سے درآمد شدہ کہانیاں جیسے پری میسن وکیل کی اسٹوریز، اور ایک یاد ہے ہٹلر کی واپسی اب تو بس ٹوٹل پورا کیا جاتا ہے۔ نئی سلسلے وار کہانی آوارہ گرد کی کیا تعریف کروں سورج کو چراغ دکھانا ہوگا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم نے فلاحی ادارے کی آڑ میں کھیلے جانے والے گھناؤنے کھیل اور معصوم بچوں کی زندگی کو برباد کرنے والوں کو بے نقاب کیا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ اسٹوری موت کے سوداگر کی جگہ لے گی۔ دوسرا سلسلہ جواری، تین اقساط کے بعد تو جیسے جمود کا شکار ہو گئی کوئی پیش رفت نہیں، ابتدا تو پھر بھی بہت بہتر تھی۔ سرورق کے دونوں رنگ ہمارے معاشرتی مسائل اجاگر کرتے بڑے بہترین اور دلچسپ انداز میں لکھے گئے۔ تھوڑے سے فرق کے ساتھ موضوع یکساں تھا۔ مریم کے خان کی دیوانے پسند آئی لیکن اسما قادری کی رسم وفا نمبر لے گئی۔ اپنے ہردلعزیز مصنف منظر امام ایک بار پھر ہنستی مسکراتی تحریر لائے۔ ویسے تو مصنف نے ہر زبان پر طبع آزمائی کی لیکن ان کی انگریزی سپر ہٹ رہی۔ مختصر کہانیوں میں گینگ میں ڈپٹی وارڈن فلچر نے اپنی ذہانت سے جعلی وارڈن کو پکڑوا دیا۔ جاسوسی ٹائپ کی دلچسپ اسٹوری تھی۔ دیگر مترجم کہانیوں میں نقب زن، کانٹریکٹ اور لب گور دلچسپ تھیں۔ انتقام سسپنس سے بھرپور رہی۔ تلاش ٹیم بالکل بور سی لگی۔''

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کے یادگار لمحات ''اس دفعہ جولائی کا شمارہ جب قارئین کے ہاتھ کی زینت بنے گا تو رمضان المبارک کا آغاز ہو چکا ہوگا۔ اس لیے ادارے اور تمام قارئین کو میری طرف سے اس ماہِ صیام کی مبارک۔ اور حسن اتفاق یہ بھی ہے کہ اس سال حیرت انگیز طور پر پھر میری سالگرہ یکم جولائی کو ہی آئی ہے اور پچھلے چھبیس سال سے ایسا ہوتا آ رہا ہے اور اب پورے ستائیس سال ہو گئے۔ (یہ زبردست کمال ہو گیا) چینی نکتہ چینی میں آپ کا اداریہ ہمیشہ کی طرح اعلیٰ تھا مگر ان سب سوالوں کے جواب جو آپ نے کیے پاکستانی عوام کو کم ہی ملتے دکھائی دے رہے ہیں۔ ملکہ کوہسار مری سے نورالہدیٰ صاحبہ نے اپنی واپسی کو یادگار بنا دیا۔ اچھی تحریر تھی آپ کی، مبارکباد قبول کریں۔ صبا گل! امیں کہیں سے قول چوری نہیں کرتا یہ تو شیکسپیئر اور گاواچی گان کے اقوالِ زریں کے.... مطالعہ کا اثر ہے، پسندیدگی کا شکریہ۔ سید محی الدین اشفاق برادر کسرِ نفسی نہیں خودشناسی کہیں، ہنوز ہم نو آموز ہی ہیں۔ شہزادہ کوہسار! آپ ڈائجسٹ اپنے طالب علموں کا امتحانی پرچہ سمجھ کر پڑھتے ہیں جو نمبر دینے لگ جاتے ہیں؟ یعنی جس کہانی کے نمبر کم ہوئے وہ مصنف اگلی دفعہ تیاری کر کے لکھے نئی کہانی، بہت خوب جناب! مرزا انجم جرال اور افتخار اعوان محفل میں نظر آتے رہا کریں اچھا محسوس ہوتا ہے۔ تصویر العین صاحبہ میں شادی کے بارے میں انتہائی سنجیدہ ہو گیا ہوں، آپ کے مشورے کے بعد آگے جو اللہ کو منظور اور پھر میری ہونے والی زوجہ کو.... ماہا ایمان! واپسی کا سفر مبارک، آپ کی محتاط تعریف کا مشکور ہوں اور بلا مبالغہ آپ ان تبصرہ نگاروں میں شامل ہیں جن کے تبصرے میں ترجیحاً... پڑھتا ہوں، اب خوش؟ مظہر سلیم برادر! آپ کا تبصرہ پڑھ کر ہمیشہ ادب جوش مارنے لگتا ہے دل و دماغ میں۔ بہت عمدہ زویا اعجاز! بہت اچھا تبصرہ لکھا آپ نے۔ آپ کی دعاؤں اور اپنی مصروفیت کی وجہ سے ابھی تک دو قسط وار کہانیاں ہی پڑھ سکا ہوں۔ سب سے پہلے جواری کی بات کریں تو کہانی پیر صاحب، شاہینہ اور انور کے اردگرد ہی گھوم رہی ہے۔ جبکہ خاور صرف مٹی شاہد بن کر داستان گوئی کر رہا ہے۔ احمد اقبال صاحب سے گزارش ہے کہ خاور کو حویلی اور شاہینہ سے ذرا دو تین قسطوں کے لیے جدا کر کے میدانِ عمل میں دکھائیں تورین کے لیے یا نادر شاہ سے برسرِپیکار، پھر دیکھیں افاقہ ہوتا ہے یا نہیں۔ اور جہاں تک بات ہے آوارہ گرد کی تو ڈاکٹر صاحب نے یہ قسط بھی بہت جاندار قسم کی لکھی ہے۔ ایک دو دفعہ ایسا لگا کہ کہیں اول خیر بے ساختگی میں شہزاد کو مادرِ غنچہ نہ کہہ دے مگر کہانی کی سمت اور واقعات نے اس کی نفی کر دی۔ شہزاد کا جذباتی پن اور اول خیر کی دور اندیشی دونوں کا ملاپ اچھا ہے۔ مختاری بیگم کہیں عابدہ کی رقیب نہ بن بیٹھے۔ اگلی قسط میں دیکھتے ہیں کیا گل کھلتے ہیں۔''

اوکاڑہ سٹی سے تصویر العین کی دوستوں سے ملاقات ''جاسوسی کے ٹائٹل میں بس دوشیزہ ہی پسند آئی۔ خبیث مسکراہٹ والا انسان تو زہر ہی لگا۔ نورالہدیٰ نے بڑے عرصے بعد انٹری دی۔ ساگر کھوکھر آپ مجھے خاصے بے رحم نظر آتے ہیں پاکستانی پولیس کی طرح۔ ہتھ ہولا رکھیں۔ بشریٰ افضل بہاولپور سے بڑی خوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔ نام پڑھ کر ہی دل کو خوشی مل جاتی ہے۔ صبا گل سسٹر میں ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو۔ اتنے شکوے مت کیا کرو۔ مرزا انجم جرال مبارک ہو، اٹھارہ سالہ تاریخ کا ریکارڈ ٹوٹ گیا۔ مجھے تو اب بھی جاسوسی 4 تاریخ کو ملا ہے۔ کبیر عباسی کا تبصرہ بھی جاندار تھا۔ افتخار اعوان آپ کا دل اتنا کمزور ہے اسے تھوڑا مضبوط بنائیں۔ تاکہ خوب صورت سے خوب صورت چہرہ بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ مظہر سلیم نے صحیح کہا کہ میں صرف دوستوں کی بات کرتی ہوں کہانیوں پر نہیں تو شاید ایک مرتبہ پہلے بھی میں نے کہا تھا کہ کہانیوں پر تو تقریباً سب ہی تبصرہ کرتے ہیں۔ اس لیے میں محفل اور دوستوں پر تبصرہ کرتی ہوں کہانیوں پر نہیں۔ سید اکبر شاہ لفظ بہت نے کیوں خوشی دی، وضاحت بھی کر دیتے۔ ناز اور سوہا بہت شکریہ۔ محمد شاہان بہت بہت مبارک ہو کیک تو کھلایا نہیں۔ جاسوسی کی پہلی کہانی بھیانک چال کا نہ سر تھا نہ پیر، مجھے تو کوئی سمجھ نہیں آئی۔ آوارہ گرد کی دوسری قسط اچھی رہی۔''

لاہور سے زویا اعجاز کی شمولیت ''ماہ جون ہمیشہ ہی سے تختِ شاہی پر قہر برساتا ہے لہٰذا جاسوسی 3 جون کی گرم جھلستی ہوئی دوپہر میں کسی نخلستان کی طرح ملا۔ ٹائٹل پر اس بار ایک زومبی خاتون اور حیوانی تاثرات کے حامل صنفِ کرخت نے بالکل اچھا تاثر نہیں چھوڑا۔ ٹائٹل بالکل انگلش موی

TWILIGHT کے ویمپائرز کی یاد دلا رہا تھا۔ انڈیکس کا نیا ڈیزائن پسند آیا۔ اداریہ اس مرتبہ اختصاریہ لگا۔ عصرِ حاضر میں اگر سستا ہے تو صرف انسان۔ شہنشاہ جنات! اوہ سوری..... میرا مطلب ہے شہزادہ کوہسار! ابھی آپ تو ماشاء اللہ کافی تخلیقی ذہن کے مالک تھے مگر اب کچھ عرصے سے آپ کے تبصرے گریڈز، فیصد، نمبرز میں ہی الجھ کر رہ گئے ہیں۔ اپنا سیکریٹری بدل ہی لیجیے اب۔ ماہا ایمان جی! ویلکم بیک۔ اب پھر سے گھریلو مصروفیات میں مت الجھ جایئے گا، آتی رہیے گا۔ زاہدہ اقبال اور بشریٰ افضل اس بار کافی عجلت میں نظر آئیں۔ وڈے شاہ جی کا تبصرہ حسبِ معمول شاندار۔ مظہر سلیم! نئی بجٹ پالیسی کے تحت آئندہ محفل سے غیر حاضری پر بھاری بھر کم جرمانہ عائد ہوگا۔ لہٰذا اپنی حاضری کا ریکارڈ بہتر بنایئے۔ کہانیوں کا آغاز بھیا تک چال سے کیا۔ اندازِ تحریر پر نشور ہادی کی چھاپ نمایاں تھی۔ آغاز اچھا تھا لیکن اختتام تک تحریر بالکل دم توڑ گئی۔ نرگس کا ایک طرف بیٹے کو منفی راہوں کا مسافر بنانا اور دوسری طرف دانیال کی محبت ملتے ہی بھائی کی مخبری کر دینا اس کے کردار کو بہت الجھا ہوا منفی تاثر دے گیا۔ آوارہ گرد جاسوسی کے صفحات میں ایک خوش گوار اضافہ ثابت ہوئی ہے۔ شہزاد کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا بیان قابلِ ستائش تھا۔ سرورق کے دونوں رنگ لالچ و ہوس کے موضوع کا احاطہ کیے ہوئے انتہائی زبردست تھے۔ دولت کہیں خون کو سفید کرتی ہے تو کہیں احساسات مردہ کرتی ہے۔ انسان کے اشرف المخلوقات کے عہدے کی تنزلی کا سبب بنتی ہے۔ جواری کا ابھی تک صرف ایک ہی صفحہ پڑھنے کا حوصلہ مجتمع کرنے میں کامیابی ہوئی ہے۔ بڑا آدمی سرسری پڑھی۔ جمیل کی فلسٹار میرا ٹاپ انگلش نے بہت محظوظ کیا۔ کانٹریکٹ انسانی حقوق کے علمبرداروں کی بے حسی اور انسانیت سوزی کا نمایاں عکس تھی۔ مہنگی بھول، انتقام، گینگ اور لب گور بھی متاثر کن رہیں۔ کترنوں کی تعداد اس دفعہ قدرے کم تھی۔“

ایم اے ہاشمی، ضلع بونیر سے لکھتے ہیں ”شمارہ 2 تاریخ کو مل گیا۔ سرورق کافی منفرد تھا۔ کوہساری ملکہ جانی پہچانی نورالہدیٰ کی تھیں۔ ہم دور دراز لوگوں کو یہ شہری لوگ نظرانداز ہی کرتے ہیں۔ پر کیا کریں اس دل کے ساتھ کہ یہ جاسوسی سے رشتہ جوڑنے پر بضد ہے۔ (ہمارے لیے سب قارئین محترم ہیں) جواری کا ٹیمپو تسلی بخش تیز ہے۔ عموماً زود نویسی معیار کی پستی کا باعث ہوتی ہے لیکن یہاں معاملہ الٹا ہے۔ ایک بات بہرحال ہے کہ ملک سلیم کی پے در پے کڈنیپنگ اس نکھار کو مجروح کرتی ہے۔ شاہینہ کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ خیر لومڑی چاہے جتنی بھی چالاک ہو لیکن جنگل کا راجا شیر ہے بھیانک چال اس ماہ کی بہترین سوغات تھی۔ بانڈ ماسٹر اور کالا سانپ انجام کو پہنچ گئے۔ نرگس کے ساتھ اچھا ہی ہوا۔ لب گور شارٹ مگر اچھی تحریر تھی۔ منظر امام نے خوب ہنسایا۔ خود کو گاؤں کا مختارِ کل سمجھنے والے مختار کو بالآخر ڈنڈے پڑ ہی گئے۔ رنگوں میں دوسرا رنگ پڑھا اچھا تھا۔“

پشاور سے طاہرہ گلزار کی تفصیلات ”آج 3 مئی کو شام 5 بجے اپنا پیارا کیوٹ سا دوست جاسوسی ملا۔ جناب اظہر جمیل صدیقی صاحب کے انتقال کا بہت دکھ ہوا۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ جاسوسی کا سرورق بالکل میرے خط کے شائع نہ ہونے پر بنا ہے۔ ایک طرف تصویر العین کچھ نروس سی تھیں ٹھنڈے ٹھنڈے دماغ سے چینی نکتہ چینی پر نظر ڈالی۔ انکل کی تپی اور کڑوی ٹانک والی باتیں دل و دماغ میں ڈال کے اپنے پیارے دوستوں کی طرف دیکھتی ہوں، مجھے کس کس نے یاد کیا ہے اور کن الفاظ میں یاد کیا ہے۔ نورالہدیٰ جی! ہم جاسوسی کے دوست ایک خاندان کی طرح ہیں۔ کوئی مشکل سے بھلایا جاتا ہے۔ نور سسٹر! کشش صنفِ مخالف میں ہی ہوتی ہے۔ تو رسسٹر ہمیں یاد نہ کر کے تین چٹکیاں نہ لیتا اے۔ انور یوسف زئی تو جاسوسی پر تنقید کرتے نظر آئے۔ بھائی ساگر ٹکو کر کافی نصیحت کرتے نظر آئے۔ بھائی یہاں سچ بولنے والے کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مرزا انجم جرال بھائی! اگر بقول آپ کے 18 سال سے پڑھ رہے ہو تو پھر آپ کی عمر مبارک کتنی ہے۔ عورتوں کی طرح چھپانا نہیں جبکہ میں نے صحیح عمر بتائی۔ سید محی الدین بھائی! آتے ہی سرورق کی حسینہ پر ناپسندیدگی کے حملے، واہ جی واہ۔ کیوں بھائی آپ نے ٹائٹل گرل کے لیے رشتہ بھیجنا تھا۔ اشفاق بھائی! مجھے بھی پاکستانی اداکار محمد علی، وحید مراد، ندیم، بابر علی، شبنم، دیبا، شمیم آرا اور بابرہ شریف اینڈ ریما پسند ہیں۔ مٹھائی کیوں نہیں تقسیم کروں گی جاسوسی، سسپنس اور سرگزشت میرے لیے لڈو، گلاب جامن اور رس گلے ہیں۔ صفدر معاویہ اتنی مختصر تحریر کے ساتھ۔ کبیر عباسی بھائی!... آپ اپنے مشورے پر عمل کر کے کس کو بانس پر چڑھا رہے ہیں۔ کبیر آئندہ کسی صنفِ نازک کی بات پر سوچ سمجھ کے عمل کیا کرو ورنہ؟ نہ نہ کبیر بھائی، بھٹی صاحب کی آوارہ گرد تو بہت زبردست جا رہی ہے لگتا ہے کہ بہت جلد للکار کی پوری کر دے گی۔ کبیر بھائی! ہمیں پتا ہے کہ آپ میتھس کے ٹیچر ہیں۔ اس لیے جاسوسی کے رائٹرز کو بھی اپنے اسٹوڈنٹ سمجھتے ہو۔ تصویر العین سسٹر جی! سید اکبر شاہ ابھی بچہ ہے کلاس 9th کا طالب علم ہے، کچھ خدا کا خوف کرو بچے کو 60 سال بوڑھا بنا دیا۔ ویلکم مینی! اب پھر غائب نہ ہونا، بہت خوش ہوں کیونکہ مجھے اپنے جاسوسی کے بہن بھائیوں سے بہت پیار اور محبت ہے۔ اللہ تم سب کو دونوں جہانوں میں خوش اور پُرسکون رکھے آمین۔ مینی سسٹر! شکیل کاظمی کو ان کی پڑوسن کسی لائق چھوڑیں گی جب نا۔ شکر ہے ماہا ایمان تفسیر جی کہ آپ نے حاضری تو دی۔ ماہا جی! ہم آپ کو نہیں بھولے آپ ہی کچھ بے مروت نکلیں۔ شکیل صاحب! دوستوں کو یاد رکھنے کے لیے بہانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ رابطہ رکھنے میں آپ ہی سست ہیں۔ مریم کے خان کی تحریر دیوانے اس خودغرض اور نفسانفسی والے معاشرے کی مکمل عکاس ہے۔ اللہ ہم سب کو نور کے بچوں اور سہیل احمد کے بہن بھائیوں جیسا بننے سے بچالے۔ ویلڈن مریم جی زورِ قلم اور تیز ہو۔ دوسرا رنگ اسما قادری کی تحریر رسم دغا بھی بہت شاندار، اسماجی معاشرے کے ایسے ناسور کو سامنے لا کر ہمیں یہی تو سکھانا چاہتی ہے کہ آنکھیں بند کر کے کسی پر اعتبار نہ کریں۔ ہمیشہ اچھی سوچ اور نیک عمل کریں ورنہ انجام سلیمان جیسا ہی ہوگا۔ اس بار دونوں رنگ بہت حساس موضوں پر تھے اور دونوں لاجواب۔ میں تین چار دن سے بیمار تھی دل بہت دکھی ہو رہا تھا۔ لیکن جب منظر امام صاحب کی تحریر بڑا آدمی پڑھی تو دل و دماغ سے مایوسی 80 فیصد تک ختم اور ہنستے ہنستے یہ بھی بھول گئی کہ میں بیمار تھی۔ جمال دستی صاحب کی تحریر انتقام، انقلاب جنگ کے دور کی بے حسی اور مظلومیت سے بھرپور تحریر ہے۔ روپا بیگم نے جس طرح انطونی ملک سے انتقام لیا بہت اچھا کیا۔ تلاش نیم بابر نعیم کی مختصر تحریر جو سر پر سے گزر گئی۔ ٹونی ایک نفسیاتی کیس تھا۔ ماہ نور صاحبہ کی مغربی مختصر تحریر لب گور مغربی معاشرے کی عکاس نہ سمجھنے والی کہانی کچھ خاص نہیں۔“

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی پسند ناپسند ”جاسوسی اس ماہ بھی 3 جون کی تپتی دوپہر میں ملا اور گرما کی طویل دوپہروں کا ساتھی بنا۔ سرورق کی طباعت اس بار غضب کی تھی۔ کیا پاکستان میں اتنی معیاری طباعت ہونے لگی ہے؟ مگر سرورق کی حسینہ اپنے نقوش اور آنکھوں سے کچھ جاپانی لگی۔ چینی نکتہ چینی کی محفل کی بازی اس بار کوہ مری کی نورالہدیٰ نے جیت لی۔ اس بار حافظ آباد کا بدلیوں میں چھپا چاند آخر نکل ہی آیا اور ساتھ ہی بشریٰ افضل، تصویر العین، زویا اعجاز، صفدر معاویہ، کبیر عباسی، شکیل کاظمی، ادریس احمد کے تبصرے زبردست رہے۔ اب کہانیوں کی طرف آئیں تو جواری کی قسط اس بار بے حد سست رہی اور ملک سلیم اب تک شاہینہ کے جنگل سے نکل نہیں پایا جبکہ نورین کا عشق اب تک نہیں بھلا پایا۔ حسن عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب۔ پیر صاحب کی قید سے رہائی اب اس کے لیے مشکل ہوتی جا رہی ہے مگر شاید اب ریشم کوئی مدد کر سکے۔ دوسری قسط وار کہانی آوارہ گرد ایک بے مقصدی داستان ہے۔ اس میں سوائے مار دھاڑ کے اور کچھ نہیں۔ سرورق کی دونوں کہانیاں دیوانے اور رسم دغا بس گزارے لائق تھیں جن میں کوئی نیا پن نہ تھا۔ منظر امام کی کہانی بڑا آدمی ایک انوکھی اور دلچسپ تحریر تھی۔ شمارے کی پہلی طویل کہانی ایچ اقبال کی بھیانک چال اس ماہ کی بہترین کہانی تھی۔ ویسے مصنف کا احمد اقبال صاحب سے کوئی تعلق ہے یا صرف نام ہی ملتا ہے؟ (صرف نام ہی ملتا ہے) ترجمہ شدہ کہانیوں میں سب سے بہتر تنویر ریاض کی نقب زن رہی۔ اس ماہ کافی عرصے بعد کچھ کارٹون نظر آئے جو مزہ دے گئے۔“

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی فرمائش ”آخری پیپر دے کر جون کی تپتی دوپہر میں تین عدد جاسوسی اکٹھے خریدے۔ جون کے شمارے کا ٹائٹل اچھا تھا۔ نیچے غالباً ماہا ایمان صاحبہ اداسی کی تصویر بنی بیٹھی تھیں اور اوپر ایک صاحب تفسیر بھائی کو کال کر رہے تھے کہ آپ کی جانی دشمن آ گئیں اور دوسرے بھائی اس صورتِ حال پر مسکرا رہے تھے۔ ٹائٹل کے پوسٹ مارٹم کے بعد دوستوں کی محفل میں انٹری دی۔ بہت عرصے بعد تصویر العین اور نورالہدیٰ کی آمد اچھی لگی۔ اتنے ماہ غیر حاضر رہنے پر کسی دوست نے یاد کیا ہی نہیں۔ ماہا ایمان آتے ہی شکیل کاظمی کی خوشامد شروع کر دی۔ شکیل کاظمی آپ کی پڑوسن کا مسئلہ پتا نہیں کب حل ہوگا۔ سید محی الدین اشفاق اور شاہان کے تبصرے اچھے تھے۔ اب پوسٹ مارٹم ہو جائے کہانیوں کا۔ اپریل کے شمارے میں گرداب کی آخری قسط دیکھ کر زبردست جھٹکا لگا۔ اسماجی نے بہت خوب صورت اینڈ کیا۔ ماہ بانو اور شہریار کے ملاپ کا پڑھ کر اچھا لگا لیکن فریدہ کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ چودھری جیسے لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ جواری معذرت کے ساتھ بہت بور کر رہی ہے۔ نئی کہانی آوارہ گرد اچھی ہے لیکن گرداب جیسی نہیں۔ اسماجی جلد نئی اسٹوری کے ساتھ انٹری دیں۔ زیرِ نظر جون کے شمارے میں ابتدائی کہانی جرائم کی دلدل میں دھنسے رشتوں پر مبنی تھی۔ دانیال کی صحت پر رشک آیا۔ مریم کے خان کی اسٹوری پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ دیوانے سبق آموز کہانی تھی۔ آج کے دور میں اپنوں پر بھی بھروسا مشکل ہے۔ دوسری کہانی اسما قادری کے شاہکار قلم کا ثبوت تھی۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے والی بات تھی۔ سلمان پر بہت غصہ آیا، خیر آخر میں سب ٹھیک ہو گیا۔ کاشف بھائی ہم شاہی، تیمور کو بہت مس کر رہے ہیں۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔“

صبا گل پیر بابا، بونیر سے فرماتی ہیں۔ ”آج میں آپ سے چار چار ہاتھ کرنے کے موڈ میں تھی لیکن خیر چھوڑیں۔ اپنی انکساری کا کیا رونا رونا۔ ایک تو گزشتہ ماہ کرفیو نے گھروں میں محصور رکھا اور اوپر سے خط کا حلیہ بگاڑنے کی ٹینشن۔ یہ ٹینشن اس وقت دور ہوئی جب ماہا ایمان کو اپنے بیچ دیکھا۔ کیسی ہیں؟ خدارا اتنی دیر تک غیر حاضر تو نہ رہیں۔ اس دفعہ صنفِ نازک نے میدان مار لیا اور صنفِ مخالف جز بز ہو کر رہ گئے۔ خطوط بھی دوستوں کے زبردست تھے۔ شکیل بھیا! پڑوسنیں بلاوجہ نہیں آتیں۔ فکر مت کیجیے کا عنقریب جاسوسی میں لکھنا بھی شروع کریں گی۔ ناظم آباد سے ادریس احمد خان کی حالت پر بے پناہ دکھ ہوا۔ اللہ صحت دے، آمین۔ کہانیوں میں جواری ٹاپ پر ہے۔ شاہینہ اور پیر کی مکاری اور ملک سلیم کا بھی پورے خشوع خضوع کے ساتھ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا۔ حالات ایک دم پر تجسس ہیں۔ آوارہ گرد بھی اچھی ہی تھی۔ ہیرو صاحب دھیرے دھیرے اپنی دھول جما رہے ہیں۔ پہلا رنگ پڑھ کر اچھا لگا۔ منظر امام نے خوب ہنسایا۔ پلیز ہر ماہ کوئی ایک آدھ مزاحیہ کہانی ضرور دیا کریں۔ انتقام بھی ٹھیک تھی۔ بھیانک چال عمدہ تحریر تھی۔ ایچ اقبال نے حساس موضوع پر قلم چلایا ہے۔ عورت کو انتہائی ارزاں کر دینے والی یہ معاشرے کی گھناؤنی سچائی ہے۔ نرگس پر غصہ آ رہا تھا اور ترس بھی۔ مجموعی طور پر شمارہ اچھا تھا۔“

خانیوال سے محسن علی طالب کی جسارت ”میں آج پہلی بار آپ کے ڈائجسٹ میں ٹپکا ہوں۔ (بھائی کہاں سے اور کس طرح ٹپکے ہو؟) پڑھتا تو رہتا ہوں، میں معمولی سا لکھاری بھی ہوں۔ مختلف رسالوں میں لکھتا ہوں۔ امید کرتا ہوں آپ اور تمام جاسوسی کے ممبر مجھے خوش آمدید کہیں گے۔ ماہ جون 2014ء کے شمارے پر تبصرہ لے کر حاضر ہوں۔ حوصلہ افزائی کی گئی تو ریگولر لکھوں گا انشاء اللہ۔ (شکریہ ضرور) ٹائٹل موزوں ترین تھا۔ مجھے تو فون کرنے والا بندہ اچھا لگا ٹائٹل پر۔ (اس کے لیے بھی نوازش) ملکہ کوہسار کی واپسی اچھی لگی۔ محمد صفدر، محمد قدرت اللہ اور ماہا ایمان کے خطوط پسند آئے۔ اللہ پاک اظہر جمیل صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ ایچ اقبال بھیانک چال بہت اچھی تحریر لائے ہمیشہ کی طرح۔ مجھے آپ کے رسالے میں احمد اقبال بہت پسند ہیں۔ جواری لاجواب اسٹوری ہے۔ مہنگی بھول اور بڑا آدمی بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ باقی شمارہ بھی بہت اچھا تھا۔“

میرپور آزاد کشمیر سے مرزا انجم جرال کا نوٹس ”جون کا شمارہ 6 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل کو نظرانداز کر کے اداریہ پڑھا۔ اللہ پاک اس ملک اور عوام پر رحم کرے کیونکہ ان سیاست دانوں سے تو کوئی امید نہیں۔ اس کے بعد محفل میں قدم رکھا۔ نورالہدیٰ مبارک ہو جی، تبصرہ اچھا تھا۔ شہزادہ کوہسار کبیر عباسی، قدرت اللہ نیازی، زویا اعجاز اور کاظمی کے تبصرے پسند آئے۔ کاظمی صاحب میں نے تو صرف آپ کی مصروفیت کا بتایا تھا۔ آپ کی پڑوسن کا تو میں نے ذکر بھی نہیں کیا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے جاسوسی کی شان یعنی آوارہ گرد پچھلی قسط کی طرح دوسری قسط بھی شاندار رہی۔ پوری قسط میں کہانی نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ شہزی نے بہت تشدد برداشت کیا لیکن دماغ حاضر رکھا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے کہ وہ اس

مصیبت سے کیسے نکلتا ہے۔ اس کے بعد جواری پڑھی۔ پچھلی قسط کی نسبت یہ قسط کافی بہتر رہی۔ آخر کار سلیم صاحب شاہینہ کے جال میں پھنس ہی گئے۔ اب دیکھتے ہیں کہ وہ اس جال سے کیسے نکلتے ہیں۔ کیونکہ اس دفعہ شاہینہ اکیلی نہیں اس کے والد محترم ڈاہیر صاحب بھی ساتھ ہیں۔ رنگوں میں سب سے پہلے مریم کے خان کی کہانی پڑھی۔ نافرمان اولاد اور نافرمان بہن بھائیوں کے متعلق اچھی کہانی تھی۔ پیسے کی ہوس کیا کچھ نہیں کرواتی۔ دو تین ماہ کے بعد مریم کے خان اچھی کہانی لے کے آئیں۔ اس کے بعد دوسرا رنگ پڑھا۔ اسما قادری کی کہانی بھی بہت اچھی تھی۔ پڑوسی نے بڑا گھبرا دیا تھا۔ ابتدائی صفحات پر لکھی گئی ایچ اقبال کی بھیانک چال کراچی کے حالات کی عکاسی کرتی تھی کہ کس طرح جرائم پیشہ افراد نے اپنے اپنے علاقے سنبھالے ہوئے ہیں اور پولیس بالکل بے بس ہے۔ باقی تمام چھوٹی کہانیاں کچھ پسند آئیں اور کچھ پسند نہ آنے کے باوجود ٹائم پاس کرنے کے لیے پڑھنی پڑیں۔ آخر میں تمام تبصرہ نگاروں سے گزارش ہے کہ کہانیوں پر تبصرہ کیا کریں۔ آپ ایک دوسرے پر زیادہ تبصرہ کرتے ہیں اور آخری دو تین لائن میں کہانیوں پر شارٹ تبصرہ کرتے ہیں۔'' (قارئین توجہ فرمائیں)

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کا تبصرہ ''جون کا شمارہ 5 تاریخ کو کلر کہار کی تپتی ہوئی دھوپ میں ملا۔ خوشی تو پوچھیے ہی نا (تو کہاں پوچھ رہے ہیں۔ ہم... ہم اتنے فارغ تھوڑی ہوتے ہیں) سرورق جاسوسی کے عین مطابق تھا۔ اداریے میں آپ بھی ہماری طرح حکمرانوں کی بے حسی کا رونا روتے نظر آئے۔ حکمرانوں کو اللہ تعالیٰ ہی پوچھے۔ اپنی محفل میں انٹری ماری تو نورالہدیٰ صاحبہ اپنے نٹ کھٹ اور شرارتی تبصرے کے سات موجود تھیں، مبارکاں جی۔ انور یوسف کے پاس گئے تو وہ خواب میں کھوئے سے نظر آئے۔ ساگر تکوکر، بشریٰ افضل، محی الدین اشتیاق، محمد جاوید مرزا مختصر مگر اچھے تبصرے کے ساتھ موجود محفل ہیں۔ کبیر عباسی صاحب نمبر بانٹتے نظر آئے۔ خانیوال سے قدرت اللہ نیازی اچھا تبصرہ کرتے نظر آئے۔ ماہا ایمان صاحبہ خون تو واقعی بڑھنا چاہیے صحت کے لیے مفید ہوتا ہے۔ لالہ مظہر تین ماہ کے بعد بھی دکھی تبصرہ کرتے نظر آئے۔ اللہ تعالیٰ جناب اظہر جمیل صدیقی کو جنت الفردوس میں مقام اعلیٰ نصیب کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ زویا اعجاز، سید اکبر شاہ، محمد شاہان سعید بھی اچھا تبصرہ کرتے نظر آئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آوارہ گرد پڑھی، مزہ ہی آ گیا۔ کیا تھرل کیا ایکشن کہانی کا پلاٹ نہایت ہی جاندار ہے۔ میڈم ہو سکتا ہے، شہزی کی سوتیلی ماں ہو۔ (ہمیں نہیں معلوم) جواری کی یہ پوری قسط ایک ہی موضوع پر گزر گئی۔ خدا کے لیے احمد اقبال جی اس میں کچھ جان ڈالو ورنہ ختم کر دو اس کو۔ بھیانک چال بس ایویں ہی گزارے لائق لگی۔ جس طرح آغاز ہوا تھا، لگا تھا بھرپور ایکشن ہوگا لیکن بغیر کوئی خاص دھینگا مشتی کے ختم ہو گئی۔ گینگ میں ڈپٹی وارڈن لیچر کی ذہانت کی داد دینا ہوگی کہ کس طرح سے جعلی وارڈن کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ بشریٰ امجد کی مہنگی بھول میں ریونت کو آخر کار لالچ لے ڈوبا۔ دھوکا بازی اور فراڈ کرنے والوں کے لیے سبق آموز اسٹوری تھی۔ مینڈک باز میں جیک کی ساری پلاننگ کو نمبر ایک گاڑی، نمبر دو فائی اور میاں بوڑھے نے مٹی میں ملا دیا۔ نقب زن کی اسٹوری بھی اچھی تھی۔ کانٹریکٹ، انسان کے اندر پایا جانے والا وائرس لالچ کو عیاں کرتی نظر آئی۔ جان چلی گئی پر آخر تک لالچ نہ گیا ڈالر کمانے کا اور اب نرس بھی گئی۔ لب گور میں قاتل نے ونسی کو مارنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا ہے۔ تلاش پیہم، انتظام اور بڑا آدمی بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ مریم کے خان کی دیوانے نہایت ہی حساس موضوع پر لکھی گئی تحریر تھی جس میں والدین کے ساتھ اولاد کے سلوک کا بھیانک پہلو اجاگر کیا گیا اور واقعی ہمارے معاشرے میں ایسا ہو رہا ہے اور والدین کا بھی حق ہے کہ وہ اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت پر توجہ دیں۔ رسم دغا اسما قادری کے قلم سے لکھی گئی ایک اچھی کہانی تھی جس میں رمشا نے تھوڑی سی ذہانت سے سلمان کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ مجموعی طور پر شمارہ بیسٹ رہا۔''

کراچی سے محمد ادریس خان کی عرق ریزی ''جون کی آمد کے ساتھ بجٹ کی آمد کا ٹمپریچر مزید بڑھ جاتا ہے کیونکہ بجٹ کے اعلان کے بعد ہمیشہ سے گھسا پٹا ایک جملہ کہ یہ عوام دوست بجٹ ہے عوام کے ساتھ کھلے مذاق کے مترادف ہے۔ عوام کو لفظوں کے ہیر پھیر کے ساتھ یہ مژدہ سنا دیا جاتا ہے کہ بجٹ کے اثرات جلد عوام تک پہنچیں گے۔ مگر ہوتا اس کے برعکس ہے۔ جاسوسی دو تین دن تاخیر سے ملا۔ سرورق ہمیشہ کی طرح مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اداریے کے بعد سب سے پہلے دوستوں کے خطوط پر نظر گئی۔ سرفہرست نورالہدیٰ تھیں سو مبارک باد۔ باقی دوستوں کا استقبال اور سب کو سلام۔ کبیر عباسی تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ تصویر العین بہت شکریہ نیک جذبات کا۔ ماہا ایمان کا بھی شکریہ کہ عرصے بعد محفل میں شریک ہوئیں۔ سب سے پہلے جواری سے ابتدا کی۔ خاور حویلی کی سیاست کی چالوں سے باہر نہیں نکل سکا ہے۔ کئی قسطوں سے یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ دوسری کہانی عبدالرب بھٹی صاحب کی آوارہ گرد ایکشن سے بھرپور ہے۔ امید ہے یہ کہانی مزید دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ ایچ اقبال کی بھیانک چال میں دولت کی چکا چوند نے نرگس کو راہ سے بھٹکا دیا تھا مگر راہِ سفر میں ہمسفر اچھے مل جائیں تو سفر اچھا کٹ جاتا ہے۔ دانیال کا پُرخلوص ساتھ اس کی مثبت سوچ کے نتیجے میں ملا۔ گینگ میں ڈپٹی وارڈن نے شاطر مجرم کا بھانڈا پھوڑ دیا جس سے وہ رنگے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ چالاک سے چالاک مجرم بھی کہیں نہ کہیں چھوٹی سی غلطی کر جاتا ہے جو ذہین انسان کی نظروں سے نہیں چھپ سکتی۔ اسی سبب اس کو پابند سلاسل ہونا پڑتا ہے۔ مہنگی بھول میں یہ تاثر ملا کہ جس کی قسمت میں جو چیز نہیں ہوتی وہ اس کو کسی بھی صورت نہیں ملتی، چاہے وہ کتنے ہی حیلے بہانے کرے۔ مینڈک باز نے بھی مزہ دیا۔ جیک کو رقیب اور بے وفا محبوبہ کو مارنے کے بعد بھی وہ ہیرے جواہرات نہیں مل سکے۔ نقب زن بھی اچھی لگی۔ کانٹریکٹ میں بغیر پڑھے دستخط کرنے سے بھاری نقصان چکانا پڑا۔ تلاش پیہم اور انجام بھی اچھی لگیں۔ انتظام میں روبا تنگ نے اپنی بہن کو تلاش کر لیا اور اس کے قاتلوں سے خود انہی کے ہاتھوں سزا بھی دلوا دی۔ منظر امام کی کہانی بڑا آدمی بھی اچھی لگی۔ سرورق کی کہانی دیوانے نے بھی اچھا تاثر دیا۔ بدلتی قدروں اور دولت کی فراوانی میں انسان اپنے حقیقی رشتوں کو بھول جاتا ہے۔ حتیٰ کہ دولت کا حصول لالچی انسانوں کو سفاک بنا دیتا ہے۔ وہ سارے رشتے ناتے بھول جاتا ہے صرف اور صرف دولت کی ہوس اس کو عقل و خرد سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ ان کے ارادوں کو مہمیز دینے میں انسان نما حیوان اور انسانیت کے دشمن انہیں

مل جاتے ہیں۔ جن کے خوفناک ظلم و ستم سے انسانیت بھی شرما جاتی ہوگی۔ سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر کیش بھی انسان نما حیوان تھا جس نے متعدد انسانوں کو پاگل کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا کیونکہ اس کو ان کے وارثوں کی طرف سے بھی کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ان کو اس حالت تک پہنچانے والے خود انہی کے جگر گوشے اور خونی رشتے تھے جو دولت کی چمک سے آنکھیں رکھتے ہوئے اندھے ہو گئے تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ سچ کو آنچ نہیں جس کی وجہ سے نور اور سہیل احمد اپنی اپنی دنیا میں لوٹ آئے۔ مگر لالچی رشتوں کی پہچان خوب ہوگئی۔ دوسری خوب صورت کہانی اسما قادری کی رسم دغا جس میں ایک پڑوسی نے پڑوسی کو اتنے بڑے سانحے سے دوچار کر دیا کہ وہ پائی پائی کو محتاج ہو گیا۔ نیوٹر جس کی زندگی شک کی بنا پر تباہ ہونے جا رہی تھی وہ بھی اپنے اچھے کردار اور مثبت سوچ کی وجہ سے شک سے بری الذمہ ہوا۔ اس کی اچھی نیت نے اسے کامیابی کا در دکھایا جس کی وجہ سے محبت کا حصول بھی ممکن ہو گیا۔ بیچ بیچ میں کترنوں نے بھی محظوظ کیا۔''

کراچی سے محمد اقبال کی آمد ''جون کی ابتدائی تاریخوں میں جاسوسی ڈائجسٹ کے حصول میں 5 جون کو کامیابی ہوئی۔ ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتے ہوئے گرمی سے بچنے کی کوشش کرتے رہے اور کافی حد تک کامیاب بھی رہے کہ جاسوسی میں گم ہو جانے کے بعد لوڈ شیڈنگ کا ہوش رہتا ہے اور نہ گرمی کی شدت کا۔ سرورق پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے فہرست کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد پہنچے دوستوں کی محفل میں جہاں نورالہدیٰ صاحبہ پہلے نمبر پر اپنے تبصرے کے ساتھ موجود تھیں، مبارک ہو۔ باقی دوستوں کے خطوط بھی پڑھے اور ہماری غیر حاضری پر کسی دوست نے یاد کرنے کی زحمت نہ کی جس کا افسوس ہوا۔ تبصروں میں بشریٰ افضل، محمد شاہان سعید، محمد قدرت اللہ نیازی، محمد جاوید مرزا، ماہا ایمان، زویا اعجاز کے تبصرے اچھے لگے۔ اظہر جمیل کے بارے میں پڑھ کر افسوس ہوا۔ اللہ پاک اظہر جمیل صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ کہانیوں میں شروعات کی رسم دغا سے۔ اسما قادری کی بہت خوب صورت تحریر تھی۔ ایچ اقبال کی بھیانک چال مزہ دے گئی۔ بشریٰ امجد کی مہنگی بھول، روایتی ہوس زر پر مبنی سبق آموز تحریر تھی۔ مختار آزاد کی مینڈک باز مناسب تھی۔ انجام پسند نہیں آیا۔ روبینہ رشید کی کانٹریکٹ ایک مختلف اور نئے انداز کی حامل تحریر تھی، اچھی لگی۔ بابر نعیم کی تلاش پیہم ایک دیوانے قاتل کی ایسی کہانی تھی جو ایک غلطی کی سزا اب تک دے رہا ہے۔ اس کے بعد آئے عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد کی جانب جہاں شہزی کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا بیان قابلِ ستائش تھا۔ شہزاد عرف شہزی حالات کا مقابلہ خوب ہمت کے ساتھ کر رہا ہے۔ ٹیمپو تیز ہے، اچھی لگ رہی ہے آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ آخر میں احمد اقبال کی جواری کی جانب گئے کہ اس قسط میں خاور جاگیرداروں کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہوتا ہے یا ابھی شاہینہ کے جال سے نکلنے کو تیار نہیں۔ احمد اقبال صاحب سے عرض ہے کہ خاور کو حویلی اور شاہینہ سے دور کر کے نورین کی تلاش میں روانہ کریں یا نادر شاہ سے برسرِ پیکار دکھائیں تو مزہ آئے، گستاخی معاف۔''

کراچی سے الیبلی کی رسیلی باتیں

''میری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو

اللہ کرے ہم سب کے دل کینہ و بغض سے پاک ہو جائیں اور اس قدر ظرف و صبر عطا ہو کہ ایک دوسرے کی خطائیں آسانی سے معاف کرتے رہیں اور سب کو رمضان المبارک کی رحمتیں اور برکتیں سمیٹنا نصیب ہوں۔ جاسوسی میں پہلی بار حاضر ہو رہی ہوں۔ میں نے چند دن پہلے ہی FB پر JDP گروپ جوائن کیا ہے۔ اس گروپ کے تمام ممبران اور ایڈمن متاثر کن شخصیت کے مالک ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے یہ گروپ سلیکٹ کیا۔ سرورق حسب معمول خوب صورتی اور ہیبت ناکی کا امتزاج تھا۔ چینی نکتہ چینی میں، نورالہدیٰ فرام مری کا تبصرہ اچھا تھا، مبارک باد۔ انور یوسف زئی ہر خواب کی تعبیر اچھی نہیں ہوتی۔ ساگر تکوکر، بشریٰ اور مرزا انجم جلال آپ کے تبصرے اچھے لگے۔ صفدر معاویہ جی زندہ رہنے کے لیے کھانا ضروری ہے یا ڈائجسٹ؟ کبیر عباسی جی لگتا ہے آپ کو نمبروں سے بہت پیار ہے جو ہر کہانی کو نمبر دیے جا رہے ہیں۔ آپ انجینئر سے زیادہ ٹیچر لگتے ہیں۔ قدرت اللہ بھائی آپ بھی خوب لکھتے ہیں ویسے جو جاسوسی پڑھتا ہے، وہ جاسوس بن ہی جاتا ہے۔ ادریس احمد صاحب ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ انشاء اللہ آپ جلد خود مارکیٹ جا کر اپنا جاسوسی خریدیں گے۔ ماہا ایمان جی زبردست! اسٹوریز بہت شاندار رہیں۔ ایچ اقبال کی بھیانک چال بہت پسند آئی۔ افتخار احمد کچھ بوجھ سے کام لیتا تو آفتاب بائنڈ ماسٹر نہ بنتا۔ نرگس دولت کی ہوس میں اندھی ہو گئی۔ امجد رئیس کی گینگ سے پتا چلا کہ بعض اوقات دوسروں کو دھوکا دینے اور جعل سازی کرنے والے خود بھی دھوکا کھا جاتے ہیں۔ جیسا کہ جیمز کے ساتھ ہوا۔ مہنگی بھول میں بشریٰ احمد نے بتایا کہ دولت اگر غلط طریقہ سے حاصل کی جائے تو اس کا انجام بھیانک ہوتا ہے۔ مینڈک باز مختار آزاد کی اسٹوری پڑھ کر اچھا لگا۔ دھوکا باز، چال باز تو سنا تھا مگر مینڈک باز پڑھ کر یقین ہو گیا کہ انسان کی بے جا چالاکی اور کم عقلی اس کو لے ڈوبتی ہے۔ جیسا کہ جیک، جمی اور ایڈ کے ساتھ ہوا کہ چوروں کو مور پڑ گئے۔ ویزلی نے نقب زنی کا سارا الزام الزبتھ اور چارلس پر ڈال کر اپنا انتقام بھی لینا چاہا تھا مگر سراغ رساں نے کایا پلٹ دی۔ کانٹریکٹ میں روبینہ رشید نے اچھی کوشش کی۔ ٹیم کے ذریعے انسان کا تمام خون نکال لیا جائے، بے ہوش بندے کے تمام اعضا بیچ دیے جائیں۔ کیا کانٹریکٹ تھا۔ ماہ نور کی لب گور میں بیسلوگنگ نے آخر کار رونسی کو لب گور پہنچا ہی دیا۔ جواری اچھا ٹائم پاس دے رہی ہے۔ آوارہ گرد جوبن پر ہے۔ عبدالرب بھٹی ویلڈن!''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

زینب حنیف، کراچی۔ ثاقب عزیز، کوٹری۔ ناہید فیاض، کراچی۔ اشفاق احمد، حیدرآباد۔ وقار احمد انصاری، میرپور خاص۔ رضوانہ سمیع، کراچی۔ عمران ملک، ٹنڈو آدم۔ فرحان شیخ، سیالکوٹ۔ آفتاب احمد، حیدرآباد۔ حمیرا رفیق، کوٹری۔ راحت امین، کراچی۔ فوزیہ مستقیم، کراچی۔

آتش بُار
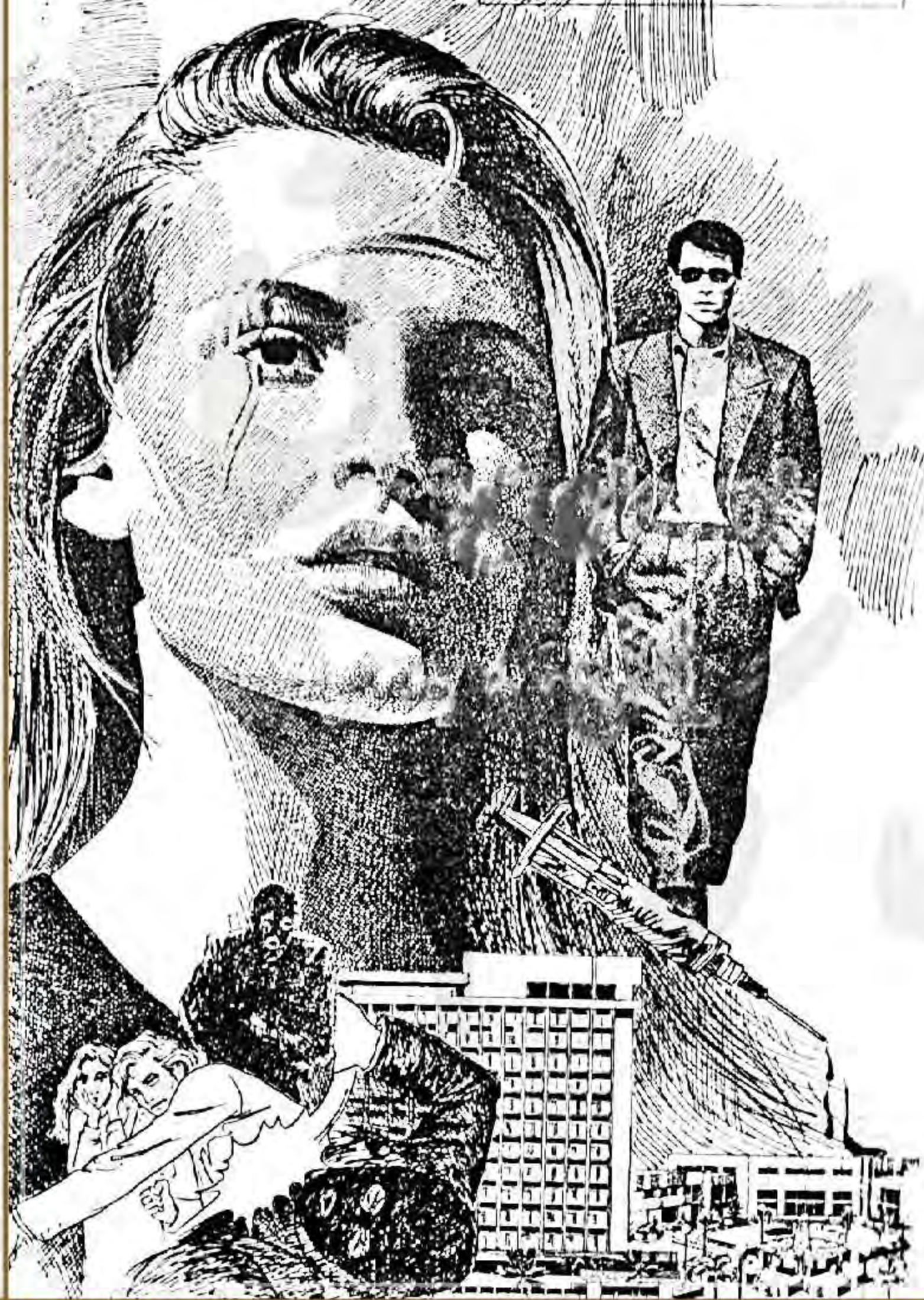
امجد رئیس

یہ لرزہ خیز کہانی کسی پسماندہ یا ترقی پذیر ملک کی نہیں، امریکا جیسے آزاد معاشرے کی ہے جہاں انسانی حقوق کی پاسداری کے ترانے گائے جاتے ہیں... تصویر کا یہ دوسرا رخ بہت بھیانک اور عبرت اثر ہے جس میں مقبول ترین امریکی مصنف کولن اینڈریوز نے اپنے بیسٹ سیلر ”دی فاؤنڈیشن“ میں طبی شعبے کے وائٹ کالر کرائم کے بارے میں یہ ہوش ربا داستان قلم بند کی ہے نرم رومان اور سنسنی خیز ہیجان سے بھرپور یہ کہانی ایک نازک بدن اور شعلہ رو مگر غریب دوشیزہ کے سپنے سے شروع ہوتی ہے، وہ اپنی قابلیت کے زور پر ملک کے سب سے بہتر اور مہنگے طبّی کالج کا انتخاب کرتی ہے... منزل سامنے آجاتی ہے مگر دو گام پہلے یکایک کمند ٹوٹ گئی... ہر طرف سے گھور اندھیروں نے اسے اپنے نرغے میں لے لیا... ہولناک سائے اس کی زندگی اور چاہت کو اپنے خون آشام پنجوں میں دبوچ کر نگل لینے کے لیے بے تاب تھے لیکن اس کی آس کا سورج روشن تھا... وہ اپنی ساری توانائیاں سمیٹ کر ان اندھیروں اور گمنام سایوں سے لڑتی رہی... لڑتی رہی... سفید اور بے داغ لباس میں ملبوس... سنجیدہ... علمی چہروں کے ساتھ بظاہر انسانیت کی فلاح کے لیے کام کرنے والے ماہرین ان نقابوں کے پیچھے سفاکی اور بربریت کا اپنا وہ روپ چھپائے پھرتے تھے جسے دیکھ کر زیرِ زمین رہنے والے جرائم کے بادشاہ بھی شرما جائیں... زندگی کے لیے سسکتے اور بلکتے لاوارث مریض اس کی نظروں کے سامنے چوہوں اور خرگوشوں کی طرح بے رحمی سے تجربات کی نذر کیے جارہے تھے... وہ دہشت زدہ تھی مگر اس کے حوصلے جوان تھے۔ امید و ناامیدی کی دردناک وادیوں میں ڈوبتی اُبھرتی ایک ایسی کہانی جس کا اسلوب اور ذائقہ ہی انوکھا ہے...

خود فراموشی میں
ڈوب کر پڑھی
جانے والی ایک
یادگار داستان جسے
آسانی سے بھلایا نہیں
جاسکے گا...

ڈاکٹر کلیرسن نے اپنی آنکھوں کو مسلا اور آرام دہ نشست سے ٹیک لگا کر اگلے اُمیدوار کا انتظار کرنے لگا۔ یہ انٹرویوز تھکا دینے والے تھے مگر ان سے مفر ممکن نہیں تھا۔ یہ جاننا نہایت اہم تھا کہ کالج جس طالبِ علم پر بھاری سرمایہ کاری کر رہا ہے، وہ کالج کے معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں؟

ایک نرم دستک ہوئی۔ ”آیئے، اندر آجائیں۔“ ڈاکٹر کلیرسن اپنی نشست پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں سرو قامت نازک اندام لڑکی داخل ہوئی۔

ڈاکٹر کلیرسن نے اس کی فائل پر نظر ڈالی۔ کوئین کلیری، عمر اکیس سال۔

کسی بھی میڈیکل کالج کے لیے وہ ایک عمدہ طالبہ ہوسکتی تھی لیکن ڈاکٹر کو جو چیز سب سے خراب نظر آرہی تھی وہ کوئین کی جنس تھی... وہ برسوں سے بورڈ کی ترجیحات دیکھ رہا تھا کہ یہاں پر صنفِ کرخت کو زیادہ تر منتخب کیا جاتا تھا۔

کسی انجانی وجہ کے زیرِ اثر کلیرسن لڑکی کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ محسوس کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کیا کرسکتا ہے اس سلسلے میں... وہ انجانی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟ ڈاکٹر کو لگا کہ لڑکی میں ایسی کوئی چیز تھی

جو اس کے اپنے طرزِ علاج کی کسی چیز سے ملتی تھی۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ لڑکی مریضوں کے لیے کچھ کرسکتی ہے یا کرنا چاہتی ہے۔

یا پھر اسے اپنی بیٹی یاد آگئی تھی۔ وہ پچیس برس کی تھی جب ایک شرابی کو "اسٹاپ" کا اشارہ نظر نہیں آیا اور اس نے ڈاکٹر کی بیٹی کلیرسن پر گاڑی چڑھادی ۔۔۔ وہ اس حادثے میں جانبر نہ ہوسکی اور ڈاکٹر کی بیوی بھی یہ صدمۂ جانکاہ برداشت نہ کرسکی۔ یادوں سے یکدم ہی وہ حال میں لوٹ آیا۔

"ہاں تو مس کوئین کلیری۔" اس نے کہا۔ کوئین اس کے مقابل میز کے دوسری جانب نشست سنبھال چکی تھی۔

کوئین کے ذہنی تناؤ کو محسوس کر کے ڈاکٹر کلیرسن مسکرایا اور بولا۔ "میرا پہلا سوال آپ کو عام بھی لگ سکتا ہے اور خاص بھی۔ یعنی کہ آپ ڈاکٹر کیوں بننا چاہتی ہیں؟"

"کیونکہ میں......" وہ ذرا لڑکھڑائی۔ "میں نے اس سوال کے لیے پوری ایک تقریر یاد کی تھی، اور اب مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔"

"گڈ، میں تقریریں سن سن کر بور ہو چکا ہوں۔" وہ بولا۔ "سمجھو تم ڈاکٹر ہو لیکن ڈاکٹر ہی کیوں؟"

"کیونکہ میں یہ کرسکتی ہوں اور کافی اچھا کرسکتی ہوں۔"

"یہ بنیادی چیز ہے لیکن انسانیت اور خدمت وغیرہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" کلیرسن کو اس قسم کے جوابات ہر سال سننے کو ملتے تھے۔

کوئین نے کندھے اچکائے، اس کا ذہنی تناؤ کم ہوگیا تھا۔ "انسانیت کی خدمت اچھی بات ہے بہرحال میرے لیے یہ محرک نہیں، کم از کم میں اس شعبے میں یہ سوچ کر نہیں آئی۔ میرا نکتۂ نظر یہ ہے کہ آپ جس شعبے سے بھی تعلق رکھتے ہیں اس میں دیانت داری اور پوری اہلیت سے کام کررہے ہیں تو وہ انسانی خدمت جیسا ہی ہے... ویسے بھی دنیا میں بے شمار لوگ ہیں جن کو مدد کی ضرورت ہے تو کیوں نہ براہِ راست انسانیت کی خدمت کی جائے... بجائے اس کے کہ آپ پہلے طب کے شعبے میں اتنے سال لگائیں پھر خدمت کریں۔" کوئین نے اپنی بات جاری رکھی۔ "جو لوگ طب کے حوالے سے "خدمت" کی بات کرتے ہیں، میرے لیے یہ محض ایک مکالمہ ہے اور کچھ نہیں۔" وہ خاموش ہوگئی۔

کلیرسن دلچسپی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ اس کی بوریت اور تھکن ختم ہوگئی تھی۔ کتنے نئے اور شفاف خیالات ہیں اس لڑکی کے۔ "اس کا مطلب میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ دوسروں کی خوشی پر اپنی خوشی قربان نہیں کرسکتیں... کیا میں غلط سمجھ رہا ہوں؟"

"میرا خیال ہے کہ بعض اوقات میں لوگوں کا حد سے زیادہ خیال رکھتی ہوں مگر یہ زیادہ بہتر ہے کہ میں اپنی توجہ ڈاکٹر بننے پر مرکوز رکھوں۔"

"ہاں، کیوں نہیں۔" ڈاکٹر کلیرسن مسکرایا۔ "ایک اچھے طالب علم کو اپنے مقصد سے وابستہ رہنا چاہیے، اس میں عزت، رتبہ اور... اور پیسہ ہے۔"

کوئین نے مسکراہٹ لوٹائی۔ "پیسہ یقیناً نیا تجربہ ہوگا، تاہم اگر ہم پارسائی کو خلط ملط نہ کریں تو میں کہوں گی کہ اس چیز کو فوقیت حاصل ہے کہ آپ جو کام کررہے ہیں اسے ٹھیک طرح سے سرانجام دے رہے ہیں۔"

"کیا آپ کو واقعی یقین ہے۔ اس بات پر؟" ڈاکٹر نے اپنی آواز میں شک کا تاثر دیا۔

"جی ہاں، بالکل۔" وہ بولی۔ "تاہم اگر آپ کو اس میں مصنوعی پن محسوس ہوا ہو تو میں معذرت خواہ ہوں... بہرحال میں ایسا ہی محسوس کرتی ہوں۔"

'بہادر اور پُرجوش بھی ہے' ڈاکٹر نے سوچا۔ اس لڑکی کو انگراہم میں ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ وہ فیصلہ کر چکا ہے لیکن ہر چیز کا انحصار کل کے ٹیسٹ پر ہے۔ وہ بھی اگر یہ لڑکی ان "خاص" سوالات کا ٹھیک جواب دے سکی جو پورے ٹیسٹ میں انگراہم کے لیے نہایت اہم ہیں۔ اس سے زیادہ وہ اس کی مدد نہیں کرسکتا بلکہ کوئی بھی نہیں کرسکتا۔

☆☆☆

فریڈرک کاؤنٹی، میری لینڈ کا انگراہم کالج جو چوبیس قیراط کے میڈیکل اسکول کے نام سے مشہور ہے، پورے ملک کا اپنی نوعیت کا بہترین میڈیکل کالج تسلیم کیا جاتا ہے۔

انگراہم کے معمول کے مطابق اس سال کے داخلے دسمبر میں ہونے تھے۔ جس میں قوم کے بہترین طلبا کو مدعو کیا گیا تھا۔ جنہیں انگراہم کے کڑے معیار کی مخصوص کسوٹی پر پرکھا جانا تھا۔

ٹیوشن اور لیب سے لے کر کتابوں اور رہائش تک طلبا کو تمام تر سہولتیں مفت حاصل ہوتی تھیں۔

"کوئین! کوئین چلو آؤ۔"

کوئین نے پکار سن لی تھی تاہم یہ آواز اس کے استغراق کو نہ توڑ سکی۔ متعدد عمارتوں کو پہاڑیوں نے گھیرا ہوا تھا۔ انہی پہاڑیوں میں سے ایک کی چوٹی پر کوئین کھڑی نیچے دیکھ رہی تھی۔ کیمپس کا پورا منظر اس کے سامنے تھا۔ چھوٹی بڑی پہاڑیوں کی آرام دہ سبز ڈھلوانوں کے نیچے گلابی رنگ

کی عمارتوں کا مرکز، نیلے رنگ کا وسیع تالاب تھا۔ جیسے گلابی رنگ کی انگوٹھی میں کسی نے نیلگوں نگینہ جڑ دیا ہو۔ یہ انگراہم کالج تھا۔

اس کے بازو کو کسی نے چھوا، وہ مڑی۔ اس کے سامنے سیاہ آنکھوں اور سیاہ بالوں والا دراز قامت میٹ کرافورڈ کھڑا تھا۔

"خیریت ہے؟" میٹ نے سوال کیا۔

"کتنا خوب صورت منظر ہے۔" کوئین نے اشارہ کیا۔

"ہاں، مگر تم سے زیادہ نہیں۔" اس نے نرمی سے ٹہوکا دیا۔ "جلدی کرو، ہم پیچھے نہ رہ جائیں۔"

وہ ہچکچاتی ہوئی مڑی۔ اس کی لمبی ٹانگیں میٹ کی چال کا ساتھ دے رہی تھیں۔ وہ دونوں جلد ہی دوسرے اُمیدواروں میں شامل ہوگئے۔ ان سب کو مسٹر ویرن کے ہمراہ کیمپس ٹور پر جانا تھا۔

'انہیں مجھے داخلہ دینا ہوگا' وہ سوچ رہی تھی۔ اس کا خواب پورا ہونے جارہا تھا۔ وہ کب سے خواب دیکھتی آرہی تھی۔ صرف انگراہم کے لیے... کیونکہ اس کی مالی حیثیت کے مطابق اس کا خواب صرف انگراہم ہی میں پورا ہوسکتا تھا۔ وہ دہلیز تک آن پہنچی تھی۔ بہت قریب... کبھی کبھی شک کا سانپ اس کے ذہن میں سر اٹھاتا کہ شاید اب بھی منزل بہت دور ہے... شاید۔

اسی وقت میٹ کا دوست ٹم بھی ان کے ساتھ شامل ہوگیا۔

"کوئین! تمہیں یاد ہے، ٹم براؤن؟" میٹ نے استفسار کیا۔ کوئین نے ٹم کو دیکھا۔ ٹم کا قد میٹ سے کم تھا۔ اس کا جسم بھی چھریرا تھا... بالوں کی رنگت براؤن اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔ کوئین کو یاد آیا کہ وہ ٹم سے کہاں ملی تھی، وہ ڈارتھ ماؤتھ کالج کا پہلا سال تھا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ گرین کی (Key) ویک اینڈ تھا، ڈارتھ ماؤتھ کالج؟" کوئین نے اظہارِ خیال کیا۔

"تم کہتی ہو تو ایسا ہی ہوگا۔" اس نے مسکراتے ہوئے اپنا چشمہ اوپر کیا اور اس کی نیلی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ ہاتھ آگے بڑھا چکا تھا۔ "خوشی ہوئی دوبارہ مل کر۔ "کوئین" تمہارے نام کا پہلا حصہ ہے یا دوسرا؟" ٹم نے سوال کیا۔

کوئین نے ہاتھ ملایا۔ "میرے نام کا دوسرا حصہ کلیری ہے۔"

"کوئین کلیری۔" اس نے چشمہ واپس نیچے کیا۔ "سماعت کو اچھا لگتا ہے۔" وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"کوئین... کلیری۔"

کوئین نے رخساروں پر تپش محسوس کی اور خود کو کوسا۔ "یہ بھی کوئی بات ہے شرمانے کی؟" اس نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا۔ "لیکن ٹم براؤن یہاں کیسے؟ اس کا میجر مضمون تو کاروبار یا معیشت تھا؟" وہ سوچ رہی تھی اور دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں اس طرح گھل مل رہے تھے جیسے دو پرانے دوست برسوں بعد ملے ہوں۔

کوئین نے حسد محسوس کیا۔ "میٹ، میرا دوست ہے۔" پھر اس احساس پر خود ہی حیران ہوئی۔ کیونکہ میٹ صرف اس کا دوست ہی تھا، پرانا دوست... دونوں کی ماؤں نے ایک ساتھ ہائی اسکول کیا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں کوئین اور میٹ نے دوستی کے رشتے میں تبدیلی محسوس کی لیکن جلد ہی یہ تبدیلی رفع ہوگئی... تب سے دونوں ایسے ہی تھے جیسے بہن بھائی یا فرسٹ کزن۔ میٹ کا گھرانہ متمول تھا جبکہ کوئین ایک نیم متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، قطع نظر اس کے، دونوں کی دوستی مستحکم تھی۔

"سنو۔" اس نے کہا۔ "میں جارہی ہوں وہ لوگ آگے نکل گئے ہیں... میں ملتی ہوں پھر۔"

کالج جدید ترین اور قیمتی لوازمات سے لیس تھا کسی لگژری ہوٹل کی طرح... لیکچر ہالز میں جدید آڈیو ویژول ٹیکنالوجی موجود تھی۔ امیدواروں کا ہر گروپ پچاس طالب علموں پر مشتمل تھا۔ ہر گروپ سروے کے بعد انٹرویو کے مرحلے سے گزرتا اور اگلے روز ٹیسٹ میں شرکت کرتا۔ یہ سلسلہ ایک ہفتہ اسی طرح چلتا۔ ایک ایک نشست پر دھواں دھار مقابلہ تھا بالآخر محض پچاس افراد اس چھلنی سے گزر پاتے۔ کوئین دوسرے گروپ میں تھی۔ "مجھے ہر صورت داخلہ لینا ہے۔" کوئین پُرعزم تھی۔ "انہیں مجھے داخلہ دینا ہی ہوگا۔" اس نے خود سے سرگوشی کی۔

وہ سب انگراہم کے سیکیورٹی چیف لوئیس ویرن کے پیچھے تھے۔ مسٹر ویرن پستہ قد اور گول مٹول سا تھا، اس کے سر پر بالوں جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔

کوئین کو یہ شخص کچھ مضحکہ خیز لگا۔

"کیمپس سیکیورٹی آفس، سائنس سینٹر میں ہے جہاں ٹور کو اختتام پذیر ہونا ہے۔" ویرن نے اسپتال کی پانچ منزلہ عمارت کے پاس سے گزرتے ہوئے اطلاع دی۔

کوئین نے ایک عجیب بات نوٹ کی کہ کیمپس کی ہر عمارت بشمول سائنس سینٹر ہر جگہ دیواروں پر سیکیورٹی کیمرے نصب تھے۔

''کیا یہاں سیکیورٹی کا مسئلہ ہے؟'' کسی دل جلے نے سوال کا نکیلا کنکر اچھالا۔ ویرن نے سوال کرنے والے کو تاڑنے کی کوشش کی لیکن موصوف کا قد آڑے آگیا۔ پھر اس نے لب کشائی کی۔

''نہیں، قطعی نہیں اور نہ کوئی مسئلہ ہوگا، کم از کم میرے ہوتے ہوئے۔'' یہ بولتے وقت ویرن نے سینہ پھلانے کی سعی کی تھی۔

''یہ لوگ کلر بلائنڈ تو ہو سکتے ہیں لیکن سیکس بلائنڈ نہیں ہیں۔'' کوئین نے ایک اور چیز نوٹ کی، گروپ میں صنفِ نازک کی تعداد قلیل تر تھی۔ بس چند ایک۔

ویرن نے گارڈ ہاؤس دکھایا جو آہنی گیٹ کے اوپر تھا۔ اطراف میں کیمپس کے چاروں طرف دس فٹ اونچی خاردار باڑھ تھی۔ ''اس حد سے پرے سب کچھ آپ کی رسائی میں ہے۔'' ویرن نے آٹھ منزلہ لارل ہلز میڈیکل سینٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ''تاہم اس طرف کیمپس میں آنے کے لیے آپ کو خصوصی شناخت کی ضرورت پیش آئے گی۔''

کوئین نے میڈیکل سینٹر، متعدد پارکنگ لاٹس اور گلابی عمارتوں کے جال کو دیکھا۔ اس کے ذہن میں ایک سوال ابھرا لیکن وہ خاموش رہی مگر گروپ میں سے پہلا سوال پھینکنے والی چبھتی ہوئی آواز خاموش نہ رہ سکی۔ سوال تھا۔ ''خصوصی شناخت کیوں؟'' ''مسٹر ویرن رکے۔ ایک بار پھر سوالی کو تاڑنے کی ناکام کوشش کی پھر خود بھی سکوت اختیار کیا ادھر کوئین نے مسکراہٹ کا گلا دبایا۔

ویرن، گروپ کو کیمپس کے عقب میں، سائنس سینٹر کے داخلی دروازے پر لے آیا، موشن ڈیٹیکٹر کے ذریعے اس نے شیشے کا پھسلنے والا دوطرفہ در وا کیا۔ ''برائے مہربانی یہاں رکیے۔'' وہ بولا اور لابی میں داخل ہوگیا۔ اس کا رخ سیکیورٹی ڈیسک کی جانب تھا۔ ڈیسک لابی کے عین مرکز میں تھی، جزیرے کے مانند۔ ڈیسک پر نیلی وردی میں دو سیکیورٹی گارڈ متعین تھے۔

کوئین متعجب تھی کہ ہر گیٹ پر سیکیورٹی گارڈز، کیمرے، خاردار باڑھ، یہ سائنس سینٹر ہے، میڈیکل کالج ہے یا نیوکلیئر سینٹر؟ اس کی خیالی رو کو ویرن کی آواز نے مرتعش کیا۔ ''اوکے۔'' اس نے تالی بجا کے کہا۔ ''وہ لوگ تیار ہیں۔ لفٹ کے ذریعے دوسری منزل پر آجائیں۔''

کون لوگ تیار ہیں؟ کوئین کی خیالی رو پھر بہکنے لگی... انگراہم کا پانچ منزلہ ہل ٹاپ، سائنس سینٹر... میڈیکل ریسرچ کے لیے آرٹ اور سائنس کا اعلیٰ امتزاج تھا۔ اس منزل پر پودوں سے حاصل کردہ کمپاؤنڈز پر تجربات کیے جاتے تھے تاکہ کینسر اور ایڈز جیسے امراض کے علاج کے لیے ادویات کو آزمایا جائے۔

تیسری منزل پر وہ جانور موجود تھے جن پر ادویات کو آزمایا جاتا تھا یہاں کی فضا میں ایک مخصوص بو رچ بس گئی تھی۔

چوتھی منزل پر ویرن نے گروپ کا تعارف، ڈاکٹر آرتھر سے کرایا۔ وہ ایک لمبا اور لاغر شخص تھا جو لیب کوٹ میں ملبوس تھا۔ عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ سبزی مائل براؤن آنکھوں میں پانی تیر رہا تھا اور دانتوں میں ہلکی سی زردی تھی۔

''ڈاکٹر ایلسٹن نہ صرف انگراہم کی میڈیکل ایجوکیشن کے ڈائریکٹر ہیں بلکہ ملک کے مایۂ ناز ڈرمٹالوجیکل پیتھالوجسٹ بھی ہیں۔'' ویرن نے مریض نما ڈاکٹر کے بارے میں بتایا۔

ڈاکٹر نے مسکرا کر سر ہلایا۔

''انکل پُراسرار۔'' کسی نے کوئین کے کان میں سرگوشی کی۔

کوئین نے بمشکل ہنسی کا گلا گھونٹا اور عقب میں جھانکا۔ وہ ٹم براؤن تھا۔ نہ جانے کب گروپ میں شامل ہوا تھا۔ اس وقت، کوئین کے بالکل قریب کھڑا تھا۔

''میں آپ لوگوں کو اب اختتامی مراحل میں ڈاکٹر ایلسٹن کے حوالے کرتا ہوں۔'' ویرن کہہ رہا تھا۔ ''یہاں جو تحقیق ہو رہی ہے، وہ اس قدر خفیہ ہے کہ میں بھی کچھ نہیں جانتا۔''

ڈاکٹر نے پیش قدمی کی اور سیکیورٹی چیف کی جانب مسکرا کر دیکھا، مسکراہٹ میں سرزنش کا عنصر شامل تھا۔

''مسٹر ویرن مبالغہ آمیزی کا رجحان زیادہ رکھتے ہیں۔'' ڈاکٹر ایلسٹن نے کہنا شروع کیا۔ ''تاہم ہماری کوشش ہے کہ ٹاپ فلور کا ڈیٹا پوشیدہ رہے یہاں کے پروجیکٹس کمرشل نوعیت کے ہیں جنہیں محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ یہ مریضوں کے مفاد میں بھی ہے۔ کیونکہ جو منافع ہوتا ہے وہ واپس تحقیق اور فنڈنگ میں چلا جاتا ہے۔'' ڈاکٹر نے غالباً ویرن کے تبصرے کی وضاحت کی۔

''پلیز، آپ لوگ آیئے۔'' ڈاکٹر ایلسٹن نے اشارہ کیا۔ گروپ ڈاکٹر کے پیچھے تھا۔ ڈاکٹر ایلسٹن متواتر بول رہا تھا۔ ''مجھے ڈر ہے کہ میں شاید زیادہ کچھ نہ دکھا پاؤں۔ میرا پروجیکٹ اس نہج پر ہے جہاں ہم اپنی پروڈکٹ کو انسانوں، یعنی مریضوں پر آزما رہے ہیں۔ ایسے مریضوں کو

ہم نے ''سبجیکٹ'' کا نام دیا ہے۔ ہر ''سبجیکٹ'' کی پرائیویسی ہماری ذمے داری ہے۔ تاہم میں اتنا بتا سکتا ہوں کہ میں کسی سینتھنک، ری جیکشن، پروف کھال کی پیوندکاری پر کام کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ مکمل مثبت نتائج حاصل کرنے کے بعد آتش زدہ مریضوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا ہو جائے گا... نہ صرف امریکا میں بلکہ سارے عالم میں۔ لیکن شاید ....''

ان کے سامنے ہال کے کونے پر کوئی لیب کوٹ میں موجود تھا۔

''اوہ، ایمرسن ایک منٹ پلیز۔''

وہ شخص مڑا۔ وہ اوسط قد و قامت کا عمر رسیدہ آدمی تھا۔

''یہ ڈاکٹر کلیرنس ایمرسن ہیں۔'' ایلسٹن نے تعارف کرایا۔

''نیورو فارماکولوجی کے دنیا کے ممتاز ترین ماہر۔ ہمیں اپنا شعبہ دکھائیں گے۔ کیا خیال ہے کلیرنس؟''

کلیرنس نے کندھے اچکائے۔

''ڈاکٹر کلیرنس بہت منکسر المزاج ہیں۔'' ایلسٹن نے کہا۔ ''تاہم وہ جس ایستھیٹک کمپاؤنڈ پر کام کر رہے ہیں، وہ حیرت انگیز ہے۔ انہوں نے ابھی تک اس کو نام نہیں دیا ہے بہرحال اس کا کوڈ نمبر 9574 ہے۔ اگر ہم کامیاب ہو گئے تو یہ بھی ایک انقلابی استھیسیا ثابت ہوگا۔''

کوئین کے بائیں جانب ٹائلڈ دیوار میں اچانک شیشہ آگیا۔ وہ رک کر شیشے کی دوسری جانب وارڈ کا جائزہ لینے لگی۔ وارڈ میں اسپتال کی طرح بیڈ موجود تھے۔ ہر بیڈ پر کوئی نہ کوئی مریض تھا۔ ''نہیں بلکہ یہ ''سبجیکٹ'' ہیں غالباً جیسے ایلسٹن نے بتایا تھا۔'' کوئین کی خیالی رو چل پڑی۔

ان بستروں پر سفید براق اجسام موجود تھے۔ کوئین نے پلکیں جھپکائیں۔ ''یہ کھال نہیں بلکہ ''گاز'' ہے۔'' اس نے تعین کیا۔ تمام مریضوں پر یہ اس کثیر تعداد میں لگا تھا کہ اجسام روپوش ہو کر ''ممی'' کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ زندگی کی علامتیں ناپید تھیں۔ وہ مُردوں کی طرح نظر آرہے تھے لیکن وہ مردہ نہیں تھے کیونکہ نرسز ضروری لوازمات کے ساتھ وارڈ میں چکرا رہی تھیں۔ سات بستر، سات اجسام یا ''ممیز''... فیڈنگ ٹیوبز، آئی۔ وی کے ذریعے ان کے ساتھ منسلک تھیں۔ کوئین کو ہلکا سا دھکا لگا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ٹم براؤن کی حرکت ہے۔ ''اوہ خدا'' ٹم کی آواز بیٹھی بیٹھی تھی۔

کوئین نے ٹم کو دیکھا۔ اس کا چہرہ غیر معمولی اور خالص تحیر کے تاثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور تعجب میں ہیبت بھی شامل تھی۔

کوئین نے پھر وارڈ میں گھورنا شروع کیا، وہ حیرت کے مارے گنگ ہو گئی۔ وہ اس ''سبجیکٹ'' کو تک رہی تھی جو عین شیشے کے بالمقابل دوسری جانب بستر پر تھا۔ اس کی صرف ناک کا بانسا نظر آرہا تھا اور دو ہلکی نیلی آنکھیں۔ باقی ہر چیز روپوش تھی مگر جس چیز نے کوئین کو منجمد کیا، وہ اس کی آنکھیں تھیں جو کوئین کی آنکھوں میں اتری جا رہی تھیں۔ وہ آنکھیں کوئین سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ وہ بولنا چاہ رہی تھیں... یہ تاثر اتنا شدید اور التجا آمیز تھا کہ کوئین گھبرا گئی۔

پورا گروپ ہی رک چکا تھا اور شیشے سے وارڈ کو دیکھ رہا تھا۔

کوئین نے ''ممی'' نما مریض کے شانوں کی چوڑائی کا اندازہ لگایا، پھر اس کے سپاٹ سینے کو دیکھا اور سمجھ گئی کہ وہ کوئی مرد ''سبجیکٹ'' ہے۔ کوئین نے ان آنکھوں کو پڑھنے کی ناکام کوشش کی۔ اس کی دھڑکن بڑھ گئی۔ آنکھوں میں اب اتھاہ بے بسی تھی۔

''اوہ ڈیئر۔'' ڈاکٹر ایمرسن قریب آیا۔ وہ کچھ پریشان سا لگا۔ ''یہ وارڈ 'سی' ہے۔ یہاں پردہ ہونا چاہیے تھا۔ مریضوں کی خاطر....''

''کیا ہوا ان کے ساتھ؟'' کوئین نے پوچھا۔

''برن۔'' ڈاکٹر کلیرنس نے نرمی سے جواب دیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اجسام تھرڈ ڈگری برن کا شکار تھے۔ یہ اسی سے نوے فیصد تک جل چکے تھے۔ یہ تازہ آتش زدہ نہیں ہیں بلکہ مختلف ''برن سینٹرز'' کے بچ جانے والے مریض ہیں۔'' اس نے آہ بھری۔ ''ڈاکٹر ایمرسن ان کی آخری امید ہے۔''

کوئین ان بولتی آنکھوں سے نظریں نہیں ہٹا پا رہی تھی۔

ڈاکٹر ایمرسن، کوئین کو مریضوں کی حالت کے بارے میں بتا رہا تھا۔ دوسرے بھی سن رہے تھے۔ وہ یہ بھی بتا رہا تھا کہ نرسز ان کی کس طرح مدد کر رہی ہیں اور وہ لوگ خود کیا کیا کر رہے ہیں۔

کوئین گم صم تھی۔ اسے ڈاکٹر ایمرسن کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ اس خاموش چیخ کو سن رہی تھی جو ان آنکھوں سے بلند ہو رہی تھی۔ وہ آنکھیں پھر سے کوشش کر رہی تھیں... بھرپور کوشش... اچانک اس نے ہلنا

شروع کیا...وہ کسمسا رہا تھا۔

''ڈاکٹر ایمرسن!'' کوئین نے کہا۔''کیا کوئی گڑبڑ ہے؟'' اس کا اشارہ اس مریض کی طرف تھا۔ ان آنکھوں نے کوئین کا اشارہ دیکھ لیا۔ اس کی کسمساہٹ بڑھ گئی۔

''اوہ ڈیئر، وہ تکلیف میں ہے۔'' ڈاکٹر نے ہٹ کر دروازہ کھولا اور ایک نرس کو اس مریض کی طرف متوجہ کیا۔ نرس نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی۔

''اب اسے آرام مل جائے گا۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

کوئین نے ایک نرس کو اس کی جانب بڑھتے دیکھا۔

''آیئے، آگے چلتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے نرمی سے کوئین کا بازو پکڑا۔ کوئین نے بدقتِ تمام خود کو آگے چلنے پر آمادہ کیا۔ تاہم اس نے ایک بار پلٹ کر دیکھا تو اس کا جسم لرز اٹھا، ان آنکھوں میں آنسو تھے پھر پردے نے منظر چھپا لیا۔

☆☆☆

میٹ، کیفے ٹیریا میں بلیٹن بورڈ پر فہرست کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی سرخی تھی۔''وہ اب کہاں ہیں؟''

''انگراہم گریجویٹس، شہری علاقوں میں اندرونِ شہر متعین ہیں اور یہ کلینکس ان نرسنگ ہومز یا میڈیکل سینٹر سے زیادہ دور نہیں ہیں جو کلیڈ رمین کی ملکیت ہیں۔'' میٹ بولا۔

''یار اصلی میڈیکل اسٹوڈنٹس کدھر ہیں؟'' ٹم نے کہا۔ دونوں پلٹے اور کیفے ٹیریا کی کارنر ٹیبل پر کوئین سے آن ملے۔ میٹ نے چاروں طرف دیکھا۔ میزوں پر تمام تر امیدوار ہی موجود تھے، کوئی بھی طالب علم نظر نہیں آرہا تھا۔ کیفے ٹیریا دو منزلہ وسیع عمارت تھی جس کی چکردار سیڑھیاں کلاس روم بلڈنگ کے ساتھ رابطہ فراہم کرتی تھیں۔ کیفے ٹیریا کی تین دیواریں شیشے کی تھیں۔

''ممکن ہے کہ یہاں کے طالب علم کرسمس کے لیے گھر چلے گئے ہوں۔'' میٹ نے کہا۔

''ہوسکتا ہے۔'' ٹم نے کہا۔''اور ہم یہاں داخلے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔''

میٹ نے ایک نظر کوئین پر ڈالی شاید اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ انگراہم کوئین کے لیے واحد امکان کی حیثیت رکھتا تھا۔ میٹ کی فیملی اسے کسی بھی کالج میں داخل کرواسکتی تھی حتیٰ کہ ٹم بھی مدد کرسکتا تھا مگر کوئین انگراہم کے لیے پُرعزم تھی۔ میٹ کوئی عقبی دروازہ بھی کوئین کے لیے نکال سکتا تھا تاہم انگراہم کی حد تک کوئی اثر ورسوخ نہیں چل پاتا۔ کوئین پیدائشی ڈاکٹر ہے، اسے یہاں داخلہ ملنا چاہیے۔ لیکن میٹ کو کوئین خوف زدہ لگ رہی تھی۔ وہ چاہ رہا تھا کہ اسے اطمینان دلائے کہ سب ٹھیک ہوگا۔

ٹم نے پیپسی ختم کر کے اِدھر اُدھر دیکھا۔''بیئر بھی ہونی چاہیے۔''

''اوہ، ہو۔'' میٹ سمجھ گیا کہ ٹم بوریت محسوس کر رہا ہے اور بوریت کے وقت وہ ہمیشہ کچھ عجیب کرتا تھا۔

میٹ نے پھر کوئین کو دیکھا، شاید وہ موضوع تبدیل کرنا چاہ رہی تھی۔

''رات اٹلانٹک سٹی میں کیا رہا؟'' میٹ نے سوال کیا۔

''تقریباً ہزار ڈالرز۔''

''بلیک جیک؟''

''یہ میرا کھیل ہے۔''

کوئین کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ایک رات میں ہزار ڈالر... کتنے ہفتے خراب کیے تھے اس نے اپنی سرٹیفکیشن کے جب وہ ہزار ڈالر کے لیے دو دو جگہ ویٹرس کی نوکری کررہی تھی اور میٹ کو بھی پتا تھا۔

ٹم نے اِدھر اُدھر دیکھا۔''یار کمال ہے، بیئر لازمی ہونی چاہیے۔''

''یہ میڈیکل اسکول کا کیفے ٹیریا ہے۔'' کوئین کی آواز میں برہمی کا اشارہ تھا۔''یہاں کوئی بیئر جیسی چیز نہیں ہے۔''

ٹم مسکرایا۔ اس کی آنکھیں اس وقت بھی چشمے کے پیچھے تھیں۔''دس ڈالر؟'' وہ بولا۔''میں لاتا ہوں۔''

''اوکے۔'' وہ بولی۔''دس....''

میٹ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔''ٹم سے کبھی شرط نہ لگانا، اگر میرا بھروسا ہے تو۔'' وہ بولا۔

کوئین نے دونوں ہاتھ باندھ لیے حالانکہ اس کے پاس پھینکنے کے لیے دس ڈالر نہیں تھے۔ تاہم یہ اتنی یقینی بات تھی کہ اس نے فیصلہ کرلیا۔ وہ چاہتی تھی، ٹم کے غبارے سے ہوا نکلنی چاہیے۔

''اوہ، اچھا۔'' ٹم نے کہا۔''مجھے یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔ میری عزت داؤ پر لگ چکی ہے۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

کوئین میٹ کی جانب متوجہ ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں غصہ تھا۔''کیا تم اس کے ساتھ رہے ہو، مجھے یاد پڑتا ہے کہ تمہارے کمرے کا ساتھی کاروباری مضامین میں دلچسپی رکھتا تھا۔'' مجھے یقین نہیں آرہا کہ وہ ڈاکٹر بننا چاہتا ہے؟''

''اس کا میجر مضمون معیشت تھا۔ تاہم گزشتہ برس اس نے کسی طرح مطلوبہ سائنس کورسز کر کے اپنے لیے دوسرا راستہ کھلا رکھ چھوڑا کہ اگر اس کا ذہن تبدیل ہوتا ہے تو وہ مشکل میں نہ پڑے، میرا خیال ہے کہ اس نے ڈاکٹر بننے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

''جواب نہیں۔'' کوئین نے کمر پیچھے نکالی۔''میں ساڑھے تین برس تک اپنی کمر توڑتی رہی، پری میڈیکل، بائیو میجر کے لیے اور اس نے کسی طرح چند کورسز کر کے انگراہم کا دعوت نامہ حاصل کرلیا۔ یہ کیسے ہوا؟''

میٹ ہنسا۔''ٹم ہم لوگوں یا دوسرے لوگوں کی طرح نہیں ہے۔ اس کی یادداشت ناقابلِ یقین ہے۔ وہ کچھ نہیں بھولتا اسی لیے''بلیک جیک'' میں ہمیشہ جیت جاتا ہے۔ وہ ہر کھیلے گئے پتے کو یاد رکھتا ہے۔''

''سب کچھ ٹھیک ہے... لیکن یہ کافی نہیں....''

میٹ نے ہاتھ بلند کیا۔''مزید یہ کہ اس کے پاس ایک نہایت تیز تجزیاتی دماغ ہے۔ کیلکولیٹر کے بغیر وہ یکدم چیز حل کرسکتا ہے۔''

میٹ نے ٹھنڈی سانس بھرلی۔''کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا ہے کہ ایسے لڑکے کو دوست بنانا بہت مشکل ہے۔ جو کسی بھی ٹیسٹ میں شامل ہو اور پسینہ بہائے بغیر اول آجائے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایک بہت اچھا انسان بھی ہے۔''

''نائس گائے... عمدہ بندہ۔'' کوئین کی آواز بلند ہو گئی۔''میٹ وہ ایک انا پرست، غیر ذمے دار اور....''

''کوئین... کوئین۔'' میٹ نے کہا۔''وہ تمہیں جانچ رہا ہے، ٹیسٹ کررہا ہے۔ یہ ایک کھیل جو وہ کھیل رہا ہے اور وہ ایسا انہی کے ساتھ کرتا ہے، جنہیں وہ پسند کرتا ہے۔''

آخری فقرے پر کوئین کے رخسار سرخ ہونے لگے....

''جب تم اسے جان جاؤ گی تو بہت لطف اندوز ہو گی۔ میرا یقین کرو، وہ....'' اس نے نظر اٹھائی۔''شیطان کا نام لو اور وہ حاضر۔''

ٹم کے ہاتھوں میں تین پیپر کپ تھے۔''رولنگ راک (بیئر کا نام) جناب کے لیے۔'' اس نے ایک کپ میٹ کو دیا۔

''کورز لائٹ (ہلکی بیئر کا نام) خوب صورت خاتون کے لیے۔'' دوسرا کپ اس نے کوئین کے آگے رکھا۔

گلابی رخساروں کا رنگ اور گلابی ہوگیا۔

کوئین نے کپ میں سفید جھاگ دیکھے۔''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''کچھ نہیں ڈیئر، میں کچن میں بھی کام کر چکا ہوں۔ ضرورت مندوں کا ذاتی ذخیرہ کچن میں ہوتا ہے۔ میں نے تین کپ کے لیے دس ڈالر کی جھلک دکھائی... وہ خوش ہو گئے۔''

اس نے کپ اٹھایا۔''چیئرز۔''

''نہیں شکریہ۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔''معاف کیجیے، میرا انٹرویو ہے۔''

میٹ کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔ یہ وہ کوئین نہیں تھی جسے وہ جانتا تھا۔ مڑتے مڑتے اس نے میٹ کو آنکھ ماری۔ میٹ پُرسکون ہوگیا۔ ٹم کے کھیل کے لیے کوئین نے جوابی کارروائی کی تھی، اچھا ہے۔

ٹم، میٹ کی جانب دیکھ کر ہنسا۔''مجھے یہ لڑکی اچھی لگی، تمہیں کہاں سے ملی۔ وہاں اور بھی ہوں گی، ایسی؟''

''ہم بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ وہ اپنی قسم کی ایک ہی ہے اور شاید تمہارے مطلب کی نہیں ہے۔''

ٹم نے بھویں اچکائیں۔''اوہ، کیا واقعی؟ یہ علاقہ تمہارا ہے؟''

''نہیں، ہم صرف اچھے دوست ہیں۔''

''گڈ۔'' ٹم نے مطمئن لہجے میں کہا اور دور ہوتی کوئین کو دیکھنے لگا۔''مجھے اس کے آس پاس رہنا اچھا لگتا ہے۔''

میٹ اس کے احساسات کا اندازہ نہ لگا سکا تاہم وہ دونوں کی طرف سے مطمئن تھا۔ اس نے دل ہی دل میں کوئین کے لیے انٹرویو کی کامیابی کی دعا کی۔ وہ جانتا تھا کہ انگراہم لڑکوں کو فوقیت دیتا ہے تاہم اسے یقین تھا کہ وہ لوگ انگراہم کے لیے کوئین کی اہمیت کے قائل ہوجائیں گے۔

☆☆☆

لوئیس ویرن، سائنس سینٹر کے نگرانی والے کمرے میں تھا۔ یہ کمرا تہ خانے میں تھا۔ وہ مرکزی اسکرین کو دیکھ رہا تھا ساتھ سگار نوشی بھی جاری تھی۔ یہ اس کا علاقہ تھا۔ پورے کیمپس میں یہ واحد جگہ تھی جہاں اسے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔ V کی شکل کا رہائشی حصہ ایک سو چار کمروں پر مشتمل تھا۔ ہر کمرا دو افراد کے لیے تھا... 100 کمرے پُر تھے۔ یہاں سے ویرن کمروں کے علاوہ اور بھی چیزوں کو چیک کر سکتا تھا۔

☆☆☆

''کیا خیال ہے کہیں یہ بھی ٹیسٹ کی کوئی شکل نہ ہو؟'' کوئین کے روم میٹ، ٹرش نے پوچھا۔ ڈنر کے بعد سے لڑکی تین مرتبہ یہ سوال کر چکی تھی۔ کوئین نے لمبے بالوں والی ٹرش کی طرف دیکھا۔ ''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی؟''

ٹرش نے آنکھیں گھمائیں۔ ''یہ کمرا، شب بسری... وہ چیک کر سکتے ہیں کہ ہم رات کیسے گزارتے ہیں، ان کے اصولوں کا احترام کرتے ہیں یا نہیں؟''

کوئین نے کمرے کا سرسری جائزہ لیا۔ ''ہوسکتا ہے، ویسے انہوں نے ہر جانب خاصی تعداد میں اصول کاشت کر رکھے ہیں۔''

انگراہم کالج کی شہرت تھی کہ وہ طالب علموں/امیدواروں پر بہت زیادہ کنٹرول رکھتے تھے۔ ٹیسٹ سے قبل رات وہیں گزارنا لازمی تھا۔ یہ امران کے متعدد اصولوں کا حصہ تھا۔

''تم پڑھائی نہیں کرو گی؟'' ٹرش نے پوچھا۔

''میں نہیں سمجھتی کے کل کا ٹیسٹ ایسا ہوگا کہ ہم رات پڑھائی کی نذر کر دیں۔'' وہ بولی۔ ''بہر حال تم جو مناسب سمجھو کرو میں تھوڑی چہل قدمی کر لوں۔'' کوئین باہر نکل گئی۔

ہال میں آکر اس نے گراؤنڈ فلور پر میٹ کے کمرے کا رخ کیا۔ وہاں ٹم کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ ''خوش آمدید، گریٹ کوئین'' وہ بولا۔ اور سوال کرنے سے پہلے ہی جواب دے دیا۔ ''میں نے اپنے کمرے کا ساتھی تبدیل کر لیا۔ یہاں کا وہاں، وہاں سے یہاں۔''

''تمہیں یقین ہے کہ یہ اصولوں کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے؟'' ٹم نے اپنی کامک بک نیچے رکھ دی۔ ''اصولوں کی تو بھرمار ہے، حد ہوگئی۔ ٹیسٹ سے قبل ہم رات میں کیا کرتے ہیں، اس سے ان کا مطلب کیا ہے؟''

''شاید وہ چاہتے ہوں کہ ہم برابری کی بنیاد پر ٹیسٹ میں شرکت کریں۔ ایک جیسا عشائیہ، ایک سا بستر، برابر کی نیند......'' کوئین نے کہا۔

''شاید۔'' میٹ نے سر ہلایا۔

''ہوں، میں نہیں جانتا تم دونوں کیا سوچتے ہو۔'' ٹم نے کہا۔ ''لیکن میرے احساسات کہہ رہے ہیں کہ ہم لیب کے چوہے ہیں۔''

''ظاہر ہے کہ یہ جگہ مفت خوروں کے لیے نہیں ہے۔'' میٹ نے کہا۔ ٹم نے کندھے اچکانے پر اکتفا کیا۔

''کون نہیں چاہتا یہاں تعلیم حاصل کرنا؟'' کوئین نے پوچھا۔

''سبھی چاہتے ہیں۔'' میٹ بولا۔ ''جب تک کسی کو پتا نہیں چلتا کہ اسے چار سال ان دیواروں کے درمیان گزارنا پڑیں گے، لازمی۔''

''اور اگر آپ چھوڑ جائیں تو آپ کو ادائیگی کرنی پڑے گی۔'' ٹم نے بتایا۔

کوئین کو حیرت ہوئی۔ ''کیسی ادائیگی؟''

''جو اخراجات طالب علم پر ہو چکے ہیں، اس کی ادائیگی۔''

''اگر کوئی بیمار ہو جائے، زخمی ہو جائے... وغیرہ؟''

''اگر ایسا ہو یا کوئی کیریئر تبدیل کرنا چاہتا ہے۔'' ٹم نے کہا۔ ''تو گڈ بائی اور گڈ لک۔ لیکن اگر وہ یہاں سے جاتا ہے اور کسی دوسری جگہ سے میڈیکل گریجویٹ بننے کی کوشش کرتا ہے تو پھر ہوشیار رہو اور تیار رہو... ادائیگی کے لیے۔''

''بھاری فیس لینے والے وکیل کی طرح بول رہے ہو۔'' میٹ نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ معاہدہ ختم کیا جا سکتا ہے۔''

''یہاں نہیں۔'' ٹم نے کہا۔ ''چند برس پیچھے، کسی کے والدین نے دو سال گزارنے کے بعد بیٹے کے ''کارن ویل'' میں تبادلے کے لیے کیس کر دیا تھا۔ یہ لڑائی کئی سال جاری رہی، تاہم وہ ہار گئے اور ادائیگی کرنی پڑی۔''

میٹ، ٹم کو گھور رہا تھا۔ ''تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟''

''ٹائم، کا مضمون تھا۔'' ٹم نے چشمہ ہٹا کر آنکھوں کو مسلا۔ ''ہم... ہم... پندرہ اکتوبر کا شمارہ، صفحہ نمبر 12 زیریں دایاں کونا۔''

کوئین نے حیرت سے ٹم کو گھورا پھر میٹ کا ردِعمل دیکھنے کے لیے اس کی جانب نظر پھیری۔ میٹ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا؟''

''مرعوب کن، بے حد عجیب۔'' کوئین نے کہا۔ اس کا مطلب میٹ نے مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا تھا۔ ٹم براؤن کی یادداشت ناقابلِ یقین تھی۔ لیکن ٹم کی ''فری لنچ'' والے نکتے نے کوئین کے دماغ میں خلش کی کیل ٹھونک دی۔ اس کی ذہنی رو چل پڑی... اگر یہ کھانا مفت نہیں ہے تو پھر اس کی ''قیمت'' کیا ہے؟

معاً اس کی نگاہ گھڑی پر گئی۔ ساڑھے دس۔ ''بہتر ہے

میں چلوں۔''

''کرفیو۔'' میٹ نے کہا۔ ''کیا تم یقین کر سکتے ہو؟ ابھی مجھے یہاں آئے مکمل چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے ہیں اور یہ جگہ میرے اعصاب پر سوار ہونا شروع ہو چکی ہے۔''

ٹم نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ ''احتیاط کرو، دوست۔ دیواروں کے بھی کان ہو سکتے ہیں۔''

''یہ شاید محاورہ ہے۔''

''ہاں، محاورہ ہے۔'' اس کی انگلی ابھی تک ہونٹوں پر تھی۔

☆☆☆

''تم شرط لگا سکتے ہو اس بات پر، ہوشیار لڑکے۔'' ویرن بڑبڑاتے ہوئے دوسرے کمرے کی طرف متوجہ ہوا۔

اچانک اسے کرٹ کی آواز سنائی دی۔ ''تمام گدوں کے سینسرز مثبت حالت میں ہیں، باس۔'' کرٹ نے کہا۔ وہ دونوں تہ خانے میں تھے۔

''ٹھیک ہے۔'' ویرن نے جواب دیا۔ ''گیارہ بجنے والے ہیں... نیند کا وقت۔ وہ مرکزی کنٹرول پینل سے کھیلنے لگا... بستر کے گدوں میں غیر محسوس مدھم لہریں پیدا ہونے لگیں، یہ لہریں امیدواروں کو نیند کی جانب مائل کر رہی تھیں۔

مخصوص ''انڈیوسر'' کمروں میں الیکٹرو میگنٹک فیلڈ تخلیق کر رہا تھا جو دماغ کی لہروں کو متاثر کرتی ہے۔ ''سو جاؤ! میرے بچوں سو جاؤ۔'' ویرن نے سرگوشی کی۔

ٹیسٹ سے پہلے انہیں پوری نیند لینی چاہیے۔ یہ انگراہم کا اصول تھا۔

''حضرات، کیا حال ہے؟'' دونوں کے عقب سے آواز آئی۔

ویرن، برہم غراہٹ کو دباتے ہوئے مڑا۔ ''اوہ ڈاکٹر ایلسٹن۔'' ویرن نے زبردستی مسکراہٹ سجائی۔ ''ایک اور شام، فن اور فنکاروں کے نام۔''

''ویرن۔'' ڈاکٹر نے اس خوش باشی کا مثبت جواب نہیں دیا۔ وہ فضا میں کچھ سونگھ رہا تھا۔ ''پھر سگار؟''

''ڈاکٹر! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' ویرن نے سگار سامنے کیا۔ ادھر کرٹ اپنی ہنسی دبا رہا تھا۔ ڈاکٹر چند ساعت ویرن کو گھورتا رہا پھر بولا۔ ''پھر بات کریں گے اس مسئلے پر... ہاں کیا صورتِ حال ہے؟''

''بیس فیصد پہلے ہی لڑھک چکے ہیں۔'' کرٹ نے جواب دیا۔ ویرن نے ٹائمر دیکھا اور بولا۔ ''شیڈول کے مطابق۔''

''خوب۔'' ڈاکٹر ایلسٹن نے کہا۔ ''سب سو جائیں تو موسیقی شروع کر دینا۔''

☆☆☆

صبح کیفے ٹیریا میں تمام امیدوار جمع تھے۔ سب ہی کسی نہ کسی حد تک نروس تھے۔ آخری رکاوٹ سر پر تھی۔

ٹم نے کن انکھیوں سے کوئین کو دیکھا۔ آج وہ اسے زیادہ اچھی لگی۔ اس نے نیوی بلیو سویٹر اور سفید پتلون پہنی ہوئی تھی۔ آنکھوں پر ہلکا میک اپ تھا۔ سر کے بال اور رخساروں پر شعلے سے لپک رہے تھے۔ ٹم نے اس کے ہاتھوں کی انتہائی خفیف سی لرزش نوٹ کر لی۔ یہ ٹیسٹ کوئین کے لیے نہایت اہم ہے۔ ٹم کے دل نے کہا کہ اسے گلے لگا کر تسلی دے لیکن وہ ابھی اتنے قریب نہیں پہنچا تھا کہ دل کی آواز پر کان دھرتا۔

''تم نے آرام دہ نیند لی؟'' اس نے سوال کیا۔

''میں یقیناً مردوں کی طرح سوئی۔ یہ میرے لیے انوکھا ہے۔'' وہ بولی۔ ''کیونکہ میں کسی بھی اہم ٹیسٹ سے قبل رات کو سوتی، جاگتی رہتی ہوں... شاید انہوں نے کھانے میں کچھ ملایا تھا۔''

''شاید۔'' ٹم نے کہا۔ ''میں بھی کٹے ہوئے درخت کی طرح پڑا رہا تاہم مجھے ایسی توقع تھی کیونکہ میں پہلے گزری ہوئی شب نیند نہیں لے سکا تھا۔''

کوئین نے کیفے کے انتہائی سرے کی جانب دیکھا۔ ''یہ کوئی مشہور آدمی ہے؟''

ٹم نے سر گھمایا۔ ''سینیٹر وھٹنی... جیفرسن اسٹیفن وھٹنی۔'' ٹم نے بتایا۔ ''بلکہ مجھے کہنا چاہیے کہ سابق سینیٹر۔'' اس کے ذہن میں وال اسٹریٹ جرنل کا صفحہ تصویر کے ساتھ ابھرا۔ اسے ''سرخی'' یاد آئی۔ ''سینیٹر وھٹنی نے مہم ختم کر دی۔ فاؤنڈیشن کا عہدہ قبول کر لیا۔''

''ستر کی دہائی میں ریاست وسکانسن کا سب سے مضبوط و مقبول سینیٹر جس نے خصوصاً فوڈ اینڈ ڈرگ ایڈمنسٹریشن کے معاملات میں ٹھیک ٹھاک ہلچل مچائی تھی۔ ری الیکشن کے موقع پر دفعتاً وہ ہٹ گیا اور کلیڈرمین فاؤنڈیشن سے جڑ گیا۔''

''جب ہی یہاں دکھائی دے رہا ہے۔'' کوئین نے کہا۔

ڈاکٹر ایلسٹن، سینیٹر کے ہمراہ تھا۔ وہ دونوں سیڑھیوں

پر اونچی جگہ کھڑے تھے۔ ٹم نے اسٹینڈ اور مائیکروفون دیکھا۔

''صبح بخیر۔'' ڈاکٹر کی آواز آئی۔ ''مجھے امید ہے کہ آپ لوگ آرام سے سوئے ہوں گے اور آپ سب کو ناشتا پسند آیا ہوگا جو انگراہم کے اسٹاف نے آپ لوگوں کے لیے تیار کیا تھا۔''

تالیاں ــــ

''آج کی صبح آپ کو یہ اعزاز مل رہا ہے کہ امریکا کے سابقہ سینیٹر جیفرسن وھٹنی، سرپرائز وزٹ پر آپ کے سامنے ہیں۔ آپ لوگ جانتے ہیں کہ سینیٹر صاحب کلیڈرمین فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر ہیں... سینیٹر۔'' وہ پیچھے ہٹ گیا۔

تالیاں .....

''گڈ مارننگ۔'' وھٹنی نے آغاز کیا۔ ''میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ ٹیسٹ میں شرکت کے لیے بے تاب ہیں۔ چنانچہ میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' وہ مسکرایا۔ ''آج کا دن آپ کے مستقبل کے لیے ایک اہم دن ہے۔''

ٹم نے مشاہدہ کیا کہ کوئین کا سر ازخود اثبات میں ہلا۔

''تاہم آپ لوگوں کو یقیناً اس امر کا ادراک بخوبی ہوگا کہ یہ دن انگراہم کے لیے بھی اتنا ہی اہم ہے۔ آپ لوگ بہترین طالب علموں کی ''کریم'' ہیں۔ آپ وہ نوجوان ہیں جن کو انگراہم اپنے اسٹوڈنٹ کے طور پر دیکھنا چاہتا ہے۔ ہم آپ سب کو شامل رکھنے کی چاہت میں مبتلا ہیں۔''

تالیاں .....

''تاہم شومئی قسمت، کلیڈرمین فاؤنڈیشن کے فنڈز محدود ہیں جبکہ ہم معیار پر بھی سمجھوتا کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جن طلبا کو داخلہ ملے گا، انگراہم ان کا ہر طرح سے خیال رکھے گا۔ آنے والے کل میں آپ لوگ ہی امریکن میڈیسن کے مستقبل کو نئی شکل دیں گے۔ میں اس وقت کلیڈرمین فاؤنڈیشن اور انگراہم کالج دونوں کی نمائندگی کررہا ہوں... ہمیں آپ پر فخر ہے....'' اس نے ہاتھ ہلایا۔

تالیاں... ایک بار پھر تالیوں کی گونج سنائی دی۔ ٹم کے دونوں ہاتھ بھی شامل تھے، مکینکی انداز میں... ''کمال ہے؟'' وہ بڑبڑایا اور تالی بجانا بند کردی۔

''وہی لفاظی۔'' ٹم نے کہا۔

''کیا مطلب ہے؟'' کوئین نے تیزی سے کہا۔

ہمیشہ کی طرح میٹ نے امنِ باہمی کے لیے کردار ادا کیا اور وضاحت کی۔ ''دراصل ٹم کو سیاست داں پسند نہیں ہیں۔''

''وہ سیاست داں تھا۔ اب وہ فاؤنڈیشن کا سربراہ ہے۔'' کوئین نے کہا۔

''یہ حقیقت ہے کہ سب اس کو سینیٹر وھٹنی کہہ کر پکارتے ہیں۔'' ٹم بولا۔ ''ویسے بھی... ایک مرتبہ سیاست داں تو ہمیشہ سیاست داں۔''

☆☆☆

ٹم اپنی پنسل چباتے ہوئے سوال نمبر 200 پر غور کررہا تھا۔ ٹیسٹ کسی دہشت ناک خواب سے کم نہیں تھا۔ بائیولوجی تو کیا، کیمسٹری کے سوالات بھی ازحد مشکل تھے۔ ٹم نے اطراف میں دیکھا۔ اس کلاس روم میں 25 امیدوار موجود تھے۔ باقی عمارت میں بکھرے ہوئے تھے۔ عجیب اتفاق تھا کہ کوئین اس کے بائیں ہاتھ کی نشست پر تھی۔ میٹ کی کرسی بھی اسی کمرے میں تھی۔ نروس امیدوار اپنے مستقبل کے لیے ذہنی توانائی خرچ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ ٹم بھی ٹیسٹ کو سرسری لینے کی غلطی نہیں کرسکتا تھا۔ اگر اسے داخلہ مل جاتا تو اس کی فیملی پر سے مالی دباؤ ختم ہوجاتا پہلی مرتبہ وہ خود کو خودمختار محسوس کرتا۔

لیکن یہ سوال نمبر 200 انوکھا تھا، یہ سوال کلیڈرمین ایکویشن کا ماحصل پوچھ رہا تھا۔ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ٹم کو جواب معلوم تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ جواب آیا کہاں سے۔ حتیٰ کہ اسے جان کلیڈرمین کے بارے میں بھی سب کچھ یاد تھا لیکن یہ جواب نہ اس نے زور لگایا نہ اس کی یادداشت میں یہ جواب موجود تھا... پھر یہ اسے کیونکر معلوم ہے... بس جواب، محض جواب!

اس نے ذہنی طور پر شانے اچکائے اور جوابات کے صفحے پر سوال نمبر 200 کے سامنے B باکس کو سیاہ کردیا۔ کون پروا کرتا ہے؟ کمپیوٹر کو گریڈ نکالنے کے لیے صرف جواب چاہیے۔ اگلے دو سوال بھی کلیڈرمین ایکویشن سے متعلق تھے۔ جوابات ازخود اس کے ذہن میں بلبلوں کی طرح ابھرے۔ جانے دو۔ اس نے صحیح یا غلط کے مطابق خانوں میں نشان لگائے اور آگے چل پڑا۔ سوالات کی نوعیت بدل گئی۔ معلومات عامہ، اس کے بعد سائنس... ٹم مسکرایا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھتا گیا۔ معاً سوالات کی نوعیت پھر بدل گئی۔ ''کس چیز کے لیے ہے یہ ٹیسٹ؟'' اس نے سوچا۔ سوالات اقرار اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت کے بارے میں تھے... جیسے وہ ایک سرجن ہے اور زخمی

پالیاں کے درمیان گھرا ہے اور اسے فیصلہ کرنا ہے کہ پہلے کس کا علاج کرے؟ یا پائلٹ ہے تو میزائل کس رنگ کی عمارت پر مارے... سرخ یا زرد؟ رستے میں ڈالر پڑا ہے تو کیا کرے؟ چھوڑ دے یا اٹھالے؟ لعنت... کیا تماشا ہے؟

ٹم نے تصور میں انگراہم کو ناگفتنی سنائی۔ وہ سوالات کے جوابات کے بجائے اس پر غور کررہا تھا کہ ان سولات کے پیچھے ممتحن کا مقصد کیا ہے؟ وہ سمجھ گیا کہ سوالات کی اہمیت نہیں ہے۔ امیدوار یا طالب علم کی اہمیت ہے۔ اس حصے میں جوابات کو نہیں پرکھا جائے گا۔ بس پنسل چلادو۔ ہارنے کا خطرہ نہیں ہے اور اس نے ایسا ہی کیا۔

''ختم ....'' ایسی کم تیسی۔

ٹم نے گھڑی دیکھی۔ اس کے 400 سوالات پورے ہوگئے تھے۔ ہر سوال پر اے، بی، سی، ڈی یا ای میں سے کسی ایک پر نشان لگانا تھا۔ آخری حصے کے جوابات میں اس نے سب جگہ ''ڈی'' باکس کو سیاہ کردیا تھا۔ ''ڈو اور ڈائی'' وہ دل ہی دل میں ہنسا۔

اب وہ فارغ تھا اور دس منٹ باقی تھے۔

اس نے کوئین کو دیکھا۔ پھر اس کے جوابات کے صفحے کو دیکھا۔ جوابات کے کالم میں ایک کالم کی چوٹی پر دو سوالات کے جوابات خالی پڑے تھے۔ کوئین مصروف تھی۔ ٹم نے اپنا صفحہ دیکھا۔ یہ وہی سوالات تھے۔

انگراہم کی جملہ مالی ضروریات کا منبع کلیڈرمین فاؤنڈیشن تھی۔ ٹم کے ذہن نے کہا کہ اگر انہی سوالات کو چھوڑ دیا گیا تو عین ممکن ہے کہ امیدوار کو فیل قرار دیا جائے۔

نگران، کوئین کے قریب ہی کھڑی تھی۔ تاہم اس کی پشت کوئین کی طرف تھی۔ ٹم ذرا سا اٹھا اور ہاتھ بڑھا کر سوال نمبر 201 اور 202 کے سامنے B اور C باکس کو سیاہ کردیا۔ وہ سیدھا ہوا اور اپنے کاغذات سمیٹ کر کھڑا ہوگیا۔

☆☆☆

کوئین، شیٹ پر ان دونوں سیاہ نشانات کو گھور رہی تھی۔ ایسے تین سوال تھے۔ تینوں نے کوئین کو صاف آؤٹ کردیا تھا۔ کلیڈرمین ایکویشن کے بارے میں اس نے پڑھا تھا نہ کہیں سنا تھا۔ وہ چکرا گئی لیکن ٹم کو پتا تھا۔ غیر اختیاری طور پر اس نے پنسل الٹی کی تاکہ ٹم کے جوابات مٹا دے۔ اس نے ہمیشہ خود پر انحصار کیا تھا۔ دفعتاً وہ منجمد ہوگئی۔ اتنے برسوں کی محنت، اس کا سپنا... اس کا مستقبل... سب کچھ داؤ پر لگا تھا۔

''یہ ایک حقیقی زندگی ہے۔'' اس کی ذہنی رو چل پڑی۔ ''کلیڈرمین ایکویشن کا مطلب ''قبول'' یا ''مسترد'' بھی ہوسکتا ہے۔'' پھر بھی یہ جوابات اس نے نہیں دیے۔ کوئین کے ہاتھ میں پنسل کا ربر سیاہی مٹانے کے لیے کاغذ کی طرف جانے لگا تھا۔ یکلخت نگراں کی آواز نے ہر حرکت کو زنجیر پہنادی۔ دھڑکنیں رہ گئیں... اضطرابی دھڑکنیں۔

''وقت ختم، پنسلیں رکھ دیجیے... اگلا کوئی بھی نشان آپ کو فیل کردے گا۔'' نگراں کی بلند آواز میں اطلاع تھی یا دھمکی تھی؟

☆☆☆

ٹم اور میٹ نیلے تالاب کے کنارے کھڑے کلاس بلڈنگ سے کوئین کے باہر آنے کا انتظار کررہے تھے۔ بالآخر وہ بھاری قدموں سے چلتی ہوئی باہر آئی۔ ٹم کو اس کے سنجیدہ تاثرات سے پریشانی محسوس ہوئی۔

''کیسا رہا؟'' میٹ نے استفسار کیا۔

کوئین نے شانے اچکائے۔ ''کلیڈرمین ایکویشن کے بارے میں پتا ہے؟''

''یقیناً۔'' ٹم نے کہا۔ ''یہ....''

''مجھے پتا ہے کہ تم جانتے ہو، میں میٹ سے معلوم کرنا چاہتی ہوں۔'' ٹم الجھ گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس مرتبہ کوئین ضرور کچھ قریب آئے گی۔

میٹ نے سر کھجایا۔ ''یہ ایک بڑھتی ہوئی آبادی میں طبی خدمات کی تقسیم سے متعلق ہے۔''

''تم بھی جانتے ہو۔ تم دونوں کو معلوم ہے۔'' اس نے سر نفی میں ہلایا۔ ''مجھے کیوں نہیں پتا... تین سوال تھے، تینوں کا نہیں پتا؟''

''خوش رہو۔'' ٹم نے کہا۔ ''بہرحال، تین میں سے دو تم نے ٹھیک کیے ہیں۔''

کوئین نے سر جھٹکا۔ اس کے تاثرات میں غصہ تھا۔ اس نے ٹم کو گھورا۔ ''دونوں جواب میں نے نہیں تم نے کیے۔ میں دوسروں کے کاموں میں ہاتھ نہیں ڈالتی ٹم۔''

''اوہ، نہیں۔ تم نے انہیں مٹایا تو نہیں؟''

''ہاں، نہیں مٹایا اور مجھے اس پر کوئی فخر نہیں ہے۔'' اس کی آنکھوں میں اذیت تھی۔ وہ مڑی اور رہائشی علاقے کی طرف چل پڑی۔

''تم نے اس کی شیٹ پر مارکنگ کی تھی؟''

''ہاں، دو خانے خالی تھے۔ میں نے سوچا کہ میں

مدد کر دوں۔'' وہ بتانا نہیں چاہتا تھا نہ تسلیم کرنا چاہتا تھا مگر اسے تکلیف ہوئی۔ ''شاید! میں اس کی توجہ حاصل نہیں کر سکتا۔''

''تو سونتاوے لوگوں میں تم ہیرو ہوتے۔'' میٹ نے کہا۔ ''لیکن کوئین کا معاملہ مختلف ہے۔ اس کا اپنا مزاج اور اپنے اصول ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا بھی تھا کہ وہ مختلف قسم کی لڑکی ہے۔''

''ٹھیک کہا تھا اگرچہ پرانا فیشن......''

''ہاں۔'' میٹ نے نرمی سے کہا۔ ''کہہ سکتے ہیں، اولڈ فیشن کی لڑکی ہے۔''

ٹم اس سے متاثر تھا اور اب افسردگی محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

کوئین کی عادت سی بن گئی تھی۔ وہ اپنے گھر میں بلا ناغہ خوابگاہ سے باہر کا نظارہ کرتی۔ وہ بھی دوربین سے۔ اس کے ذہن میں سرخ بتی روشن تھی۔ اب تک کوئی ڈاک نہیں آئی تھی۔ اس کی بے صبری بڑھتی جا رہی تھی۔

''آج تو ڈاک آنی چاہیے۔'' اس نے پھر دوربین اٹھائی۔ اس کی ماں نے اسے ایک پرانی کہاوت بھی سنائی تھی کہ ''مت بھولو کہ تم جو چاہتے ہو وہ ہمیشہ تمہیں ملے گا، یہ ضروری نہیں۔''

فون کی گھنٹی بجی۔ وہ اچھل کر فون کی طرف لپکی۔ یہ میٹ کا فون تھا۔ ''کوئین، کوئی خبر ملی؟''

''نہیں، میٹ... ابھی تک کچھ نہیں۔''

''اچھی خبر آئے گی۔ اسے آنا چاہیے۔'' میٹ کو گزشتہ ہفتہ داخلے کا لیٹر مل گیا تھا اور اب یہ جمعہ آ گیا تھا کوئین ابھی تک منتظر تھی۔

''دیکھو میٹ، تمام داخلے ہو گئے ہیں اور میں نہیں ہوں۔ یہی حقیقت ہے۔'' کوئین نے کہا۔

''مجھے یقین نہیں ہے، نہ ہی ٹم کو۔'' میٹ بولا۔ کوئین کو دسمبر کے ٹیسٹ کی یاد آئی اور ٹم کی حرکت بھی۔

''میٹ، ٹم کا داخلہ ہو گیا؟''

''ہاں، کوئین۔ اس کو بھی لیٹر مل گیا ہے۔''

اس کا مطلب اس کے جوابات ٹھیک تھے۔ تو میں کیوں باہر ہوں؟ وہ سوچ رہی تھی۔

''مجھے فون کرنا، اطلاع ملتے ہی۔'' میٹ نے کہا۔

''کیوں نہیں، شکریہ۔'' کوئین نے فون رکھ دیا۔ وہ تھکی تھکی سی کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔

اسی وقت، ہلکی سیٹی جیسی آواز آئی، یہ ڈاک والے ٹرک کے بریکوں کی آواز تھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکا۔ بمشکل اس نے اپنی رفتار معتدل رکھی اور میل باکس سے ڈاک لے کر آ گئی۔ بجلی کا بل... فون کا بل... انگراہم کالج آف میڈیسن۔ اسے لگا دھڑکتا دل، ایک دھڑکن چھوڑ گیا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔ اسے لفافہ ہلکا لگا۔ غالباً اس میں محض ایک کاغذ کا ٹکڑا تھا۔ مطلب اسے مسترد کر دیا گیا ہے۔ اس نے خود سے کہا۔

اس نے کانپتی انگلیوں سے لفافہ کھولا۔

''ڈیئر مس کلیری!

ہر سال داخلہ اور ٹیسٹ کے سلسلے میں انگراہم کالج سیکڑوں امیدواروں کی جانچ کرتا ہے۔ یہ ایک بہت مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمیں محض پچاس طالب علم منتخب کرنے ہوتے ہیں۔ داخلہ دفتر آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے بہت افسوس محسوس کرتا ہے کہ منتخب کردہ طلبا میں آپ کا نام شامل نہیں ہے۔ تاہم چونکہ آپ کا ''اسکور'' بلند ترین 100 امیدواروں میں موجود ہے اس لیے دفتر ہذا نے آپ کا نام ''ویٹنگ لسٹ'' میں رکھا ہے۔ اگر کوئی مثبت تبدیلی آپ کے حق میں وجود پذیر ہوتی ہے تو یہ دفتر آپ کو فوراً مطلع کرے گا۔ اگر آپ کی خواہش ہے کہ منتظر افراد کی فہرست میں آپ کا نام نہ رکھا جائے تو برائے مہربانی داخلہ دفتر کو فوراً اطلاع بہم پہنچایئے۔ شکریہ۔''

☆☆☆

کوئین کی لرزیدہ انگلیوں سے کاغذ کا ٹکڑا پھسل گیا۔ اس کی نظر دھندلانے لگی۔ اس کی تمام زندگی ڈاکٹر بننے کا سپنا دیکھتے گزری تھی اور عین اس وقت جب وہ منزل کے انتہائی قریب پہنچ گئی تھی تو کاغذ کے ایک بظاہر حقیر ٹکڑے نے سیکنڈوں میں اس کا خواب، اس کا مستقبل، اس کی زندگی... سب کچھ چھین لیا تھا۔

''اوکے۔'' اس نے بھیگی آنکھوں سے سرگوشی کی۔

''تم بائیس سال کی ہونے والی ہو، بالغ ہو... جوان ہو... بچوں کی طرح مت رونا۔'' اس کی ذہنی رو نے اسے تسلی دی۔ وہ اپنے کرچی کرچی وجود کو اکٹھا کرنے لگی۔ آنکھوں کا پانی نیلے کٹوروں سے باہر نہ آ سکا۔

''مضبوط رہو۔'' اس نے خود سے کہا۔ ''انگراہم کے دروازے ابھی پوری طرح بند نہیں ہوئے۔''

اس کی بے جان ٹانگیں اسے پورچ میں لے آئیں۔ کوئین نے نظر اٹھائی، اس کی ماں شاید اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ ماں تھی، سمجھ گئی۔

''اوہ کوئین۔'' ماں نے بیٹی کا بازو تھاما۔

''وہ سمجھ گئی ہیں۔'' کوئین نے سوچا۔ ''کیا وہ اس قدر لٹی ہوئی لگ رہی ہے کہ ماں نے فوراً سمجھ لیا۔''

اس نے ماں کی آنکھوں میں دیکھا جہاں کرب تھا اور ہمدردی تھی۔ آناً فاناً کوئی نازک سی شے کوئین کے بدن میں ''چھن'' سے ٹوٹ کر بکھر گئی۔ وہ بے اختیار ماں سے لپٹ گئی اور سسکیاں لینے لگی۔ گھٹا سینے کی گہرائیوں سے آزاد ہو کر اٹھی اور نیلے کٹورے برسنے لگے۔ وہ رو رہی تھی۔ وہ سب کچھ بھول کر ماں کی مہرباں آغوش میں سمٹ گئی۔ یہ سب سے مضبوط و معتبر پناہ گاہ تھی۔

☆☆☆

ٹم، میٹ کی خواب گاہ میں موجود تھا۔ وہ میٹ کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ ٹم سمجھ گیا کہ اس کا دوست کوئین سے بات کر رہا ہے۔

میٹ فون رکھ کر مڑا۔ وہ کچھ بولنے ہی والا تھا کہ ٹم نے ہاتھ بلند کر کے اسے روک دیا۔ ''میں سمجھ گیا۔'' وہ بولا۔ اس نے تکلیف محسوس کی۔ اس سچے سپاہی کی طرح جس کا کمانڈر گم ہو گیا ہو۔

''ٹھیک نہیں ہے۔'' ٹم نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ میرے احساسات اس کے لیے ایسے ہی ہیں جیسے اس کے احساسات ڈاکٹر بننے کے لیے ہیں۔''

''لعنت ہے۔'' میٹ نے غصے سے کہا۔ ''کیا ان لوگوں کو احساس ہے کہ انہوں نے کوئین کی زندگی کے ساتھ کیا، کیا ہے؟'' وہ کھڑا ہو گیا اور کمرے میں چکرانے لگا۔ ''میرے ذہن میں اس جگہ کے لیے شروع سے تحفظات تھے لیکن یہ تو حد ہے... میں ان کو بتاؤں گا کہ ان کی کیا اوقات ہے، میں ان پر تھوک کر دکھاؤں گا۔ میں مذاق نہیں کر رہا۔''

ٹم کے ذہن میں ایک منصوبے کا بیج پھوٹا...

☆☆☆

''انگراہم ایڈمیشن، روتھ بول رہی ہوں۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟''

''ہائے، روتھ! میں ہوں۔ کوئین کلیری۔''

''کیسی ہو، کوئین ڈیئر؟''

''انتظار کر رہی ہوں، کوئی اطلاع؟''

''اوہ ہنی، نہیں۔ کوئی نہیں... ایسا بہت مشکل سے ہوتا ہے کبھی کبھی... میرا مطلب ہے جس کو یہاں داخلہ مل جاتا ہے پھر وہ چھوڑتا نہیں ہے۔''

''میں جانتی ہوں لیکن میں امید تو کر سکتی ہوں؟''

''کیوں نہیں، سویٹ ہارٹ۔ ہم لوگ بھی یہاں تمہارے ساتھ پُرامید ہیں۔'' روتھ نے انسیت سے کہا۔

''شکریہ روتھ۔'' کوئین نے فون پر جواب میں کہا۔

''بائے، ڈیئر۔''

موسم بہار سے اب تک کوئین داخلہ آفس میں اتنی بار فون کر چکی تھی کہ وہ سب کو ان کے نام سے جان گئی تھی اور وہ بھی کوئین سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔

کوئین وہی پرانا ویٹرس والا کام کر رہی تھی۔ فارغ اوقات میں وہ اسٹوڈنٹ لون کے لیے درخواستیں بھیجتی رہتی۔ بینک، سست معیشت کے باعث اور سرکاری فنڈز کی قلت کے پیش نظر معذرت کرتے رہتے۔ یا پھر وہ داخلہ آفس، انگراہم فون کرتی رہتی... مختصر یہ کہ وہ اپنے خواب سے دستبردار ہونے کے لیے آمادہ نہیں تھی۔

☆☆☆

''میں نہیں جا رہا۔''

''کہاں؟''

''انگراہم!''

ٹم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں، میٹ کے گھر کے عقبی لان میں نہایت وسیع سوئمنگ پول کے کنارے لیٹے ہوئے تھے۔

''واقعی، میرا یہی مطلب ہے۔'' میٹ نے کہا۔ ''میرے والد چاہتے ہیں کہ میں ییل (Yale) میں داخلہ لے لوں۔ وہ اور میرے دادا دونوں نے ییل ہی سے ڈگری لی تھی۔ مجھے ان کی ییل سے وابستگی کا احساس دیر سے ہوا۔''

ٹم پریشان ہو گیا۔ وہ میٹ جیسے دوست کے ساتھ کافی ہم آہنگی محسوس کرتا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میٹ جو جواز فراہم کر رہا ہے درحقیقت وجہ کچھ اور ہے۔

''تم ان کو بتاؤ گے تو ان کا ردِعمل کیا ہو گا؟''

''انگراہم؟''

''ہاں۔''

''کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میٹ بولا۔ ''سوچتا ہوں اپنی جگہ کوئین کا نام لے دوں... وہ بتا رہی تھی کہ ویٹنگ لسٹ پر اس کا نام گیارہویں نمبر پر ہے۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ وہ تمہارے کہنے پر کوئین کو دس افراد پر ''جمپ'' کرنے دیں گے بلکہ اس کا الٹا اثر ہو سکتا ہے۔'' ٹم نے کہا۔ ''اس میں بہت رسک ہے۔''

''تمہارے پاس کوئی آئیڈیا ہے؟'' میٹ نے سوال

کیا۔

’’شاید، ٹھہرو ذرا۔‘‘ ٹم واپس لیٹ گیا۔ اس موسم گرما میں اس نے کوئین کو دو مرتبہ فون کیا تھا۔ دوسری مرتبہ بات ہونے پر کوئین نے بتایا تھا کہ اس کی داخلہ آفس کی خواتین سے اچھی خاصی دوستی ہوگئی ہے وہ پھر اٹھ گیا۔

’’آئیڈیا!‘‘

’’کیا؟‘‘ میٹ نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

’’میری بات کراؤ، کوئین سے۔‘‘

☆☆☆

کوئین نے کچھ بے چینی محسوس کی۔ تاہم اس کے پاس کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ اسے یہ منصوبہ ایسا ہی لگا جیسے دیوار پھاند کر اندر داخل ہونا۔ بہرحال اس نے ٹم کی پیشکش قبول کرلی کہ اس کے ساتھ انگراہم چلے۔

دونوں روٹ 95 کے ساتھ ساتھ، ٹم کی پرانی کار میں میری لینڈ جا رہے تھے۔ لگتا تھا ٹم کو ’’سیرا‘‘ سے پیار ہے۔ حتیٰ کہ اس نے اپنی گاڑی کا گریفن نام بھی رکھ چھوڑا تھا۔

وہ انگراہم پہنچے تو گارڈ نے ٹم کا نام فہرست میں دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔ ٹم نے ایک جگہ چن کر پارکنگ میں گاڑی لگائی۔

’’تمہارے خیال میں بات بن جائے گی؟‘‘ کوئین نے سوال کیا۔

’’بن جائے گی۔‘‘ وہ بولا۔ ’’یہ ترکیب ’ماسٹر پلانز‘ کی ہے آج رجسٹریشن کا آخری دن ہے۔ وہ بھی جلد ختم ہوجائے گا۔۔۔ رجسٹریشن کلاس بلڈنگ میں ہے، میں وہاں ہوں گا۔ تم ایڈمیشن آفس میں اپنی ’’سہیلیوں‘‘ کے پاس جاؤ۔‘‘

کوئین خوف زدہ تھی۔ ’’اگر کام نہیں بنا پھر؟‘‘

’’کام بنے گا۔ نہیں بھی بنا تو تمہارا کیا نقصان ہے؟‘‘

کوئین نے سر ہلایا۔ منطق تو ٹھیک ہے۔ اس نے کار سے باہر قدم رکھا تو ٹم نے کہا۔ ’’گڈلک، کوئین۔‘‘

’’شکریہ۔ مجھے اس کی ضرورت رہے گی۔‘‘ اس کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔

ایڈمیشن آفس ایک چھوٹا کمرا تھا۔ جس میں ماربل کا ایک لمبا کاؤنٹر تھا۔ جس کے عقب میں ایک خاتون موجود تھیں۔ سامنے نام کی تختی پر روتھ لیک لکھا تھا۔

کوئین نے گلا صاف کیا۔ ’’تم روتھ ہونا؟‘‘

خاتون نے نگاہ اٹھائی۔ ’’اگر تم رجسٹریشن کے لیے۔۔۔‘‘

’’میں کوئین ہوں۔ کوئین کلیری۔‘‘ اس نے کہا۔

روتھ اپنی نشست سے اچھل پڑی۔

’’کوئین۔۔۔ تم۔۔۔ اوہ سویٹ ہارٹ۔۔۔ مارجوری! ایولن! دیکھو کون ہے۔۔۔ کوئین آئی ہے۔‘‘ دو اور پستہ قد، کسی قدر موٹی خواتین نمودار ہوئیں۔ ان کا ردِعمل رشتے داروں کی طرح تھا۔

’’لیکن۔۔۔‘‘ روتھ کو معاً خیال آیا۔ ’’کوئین تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ ہم نے۔۔۔ کسی کو۔۔۔‘‘

’’میں جانتی ہوں۔‘‘ کوئین نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔ اور ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ’’میں۔۔۔ میں نے سوچا کہ ایک آخری کوشش کرلوں۔۔۔ شاید۔۔۔ شاید کوئی غیر حاضر ہوجائے، آج۔۔۔ تو میرا چانس بن سکتا ہے۔‘‘

تینوں نے معصوم پرندوں کی طرح نظریں لڑائیں۔۔۔

’’اوہ، بے بی۔‘‘ روتھ نے کہا۔ ’’خوش آمدید، جب تک تمہارا دل کہے۔۔۔ تم انتظار کرلو۔ کافی پیو گی؟‘‘

’’گریٹ!‘‘ کوئین تشکر آمیز انداز میں مسکرائی۔ ’’کافی ٹھیک ہے۔‘‘

☆☆☆

ٹم ایک گھنٹا بعد طلوع ہوا۔ کوئین نے اس کا تعارف لڑکیوں، جیسا کہ وہ خود کو ظاہر کر رہی تھیں، سے کرایا۔

’’میں ذرا ٹانگیں سیدھی کر کے آتی ہوں۔۔۔ واپس آتی ہوں۔۔۔ شاید کوئی اچھی خبر مل جائے۔‘‘

’’تمہاری سہیلیاں تو بہت اچھی ہیں۔‘‘ ٹم نے تعریف کی۔

’’ہاں، ٹم! میں نے تمہیں بتایا تھا نہ روتھ کے بارے میں۔۔۔ مارجوری اور ایولن کے بارے میں؟‘‘

’’ہاں تم نے جتنا بتایا تھا۔‘‘ ٹم کی رگ پھڑکی۔ ’’میں نے اس سے زیادہ پایا۔‘‘ وہ تینوں کی جانب دیکھ کر مسکرایا۔

تینوں نے خوش دلی سے مسکرا کر جواب دیا۔ وہ دونوں باہر آگئے۔

’’ٹم! تم بہت۔۔۔ بہت۔۔۔ وہ۔۔۔ ہو۔‘‘ وہ ’’بدمعاش‘‘ کہتے کہتے رک گئی۔

’’نہیں، تم بول دو۔ بول دو، میں کیا ہوں؟‘‘

’’کچھ نہیں۔‘‘ کوئین نے تیزی سے کہا۔

’’سمجھا، مطلب تھنک۔‘‘

وہ دونوں شاہ بلوط کے درخت کے نیچے تالاب کے قریب ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

کوئین نے غور سے ٹم کو دیکھا۔ ’’تمہارے لیے اس

میں ایا ہے؟ تم مجھے جانتے نہیں۔ تمہیں کیا فرق پڑے گا اگر میرا داخلہ انگراہم میں نہیں ہوتا۔ تم کیوں کر رہے ہو؟‘‘

وہ ہچکچایا، جیسے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہا ہو۔ ’’انگراہم جیسے ادارے۔۔۔‘‘ اس نے آغاز کیا۔ ’’ایسے اداروں کا اپنا ایک نظام ہوتا ہے۔ کچھ سرپھرے جمع ہوتے ہیں اور کوئی نئی چیز شروع کرتے ہیں۔ اپنا نظام وضع کرتے ہیں یہ لوگ مخصوص نظام کے بارے میں حساس ہوتے ہیں۔‘‘ وہ ٹھہر گیا، پھر بولا۔ ’’جیسے انگراہم ہے، ان کا اپنا سسٹم ہے۔ وہی نظام، اصول وغیرہ۔ یہ لوگ صرف 50 طلبا کو داخل کریں گے۔۔۔ نہ کم نہ زیادہ، ان کو یقین ہے کہ پچاس انڈے ان کی باسکٹ میں آئیں گے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ ایک انڈا سبز رنگ کا ہے یا اودے رنگ کا ہے۔۔۔ وہ ان کی باسکٹ میں نہیں آئے گا۔ میرا مطلب ہے، میٹ کرافورڈ۔ جیسے یہ مختلف ہیں ویسے ہی میٹ چیز دگراست۔۔۔ اس کا اور اس کی فیملی کا معاملہ بھی مختلف ہے۔‘‘ ٹم پھر تھم گیا۔ ’’سمجھ رہی ہو؟‘‘

’’شاید۔۔۔‘‘

’’یہ لوگ اگر تم سے، مجھ سے چھلانگ لگانے کے لیے کہیں گے تو ہم لگائیں گے بلکہ پہلے پوچھیں گے کہ کتنی لمبی؟ تاہم میٹ کہہ سکتا ہے۔ میں چھلانگ کیوں لگاؤں۔ جاؤ میں نہیں لگاتا۔‘‘

’’لیکن دنیا جس طرح چل رہی ہے، تم اس کو نہیں بدل سکتے۔ ٹم۔‘‘

’’میں یہ نہیں کہہ رہا، انگراہم یا ایسے کسی نظام کے لیے میں ہر موقع تلاش کرتا ہوں۔۔۔ وہ موقع بھی جو بظاہر موجود نہیں ہے، میں اس نظام کو توڑ کے دکھاؤں گا۔‘‘

’’نہیں، بات وہیں آجاتی ہے کہ تم میرے لیے معمول سے کیوں ہٹو گے؟ تم، تجسس کے لیے مجھے الزام نہیں دے سکتے کیونکہ تم خود کہتے ہو۔۔۔ TANSTAAFL وہی بات، دنیا میں مفت کھانا خوامخواہ نہیں ملتا۔۔۔ یاد ہے؟‘‘

معاً ٹم نے اپنا سر اس کے بازو پر رکھ دیا۔ ’’او کے، میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ بہت پسند کرتا ہوں۔‘‘ اس نے تیزی سے کہا۔ لگ رہا تھا کہ گھاس سے باتیں کر رہا ہے۔

کوئین منجمد رہ گئی۔ اس کے رخساروں کا رنگ تیزی سے بدلا۔

’’اور میں کسی کو نہیں جانتا۔‘‘ اس نے بات جاری رکھی، اس کا سر کوئین کے بازو پر کہنی سے نیچے ٹکا تھا۔ وہ گھاس سے باتیں کر رہا تھا۔ ’’کسی کو نہیں جانتا جو اتنی شدت سے اپنے ہدف کو حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہو۔ میرا یقین کرو، ڈاکٹر بننے کی خواہش تمہارے وجود سے پھوٹتی ہے، کسی ان دیکھی روشنی کے مانند۔۔۔‘‘

’’واقعی؟ ٹم۔‘‘

’’ہاں، بالکل۔‘‘ کوئین نے اس کا سر ہٹانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بولتا رہا۔ ’’مجھے کوئی ایسا نظام دکھاؤ جہاں کے منتظمین نے کسی کی زندگی کو اس طرح خراب کیا ہو۔۔۔ مجھے ایسا ہی لگا جیسے کسی مشتعل بھینسے کے سامنے انہوں نے سرخ چادر لہرائی ہے۔ میں انہیں شکست دوں گا۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ ان کے پاس اس بات کے لیے کوئی متبادل منصوبہ نہیں ہوگا کہ میٹ ان کی باسکٹ میں نہیں آئے گا تو وہ کیا کریں گے؟ 49 طلبا انہیں قبول نہیں اور 50 طلبا چاہئیں۔۔۔ ان کے گمان میں نہ ہوگا کہ ایک انڈا باسکٹ سے اچانک اچھل جائے گا۔ رجسٹریشن تقریباً بند ہوچکے ہیں اور کسی بھی ساعت انہیں پتا چلنے والا ہے کہ ایک انڈا غائب ہے۔‘‘

’’ٹم اٹھ جاؤ۔‘‘ کوئین نے نرمی سے اس کے بالوں کو سہلایا۔

ٹم نے سر اٹھا کے اس کی نیلی آنکھوں میں جھانکا۔ کوئین مہر بہ لب اس کو تکتی رہی۔۔۔ غالباً آنکھوں آنکھوں میں کچھ بات ہوئی اور دونوں کھڑے ہوگئے۔

وہ ایڈمیشن آفس کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی کوئین نے محسوس کیا کہ ماحول میں کچھ تبدیلی در آئی ہے۔۔۔ کوئی غیر معمولی تبدیلی۔

روتھ کی آنکھیں کوئین کو دیکھ کر پھیل گئیں۔

’’کوئین! ابھی ابھی رجسٹریشن آفس سے اطلاع آئی ہے۔‘‘ روتھ سنسنی محسوس کر رہی تھی۔ فضا میں کرنٹ سا تھا۔۔۔ ’’ایک شخص کم ہے، وہ نہیں آرہا۔ میرے لیے بالکل ناقابلِ یقین۔‘‘

کوئین نے ٹم کی کہنی پسلیوں میں محسوس کی۔ وہ انجان بنی رہی۔ ’’شاید یہ میرا موقع ہے، میری قسمت ہے۔‘‘ اس نے روتھ سے کہا۔ ’’کیا نام ہے، اس کا؟‘‘

’’کرافورڈ، میتھیو کرافورڈ۔‘‘

’’کیا تم اسے فون کرو گی؟ ہوسکتا ہے کوئی معمولی مسئلہ ہو۔۔۔ شاید وہ بیمار ہو یا شاید راستے میں اس کی گاڑی خراب ہوگئی ہو؟‘‘

’’وجہ کچھ بھی ہو، پہلے مجھے ڈاکٹر ایلسٹن سے بات

کرنی ہوگی۔''

کوئین پیچھے ہٹ گئی اور انگلیوں میں انگلیاں پھنسا کر انتظار کرنے لگی۔ روتھ نے فون پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر کوئین کی جانب دیکھا۔ ''ہنی! شاید آج کا دن تمہارے لیے خوش قسمتی کا پیغام لے کر آنے والا ہے۔ تم بہت خوش قسمت ہو۔''

وہ فون پر بات کرنے لگی۔ ذرا دیر بعد اس نے فون رکھ دیا۔ ''وہ نہیں آ رہا۔'' مارجوری اور ایولن نے بھی اظہارِ مسرت کیا۔ کوئین نے ٹم کا بازو تھام لیا۔ اس کی گرفت بازو پر سخت تھی۔ یکلخت اسے احساس ہوا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اس نے بازو چھوڑ دیا۔

''کوئی بات نہیں۔'' ٹم نے کہا۔ ''میں باقاعدگی سے ہاتھ دھوتا ہوں۔''

روتھ نے کاؤنٹر پر جھک کے کوئین کو اشارہ کیا۔ کوئین قریب ہوگئی۔ روتھ نے آہستہ سے کہا۔ وہ لڑکا ''ییل اسکول آف میڈیسن'' میں داخلہ لے رہا ہے، میری، اس کی ماں سے بات ہوئی ہے۔ اس کے مطابق انہوں نے گزشتہ ماہ ہی ہمیں خط ارسال کر دیا تھا۔ اس کی ماں کو یقین نہیں آیا کہ ہمیں کوئی خط نہیں ملا۔'' وہ واپس ڈیسک کی جانب گئی۔ اس نے کوئی نمبر ملایا۔ ''ڈاکٹر ایلسٹن، میں روتھ بات... جی، ہم نے فون کیا تھا... جی ہاں۔ وہ... بظاہر وہ ییل Yale میں ہے... جی سر، میں کر سکتی ہوں لیکن میں آپ کے علم میں لانا چاہتی ہوں کہ منتظر افراد کی فہرست میں سے ایک امیدوار یہاں موجود ہے۔ جی... جی بہت اچھا۔ اس کا نام... میں دیکھ کر بتاتی ہوں۔'' اس نے کوئین کو آنکھ ماری۔ کاغذات الٹنے پلٹنے کے بعد وہ پھر فون کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''یہ رہا... کلیری سر، کوئین کلیری... اوکے سر! ٹھیک ہے... جی میں سمجھ گئی... میں ابھی کرتی ہوں۔'' اس نے فون رکھ دیا اور کوئین کی جانب آئی۔

''ہنی! تم نے ڈاکٹر ایلسٹن کے اوسان خطا کر دیے ہیں۔ میں نے جیسے ہی تمہارا نام بتایا تو وہ گنگ رہ گیا۔ جو اسے جانتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ ڈاکٹر ایلسٹن شپٹانے والا شخص نہیں ہے۔ وہ تمہاری درخواست نکال کر کمیٹی سے بات کرنے گیا ہے۔''

کوئین کے سر کا بوجھ سرکنے لگا۔ ''تو میرا چانس بنتا ہے؟''

''یقیناً۔'' روتھ نے کہا، اس کی آواز دھیمی ہوگئی۔ ''مجھے ہدایت کی گئی ہے یہ میرے تمہارے درمیان ہے کہ اس دوران میں، منتظر افراد کی فہرست میں موجود دوسرے امیدواروں کو فون کروں ...'' اس کی دھیمی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔ ''میں جانتی ہوں کہ وہ دوسرے اسکولوں اور کالجوں میں چلے گئے ہوں گے... اگر کوئی بچا بھی ہوگا تو وہ گھر پر نہیں ہے... تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو نا؟''

کوئین تشکر آمیز انداز میں مسکرا دی۔

☆☆☆

''مجھے کچھ جلنے کی بُو آ رہی ہے۔''

ڈاکٹر کلیرین ایمرسن حیران رہ گیا۔ اسے ایلسٹن کا ناخوشگوار لہجہ، اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

''میں، جانوروں پر تجربات کرتا ہوں۔'' کلیرین بولا۔ ''بو مجھے آنی چاہیے اور مجھے ایسا کچھ محسوس نہیں ہو رہا۔''

''اچھا، ایلسٹن نے ناک سکیڑی۔ ''یہ ایک سنجیدہ معاملہ ہے۔''

کلیرین نے اطراف میں نظر دوڑائی۔ انگراہم کی داخلہ کمیٹی کے چھ ارکان، لکڑی کی چمکتی ہوئی شان دار گول میز کے گرد بیٹھے تھے۔ یہ کانفرنس روم تھا۔ سینیٹر وھٹنی کے پاس ویٹو پاور تھی۔ پہلے سال کے منتخب شدہ طالب علموں کے لیے اس کو تقریر کرنی تھی۔ بذریعہ ہوائی سفر اس کی آمد بھی متوقع تھی۔

''میں اس معاملے کو سرسری نہیں لے رہا ہوں۔'' کلیرین نے کہا۔ ''تاہم مجھے کسی قسم کی سازش کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔'' ایلسٹن نے پنسل سے میز کی سطح بجائی۔ ''دونوں طلبا کا تعلق کنکٹی کٹ سے ہے... اور یہ چیز میرے حلق سے نہیں اتر رہی کہ یہ محض ایک اتفاق ہے۔''

کلیرین بھی سمجھتا تھا تاہم وہ ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ جب سے اس کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ انگراہم کے دروازے پر کوئی اور نہیں بلکہ کوئین کلیری ہے۔ تب سے وہ ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اسے وہ لڑکی بخوبی یاد تھی جس کا اس نے انٹرویو لیا تھا اور بہت زیادہ نمبروں سے لڑکی کو پاس کیا تھا۔ کلیرین کو افسردگی کا احساس ہوا تھا جب اس نے کوئین کا نام 'ویٹنگ لسٹ' میں دیکھا تھا۔

''وہ مختلف اداروں میں جا رہے ہیں، یہ کوئی کھلا ثبوت نہیں ہے۔'' کلیرین نے کہا۔

باقی اراکین غیر متعلق سے نظر آ رہے تھے۔ ایلسٹن کے سوا کوئی بھی کوئین سے نہیں ملا تھا۔

''میری بات پر توجہ دیں۔'' ایلسٹن کھڑا ہو گیا۔ وہ دھیرے دھیرے میز کے گرد ٹہل رہا تھا۔ ''گزشتہ سال دسمبر میں انگراہم نے جتنے طلبا کو پرکھا اور منتخب کیا پھر دو فہرستیں مرتب کی گئیں ایک منظور شدہ، دوسری ویٹنگ لسٹ۔ کل 100 طلبا... 50 منتخب اور 50 منتظر۔ باقی سب باہر۔ دوسری فہرست کے 50 طلبا میں سے صرف مس کوئین۔ رجسٹریشن والے روز آتی ہیں... اس امید میں کہ شاید داخلہ مل جائے۔ منتظر افراد میں یہ واحد کوشش یا پیش قدمی ہے... جو اس کے عزم اور شدید خواہش کو ظاہر کرتی ہے۔ نیز جو منتخب امیدوار نہیں آیا، وہ ییل اسکول آف میڈیسن جا چکا ہے۔''

ایلسٹن واپس اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

''لیکن .....'' کلیرین نے بولنا چاہا۔

تاہم ایلسٹن نے قطع کلامی کی۔ ''دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ امیدوار ایک لڑکی ہے۔'' ایلسٹن نے دباؤ بڑھایا۔ وہ دیگر اراکین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں تجسس نظر آ رہا تھا۔ ''انگراہم کو [illegible] کا سامنا ہے کہ وہ لڑکیوں کو زیادہ تر باہر کر دیتے ہیں۔ اب ہمارے پاس موقع ہے کہ ہم مس کوئین کو قبول کر لیں۔ جو پہلے ہی بہت زیادہ صلاحیتوں کی مالک ہے اور وہ ثابت بھی کر چکی ہے۔''

''لیکن کلیڈرمین ایکویشن کے سوالات۔'' ایلسٹن کی آواز کمزور پڑ گئی تھی۔ ''اس نے ایک سوال چھوڑا ہے۔''

''یقیناً اس نے تین میں سے دو کے جوابات دیے ہیں تاہم دونوں جوابات صحیح ہیں۔ اگر وہ تیسرے کا جواب بھی دے دیتی تو 'پہلی فہرست' میں ہمارا پہلا انتخاب ہوتی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' کلیرین نے سوال کیا۔

''ٹھیک ہے۔'' ایلسٹن نے تردد کیا۔ ''لیکن ....''

''لیکن، ویکن... کچھ نہیں۔'' کلیرین نے سب کی جانب دیکھا۔

''ہم اسے منظور کرتے ہیں... کیا ہم یہ ظاہر کر سکتے ہیں کہ عزم، جوش، پیش قدمی، صلاحیت اور ناقابلِ شکست جیسی اشیا کی انگراہم میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ ایسے طلبا جب ڈاکٹر بنتے ہیں تو اپنے مریض کو بچانے کے لیے آخری حد تک جاتے ہیں یا نہیں؟''

ایک کمیٹی ممبر نے کہا۔ ''میرا ووٹ اس کے حق میں ہے۔'' پھر یکے بعد دیگرے سب نے منظوری دے دی۔

''یہ معاملہ اب ختم ہے۔'' کلیرین نے کہا۔

آرتھر ایلسٹن نے کھنکھار کے گلا صاف کیا۔ ''جی ہاں اب سینیٹر کی آمد کا وقت قریب ہے۔ میں ان کو کوئین کا ریکارڈ اور آپ لوگوں کی آرا ان کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔''

''گڈ، صرف ایک چھوٹی سی رکاوٹ رہ گئی ہے۔'' کلیرین نے سوچا۔

☆☆☆

انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ گھنٹا پر گھنٹا گزر رہا تھا۔ حتیٰ کہ ایڈمیشن آفس کی تینوں ''لڑکیوں'' کے جانے کا وقت آن پہنچا لیکن وہ تینوں رک گئی تھیں اور کوئین کی حوصلہ افزائی میں مشغول تھیں۔

سنسان مرکزی کوریڈور میں کوئی شخص دکھائی دیا۔ جو ایڈمنسٹریشن بلڈنگ کی جانب سے آ رہا تھا۔ کوئین کو سانس لینا مشکل ہو گیا، دروازہ کھلا۔ ایک سفید سر والے شخص نے اندر جھانکا۔

''مس کلیری؟''

''جی؟'' کوئین کھڑی ہو گئی۔ وہ بدن کی لرزش کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

وہ شخص مسکرایا۔ ''کیا تمہیں یاد ہے؟''

''جی جناب... ڈاکٹر کلیرین، آپ نے میرا انٹرویو کیا تھا۔''

''درست، اور تمہیں بہت بلند نمبروں کے ساتھ پاس کیا تھا۔''

''شکریہ، جناب۔''

''کمیٹی نے تمہارے حق میں فیصلہ دیا ہے۔'' ڈاکٹر نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''انگراہم میں تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔''

''یس۔'' روتھ کی چیخ نکل گئی۔ تینوں اظہارِ مسرت میں بے قابو ہو رہی تھیں اور کوئین بے جان گھٹنوں کے ساتھ ڈاکٹر سے ہاتھ ملانے کے لیے بڑھ رہی تھی۔

''لگتا ہے سب لوگ یہاں جشن منانے کے لیے جمع ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''لوگ بہت جلد گرم جوش ہو جاتے ہیں تمہارے لیے۔ یہ کسی ڈاکٹر کے لیے تاجے کی طرح ہے۔ اس کو کھونا مت۔'' کلیرین کی آنکھوں میں چمک تھی۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

کوئین سکتے کے عالم میں کھڑی رہ گئی۔ اس نے اپنے خواب کی تعبیر پالی تھی۔

''میں آ گئی ہوں۔ میں ڈاکٹر بنوں گی۔'' کوئین نے ٹم کو دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے... ادھر ٹم انگوٹھا اونچا کر کے مسکرا رہا تھا۔

میٹ اور ٹم۔ کتنے اچھے دوست ملے ہیں اسے۔

کوئین نے سوچا۔ ان دونوں نے اس کی زندگی بچائی ہے۔ وہ کیسے یہ بھاری قرض اتارے گی۔نہیں۔۔۔وہ یہ قرض نہیں اتار سکتی۔

اس نے ایڈمیشن آفس کی کارکنان کا شکریہ ادا کیا۔ پھر اس نے اچانک ٹم کی پیشانی کو چوم لیا۔''شکریہ۔'' وہ بمشکل بول پائی۔

''کوئی۔۔۔کوئی بات نہیں۔'' ٹم شرمندہ شرمندہ سا لگا۔ وہ بھونچکارہ گیا تھا۔

☆☆☆

لوئیس ویرن، تہ خانے میں موجود تھا۔ ہر چیز ٹھیک کام کررہی تھی۔ اس نے مطمئن ہو کر تازہ سگار نکالا اور اسی وقت ڈاکٹر ایلسٹن، سینیٹر وھٹنی کے ہمراہ وہاں پہنچا۔ ویرن نے بعجلت سگار چھپایا۔

''ایک تبدیلی آئی ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ہمارے ٹارگٹ کے مطابق 50 طالب علم پورے ہیں۔ کمرا نمبر 252 بھی پر ہوگیا ہے۔ یہ ایک طالبہ ہے جس کا نام کوئین کلیری ہے۔

ویرن نے سر ہلایا۔ ''کوئی مسئلہ نہیں، ہر چیز تیار ہے۔''

''گڈ۔'' سینیٹر وھٹنی نے کنپٹی کے سفید بالوں کو سہلایا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم اس لڑکی پر کچھ عرصہ گہری نظر رکھو۔ اس کا داخلہ ذرا معمول سے ہٹ کر ہے۔۔۔ ہمیں کچھ روز احتیاط کرنی ہوگی۔''

''سمجھ گیا۔''

وہ دونوں رخصت ہوگئے۔ ویرن نے کمپیوٹر پر کوئین کو ٹریک کیا، وہ ایڈمنسٹریشن میں پے فون پر تھی۔ ویرن کمپلیکس کا ہر فون ٹیپ کرسکتا تھا۔ اس نے جلد ہی کوئین کی فون کالز کا ریکارڈ نکال لیا۔ اس کے علم میں یہ بات آگئی کہ ایک کال میٹ کرافورڈ کو کی گئی ہے۔ اس نے مزید جانچ پڑتال کی اور بہ آسانی یہ معلوم کرلیا کہ میٹ ہی وہ امیدوار تھا جو رجسٹریشن والے دن نہیں آیا تھا۔

کیا اسے یہ بات ڈاکٹر ایلسٹن کے علم میں لانی چاہیے؟ اس نے مذکورہ کال میں کوئی خطرے والی بات محسوس نہیں کی۔ ''مجھے امید ہے کہ تم اچھے بچوں کی طرح چار سال گزار لوگی۔'' ویرن خود سے ہمکلام تھا۔ اس نے ہیڈ فون ہٹا دیا ورنہ۔۔۔؟

☆☆☆

کوئین کی شمولیت کے بعد انگرا ہم میں طالبات کی تعداد 17 ہوگئی۔ سترہ لڑکیوں کو جو کمرے دیے گئے وہ پہلی منزل پر جنوب کی سمت کونے میں باہم منسلک تھے۔ یہ حصہ ''وومین کنٹری'' کے نام سے معروف تھا۔ ہر کمرے میں دو لڑکیاں تھیں جبکہ کمرا نمبر 252 میں کوئین اکیلی تھی۔

پہلے دن کوئین نے متعدد لیکچرز اٹینڈ کیے۔ تاہم اینا ٹومی لیب میں جاتے ہوئے اسے ہچکچاہٹ محسوس ہوئی۔ یہ ایک مختلف معاملہ تھا۔ زندوں کے بجائے اسے مردوں کا سامنا کرنا تھا۔ ٹم نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے ٹم کا بازو پکڑ کر گہری سانس لی اور ڈبل ڈور کو دھکا دیا۔ لیب میں عجیب سی بو تھی، ٹھنڈک بھی زیادہ تھی۔

''میں نے فہرست دیکھی تھی، ہماری ٹیبل نمبر 4 ہے۔'' ٹم نے کہا۔

''ہماری ٹیبل؟''

''میرا قصور نہیں ہے۔ ''براؤن'' کا ''بی''، کلیری کے ''سی'' سے پہلے آتا ہے۔ ایسا ہی کوئی طریقہ انہوں نے وضع کیا ہے۔'' وہ بولا۔ ''چلو اب ''مسٹر کیڈور'' سے ملتے ہیں۔''

وہاں مردوں کی تعداد 25 تھی۔ ان کی میز بائیں جانب کونے میں تھی۔ دونوں وہاں آگئے۔ بک اسٹور سے ضروری لوازمات، بمع ڈائی سیکشن کٹ کے انہیں مل گئے تھے۔ نمبر 4 پر چادر کے نیچے کون تھا۔ دونوں نے کچھ توقف کیا اور اردگرد دوسرے طلبا کو دیکھا۔ پھر ٹم نے چادر کا کونا اٹھایا۔

''او۔۔۔اوپس۔۔۔سوری مسز کیڈور۔'' اس نے چادر چھوڑ دی۔

''ٹم!'' کوئین نے اس کی پسلیوں میں کہنی مار کر تنبیہ کی۔ ٹم نے پھر چادر ہٹائی۔ یہ کسی خاتون کی نعش تھی۔

''وہ، میں واقعی خوف زدہ ہوگیا تھا۔'' اس نے چشمہ پیشانی پر چڑھایا۔

سر کے اوپر اسپیکر سے آنے والی آواز نے کوئین کو چونکا دیا۔ متعدد جگہوں پر چھت میں اسپیکرز نصب تھے۔ ایک جانب چبوترے پر ڈاکٹر تائی فس کوگان، مائیکروفون تھامے کھڑا تھا۔

''خواتین و حضرات! ہم پہلا ڈائی سیکشن کرنے والے ہیں۔'' ڈاکٹر نے بولنا شروع کیا۔ ''لیکن اس سے قبل ہر ایک دھیان سے میری بات سنے۔ اگلے نو ماہ تک آپ لوگ لاشوں کی تراش خراش کریں گے۔ اپنی اپنی میز کا خیال رکھیں۔ مت بھولیں کہ آپ انسانی لاشوں کی کانٹ چھانٹ کررہے ہیں۔ یہ ایک نادر موقع ہے آپ کے لیے۔ تمام لاشیں گمنام ہیں۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی کوئی شناخت نہیں ہے۔ یہ بھی ہماری طرح زندہ تھے، ان کی بھی فیملی اور دوست تھے۔ یہ سب احترام کے مستحق ہیں۔ اب آپ لوگ آغاز کیجیے۔''

''تیار ہو، پارٹنر؟'' ٹم نے بھویں اچکائیں۔

''یقیناً۔'' کوئین نے دل مضبوط کیا اور سوچا۔۔۔ابھی یا کبھی نہیں۔ دونوں نے چادر کے چاروں کونے پکڑ کر چادر میز کے نیچے مخصوص جگہ پر رکھ دی۔ یہ ایک عمر رسیدہ اور لاغر خاتون کی لاش تھی جو میز پر منہ کے بل رکھی تھی۔ کوئین نے چاہا کہ اسے دوبارہ چادر کے نیچے چھپا دے۔ تاہم وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے دل کڑا کیا۔ نعش کی بائیں ٹانگ کے انگوٹھے سے ایک ٹیگ منسلک تھا۔ کوئین نے ٹیگ پلٹ کر پڑھا۔ اس پر متوفیہ کا نام ڈورتھی ہیورز اور تدفین کے ادارے کا نام فریڈرک سن درج تھا جو لوسن نامی قصبے میں واقع تھی۔

ڈورتھی ہیورز، نعش کو گمنام ہونا چاہیے۔ کوئین نے ڈائی سیکشن کٹ نکالی۔ قینچی سے ٹیگ کی ڈوری کاٹ کر ٹیگ، لیب کوٹ کی جیب میں منتقل کیا۔

''کیا کررہی ہو؟'' ٹم نے سوال کیا۔ اس کو جواب نہیں ملا کیونکہ ڈاکٹر کلیرسن وہاں آگیا تھا۔

''گڈ آفٹرنون۔'' ڈاکٹر کی آواز آئی۔ کوئین پلٹی اس نے ڈاکٹر کو پہچان لیا۔ ''خوشی ہوئی آپ کو یہاں دیکھ کر۔'' وہ بولی۔ کوئین کی آنکھوں میں پسندیدگی کا رنگ تھا، وہ ڈاکٹر کی ممنون تھی۔ انگرا ہم میں داخلے کے لیے ڈاکٹر نے کوئین کے لیے بہرحال ایک کردار ادا کیا تھا۔ اہم کردار۔

''کیسا لگ رہا ہے؟'' ڈاکٹر نے استفسار کیا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتی۔'' کوئین بوکھلا گئی۔ ''یہ پیٹ کے بل کیوں رکھی گئی ہے؟'' کوئین نے گھبراہٹ چھپانے کے لیے سوال کیا۔

''کیونکہ آپ کو گردن کے عقبی مرکزی اعصاب کو دیکھنا ہے۔'' ڈاکٹر نے ٹم کی جانب دیکھا۔ ''ڈاکٹر کوگان، ابھی بتائیں گے۔''

''اوکے۔'' کوئین نے کہا اور چادر نکال کر واپس نعش کی کمر تک پھیلا دی۔

☆☆☆

ٹم نے اسٹوڈنٹ پارکنگ میں گاڑی لگائی اور اپنا سر اسٹیئرنگ پر رکھ دیا۔ وہ بالٹی مور سے 40 منٹ میں کالج پہنچا

تھا۔ پھر وہ سیدھا ہوا، گھڑی دیکھی، دو منٹ رہ گئے تھے۔ ڈاکٹر ایلسٹن کا لیکچر شروع ہونے میں۔ "انکل پُراسرار۔" وہ گاڑی سے کودا، سیکیورٹی کیمروں پر اچٹتی نگاہ ڈالی اور پھرتی سے کلاس کی جانب رواں ہوگیا۔

دن ہفتوں میں بدل گئے تھے۔ اس نے خود کو کلاس اور لیب شیڈول سے ہم آہنگ کرلیا تھا۔ ایک چیز پریشان کن تھی کہ وہ بوریت محسوس کرنے لگا تھا جس کا حل اس نے یہی تلاش کیا کہ کیمپس سے نکلا جائے۔ کوئین کی آواز نے اس کی تیز قدمی کو تھام لیا۔

"عجیب لگ رہے ہو تم کہاں غائب تھے؟"

"بالٹی مور۔"

"خیریت؟"

"تاش کھیلتا رہا۔"

"چلتے رہو، ہمیں دیر ہوگئی ہے۔" کوئین نے کہا۔

ٹم نے ڈاکٹر ایلسٹن کا لیکچر کبھی نہیں چھوڑا تھا۔ اسے دلچسپ لگا تھا... مزہ آتا تھا۔ سوائے اس کے کہ ڈاکٹر کی شخصیت اسے وقتاً فوقتاً پُراسرار اور متنازع محسوس ہوتی۔ ڈاکٹر کا موضوع بھی عجیب تھا۔ "طبی اخلاقیات۔" چند ہفتوں قبل ڈاکٹر کا پہلا لیکچر اس کے تصور میں ابھرا۔

"یہ کورس میڈیکل اسکولز میں نہیں پڑھایا جاتا۔" ڈاکٹر نے کہا پھر اس نے ڈائس سے اتر کر ایک طالب علم کی طرف اشارہ کیا۔ "مسٹر کوہل، ذرا سوچو کہ تم ایک گردہ عطیہ کرنا چاہتے ہو اور تمہارے سامنے چار امیدوار ہیں۔ پہلی نو سالہ بچی، 35 سالہ لوہار جس کے ذمے ایک فیملی بھی ہے، تیسرا امیدوار 47 سالہ ایک بے خانماں عورت اور چوتھا امیدوار 62 سالہ دولت مند چیف ایگزیکٹو ہے۔ تم کس کو گردہ عطیہ کرو گے؟"

کوہل نے بمشکل جواب دیا۔ "بچی کو۔" پھر خود وضاحت کی۔ "کیونکہ اس کے پاس پیسا نہیں ہے۔"

"پیسے کا مسئلہ نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے دوسرے طالب علم کی جانب رخ کیا۔ "مسٹر گریلی؟"

ٹم متاثر ہوا کہ پہلے ہی لیکچر میں ڈاکٹر کو ہر طالب علم کا نام یاد تھا... گریلی نے بھی جواب میں "بچی" کہا تو ڈاکٹر تھم گیا۔

"واقعی؟ مگر کیوں؟"

"کیونکہ بچی کے سامنے ابھی ساری زندگی پڑی ہے۔"

"زندگی پڑی ہے مگر تم نہیں جانتے کہ وہ زندگی کیسے گزارے گی؟" ڈاکٹر نے رد کردیا۔ "مس کلیری؟" وہ کوئین کی جانب آیا۔

"لوہار۔" کوئین نے جواب دیا۔ "وہ اپنی فیملی کا سہارا ہے نیز اس کے سامنے خاصے پیداواری سال موجود ہیں۔"

"چیف ایگزیکٹو کے بارے میں کیا کہو گی؟ وہ بھی خاصا پروڈکٹو ہے؟"

کوئین ذرا ٹھہر کر بولی۔ "سی او شاید 15-10 برس اور گزارے لیکن لوہار شاید 40 سال مزید کام کرے۔"

"شاید، لیکن، اگر مگر... کچھ نہیں۔ سی او کے نیچے ہزاروں کارکن کام کرتے ہیں۔ اس کے بغیر کارپوریشن بیٹھ سکتی ہے۔"

"کیا ڈاکٹرز خدا کی جگہ لے سکتے ہیں؟" یہ ٹم کی آواز تھی۔

"خوب، مسٹر براؤن۔" ایلسٹن ٹم کی طرف متوجہ ہوا۔ "ہم خدا کا کردار ادا نہیں کر رہے نہ کر سکتے ہیں... لامحدود امکانات تک انسان کی رسائی ممکن نہیں۔ معاملہ یوں نہیں ہے... تاہم ہم ممکنہ حد تک ایک آئیڈیل پوزیشن تک پہنچنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اعضا عطیہ کرنے والے ایک محدود تعداد میں ہیں۔ جو بمشکل ضرورت مندوں کے دسویں حصے کے برابر ہے۔ باقی نو حصے کیا کریں گے؟" ڈاکٹر نے کلاس کا جائزہ لیا پھر بولا۔ "آئیڈیل صورتِ حال میں اتنے "ڈونرز" ہونے چاہئیں جو تمام ضرورت مندوں کا مسئلہ حل کر سکیں۔ تاہم عملی طور پر ایسا ممکن نہیں۔ اور نہ کبھی ممکن ہوگا۔ بلکہ وقت کے ساتھ یہ خلا بڑھتا جائے گا مثلاً آج 100 مریضوں کو جگر کی پیوندکاری کی ضرورت ہے اور عطیہ کرنے والے صرف 15 کی ضرورت پوری کر سکتے ہیں... پھر کیا کرنا چاہیے؟"

کلاس میں بھنبھناہٹ ہونے لگی۔

"کیا ہمیں راشن بندی کرنی پڑے گی؟" ٹم نے کہا۔

"کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہوگی۔ ہمیں مریضوں کو منتخب کرنا پڑے گا۔ ذرا سوچو اس وقت 30 ملین افراد 65 سال سے زائد عمر کے ہیں جن کو جدید طبی سہولیات کی ضرورت ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 2030 تک نوزائدہ بچوں کی تعداد 65 ملین ہوگی۔ یہ "بے بی بوم" ایسا ہی ہوگا جیسے دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوا تھا۔ یہ تعداد 65 ملین سے تجاوز بھی کر سکتی ہے۔ ان تمام کے لیے طبی سہولیات

کہاں سے آئیں گی۔ کون پوری کرے گا۔ قومی قرضے پہلے ہی 17 ٹریلین ڈالر سے تجاوز کر چکے ہیں۔"

"لب لباب یہ ہے کہ معاشرتی قدر کی اہمیت ہے۔ ہمیں راشن بندی کرنی پڑے گی اور بہتر امیدوار ہی جدید طبی سہولیات سے مستفید ہو سکے گا۔"

"کوئی بھی مکمل طور پر ناکارہ نہیں ہے۔" ایک نسوانی آواز بلند ہوئی۔ ٹم نے پہچان لیا کہ یہ کوئین تھی۔

"مس کوئین تم ٹھیک کہتی ہو لیکن ہم جس منظرنامے کی تصویر کشی کر رہے ہیں اور جو کچھ مستقبل میں ہوتا نظر آرہا ہے... تم ڈاکٹر بننے کے بعد خود کو امکانات کا جائزہ لینے پر مجبور پاؤ گی... یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ فیملی پلاننگ۔ آخر ہم کیوں بہت ساری زندگیوں کو دنیا میں آنے سے روک دیتے ہیں؟"

☆☆☆

اس تعارفی لیکچر کے بعد ٹم نے کبھی ایلسٹن کا لیکچر مس نہیں کیا۔ بعدازاں طلبا کے مابین پُرجوش تبادلۂ خیال ہوا لیکن ہر مرتبہ بحث و مباحثہ کا اختتام ڈاکٹر ایلسٹن کی لائن کے مطابق ہوتا۔ صرف کوئین تھی جو اختلافی نظریات رکھتے ہوئے بحث میں شرکت کرتی۔ ٹم کو اس بات پر حیرت تھی اور اس سے زیادہ تشویش اس بات پر تھی کہ وقتاً فوقتاً اس کا ذہن بھی اختلافی سوالات اٹھاتا لیکن ایلسٹن بہ آسانی اس کو اپنی ڈگر پر لے آتا۔ حالانکہ وہ اتنی آسانی سے قائل ہونے والا نہیں تھا۔ تاہم کوئی ان دیکھی طاقت اسے ایلسٹن کا ہم خیال بنادیتی۔

وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کوئین ہی وہ طالب علم تھی جو کلیڈرمین ایکویشن سے متعلق تینوں سوالات کے جوابات سے آگاہ نہیں تھی اور وہی ایلسٹن کی ہم خیال نہیں تھی۔ ٹم نے یہ بات بھلائی نہیں تھی کہ وہ خود بھی ان سوالات کا جواب نہیں جانتا تھا لیکن جوابات اچانک ہی اس کے سطحِ شعور پر بلبلوں کی طرح نمودار ہوگئے تھے۔ ٹم کو کوئین کا تبصرہ یاد آتا کہ وہ امتحان کی رات کیمپس میں کیسی مدہوشی کے عالم میں سوئے تھے، اس وقت ٹم نے اس امر کو اہمیت نہیں دی تھی نہ ہی کوئین نے کوئی اظہارِ تشویش کیا تھا۔

ٹم کڑی سے کڑی ملانے کی کوشش کرتا... تنہائی میں غور کرتا۔ جو نتائج اس نے اخذ کیے تھے، ان کے مطابق منتخب امیدواروں میں سے کسی کو بھی کلیڈرمین ایکویشن کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا پھر بھی سب نے (سوائے کوئین کے) تینوں جوابات ٹھیک دیے تھے۔ آخر کیونکر؟

آتش ربا

دوم۔ منتخب طلبا کے انتخاب کا ان جوابات سے گہرا تعلق تھا۔ ٹم کو یقین تھا کہ جو طلبا منتخب نہیں ہوئے، وہ صرف ان تین سوالات کے جواب نہ دینے کی بنا پر مسترد کیے گئے ہیں۔

سوم۔ ٹیسٹ سے ایک رات قبل تمام امیدواروں کے کھانے میں کوئی خواب آور دوا ملائی گئی تھی اور گہری نیند کے دوران کلیڈرمین ریکویشن کے جوابات ان کے اذہان میں جذب کیے گئے لیکن کس طرح؟ ہپناٹزم کی کوئی خفیہ قسم یا کچھ اور؟ کیوں تمام اذہان نے یکساں طور پر ان جوابات کو قبول نہیں کیا؟

چہارم۔ وہ کیوں بعض اوقات ڈاکٹر ایلسٹن سے اختلاف کرتے کرتے دوسروں کی طرح ڈاکٹر کا ہم خیال ہو جاتا ہے۔ کیا ان سب کی برین واشنگ کی گئی ہے؟ لیکن کب اور کیسے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ کیا یہاں "مخصوص" قسم کے ڈاکٹر تیار کیے جاتے ہیں؟

پنجم۔ سب کچھ مفت کیوں ہے؟ اور کلیڈرمین فاؤنڈیشن کی فنڈنگ کا کیا مقصد ہے؟ سینیٹر کا کلیڈرمین سے کیا تعلق ہے؟ یہاں اتنی سیکیورٹی کیوں ہے؟

وہ جتنا سوچتا، اتنا ہی الجھتا جاتا۔ کوئی پُراسرار گتھی تھی جس کی گرہ کھولنے میں وہ اب تک ناکام تھا۔

تاہم اس بات پر اس کا یقین پختہ ہو چلا تھا کہ کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔

☆☆☆

"نائٹ میوزک کا وقت ہوگیا ہے۔" ایلسٹن نے کہا۔ وہ ویرن کے شانوں پر جھکا ہوا کمپیوٹرز اور دیگر آلات کا جائزہ لے رہا تھا۔ ویرن نے بمشکل اپنی ناگواری کو پوشیدہ رکھا۔

"یو آر دی باس۔" ویرن نے کہا۔ تاہم اس نے دل سے نہیں کہا تھا۔

"اوہ، روم نمبر 107 میں کیا ہو رہا ہے؟" ایلسٹن نے اشارہ کیا۔

ویرن نے جائزہ لیا اور دیکھا کہ نمبر 107 میں میٹرس B کے سینسرز کی بتی سرخ تھی اور اشارہ کر رہی تھی کہ بستر پر وزن معمول سے زیادہ ہے۔ ویرن نے آڈیو اسپیکرز آن کیے اور مخصوص بے معنی اور جذباتی آوازیں سن کر دوبارہ بند کردیے۔ کسی نے تبصرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ایلسٹن کا چہرہ بے تاثر تھا۔

ویرن نے سگار کا گہرا کش لیا۔ ڈاکٹر ایلسٹن پیچھے

ہٹ گیا۔ ”تم نہیں مانو گے، ویرن؟“

”اگر تمہیں دھواں برداشت نہیں ہے تو مشینوں سے دور رہا کرو۔“ ویرن بڑبڑایا اور ایلسٹن کی جانب نگاہ اٹھائی۔ معاً اس نے ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر محسوس کی۔ ڈاکٹر ایلسٹن کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات میں خوفناک غضب ابھرا ہوا تھا۔ آنکھیں بھی شعلہ فشاں تھیں پھر یہ رنگ فوراً ہی غائب ہو گیا۔ بے تاثر تاریکی کے عقب میں روپوش ہو گیا۔ تاہم ویرن متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

ویرن نے اپنے ساتھیوں کرٹ اور ایلیٹ کی طرف دیکھا۔ دونوں خاموش تھے۔ اس کے دونوں اسسٹنٹ ظاہر کر رہے تھے کہ انہوں نے کچھ دیکھا ہے نہ سنا ہے۔ وہ دونوں سی آئی اے کے سابق ملازم تھے۔

ایلسٹن کے ساتھ ویرن مشکل محسوس کرتا تھا۔ آج پہلی بار اس نے ڈاکٹر کے اندر چھپے درندے کی جھلک دیکھ لی تھی۔ یہ جھلک چند لمحوں کی تھی جیسے بادلوں میں بجلی کڑک کر غائب ہو جاتی ہے۔ ویرن کو اطمینان ہوا کہ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اور ڈاکٹر دونوں فاؤنڈیشن کو جواب دہ تھے۔ اور فاؤنڈیشن مسٹر کلیڈ رمین کو۔

”ویرن!“ ڈاکٹر نے معمول کی آواز میں کہا۔ ”میں یہاں غیر ضروری طور پر نہیں آتا۔“

ویرن نے سگار ایش ٹرے میں مسل کر امن کا اشارہ دیا۔ ”مجھے آپ سے کوئی اختلاف نہیں ہے، ڈاکٹر... نازک آلات سے کھیلتے وقت ہم نروس محسوس کرتے ہیں۔ یہ بس ایک طریقہ ہے میرا کام کے دوران میں۔“

ڈاکٹر نے اس کی وضاحت قبول کر لی۔ ”میرے خیال میں ابھی تک سب ٹھیک ہے؟“

”ہر ایک سینسنگ یونٹ بہت اچھا کام کر رہا ہے۔“

”کیا تمام طلبا کا رویہ درست سمت میں ہے؟“

”سب کا بالکل... سوائے اس لڑکے براؤن کے....“

”تھوتھی براؤن، نیو ہیمپشائر... کیا کر رہا ہے وہ؟“

”رات کا راہی ہے۔“ ویرن نے جواب دیا۔ ”اکثر کیمپس سے غائب ہو جاتا ہے۔“

”کیا واقعی؟“ ایلسٹن کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ ”یہ ٹھیک نہیں ہے، ویک اینڈ کی راتوں میں بھی؟“

”ایک منٹ، میں بتاتا ہوں۔“ ویرن، کمپیوٹر کی جانب متوجہ ہوا۔ اس نے براؤن کے کمرے کا نمبر دبایا اور ڈیٹا اسکرول ہونے لگا۔ ”ایک منگل اور ایک ہفتے کی رات۔“

”ہم... مم... مجھے پسند نہیں ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”امید کرنی چاہیے کہ وہ اس کو عادت نہیں بنائے گا۔“

”تاہم ویک اینڈ کی مجھے پروا نہیں ہے لیکن مسٹر براؤن پر نظر رکھو۔ دو سال قبل جو فساد ہوا تھا ایسا کوئی دوسرا ہم افورڈ نہیں کر سکتے۔“

ویرن بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دو سال قبل ایک طالب علم غائب ہو گیا تھا... ”ہم نظر رکھیں گے۔“ اس نے یقین دلایا۔ ”یو آر دی باس۔“

”گڈ۔“ ڈاکٹر مسکرایا۔ ”میوزک شروع کر دو۔“

☆☆☆

انگراہم کی لیب میں ڈورتھی کی لاش کی چیر پھاڑ کرتے ہوئے کوئین کا مزید تجسس میں پڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن دماغ کے کسی خانے میں عجیب سی اکساہٹ ہوئی اور وہ چھٹی والے دن لوسن نامی قریبی قصبے کی لائبریری میں جا پہنچی۔ پرانے اخبارات میں اسے ایک میڈیکل سینٹر میں ڈورتھی کی موت کی خبر مل گئی۔ میڈیکل سینٹر کا ڈائریکٹر انگراہم کا پرانا طالب علم تھا۔ اس نے بتایا کہ ڈورتھی کئی مہینوں تک وہاں زیرِ علاج رہی مگر اس کی حالت بگڑتی چلی گئی اور تقریباً آخری سانسوں پر اسے انگراہم منتقل کر دیا گیا جہاں اسے بہترین طبی امداد مل سکتی تھی۔

میڈیکل سینٹر میں نصب ایک پلیٹ پر کلیڈ رمین انڈسٹریز کے مخفف KMI بڑے حروف میں کندہ تھے جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سینٹر KMI کی ملکیت تھا اور کلیڈ رمین فاؤنڈیشن ہی انگراہم کو سو فیصد مالی سرپرستی فراہم کرتا تھا۔

ڈورتھی کی لاوارث لاش کی تجرباتی چیر پھاڑ سے کچھ کڑیاں مل رہی تھیں۔ میڈیکل سینٹر سے واپسی پر کوئین ایک انجانی بے چینی اور لرزہ خیز تجسس محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

ٹم اور کوئین اینا ٹومی لیب میں تھے۔ ٹم آج بھی تاخیر سے پہنچا تھا۔ وہ دونوں میز نمبر چھ پر تھے۔

”میں سوچتی رہی ہوں کہ ہمیں اس کا کوئی نام رکھ دینا چاہیے۔“ کوئین نے خواہش ظاہر کی۔

ٹم نے اسے دیکھا۔ ”کوئی خاص نام تمہارے ذہن میں ہے؟“

”ڈوروتھی۔“

”اچانک تمہیں یہ خیال کہاں سے آیا؟“ ٹم نے کہا۔

”وہ بات ہی کچھ ایسی۔“

ٹم اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ ”ڈوروتھی اصل نام نہیں ہے؟“

”ہاں۔“ وہ ہچکچائی۔ پھر کوئین نے ساری کہانی ٹم کو سنا دی۔ لائبریری، نرسنگ ہوم اور ڈاکٹر کلنٹن وغیرہ۔

ٹم کو حیرت ہوئی۔ تاہم وہ خاموش رہا۔ ڈاکٹر کلیرسن کا اسسٹنٹ ان کی جانب آ رہا تھا۔ ”ڈاکٹر کلیرسن ملنا چاہتے ہیں مس کوئین۔“ اس نے کہا۔ ”کلاس کے بعد آپ فیکلٹی بلڈنگ میں ان سے ملاقات کر لیں۔“ یہ اطلاع دے کر وہ چلا گیا۔

”کیا خیال ہے ڈاکٹر کیا چاہتا ہے؟“ ٹم نے سوال کیا۔

”قطعی اندازہ نہیں ہے۔“ کوئین نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

”ان بوڑھے گدھوں سے ہوشیار رہنا۔“ ٹم نے آنکھ ماری۔

کوئین نے ٹم کو مارنے کے لیے ایک آلہ اٹھا لیا۔

☆☆☆

کلیرسن ایمرسن اپنی نئی ایجاد 9574 کے تازہ ترین تجربات کی رپورٹ اپنے کمپیوٹر کی اسکرین پر دیکھ رہا تھا۔ نئے نتائج.... توقع کے عین مطابق پہلے سے بہت اچھے تھے۔

”آپ بات کرنا چاہتے ہیں، ڈاکٹر کلیرسن؟“ کوئین پہنچ گئی۔

”مس کلیری، آؤ بیٹھو۔ دراصل مجھے ایک ریسرچ اسسٹنٹ کی ضرورت ہے۔ یہ ایک جز وقتی کام ہے۔ تاہم تمہیں موقع ملے گا کہ تم سائنس سینٹر کے ٹاپ فلور پر کام کر سکو۔ تم نئی نیورو فارمالوجیکل تحقیق کو دیکھ سکو گی۔ جو آئندہ یہاں پر پڑھائی کے دوران میں تمہارے کام آئے گی اور ہم شیڈول کو ارینج یا ری ارینج کر سکتے ہیں، گھنٹوں کے حساب سے۔“ ڈاکٹر نے بلا کسی تمہید کے مدعا بیان کیا اور رک کر اس کا ردِعمل دیکھنے لگا۔

کوئین نچلا ہونٹ چباتے ہوئے..... غور کر رہی تھی۔

”دس ڈالر فی گھنٹا۔“ ڈاکٹر نے مزید بتایا۔

”کیا میں پہلے اسے بطور آزمائش کر کے دیکھ سکتی ہوں، میرا مطلب ہے کہ حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے... دراصل پڑھائی کے دوران میں نے جاب کے بارے میں ذہن نہیں بنایا بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔“

”فائن۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”ہم تمہیں تین سے چار ہفتے دیتے ہیں یکم نومبر تک۔“

وہ مسکرائی اور کمرے میں اجالا سا ہو گیا۔ ”او کے، گریٹ۔“

”ونڈر فل۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں کل انتظار کروں گا۔“

”میں پہنچ جاؤں گی۔“ وہ اٹھی۔ دروازے کی طرف مڑی، اس کے تاثرات میں الجھن تھی، وہ ہچکچائی۔ ”لیکن... میں ہی کیوں؟“

ڈاکٹر کو اپنی بیٹی کلیریس یاد آئی۔ ”میرا خیال ہے کہ تم بہتر انداز میں نہ صرف مدد کر سکتی ہو بلکہ کچھ نیا بھی دریافت کر سکتی ہو۔“

وہی معصوم دلکش مسکراہٹ۔ ”او کے، میں کوشش کروں گی۔“

☆☆☆

”ہم... مم.....“ ٹم نے ہنکارا بھرا۔ ”تو بزرگ شریف ہیں۔“ ٹم کوئین کے کمرے میں فالتو بستر پر سیدھا لیٹا تھا۔

”تم کیا سمجھے تھے؟“

”میں سمجھا۔“ ٹم مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ ”ڈاکٹر کلیرسن تمہیں پسند کرنے لگے ہیں۔“

”ار... ر... ارے....“ ٹم نے دونوں ہاتھ سامنے کیے۔ کوئین نے تکیہ ہی کھینچ مارا تھا۔

”آرام سے بھئی۔“ ٹم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”اچھا میری خبر سنو۔ میرے دوستوں نے بلایا ہے۔ ڈونالڈ ٹرمپ کا تاج محل، یہ کیسینو ہے۔ مجھے اٹلانٹا سٹی جانا پڑے گا۔ ایک رات کے لیے مفت کمرا ملے گا، کسی بھی تاریخ کو... یکم نومبر سے 28 فروری کی درمیانی مدت میں۔“

”آخر کیوں؟“

”کیونکہ میں تواتر کے ساتھ جیتتا ہوں اور کافی دنوں سے غائب ہوں۔ وہ مجھے واپس دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”اگر تم ان سے رقم جیتتے رہتے ہو تو پھر وہ تمہیں کیوں بلا رہے ہیں؟“

”کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس مرتبہ صورتِ حال مختلف ہے اور ان کے پاس موقع ہے کہ وہ اپنی ہاری ہوئی رقم مجھ

سے واپس جیت لیں۔"

"توتم جاؤگے؟"

"کیوں نہیں اور تمہیں بھی مدعو کر رہا ہوں۔"

کوئین ہنس پڑی۔ "اٹلانٹا سٹی کے تاج محل میں تمہارے ساتھ ایک رات؟"

"ڈبل بیڈ ہے، تم اپنے بستر پر رہوگی۔"

"خواب دیکھتے رہو، مسٹر براؤن۔" کوئین نے انگوٹھا دکھایا۔

"اوکے۔" وہ بولا۔ "تاہم میں سنجیدہ ہوں، میں تمہیں دکھانا چاہتا ہوں کہ میں ایسی جگہوں پر کیا کاریگری دکھا سکتا ہوں۔"

کوئین نے بغور ٹم کے پُرامید چہرے کو دیکھا۔ ٹم کی جگہ کوئی اور اگر یہ پیشکش کرتا تو وہ بلاتردد فوراً مسترد کر دیتی۔ مگر اس کا ٹم کے معاملے میں دل کہتا تھا کہ ٹم قابلِ اعتبار ہے... یا شاید وہ غیر محسوس طور پر ٹم کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ "ٹھیک ہے، کیا یاد کروگے تم بھی۔"

ٹم کا چہرہ کھل اٹھا۔ "گریٹ!" وہ ہاتھ ہلاتا ہوا کمرے سے نکلنے لگا پھر رک کر بولا۔ "نومبر کے دوسرے ہفتے میں ایناٹومی کی مڈٹرم کے فوراً بعد ٹھیک رہے گا۔" وہ باہر نکل گیا۔ کوئین اپنی مسکراہٹ نہ دبا سکی۔ وہ کرسی پر آگے پیچھے جھول رہی تھی۔ مزہ آئے گا... اس نے سوچا۔ اس نے کبھی کیسینو کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ ویک اینڈ اٹلانٹا سٹی میں اور ٹم کے ساتھ....

لیکن ایک ہی کمرے میں؟ مجھے کس کا خوف ہے؟ ٹم ہی تو ہے اسے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ ٹم کو پسند کرنے لگی ہے۔

اسکول/کالج میں لڑکوں کے ساتھ اس کا میل جول رہا تھا لیکن کوئین نے کبھی کسی کو ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا تھا۔ جذباتی تعلق کا تو سوال نہیں پیدا ہوتا۔

اس نے ذہن سے لڑکوں اور "نومبر" کو باہر نکالا۔ اب وہ ڈیسک پر توجہ مرکوز کر رہی تھی جہاں پیتھالوجی کے نوٹس موجود تھے۔ اس کے لیے فوری توجہ طلب مسئلہ کل کی کلاس تھی۔

☆☆☆

کمرانمبر 252 کا والیم ایڈجسٹ کرتے ہوئے ویرن نے لعنت بھیجی۔ بات نہیں بنی، اسے صرف دو الفاظ ہی سنائی دیے۔ "اٹلانٹک سٹی" اور بس... ایلسٹن، کوئین اور براؤن پر خاص توجہ چاہتا تھا کہ اچانک کمرانمبر 252 میں ویرن کا نگرانی کا نظام فیل ہو گیا۔ "ایسا ممکن نہیں ہے۔"

وہ بڑبڑایا اور کنٹرول پینل پر ہاتھ مارا۔ "خرابی یہاں نہیں ہے بلکہ کمرے کے اندر ہے۔" وہ کرٹ کی طرف مڑا۔ "کمرانمبر 252 کا آڈیو پچھلی مرتبہ کب تبدیل کیا گیا تھا؟" ویرن نے پوچھا۔

کرٹ کچھ دیر چیک کرنے کے بعد گویا ہوا۔ "دو سال قبل۔"

"یعنی ختم ہے۔"

"تھینکس گیونگ ڈے کے وقفے میں، میں اسے بدل دوں گا۔"

"انتظار نہیں کیا جا سکتا۔" ویرن نے کہا۔ "میں کل یہ کام خود کروں گا۔"

☆☆☆

سائنس سینٹر کی گلابی عمارت کے شیشے کا دہرا دروازہ اطراف میں پھسلتا ہوا کھل گیا۔ کوئین ہال کے ماربل فلور پر آ گئی۔ چھت کافی بلند تھی۔ لفٹ کی طرف جاتے ہوئے وہ ہیجانی کیفیت کا شکار تھی۔ آج کام کا پہلا دن تھا۔

"میں کیا مدد کر سکتی ہوں؟" سیکیورٹی ڈیسک کے عقب میں سیاہ فام لڑکی نے شائستگی سے پوچھا۔ اس کے یونیفارم/بیج پر شارلن ٹرنر لکھا تھا۔ چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ شارلن کافی بھاری بھرکم تھی۔

"میں ڈاکٹر کلیرن کے لیے کام کر رہی ہوں۔"

"نام؟"

"کلیری، کوئین کلیری۔"

شارلن نے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں، پھر ڈیسک کی دراز کھول کر فائل میں سے ایک لفافہ نکالا۔ لفافے میں سے اس نے ایک بیج برآمد کیا۔ بیج کی تصویر کوئین کے چہرے سے ملائی ساتھ ہی ایک کارڈ نکالا جو کریڈٹ کارڈ جیسا تھا۔

دونوں اشیا اس نے کوئین کو دے دیں۔ "اس عمارت میں داخل ہونے کے لیے، اس بیج کو تمہارے کوٹ پر ہونا چاہیے جب تک تم یہاں ہو، بیج دکھائی دینا چاہیے، کارڈ تم والٹ یا جیب میں رکھ سکتی ہو۔ اسے کھونا مت، مشکل کھڑی ہو جائے گی۔"

کوئین نے بیج پتلون کی بیلٹ کے ساتھ کلپ کر دیا... "یہ کیا ہے؟" اس نے کارڈ کے بارے میں سوال کیا۔

"سیکیورٹی کی۔" شارلن نے بتایا۔ "تم اس کے بغیر اپر فلور تک نہیں جا سکتیں۔ اس پر ایک پٹی ہے جہاں کوڈ بنا ہوا ہے۔ لفٹ کار کی جھری میں کارڈ کا منہ اوپر کی طرف رکھ کر داخل کرنا۔"

"شکریہ۔" کوئین لفٹ کی جانب چل دی۔ سیکیورٹی کا معاملہ یہاں بہت حساس ہے، اس نے سوچا۔

کنٹرول پینل پر چھ بٹن تھے، چار منزلوں کے لیے اور ایک بیسمنٹ کے لیے۔ چار اور بی کے سامنے دو دو انڈیکیٹر لائٹس تھیں۔ سرخ انڈیکیٹر چار اور بی دونوں کے سامنے روشن تھے۔ بٹنوں کے اوپر جھری میں کوئین نے کارڈ داخل کیا اور نمبر چار بٹن دبایا۔ ہلکی سی کلک کے ساتھ نمبر چار کے سامنے سرخ انڈیکیٹر بجھ گیا۔ جوڑی کا دوسرا گرین انڈیکیٹر روشن ہو گیا۔ کوئین نے کارڈ واپس نکال کر جیب میں رکھ لیا۔

چوتھے فلور پر آ کر وہ ایک لمحے کے لیے گم صم ہو گئی۔ اس نے وارڈ سی کی کھڑکی کی جانب دیکھا۔ وہی چیختی ہوئی نیلی آنکھیں اس کے تصور میں ابھر آئیں۔ اس سے قبل بھی کئی مرتبہ وہ نیلی آنکھیں اسے یاد آئی تھیں... گھر پر بھی... ایڈمیشن کے وقت بھی... اور ہر مرتبہ وہ نامعلوم الجھنوں کا شکار ہو گئی تھی۔ "ویسی" بولتی آنکھیں اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

کوئی اَن دیکھا ہاتھ اسے پکڑ کر وارڈ "سی" کے شیشے تک لے گیا۔ تقریباً وہی پرانا منظر تھا تاہم وہ نیلی آنکھوں والی "ممی" غائب تھی۔ اس کی جگہ روئیوں سے ڈھکا جو جسم تھا، وہ کسی لڑکی کا تھا۔ چادر چہرے تک تھی۔ کوئین نے سینے کی حرکت سے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی لڑکی ہے۔

"مس کلیری۔"

کوئین گھوم گئی۔ ڈاکٹر کلیرن اس کے قریب کھڑا تھا۔

"مجھے گراؤنڈ فلور سے تمہاری آمد کا پتا چل گیا تھا۔"

"میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کس طرف جانا ہے۔" کوئین نے کہا۔

وہ مسکرایا۔ "میری غلطی ہے۔" ڈاکٹر نے برن وارڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

"میڈیکل سینٹر کے دوسرے مریض صحت یاب ہو کر چلے جاتے ہیں مگر یہ مریض یتیم جیسے ہیں۔ کسی کو ان کی فکر نہیں ہے۔ ان کا علاج نرسنگ ہومز یا عام کلینکس میں نہیں ہو سکتا۔ نہ کوئی اسپتال ان کے علاج کی ذمے داری اٹھانے کے لیے تیار ہے۔" ڈاکٹر کا اشارہ وارڈ "سی" کی جانب تھا۔ "اس لیے یہ یہاں نظر آ رہے ہیں۔ انگراہم ان کی بری طرح جلی ہوئی کھال کے لیے تجرباتی علاج کر رہا ہے۔"

"تجرباتی؟" کوئین کو تشویش ہوئی۔

ڈاکٹر ہنس پڑا۔ "ایسا لگ رہا ہے، مس کلیری کہ تم ہمیں دیوانہ سائنس داں سمجھ رہی ہو۔ ایسا نہیں ہے۔ ہر نئی دوائی یا سرجری جیسے ڈاکٹر ایلسٹن کی اسکن گرافٹنگ، کو پہلے نہایت احتیاط اور وسیع پیمانے پر جانوروں پر آزمایا جاتا ہے پھر قومی ادارہ ایف ڈی اے اس کا جائزہ لیتا ہے... تب کہیں جا کر انسانی رضا کاروں پر اس کی آزمائش کی جاتی ہے۔ نہایت احتیاط کے ساتھ۔"

کوئین نے شیشے کی جانب دیکھا۔ "لیکن یہ...."

"سب رضا کار ہیں یا پھر ان کے خاندانوں نے علاج و تجربات کے لیے دیے ہیں۔" ڈاکٹر کی آواز میں نرمی تھی۔ "انگراہم ان کی آخری امید ہے۔ ڈاکٹر ایلسٹن مریض کی صحت مند جلد کا نمونہ لے کر...." وہ کوئین کو ایلسٹن کا پیچیدہ طریقۂ کار بتانے لگا کہ وہ کس طرح جھلسی ہوئی جلد کے لیے صحت مند کھال کے ٹکڑے حاصل کرتا ہے اور یہ عمل کس قدر کرشمہ ساز ہے... وغیرہ وغیرہ۔

کوئین کو خواہش ہوئی کہ وہ ڈاکٹر ایلسٹن کے ساتھ بھی کام کرے۔ ڈاکٹر کلیرن اس کے دماغ کو پڑھ رہا تھا۔ "میں کبھی نہیں کہوں گا۔" اس نے مشورہ دیا۔ "تمہاری ڈیوٹی میرے ڈپارٹمنٹ میں ہے۔ وہاں جو کام ہو رہا ہے، اس کا براہِ راست تعلق برن وارڈ سے ہے۔" اس نے ہال کی ایک جانب اشارہ کیا۔ "میں تمہیں اپنی لیب دکھاتا ہوں تاکہ تم بہتر طور پر سمجھ سکو۔"

اصلی مریضوں کے ساتھ کام کے مواقع نے کوئین کے ہیجان اور دلچسپی کو بڑھا دیا۔ وہ ڈاکٹر کلیرن کے پیچھے تھی۔

"میرے خیال میں یہ کمرا بہت گلیمرس نہیں ہے۔ تاہم فرنٹ سیکشن ادھر ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

یہ ایک چھوٹا کمرا تھا۔ دیوار کے ساتھ میز اور کمپیوٹرز کی قطار تھی۔ درمیانی عمر کی ایک عورت جس کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی، ایک "کی بورڈ" پر جھکی ہوئی تھی۔

"ایلس۔" ڈاکٹر نے اس کے شانے کو چھوا۔ "یہ کوئین کلیری ہے۔ اسٹوڈنٹ اسسٹنٹ۔ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں۔"

ایلس نے مڑ کر اپنا ہاتھ آگے کیا۔ اس کی مسکراہٹ

میں خلوص اور خوش آمدیدگی کا عنصر واضح تھا۔

بعدازاں، ڈاکٹر کلیرنؔ کوئین کو آفس کے عقبی دروازے کی جانب لے گیا۔ کوئین کچھ حیران تھی کہ وہ ایک بار پھر وارڈ ''سی'' کے قریب تھے۔ وارڈ کے دروازے پر ایک ڈیسک پر کئی نرسز موجود تھیں۔ کچھ دیر قبل بھی کوئین نے انہیں دیکھا تھا۔ اسے یاد تھا کہ کئی ماہ قبل جب اس کا داخلے کے لیے انٹرویو ہونا تھا تو ''امیدواروں'' کو کیمپس کا دورہ کرایا گیا تھا۔ جب کوئین نے وارڈ ''سی'' کے نیلی آنکھوں والے مریض کو دیکھا تھا۔ اس وقت وارڈ کے باہر یہ نرسنگ اسٹیشن قائم نہیں تھا۔

''مارگریٹ!'' ڈاکٹر نے کاؤنٹر پر ایک درمیانی عمر کی نرس کو آواز دی۔ ''9574 کا وائل دیجیے۔''

نرس نے عقب میں رکھی ٹرالی سے دواؤں کی ایک شیشی منتخب کی اور ڈاکٹر کے حوالے کردی۔ ڈاکٹر کلیرنؔ نے شیشی کوئین کو پکڑائی اور بولا۔ ''یہ ہے، وہ وجہ کہ ڈاکٹر ایکسٹن اور میری لیب ایک ہی فلور پر ہے۔ یہ ایک نیا اینستھیسیا ہے جس پر میں کام کررہا ہوں۔ ابھی تک اس کا کوئی نام نہیں ہے، سوائے انٹری نمبر یا کوڈ نمبر کے۔''

کوئین نے دیکھا کہ شیشی میں کوئی شفاف سیال موجود تھا۔

ڈاکٹر پھر گویا ہوا۔ ''یہ ایک غیر معمولی چیز ہے۔ یہ قدرتی نیوروماءٔن ہے جو نیند کے دوران میں منٹوں میں دماغی خلیات میں نفوذ کرتا ہے۔''

''واقعی؟'' کوئین نے شیشی واپس کاؤنٹر پر رکھ دی۔ وہ مسکرائی، ڈاکٹر پُرجوش نظر آرہا تھا۔

''ہاں، انسان نیند کے دوران مفلوج ہو جاتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ خواب کے دوران میں بات کرتا، ہنستا، روتا، آنکھیں کھولتا... وغیرہ وغیرہ۔ تاہم ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے اور سینہ حرکت کرتا ہے یا دل وغیرہ یا وہ کروٹ لیتا ہے... تم کہہ سکتی ہو کہ نیند کے دوران فالج نما کیفیت، فالج کی ایک منتخب شدہ حالت ہوتی ہے۔''

''آپ نے بتایا تھا کہ یہ اینستھیٹک ہے؟''

''ہاں ہے۔ اس کی زیادہ خوراک مکمل اینستھیسیا ہے۔ میں اسی کے میکنزیم پر کام کررہا ہوں۔ اس اینستھیسیا میں مریض اپنی مرضی سے سانس لے سکتا ہے جبکہ عام اینستھیسیا اور نیند کی حال میں مریض سانس خود سے لینے کے سلسلے میں بے اختیار ہوتا ہے، ہمارا اینستھیسیا سینے کو چھوڑ کر ہر قسم کی سرجری میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ الرجیک ری ایکشن بھی نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ 9574 انسانی نیوروہارمون ہے۔ اسی لیے اینستھیسیا کے بعد کے ضمنی اثرات بھی ظاہر نہیں ہوتے۔ مریض ریکوری روم سے اس طرح جاتا ہے جیسے نیند سے بیدار ہوا ہے۔''

''حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین۔'' کوئین نے تبصرہ کیا۔

ڈاکٹر نے ہاتھ بلند کیے۔ وہ بہت فخر محسوس کررہا تھا جو اس کی حرکات وسکنات سے ظاہر تھا۔ ''اتنا ہی نہیں بلکہ یہ کسی قسم کے بھی اثرات سے بھی مبرا ہے اس کا ایل ڈی۔''

''ایل ڈی۔''

''ایل ڈی۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔ ''یعنی لیدل ڈوز... اتنی خوراک جو انسان کے لیے مہلک ثابت ہو۔''

اس نے فاتحانہ انداز میں جذباتی ہوکر ہاتھ لہرائے۔ اس کا ہاتھ کاؤنٹر پر رکھی شیشی کو لگا۔ قبل اس کے کہ شیشی کاؤنٹر سے نیچے گرتی عین وقت پر مارگریٹ نے پھرتی دکھائی اور اسے بچالیا۔

''خدا کا شکر ہے۔'' ڈاکٹر جو اچانک گھبرا گیا، سنبھل گیا۔ وہ پھر کوئین کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ہمارے پاس 9574 بہت کم مقدار میں ہے۔ ہم اس کی بہت احتیاط کرتے ہیں۔ یہ سونے سے زیادہ قیمتی ہے۔''

''لیکن یہ کہاں استعمال ہوتا ہے؟''

''وارڈ ''سی'' کے مریضوں پر۔''

''لیکن آپ لوگ کیوں ان کو مفلوج کرنا چاہتے ہیں؟''

''نہیں، مفلوج نہیں... دراصل بیشتر مریضوں کی حالت خوفناک ہے، ان کے ٹشوز اکڑ گئے ہیں اور تقریباً ناقابلِ حرکت ہیں۔ ہم 9574 فزیکل تھراپی کے دوران استعمال کرتے ہیں تو تھراپسٹ اعضا اور جوڑوں کی ورزش کرانے کے قابل ہوتا ہے۔ جو کہ بہت ضروری ہے۔ 9574 کے بغیر مریض ناقابلِ برداشت اذیت محسوس کرے گا۔''

''تاہم آپ نے کہا تھا کہ اس کا کم ڈوز فالج زدہ کر دیتا ہے اور زیادہ خوراک اینستھیسیا کی طرح کام کرتی ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ تھراپی کے دوران مریض مکمل مفلوج ہوتا ہے؟'' کوئین بے کلی محسوس کررہی تھی۔

ڈاکٹر ایمرسن نے کوئین کو بغور دیکھا۔ ''9574، وارڈ ''سی'' کے مریضوں کے لیے غیر نقصان دہ ہے۔ تاہم ان میں سے چار ایسے ہیں جن کو تھراپی کے لیے مفلوج کرنا

...تا ہے۔ ان چاروں کا دماغ متاثر ہوا ہے۔ تپش یا دھوئیں یا ...آگ کی دہشت کی وجہ سے... بلکہ چاروں میں سے دو تو ...نک ہیں اور تھراپسٹ کو کافی محنت کرنی پڑتی ہے۔''

کوئین کو رنج ہوا۔ اس کے تصور میں پھر وہی چیختی ...والی نیلی آنکھیں ابھر آئیں جو پہلے وزٹ پر کوئین سے کچھ ...نے کی کوشش کررہی تھیں۔

''آؤ، میں کچھ اور میڈیکل ریسرچ سے متعلق ...دکھاؤں۔'' وہ وارڈ ''سی'' کے سامنے سے ہٹنے لگا۔

☆☆☆

ویرن طلبا کے رہائشی کمروں کے قریب تھا۔ اس کی ...پہلی منزل کے جنوبی حصے کی طرف تھی۔ المعروف ...وین کنٹری... اس کے پاس کام کے لیے صرف ڈنر کا وقت تھا جب ہر کوئی کیفے میں چلا جاتا۔ اس کا ساتھی کرٹ ...رابطے میں تھا، کرٹ سائنس سینٹر کی لفٹ کی نگرانی کررہا تھا۔ ویرن کوئی چانس نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس لیے کرٹ کے ...ذریعے اسے اطمینان کی ضرورت تھی کہ کوئین سائنس سینٹر کی عمارت میں ہے۔ اب وہ مطمئن تھا، چند اور طالبات جنوبی حصے سے نکل کر کھانے کے لیے روانہ ہورہی تھیں۔

ویرن حرکت میں آگیا۔ ماسٹر کی استعمال کرکے وہ کمرا نمبر 252 میں داخل ہورہا تھا۔

☆☆☆

کوئین نے کمپیوٹر سے سر اٹھایا اور گھڑی کی جانب دیکھا۔ ڈنر ٹائم۔ اس نے آنکھوں کو مسلا۔ ذرا دیر بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ لفٹ کی طرف جاتے ہوئے اس نے وارڈ ''سی'' کے شیشے کی جانب دیکھا، اسے خوشی ہوئی کہ شیشے پر پردہ پڑا تھا۔

لفٹ پر اس نے دیکھا کہ دونوں لفٹ کارز مصروف تھیں اور سرخ اشارے روشن تھے۔ کچھ سوچ کر اس نے کارڈ استعمال کیا تاہم دونوں سرخ اشارے اب بھی روشن تھے۔ اس نے کارڈ واپس نکال لیا اور سیڑھیوں کا رخ کیا، لفٹ استعمال کرنا لازمی نہیں تھا۔ نہ اس کی لمبی ٹانگوں کو نیچے جانے کے لیے لفٹ کی ضرورت تھی۔ اس نے انتظار نہیں کیا اور سیڑھیاں طے کرنے لگی۔ لیکن سیڑھیوں پر آنے کے لیے اسے چوتھی منزل والے زینے کے دروازے پر مخصوص کارڈ استعمال کرنا پڑا۔ جس پر اسے اندازہ ہوا کہ کارڈ کے بغیر چوتھی منزل پر آنا اور وہاں سے واپس جانا ممکن نہیں ہے۔

گراؤنڈ فلور پر پہنچنے کے لیے اس نے پھر کارڈ استعمال کیا۔ لابی قریب تھی۔ وہ ٹھٹکی۔ ہال سے گزرے یا لابی میں جائے؟ لابی استعمال کرنے پر کچھ وقت بچ جائے گا۔ وہ لابی کی طرف آئی لیکن یہاں بھی اسے معمول کی وارننگ نظر آئی۔ ''یہ ایگزٹ نہیں ہے۔ کھولنے کی کوشش میں الارم بجنے لگے گا۔'' وہ پھر سوچ میں پڑ گئی تاہم اس نے وہاں مخصوص جھری بھی دیکھ لی تھی۔ کوئین نے کارڈ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ سیکیورٹی کارڈ نے لاک کھول دیا، سبز بتی روشن ہوگئی۔ وہ مسکرائی اور لابی میں آگئی۔ لابی کے بیرونی سرے پر اسے ایک بار اور رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مرتبہ اس نے بلاتامل کارڈ استعمال کیا۔ اب وہ کھلی فضا میں تھی۔ اکتوبر کی خنک فضا میں اس نے گہرا سانس لیا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ کوئین ''کارڈ کی'' کی سہولت سے خوش تھی۔ خراب موسم میں کارڈ مزید مفید ثابت ہوگا۔ کھانے سے قبل اس نے کمرے کا چکر لگانے کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

ویرن نے خفیہ جگہ سے مختصر لیکن طاقتور ناکارہ مائیک نکال کر اس کی جگہ دوسرا فٹ کیا۔ اطمینان سے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا اور واپسی کا رخ کیا۔ معاً وہ منجمد سا ہوگیا۔ دروازے پر کسی نے تالے میں چابی داخل کی تھی۔ اس نے تیزی سے خود کو دیوار کے ساتھ بستر کے پہلو میں گرادیا۔ قریب ہی دیوار میں کھڑکی تھی۔ دروازے کے تالے میں چابی گھومی... ویرن کے مسامات نے پسینا اگلا اور اس نے سانس تک روک لی۔ دروازہ کھل گیا۔ کمرے میں داخل ہونے والی لڑکی باتھ روم میں داخل ہوگئی۔ اس نے پانی گرنے کی آواز سنی اور کرٹ کو کوسا... کرٹ نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟ چیف ویرن کسی لڑکی کے کمرے سے برآمد ہو یہ خبر بہت تیزی سے پھیلتی اور ویرن بُری طرح پھنس جاتا۔ بڑی نازک صورتِ حال تھی۔

ویرن نے خطرہ مول لے کر اپنی گول کھوپڑی اونچی کی۔ کمرا خالی تھا۔ اس نے پانی گرنے کی آواز پر کان رکھے اور ہانپتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا، عقب میں احتیاط سے اس نے دروازہ بند کیا۔ ویرن کی دھڑکنیں بے ترتیب تھیں۔ اس کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔

☆☆☆

ویرن، کرٹ پر برس رہا تھا۔ ''میں تمام وقت وہاں موجود تھا... میں قسم کھاتا ہوں۔ وہ لڑکی لفٹ سے نکلی ہی نہیں۔'' کرٹ نے صفائی پیش کی۔ ویرن اس کو گھور رہا تھا۔ ایلیٹ لاتعلقی سے اپنے کام میں لگا تھا۔ تینوں اس وقت کنٹرول روم میں تھے۔

''پھر کوئین کے کمرے میں کون آیا؟'' ویرن نے اعتراض کیا۔ کرٹ کان کھجا رہا تھا۔ اچانک اسے کوئی خیال سوجھا۔ ''رکو، میں ثابت کر سکتا ہوں۔'' وہ اچھل پڑا۔ اس نے ایک کرسی سنبھالی۔ اس کی انگلیاں سرعت کے ساتھ کی بورڈ پر رواں ہو گئیں۔ ''ہم نے اسے ایک کارڈ ایشو کرایا تھا، ٹھیک؟''

ویرن چپ تھا۔ وہ کرٹ کے پیچھے کھڑا ہو کر اسکرین کو دیکھنے لگا۔ سائنس بلڈنگ کے الیکٹرونک لاکس، کنٹرول روم سے منسلک تھے۔ یہاں کا مربوط نظام اس چیز کا ریکارڈ رکھتا تھا کہ کون سا الیکٹرونک لاک کتنی بار کھلا اور کون سا ''کی کارڈ'' استعمال کیا گیا۔

کرٹ نے ان تمام افراد کی فہرست نکالی جن کی ملکیت میں اس قسم کے کارڈ تھے۔ پھر اس نے کوئین کا نمبر ہائی لائٹ کر کے اسے آج کی تاریخ کے سرچ میں ڈال دیا۔

''اب خود دیکھ لو۔'' کرٹ نے اطمینان کی سانس بھری۔

ویرن حاصل کردہ معلومات کو گھور رہا تھا۔ جہاں کوئین کے کارڈ کا ریکارڈ تھا۔ چوتھے فلور سے لے کر زینہ اور لابی تک... کون سا لاک اس نے کتنی بار اور کتنے بجے کھولا۔

''میں معذرت خواہ ہوں، کرٹ۔'' ویرن سمجھ گیا۔

''کوئی بات نہیں۔'' کرٹ نے کہا۔

اب ایلیٹ نے لب کشائی کی۔ ''چیف، ناکارہ بگ مل گیا؟''

''ہاں۔'' ویرن نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پھر وہ بوکھلا کر بقیہ جیبیں ٹٹولنے لگا۔ ویرن کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ بگ نہیں تھا۔ اس نے دعا کی غائب شدہ بگ غلط ہاتھوں میں نہ چلا جائے۔

''تم نے کھو دیا؟'' ایلیٹ نے کہا اور اپنے کونسول کے نیچے سے میٹل ڈیٹیکٹر نکالا۔ وہ ویرن کے قریب آ گیا۔ سر سے پیر تک اس نے ہر طرف ڈیٹیکٹر گھمایا لیکن ڈیٹیکٹر کی سوئی نہیں ہلی۔ تینوں ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔

''تم نے کہیں گرا دیا ہے۔'' کرٹ نے کہا۔

''مجھے سوچنے دو۔'' ویرن تڑخ اٹھا۔ دونوں خاموش ہو گئے۔ ویرن گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ بگ کمرے میں ہے اور اس وقت گرا ہے جب وہ بستر کے پہلو میں نیچے گرا تھا۔

کرٹ نے میٹل ڈیٹیکٹر لیا۔ ''مجھے کمرے میں جا کر چیک کرنا چاہیے۔''

''نہیں۔'' ویرن نے ہاتھ اوپر کیا۔ ''اب وقت نہیں بچا ہے۔''

''اگر وہ کمرے میں ہے تو ہم اسے وہاں نہیں چھوڑ سکتے۔ اگر وہ بگ منظر عام پر آ گیا تو کیا کیا چہ میگوئیاں ہوں گی۔ طلبا اپنے اپنے کمروں کو کھنگالنا شروع کر دیں گے۔ بات کہیں سے کہیں نکل جائے گی... ڈاکٹر ایلسٹن اس کے ساتھ کیا کرے گا؟ ایسی ہی تمام باتیں ویرن کے ذہن میں چکرا رہی تھیں۔ ویرن نے گھڑی دیکھی۔ ڈنر کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ بگ اتنا چھوٹا ہے کہ اس کے دیکھ لیے جانے کا امکان بہت کم ہے۔ ہم اسے کل اٹھا لیں گے، پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔ ویرن نے طے کر لیا لیکن وہ اندر سے کیوں ڈرا ہوا ہے؟ ویرن کو پریشانی لاحق ہوئی...

☆☆☆

کوئین نے آئی ڈی بیج لیب کوٹ پر لگایا اور ٹم کی جانب دیکھا۔ ''بہت سائنٹیفک لگ رہی ہو۔'' اس نے کہا۔ وہ کوئین کے کمرے میں دوسرے بستر پر کھڑکی کے قریب بالٹی سورسن کا مطالبہ کر رہا تھا۔

''تم کچھ دیر میرے کمرے میں رکو، میں تھوڑی دیر میں واپس آؤں گی، پھر ڈنر ساتھ کریں گے۔''

''اچھا۔'' اس نے مطالعہ بند کر دیا۔ ''خیریت؟''

''تب تک تمہارا روم میٹ کیون سو چکا ہوگا۔''

''ضروری نہیں ہے، خیر تم لوٹ کر آؤ۔''

کوئین نے ٹم کو اس لیے نہیں روکا تھا کہ ٹم کا آس پاس رہنا اسے اچھا لگتا تھا۔ درحقیقت ایک دن قبل جب وہ ڈنر سے واپس آئی تو اس کی حساس طبیعت نے ان دیکھی سنسنی محسوس کی۔ کچھ عجیب اور پُراسرار تھا۔ وہ اس معمے کو حل نہ کر سکی۔ نہ ہی ان عجیب احساسات سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اس کا یہ احساس بہرحال پختہ تھا کہ کوئی شے یا شخص آس پاس منڈلا رہا ہے۔ آج اس نے سوچا کہ اس وقت کمرے کو خالی نہ چھوڑا جائے۔ اسی ناقابلِ فہم خیال کے تحت اس نے ٹم کو روک لیا تھا۔

☆☆☆

کوئین جا چکی تھی اور ٹم اخبار میں مگن تھا۔ تالے میں چابی کی آواز سن کر وہ اچھل پڑا اور پنجوں کے بل چلتا ہوا دروازے کے قریب دیوار سے چپک گیا۔ دروازہ اندر کی جانب کھلا اور ٹم اچانک سامنے آ گیا۔

''ہاؤ... ؤ... ؤ...'' وہ زور سے چیخا مگر یہ دیکھ کر

اسے شاک لگا کہ دروازہ کھولنے والی کوئین نہیں تھی۔ یہ تو کوئی اور ہی شخص تھا۔ جو بھی تھا اس کے چہرے پر بھی الجھن کے آثار تھے۔ ''کون ہو تم؟'' ٹم نے ویرن کو پہچان کر بھی سوال کر ڈالا۔

''یہی میرا سوال ہے لڑکے...'' ویرن نے اپنی بوکھلاہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ٹم نے اس کے ایک ہاتھ میں فلیش لائٹ اور دوسرے ہاتھ میں الیکٹرونک کی ڈنڈا نما کوئی چیز تھی۔

''تم سیکیورٹی چیف ہو؟'' ٹم نے کہا۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟'' ویرن نے سنبھالا لیا۔

''ہاں، میں فرسٹ ایئر کا طالب علم ٹم براؤن ہوں اور کلیری کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''میں ID دیکھ سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں۔'' ٹم نے والٹ نکالا اور کارڈ ویرن کے ہاتھ میں دے دیا۔ ٹم نے ویرن کی ہاتھوں کی خفیف سی لرزش کو دیکھ لیا۔

''ہمارے پاس رپورٹ ہے کہ کوئی بندہ کسی لڑکی کے کمرے میں چھپا ہوا ہے... میں اسی کی تلاش میں ہوں۔'' ویرن نے بہانہ گڑھا۔ ''اس کمرے کی لڑکی کہاں ہے؟''

''ڈاکٹر کلیرسن سے ملنے گئی ہے۔''

''اسے پتا ہے کہ تم یہاں ہو؟''

''کیوں نہیں، ہم دونوں ساتھ ڈنر کے لیے جائیں گے۔''

ویرن کا واکی ٹاکی بولا۔ ویرن نے اسے بیلٹ سے الگ کیا اور ٹم کی جانب سے رخ پھیر لیا۔ ''ہاں۔''

''وہ آ رہی ہے چیف۔''

''ٹھیک ہے۔'' ویرن نے کہا۔ پھر ٹم کی طرف پلٹا۔ ''مجھے جانا ہوگا۔''

ٹم اسے عجلت میں روانہ ہوتے دیکھ رہا تھا۔ کس نے سیکیورٹی کو کال کیا تھا؟ ٹم نے دروازہ بند کیا اور خیالات میں الجھا ہوا دوسرے بستر کی طرف جانے لگا۔ فلیش لائٹ اور الو کھے آلے کی موجودگی سے نمٹنے کے لیے وہ دونوں اشیا قطعی موزوں نہیں تھیں۔ ٹم خیالات میں مگن کھڑکی کے رخ سے بستر کے قریب پہنچا۔ معاً اس کی سسکی نکل گئی۔ دائیں پیر کے اگلے حصے میں کوئی شے چبھ گئی تھی۔ ٹم بستر پر بیٹھ گیا۔ دایاں پیر اٹھا کر بائیں گھٹنے پر رکھ لیا۔ وہ جائزہ لے رہا تھا۔ کوئی ننھی سی چیز موزے سے گزر کر پیر کے اگلے حصے میں اٹکی ہوئی تھی۔ یہ پن کی شکل جیسی کوئی نکیلی چیز تھی، ٹم نے چٹکی سے پکڑ کر اسے پیر سے الگ کیا۔

سیاہ رنگ کی چھوٹی سی، چپٹی اور دائرہ نما شے تھی۔ سیدھی پن کے ساتھ منسلک تھی۔ کیا چیز ہے؟ دروازہ کے لاک میں دوبارہ چابی گھومنے کی آواز آئی۔ اسے امید تھی اس مرتبہ کوئین ہوگی۔ اس کا اندازہ صحیح تھا۔ مخصوص خوشبو، مخصوص مسکراہٹ... ''تم نے میرے اوپر کیا جادو کر دیا ہے، کوئین کلیری؟'' ٹم نے سوچا اور کہا۔ ''آفس کا کیا حال تھا آج؟''

کوئین نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔

اس نے سیاہ رنگ کی اسٹک پن سامنے کی۔ ''تمہاری ہے؟''

کوئین نے دیکھا اور لاعلمی کا اظہار کیا۔ ''یہ کیا ہے؟''

ٹم نے اسے بتایا کہ یہ اسے کہاں سے ملی۔ پھر اس نے پن اپنے اسپورٹس کوٹ پر سجا کر پوز بنایا۔ ''کیسا؟''

کوئین نے آنکھیں سکیڑیں۔ ''مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔''

ٹم نے سر جھکا کر دیکھا، اسٹک پن کوٹ کے ''ہیرنگ بون'' پیٹرن میں مدغم ہو کر تقریباً غائب ہو گئی تھی۔

''اچھا... خیر، چلو ڈنر کے لیے نکلتے ہیں۔'' ٹم نے کہا۔

☆☆☆

ان دونوں کے کیفے ٹیریا کی جانب روانگی پر ویرن ایک بار پھر نمودار ہو گیا۔ وہ تیزی سے جنوبی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے کمرا نمبر 252 کا لاک کھولا اور اندر داخل ہو کر دروازہ عقب میں بند کر دیا۔ میٹل ڈیٹیکٹر کے ذریعے اس نے سب سے پہلے کھڑکی کے فرش کو جانچا اور بالآخر تمام قالین کو چیک کر لیا۔ تاہم اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ بگ (bug) کہاں گیا؟ اس نے سر کھجایا۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔

☆☆☆

کوئین ڈاکٹر کلیرسن کی لیب میں تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

''ڈاکٹر کلیرسن۔'' وہ سوچ میں پڑ گئی پھر بولی۔ ''میرے ذہن میں ایک عجیب سوال ہے، کیا میں پوچھ سکتی ہوں؟''

''کیوں نہیں۔'' ڈاکٹر کی نظریں میگزین پر تھیں۔

''مجھے عجیب سوال اچھے لگتے ہیں۔''

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

ڈاکٹر نے چشمے کے اوپر سے اسے دیکھا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں جلدی وضاحت چاہیے۔ ہم 9574 کو ....''

''نہیں... نہیں، سوال یہاں لیب سے متعلق نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ انگراہم میں کیا ہو رہا ہے؟''

ڈاکٹر نے میگزین ایک طرف رکھ دیا۔ وہ کوئین کو تک رہا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں تمہارا سوال سمجھ نہیں پایا؟''

کوئین، اس کے مقابل نشست پر بیٹھ گئی۔ ''مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں سب کی سوچ ایک جیسی ہے، ایک ہی نقطۂ نظر ہے۔''

''یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ایسا ہوتا ہے بہت سے تعلیمی اداروں میں۔ متعدد نکات پر ایک ہی ڈپارٹمنٹ میں زیادہ تر اذہان میں اتفاق پایا جاتا ہے۔''

''لیکن میں کسی ایک ڈپارٹمنٹ کی بات نہیں کررہی۔ تمام کی بات کررہی ہوں۔ طلبا کی، فیکلٹی کی، انگراہم کی ....'' کوئین نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''یوں لگتا ہے جیسے سب ڈاکٹر ایلسٹن کی طرح بات کرنے لگے ہیں۔''

ڈاکٹر کلیرن ہنس پڑا۔ ''اوہ نہیں۔'' اس نے کسی کی جانب ہاتھ ہلایا۔ ''آؤ آرتھر... تم بھی سنو ....''

کوئین نے مڑ کر ڈاکٹر ایلسٹن کو دیکھا۔ ڈاکٹر کی نگاہ میں چبھن تھی۔ ''کیا میں فرض کروں مس کوئین کہ میرے نظریات آپ کے لیے قابلِ قبول نہیں ہیں؟''

کوئین کو یہ انداز ٹھیک نہیں لگا۔ ''مجھے یہ قبول کرنے میں مشکل کا سامنا ہے کہ معاشی اور معاشرتی بنیادوں پر میڈیکل کیئر کی راشن بندی ہونی چاہیے۔''

''اس قسم کی راشن بندی ناگزیر ہے۔'' ڈاکٹر ایلسٹن کا انداز تیزی سے بدل کر نرم ہو گیا۔ ''تاہم تمہارے ذہن میں کیا متبادل یا تجویز ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' وہ بولی۔ ''لیکن دنیا میں بہت سے امور ناگزیر معلوم ہوتے ہیں اور ان میں سے بیشتر کبھی حقیقت میں تبدیل نہیں ہوتے۔''

''تمہارا کہنا درست معلوم ہوتا ہے تاہم میں نے ٹھوس اعداد و شمار پیش کیے تھے۔'' ایلسٹن کا سر دھیرے دھیرے ہل رہا تھا۔ اس کی نگاہ میں کوئی نامعلوم شے تھی جسے کوئین پڑھ نہیں پا رہی تھی۔ البتہ وہ خود کو بے چین و بے کل محسوس کررہی تھی۔

''تم نے مجھے کسی حد تک سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔'' ڈاکٹر ایلسٹن کی نظر اب بھی کوئین پر جمی تھی۔ پھر اس نے دونوں کی طرف جانے کا اشارہ کیا اور باہر نکل گیا۔ کوئین کی سنسنی بھی ختم ہوئی، وہ ڈاکٹر ھیرن کی طرف مڑی۔

''کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ انگراہم میں صرف میں ہی اکیلی ہوں جو ڈاکٹر ایلسٹن کی لائن پر نہیں چل پا رہی ہوں؟''

''ایلسٹن کو معلوم ہونا چاہیے۔'' کلیرن نے جواب دیا۔ ''ویسے مجھے یقین ہے کہ وہ خود بھی اس سوال کا جواب ڈھونڈ رہا ہوگا۔''

☆☆☆

لوئیس ویرن نے ڈاکٹر ایلسٹن کے آفس کے دروازے پر دستک دی۔ وہ حیران تھا کہ ڈاکٹر کیا چاہتا ہے۔ ویرن کو امید تھی کہ بگ والی اطلاع ڈاکٹر کے کانوں تک نہیں پہنچی ہوگی۔

دستک کا جواب مثبت تھا۔ ویرن آفس میں داخل ہو گیا۔ ڈائریکٹر آف میڈیسن کا دفتر، فیکلٹی بلڈنگ میں سب سے بڑا تھا۔ ویرن نے ڈیسک کی دوسری جانب ڈاکٹر کے سامنے نشست سنبھالی۔ ''سب ٹھیک ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''کسی کمرے کا سینسنگ یونٹ ٹھیک کام نہیں کررہا ہے، مجھے نمبر نہیں معلوم لیکن اسٹوڈنٹ کا نام پتا ہے... کوئین کلیری۔ میں پریشان ہوں کہ یہاں ہمارا تنویمی عمل کیوں کام نہیں کررہا۔ مجھے لگتا ہے کہ پورے سمسٹر میں رات کو میوزک اس تک پہنچا ہی نہیں۔

انگراہم کے نظام میں نیند کے دوران مخصوص مدھم موسیقی کی کمروں میں ترسیل نہایت اہمیت کی حامل تھی۔

''آپ کے اس خیال کا محرک کیا ہے؟'' ویرن نے سوال کیا۔ ''سینسنگ کے تمام انڈیکیٹرز سبز ہیں، کہیں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔''

''لڑکی سے میری بات ہوئی ہے۔ اس کا نقطۂ نظر تبدیل نہیں ہوا ہے۔ اس کا مطلب میوزک اس تک نہیں پہنچ رہا ہے۔ یعنی کہ سینسنگ یونٹ میں گڑبڑ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے فوراً چیک کرو۔''

ویرن نے دانت پر دانت جمائے۔ ''پھر وہی کوئین کلیری، کمرا نمبر 252؟'' ویرن کی زبان پھسل گئی۔ چالاک ڈاکٹر الرٹ ہو گیا۔ ''کیا کوئی مسئلہ پیش آیا ہے تمہیں اس کے ساتھ؟''

''اس کے کمرے کا آڈیو خراب ہو گیا تھا، میں نے اسے بدل دیا ہے۔'' وہ گمشدہ بگ کی اطلاع گول کر گیا تھا۔

''کیا یہ مشکوک نہیں ہے کہ ایک ہی کمرے کے دو الیکٹرانک آلات ایک ہفتے کے دوران خراب ہو گئے۔ آخر وہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''ایسا ہونا نہیں چاہیے۔'' ویرن نے کہا۔

''ہمیں اپنی پوری تسلی کرنی پڑے گی۔ دو برس قبل جو واقعہ ہوا تھا، میں اسے دہرانا نہیں چاہتا... نہ اسے بھول سکتا ہوں، زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔'' ڈاکٹر کی پیشانی پر سلوٹیں گہری ہو گئیں۔

ویرن نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ وہ نکتہ تھا جس پر وہ ڈاکٹر سے پوری طرح اتفاق کرتا تھا۔

''وقتاً فوقتاً کوئی مسئلہ اٹھ رہا ہے اور ہر مرتبہ یہ لڑکی ملوث ہوتی ہے۔ کیا مجھے پچھتانا پڑے گا کہ میں نے اسے انگراہم میں آنے دیا؟''

ویرن کو امید تھی کہ ایسا نہیں ہوگا اگر ایسا ہوا تو خود ویرن کو بھی پچھتانا پڑے گا اور سب سے بڑھ کر لڑکی کو...

☆☆☆

''کوئین دروازہ لاک مت کرو، آج وہ لوگ اسپرے کریں گے۔'' ٹم نے اس کی ''کی چین'' کو دیکھا۔

''اوہ، ہاں۔'' کوئین نے چابیاں واپس جیب میں رکھ لیں۔ ان دونوں کو آج رات اٹلانٹا سٹی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ ٹم ہال میں نکلا، اس کی نظر پھر نوٹس پر پڑی۔ معمول کے مطابق ''اسپرے'' کا وقت آ گیا ہے۔ پہلی منزل کا شیڈول جمعے کی صبح ہے۔ طلبا سے درخواست ہے کہ تمام کمرے آٹھ بجے سے دوپہر تک خالی چھوڑ دیے جائیں۔ کمروں کو لاک نہ کیا جائے... لوئیس ویرن، چیف آف کیمپس سیکیورٹی۔

ٹم مطمئن نہیں تھا تاہم اس نے معاملے کو کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

''تمہیں کوئی بگ ملا ہے کمرے میں؟'' ٹم نے اچانک سوال کیا۔

''نہیں تو، یہاں بگ وغیرہ کا کیا کام؟ نکلنے کی کر و دیر ہو رہی ہے۔'' کوئین نے جواب دیا۔ ''نہ میں ایسی کسی چیز کی پہچان رکھتی ہوں۔''

نوٹس کے نیچے ویرن کا نام شاید ٹم کو کھٹک رہا تھا۔ اسے احساسِ جرم تھا کہ اس نے کوئین کو ویرن کے ساتھ مڈبھیڑ والی بات اس روز کیوں نہیں بتائی۔ اس روز ویرن کی حالت اسے مشکوک لگی تھی اور اب یہ نوٹس۔ تمام کمرے خالی ہوں گے، بغیر تالے کے... اور ویرن آزاد ہوگا۔ وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟ ٹم کا ذہن کہہ رہا تھا کہ یہ ڈراما ہے اور ویرن سیدھا کوئین کے کمرے میں آئے گا۔ خیر پتا چل جائے گا... ٹم نے خود کو تسلی دی۔

☆☆☆

ویرن، ایلیٹ کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں کمرا نمبر 252 میں موجود تھے۔ ایلیٹ کتابوں کے شیلف کے عقب میں سینسنگ یونٹ کو چیک کررہا تھا۔ پھر اس نے پوشیدہ جگہوں پر تاروں اور سرکٹ بورڈز کو جھنجوڑا...

''کیسا لگتا ہے؟'' ویرن نے پوچھا۔

''سب ٹھیک ہے، چیف۔''

''سب ٹھیک ہے تو پھر گڑبڑ کہاں ہے۔ کیا لڑکی کے سسٹم میں کوئی خرابی ہے؟ تیسری وجہ تو نظر نہیں آتی ....''

☆☆☆

کوئین چلتے چلتے رک گئی۔

''کیا ہوا؟''

''ابھی دس منٹ ہیں پیتھالوجی کی کلاس میں اور میں اپنے نوٹس کمرے میں ہی چھوڑ آئی ہوں۔ وہ واپس ''ڈومن کنٹری'' کی طرف جانا چاہتی تھی۔ ٹم ہچکچایا پھر وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔

کوئین حیرت کے ساتھ مڑی۔ ''کیا تم بھی کچھ بھول آئے ہو؟''

''نہیں لیکن میں تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔''

کوئین نے اسے گہری نظر سے دیکھا۔ ''مذاق کررہے ہو؟''

''نوٹس کے مطابق اس وقت وہ لوگ وہاں منڈلا رہے ہوں گے۔''

''میرے ہیرو۔'' کوئین نے اس کا بازو چھوا۔ ''شکریہ مگر اس کی ضرورت ....''

''کوئی بحث نہیں، وقت کم ہے۔ میں کسی انہونی کو آج کی رات برباد کرتے نہیں دیکھ سکتا۔''

''رئیل ہیرو۔'' کوئین ہنس پڑی۔ ٹم کو بہت اچھا معلوم ہوا۔ پانچ منٹ میں وہ پھر وہیں تھے۔ ویرن کوئین کے کمرے پر تھا۔ اس نے پلٹ کر حیرت سے دونوں کو دیکھا۔

''نوٹس نہیں پڑھا تھا، کیا؟'' وہ بولا۔

''بس ایک سیکنڈ۔'' کوئین نے کہا اور آگے بڑھی۔

"تم اندر نہیں جاسکتیں، اسپرے ہو رہا ہے۔"
"ہاں ٹھیک ہے۔" ٹم نے کہا اور ویرن کی دوسری جانب سے گھوم کر دروازے پر پہنچ گیا۔ بہت ہوگیا... اس نے سوچا۔ اس منزل پر باقی کمرے چھوڑ کر نمبر 252 میں اسپرے ہو رہا ہے۔ پہلے ہی کافی اتفاقات ہو چکے ہیں، اسے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔
ویرن اس کی طرف لپکا۔ لیکن دروازہ کھل چکا تھا۔ تقریباً تیس سالہ دراز قامت اور سیاہ بالوں والا کوئی آدمی وہاں کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹول باکس تھا۔ دوسرے ہاتھ میں دو گیلن کا اسپرے والا کنٹینر۔ وہ ٹم کو دیکھ کر مسکرایا۔
"کیسا چل رہا ہے؟" پھر اس نے ویرن کو مخاطب کیا۔ "اب کون سا کمرا؟"
"اوہ، ہاں اب نمبر 252۔" ویرن نے ٹم کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ٹم نے کوئین کو دیکھا جس کے چہرے پر مزاحیہ تاثرات تھے۔ کچھ غلط ہو رہا تھا لیکن وہ کیا بتائے؟ اسے کوئی صحیح آئیڈیا نہیں مل رہا تھا۔ وہ کمرے میں موجود آدمی کی جانب پلٹا جو ٹم کو ہی دیکھ رہا تھا بلکہ ٹم کو نہیں، اس کے بالائی لباس پر کسی چیز کو دیکھ رہا تھا۔
"اچھی پن ہے، کہاں سے لی؟" لمبا آدمی بولا۔
"کہیں سے نہیں، ملی تھی۔" ٹم نے جواب دیا۔
"مسٹر ویرن، دیکھیے، ایسی چیز پہلے کبھی دیکھی ہے؟" لمبے آدمی نے ویرن کی توجہ دلائی۔ ویرن گھوم کر ٹم کے سامنے آیا۔ اس کے عضلات میں تناؤ پیدا ہوگیا۔ گمشدہ بگ ٹم کے بائیں کالر کے نیچے موجود تھا۔
ٹم الجھن کا شکار تھا۔ "اس کو نوٹس مل گئے ہیں تو ہم چلتے ہیں۔"
"اوہ... ہاں، کیوں نہیں۔" لمبے آدمی نے کہا۔
کوئین مطلوبہ کاغذات لے کر باہر آگئی، اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور چل پڑی۔ "ٹم تم ٹھیک ہو؟" اس نے سرگوشی کی۔
"ہاں، کمرے کی کیا حالت تھی؟"
"کمرا ٹھیک تھا۔"
"کیوں؟"
"چلو، چلو جلدی کرو۔" وہ کلاس کی طرف جا رہے تھے۔ کوئین نے پھر اسے دیکھا تاہم خاموش رہی۔ ٹم جانتا تھا کہ کمرے میں کوئی کارروائی ہوئی ہے لیکن کیا ہوئی ہے؟ وہ اس جانب سے ذہن کو ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆☆☆

کرٹ کھل کر ہنس رہا تھا۔
"کون سا لطیفہ ہے؟" ویرن نے کہا۔
"ہم ایک ہفتے سے بگ کی تلاش میں چکرا رہے ہیں اور وہ لڑکا اسے اسٹک پن کی طرح کوٹ پر سجائے پھر رہا ہے۔" کرٹ پھر ہنسنے لگا۔ ایلیٹ نے احمقوں کی طرح دانت نکالے۔ ویرن نے دانت پیسے۔
"براؤن اور کلیری آج رات اٹلانٹک سٹی جا رہے ہیں چیف، شاید ہماری قسمت کی تبدیلی شروع ہونے والی ہے۔" ایلیٹ نے بتایا۔
"ہمیں بگ واپس ملنے والا ہے، ابھی اس کا راز نہیں کھلا۔" ویرن نے کہا۔ "لیکن اگر وہ اسی کوٹ میں روانہ ہوتا ہے تو پھر تم دونوں کو بھی اٹلانٹک سٹی جانا پڑے گا اور موقع ملتے ہی بگ واپس حاصل کرنا ہے لیکن یہ واردات صفائی کے ساتھ کرنی ہے۔" ویرن نے دونوں کو ضروری ہدایت دیں۔ وہ اب کچھ مطمئن نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

"مجھے امید ہے کہ میں کوئی غلطی نہیں کر رہی۔" کوئین نے اپنا بیگ "گریفن" میں اچھالا۔
ٹم نے اپنا بیگ بھی وہیں رکھا اور ڈکی بند کر دی۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"
"میرا مطلب ہے کہ ہم دوستوں کی حیثیت سے سفر کر رہے ہیں۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔"
وہ ہنس پڑا۔ "گڑبڑ؟"
"تم جانتے ہو میرا کیا مطلب ہے، میں نہیں چاہتی کہ کوئی غلط فہمی ہو۔"
"تم واقعی "کوئین" ہو۔" وہ بولا۔ "اور میں ہیرو... ہیرو کا کام "کوئین" کی حفاظت کرنا ہے اور صحیح سلامت کنگ تک پہنچانا ہے... ویسے کنگ ہے کون؟"
"کنگ کا ابھی کچھ پتا نہیں۔"
"ہائے... کب پتا چلے گا؟" ٹم نے ٹھنڈی سانس بھری۔
کوئین اپنی نشست سنبھال رہی تھی تو ایک سیاہ رنگ کی سیلیکا کار عین اس کے قریب آ کے رکی۔ وہ حیران ہوئی کہ پارکنگ کی متعدد خالی جگہوں کو چھوڑ کر وہ کار وہاں کیوں آن رکی۔ اس میں سے بھورے بالوں والا ایک ہٹا کٹا آدمی نکلا اور ان کی جانب دوستانہ انداز میں سر کو جنبش دے کر آگے بڑھ گیا۔ کوئین اسے پہچان گئی تھی۔ وہ اسے سائنس

سینٹری سیکیورٹی ڈیسک پر نظر آیا تھا۔ کوئین نے دیکھا کہ وہ اس کے قریب سے گزرتے وقت ٹم کو گھور رہا تھا۔

ٹم کی گاڑی کا انجن بیدار ہوا۔ کوئین نے خیالات کو جھٹکا۔ اب اس کی ذہنی رو ٹم کی طرف تھی۔ وہ اسے پسند کرتی تھی۔ تاہم یہ مناسب وقت نہیں تھا کہ کوئی سنجیدہ تعلق پیدا کیا جائے۔ ابھی کافی وقت پڑا تھا۔ فی الحال اسے مستقبل پر نگاہ رکھنی چاہیے۔

دونوں نیوجرسی کے روٹ 40 (فورٹی) پر تھے۔ ان کا رخ اٹلانٹک سٹی کی جانب تھا۔ ”مجھے روپوں کی خوشبو آرہی ہے۔ مجھے ابھی لائحہ عمل ترتیب دینا چاہیے۔“ ٹم نے کہا۔

”کیسا لائحہ عمل؟“

”ہم دونوں کھیلیں گے۔“

”نہ مجھے کھیلنا آتا ہے نہ میری استطاعت ہے۔“

”تم میرے پیسوں سے کھیلو گی۔“ ٹم نے اسے بلیک جیک کے بارے میں لیکچر دینا شروع کیا۔ اس نے کوئین کو بتایا کہ کیسینو والے کیسے جیتتے ہیں اور کھیلنے والوں کی ترکیبوں کو کیسے ناکام بناتے ہیں۔۔ اور وہ خود کیا کرتا ہے۔

”تو پھر تم کبھی کبھی کیوں کھیلتے ہو؟“

”یہ پیسوں کا یا ہار جیت کا سوال نہیں ہے۔ یہ طریقۂ کار کی بات ہے۔ کیسینو کا اپنا سسٹم ہے۔ میں پیسے جیتنے سے زیادہ سسٹم کو ہرانے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ ہر کارڈ میرے ذہن میں رہتا ہے اور میں کیسینو سسٹم کو ہرا سکتا ہوں۔“ وہ مسکرایا اور اپنی تکنیک کی مزید وضاحت کی۔ ”اب تو تم بھی ہو مدد کے لیے۔“

”کیا مطلب؟“

”جانتی ہو اس کا مطلب؟“ ٹم نے انگوٹھا اور چھوٹی انگلی بلند کی اور درمیانی تینوں انگلیوں کو تہ کرلیا۔ پھر وہ اس اشارہ کو آگے پیچھے کرنے لگا۔ ”یہ ہوائی (Hawai) کا مخصوص اشارہ ہے، جب میں یہ اشارہ کروں تو تم ہارنا شروع کردینا۔“ اس نے کوئین کو آنکھ ماری۔

”ہے... ہے...“ کوئین نے مکا دکھایا۔

”ارے بھئی، میری آنکھ میں کچھ گر گیا ہے۔“ ٹم نے دفاع کیا۔

☆☆☆

وہ دونوں کیسینو ٹیبل پر تھے۔ ٹم، کوئین کے عقب میں کھڑا تھا۔ وہاں تین مرد اور ایک عورت کھیل میں شریک تھے۔ کوئین کا تعارف اس نے نئے کھلاڑی کے طور پر کرایا۔ وہ ٹیبل کے قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے کوئین کو کھلا رہا تھا۔ جلد ہی کوئین 100 ڈالر ہار گئی۔ پھر ہاری... بالآخر 100 ڈالر جیتے اور پھر ہار گئی۔ دھیرے دھیرے وہ رواں ہوگئی۔ اسے مزہ آنے لگا۔ ایک نشست خالی ہوتے ہی ٹم کھیل میں شریک ہوگیا۔ اب دونوں انفرادی طور پر کھیل رہے تھے۔ ٹم دو اشارے استعمال کررہا تھا۔ ایک ہوائی والا اشارہ دوسرا اشارہ... وہ کہنی میز پر ٹکا کر مٹھی بند کرلیتا اور ٹھوڑی اس پر ٹکا دیتا... مطلب کوئین اب اپنے ذہن سے کھیلے۔ ٹم نے اشارے بہت کم استعمال کیے۔ ٹیبل پر آنے والا ہر کارڈ اس کی یادداشت میں محفوظ تھا۔ وہ اپنی مرضی سے ہار اور جیت رہا تھا۔

”بس کرو، ہنی... ڈنر کے لیے چلتے ہیں۔“ ٹم کھڑا ہوگیا۔

”بھوک لگنے لگی۔“

”... ہاں... کچھ کھا لینا چاہیے۔“ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

”گریٹ۔“ اس نے کوئین کے کان میں سرگوشی کی۔

”کتنے بن گئے؟“

”دو ہزار ڈالر۔“

کوئین خوش بھی تھی اور پریشان بھی۔ ”یہ سب تمہارے ہیں۔“

”اوہ... ہو، ابھی تو ابتدا ہے۔ کیا کرتی ہو؟ رکھو... ایک ہی بات ہے۔“ کوئین نے اسے گھورا تاہم خاموش رہی۔

”چلو پہلے باہر چلتے ہیں۔ مجھے تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔“ کوئین نے خواہش ظاہر کی۔

کوئین نے باہر آکر گہری سانس لی۔ وہ ریلنگ سے ٹکی ہوئی اٹلانٹک کی خنک ہوا سے لطف اندوز ہورہی تھی۔ تاریکی میں ڈوبے ساحل سے سمندر کی موجیں ٹکرا رہی تھیں۔

”میں ریت پر چلنا چاہتی ہوں۔“ اس نے جوتے اتارے۔ ٹم تو بندۂ بے دام تھا حالانکہ اسے جوتوں میں ریت کے خیال سے وحشت ہورہی تھی۔ کوئین نے سیڑھیوں پر قدم رکھا اور اسے وہی سنسنی محسوس ہوئی جو کیسینو میں ہوئی تھی کہ کوئی ان کی نگرانی کررہا ہے۔ اس کا یہ احساس پھر شدت سے ابھرا۔ وہ مڑی، بالائی ریلنگ پر اس کی نظر گئی۔ ریلنگ کے پاس دو تاریک سائے ان دونوں کی جانب دیکھ رہے تھے۔ کوئین کو کچھ مشکوک لگا۔ اس نے ٹم کے بازو کو پکڑ لیا۔ ”ہمیں واپس جانا چاہیے۔“ اس کی آواز میں سراسیمگی تھی۔

”ابھی تو آئے ہیں۔“

کوئین نے پھر اوپر دیکھا۔ دونوں مرد تھے اور اونی ٹوپی چڑھائی ہوئی تھی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اونی ٹوپیوں نے پورا چہرہ ڈھک لیا اور ماسک کی شکل اختیار کرلی۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے کی طرف آنے لگے جہاں وہ دونوں موجود تھے۔

”ٹم... م... م... م۔“ وہ چیخی۔ بھاری قدموں کی آواز ٹم کو بھی سنائی دی۔ وہ مڑا تاہم اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھتا، دونوں اجنبی ان کے سر پر پہنچ گئے۔ دونوں نے ٹم پر حملہ کیا اور وہ باقی ماندہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا ریت پر جاگرا۔ دونوں اسے مار رہے تھے اور اس کے کپڑوں کے ساتھ الجھے ہوئے تھے۔

چند سیکنڈ تک کوئین سکتے اور خوف کے عالم میں کھڑی رہ گئی۔ پھر اس نے مدد کے لیے چلانا شروع کردیا۔ ساتھ ہی وہ دوڑتی ہوئی جائے واردات پر پہنچ گئی۔ وہ کیا کرسکتی تھی۔ اس نے حملہ آوروں کی پشت پر مکے برسائے۔ ایک نے پلٹ کر اسے پرے دھکیل دیا۔ اس کی جیب سے کیسینو کے چپس نکل کر گر گئے۔ چھوٹے قد والے نے چپس سمیٹنا شروع کردیے۔ دوسرا ٹم کے ساتھ الجھا ہوا تھا۔ اسی اثنا میں کوئین سنبھل چکی تھی۔ دوسرا حملہ آور ٹم کو چھوڑ کر کوئین کی جانب جھپٹا۔ کوئین نے سیڑھیوں کی طرف دوڑ لگائی۔ ساتھ ہی وہ مدد کے لیے چیخ رہی تھی۔ ابھی وہ آدھے راستے میں تھی کہ لمبا آدمی اس تک پہنچ گیا۔ اسی وقت ٹم ظاہر ہوا... اس کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کا گھونسا ماسک کے نیچے حملہ آور کی ناک پر پڑا۔ کوئین نے عجیب سی آواز سنی ساتھ اذیت میں ڈوبی ہوئی چیخ۔ ٹم کا وار بھرپور اور نازک مقام پر لگا تھا۔ اس دوران پستہ قد نے اپنے ساتھی کو منظرِ عام سے ہٹا لیا۔

کوئین متواتر چلا رہی تھی۔ اس نے کیسینو سے باہر رنی گارڈز کو نکلتے دیکھا۔ وہ پلٹی لیکن دونوں حملہ آور تاریکی میں غائب ہوگئے تھے۔ ٹم ریلنگ کے ساتھ ٹکا ہوا ہانپ رہا تھا۔ کوئین اس کی طرف لپکی اور اسے بانہوں میں لے لیا... وہ رو رہی تھی۔

☆☆☆

”کم از کم میرے دانت تو بچ گئے۔“ ٹم ہوٹل کے کمرے میں بستر پر بیٹھا تھا۔ وہ دائیں رخسار پر برف کی ٹکور کررہا تھا۔

کوئین گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھی تھی۔

”تمہاری زندگی بھی جاسکتی تھی۔“ وہ دونوں ہوٹل اور سٹی پولیس ڈپارٹمنٹ کو تفصیلات بتا کر واپس آگئے تھے۔ اتفاقِ رائے پایا جاتا تھا کہ یہ لوٹ مار کی عمومی واردات تھی لیکن کوئین کے دماغ میں کچھ اور تھا، اسے یقین ہو چلا تھا کہ ان دونوں کی شروع سے نگرانی ہورہی تھی۔

ٹم کے اسپورٹس کوٹ کی بری حالت تھی۔ اس نے کوئین کو دیکھا اور اس کا بازو سہلایا۔ ”تم ٹھیک ہو؟“ کوئین کو اس کے خلوص اور تفکر کی حرارت اچھی لگی۔ اس نے سر ہلایا اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”تم بہت بہادر ہو۔“ ٹم نے ستائش کی۔

”بہادر؟“

”ہاں، تم پستہ قد کے ساتھ مصیبت میں تھیں۔ پھر بھی میری مدد کے لیے آئیں، میں نے دیکھا تھا۔“

”میں برداشت نہیں کرسکتی تھی، کیا مجھے تماشا دیکھنا چاہیے تھا؟“ کوئین قریب آگئی اور اپنا سر ٹم کے شانے پر رکھ دیا۔

”درد ہورہا ہے؟“

”اب نہیں۔“

کوئین جذباتی ہوگئی۔ اسے سانس لینے میں مشکل ہورہی تھی۔ ٹم کے لیے تمام تر اچھے احساسات نے اس کا احاطہ کرلیا تھا۔ تمام شکوک اور تحفظات کہیں گم ہوگئے۔ آج وہ ٹم کے ساتھ آگے کی دیوار عبور کرسکتی تھی۔ اس نے سر اٹھایا اور بڑی نرمی سے ٹم کے متورم نچلے ہونٹ پر اپنے گرم لبوں کی تپش منتقل کردی۔

”سوری۔“ کوئین نے کہا۔ ”مجھے نہیں پتا میں نے ایسا کیونکر کیا۔“ اور یہ سچ تھا... نہ اس کا ارادہ تھا۔ نہ اس نے سوچا تھا۔

”ایک بار اور۔“ ٹم نے گداز سرگوشی کی۔ ”لیکن دھیرے سے، ورنہ میں مرجاؤں گا۔“

پھر جو ہوا وہ فطری تھا۔ دھیرے سے شروع ہوا... کوئین کی نیلے کٹوروں جیسی آنکھیں بند ہوگئیں۔ نیند آنکھوں کے پیچھے ان گنت رنگ، انوکھے رنگ جو اس نے کبھی نہیں دیکھے تھے... رنگوں کی برسات تھی... وہ بے سدھ ہوگئی۔ اس کے روئیں روئیں میں ننھے دیے جل اٹھے۔ ٹم کی تمام تر تکلیف انوکھی گرم جوشی، غیر متوقع طلن نے جذب کرلی تھی۔ دونوں اس سحر انگیز مرحلے سے گزر گئے

جس کا ان دونوں نے نہیں سوچا تھا۔

☆☆☆

وہ پشت کے بل خاموش لیٹی تھی۔

''یہ کیا کر دیا ہم نے، ٹم۔'' بالآخر وہ بول پڑی۔

''تمہارا مطلب ہے کہ ہم نے ایک حسین دوستی کو نابود کر دیا؟''

''ہاں۔''

وہ قریب آ گیا اور ہونٹوں سے اس کے کان کو سہلانے لگا۔

''میں یقین سے کہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے لیکن ہمیں گزرے لمحات سے آنکھیں بھی نہیں چرانی چاہئیں۔''

''میں سمجھ رہی ہوں۔''

''کیا تم چاہتی ہو کہ ہم آئندہ اس حد تک نہ جائیں؟''

''نہیں، لیکن جب ہم تنہا ہوں گے تو کیا ہم پھر ایسا ہی چاہیں گے؟ ٹم! میں مزید ملوث نہیں ہونا چاہتی، کم از کم اس مرحلے پر۔''

''کیا تم ملوث ہو گئی ہو؟''

کوئین نے اسے دیکھا۔ کسی کے بارے میں اس کے ذہن میں کبھی ایسے احساسات نے جنم نہیں لیا تھا۔ یہ پیار تھا، محبت تھی... ''ہاں، ہاں ہاں... اور تم؟''

''میں نے تو جب پہلی بار تمہیں دیکھا تھا تب سے ہی ...'' وہ چپ ہو گیا۔ کوئین سمجھ گئی ٹم آگے کیا کہنا چاہتا ہے۔

☆☆☆

''تمہارے ساتھ کیا مصیبت آ گئی ہے؟'' ویرن نے کرٹ کو دیکھا۔ کرٹ کی سوجی ہوئی رنگین ناک پر بیگنی رنگ کی جھلک تھی۔ ''بگ کہاں ہے؟''

کرٹ نے ٹم کے کوٹ سے نوچا ہوا بگ ویرن کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ ویرن نے اسے زمین پر گرا کر جوتے کی ایڑی سے کچل دیا۔ ایلیٹ کونسول کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اور کرٹ ناک کے لیے برف کی تلاش میں نکل گیا۔ ویرن کچھ مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ تاہم وہ کوئین کو ایک مسئلہ سمجھ رہا تھا۔ ایلیٹ نے سینسنگ یونٹس کی بھرپور جانچ پڑتال کی اور مطمئن ہو گیا۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ گڑبڑ لڑکی کے ساتھ ہی تھی... کیا تھی؟

☆☆☆

اٹلانٹک سٹی کے حادثے کے ایک ہفتے بعد تک ٹم نے کافی بے قراری میں وقت گزارا۔ وہ اس کے قریب رہنا چاہتا تھا لیکن سات دن بہت مصروف رہے۔ کلاس، لیب اور کوئین کی عارضی ملازمت۔ مزید برآں رات تک دیر تک پڑھائی۔ دونوں کے پاس ساتھ گزارنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔

ڈاکٹر ہیرسن کی کلاس میں اس وقت ٹم نے کوئین کے چہرے پر مشکل اور الجھن کے آثار دیکھے، جب ہیرسن اوورسیز میڈیکل سہولتوں کی یکساں تقسیم کے حوالے سے مرکزی گورنمنٹ کی اتھارٹی کے خیالات کی تشریح کر رہا تھا۔

ٹم سمجھ نہیں سکا۔ خود اس کو تو ہیرسن کے خیالات دوسرے طلبا کی طرح بہت عمدہ لگ رہے تھے۔

''مریضوں کا کیا ہوگا؟'' کوئین نے سوال کیا اور قریباً ایک درجن سر کوئین کی جانب مڑ گئے۔

ہیرسن نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''مریضوں کی مختلف درجہ بندی ضروری ہے۔ وہ سب بہترین میڈیکل کیئر وصول نہیں کر سکتے۔ اور کسی کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ کس قسم کی میڈیکل کیئر کے لیے ان کی درجہ بندی کس طرح کی جائے۔ کوئی اس سے خوش نہیں ہوگا لیکن یہ ایک ناپسندیدہ حقیقت ہے جس کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

''ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مریض ہمیں جہاں بھی ملے ہمیں بہترین علاج کی کوشش کرنی ہوگی۔ ہم منتخب شدہ آبادی کے لیے ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ خدا کے کھیل ہیں ہم خدا کا کردار کیونکر ادا کریں گے۔'' کوئین متفق نہیں تھی۔

''لیکن گیم ایسے ہی چل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایگراہم کے گریجویٹ، پرائمری کیئر کے لیے خدمات انجام دیتے ہیں۔ یہ فرنٹ لائنز ہیں۔'' ہیرسن نے کہا۔

ٹم کے احساسات عجیب تھے۔ کہیں گہرائی میں وہ کوئین سے اتفاق کر رہا تھا لیکن کوئی اور چیز اسے ڈاکٹر ہیرسن کی طرف دھکیل رہی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ ہیرسن کے اختتامی فقرے کوئین کے سوال کے جواب میں حرف بہ حرف ٹم کے ذہن میں بھی آئے تھے۔ جیسے اسے اس کے لیے پہلے سے تیار کیا گیا ہو۔ یہ ایک ناقابلِ یقین اور پریشان کن بات تھی۔ ایسا کیسے ممکن ہے؟ دفعتاً وہ کلاس سے نکل گیا۔ وہ چل نہیں رہا تھا، دوڑ رہا تھا۔

☆☆☆

اٹلانٹک سٹی کے واقعے کے بعد ڈاکٹر ایلسٹن کی آمد تہ خانے میں موجود کنٹرول روم میں بڑھ گئی تھی۔ وہ کوئین کے [illegible] کچھ سننا چاہتا تھا۔ ویرن نے اسے آخری ہیرسن کی کلاس کی ریکارڈنگ سنائی۔ کوئین کے خیالات واضح اور [illegible] تھے۔ ویرن سمجھتا تھا کہ ایلسٹن کیا سوچ رہا ہے۔ تاہم کن کو الزام دیا جا سکتا تھا۔

''تم نے اس لڑکی کے سینسنگ یونٹ کے بارے میں کیا کیا؟'' ایلسٹن ویرن سے مخاطب تھا۔

''ہم بے بس ہیں۔ اس کے کمرے میں ہر چیز ٹھیک کام کر رہی ہے۔''

ایلسٹن خاموش تھا۔ آخر کار وہ تھکی ہوئی آواز میں بولا۔ ''کیا کیا جا سکتا ہے... سوائے اس کے....'' وہ پھر چپ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

☆☆☆

ٹم بے سکون تھا۔ رات وہ ٹھیک طرح سو نہیں سکا۔ صبح اس نے گراؤنڈ فلور کے شمالی بازو کا رخ کیا۔ وہاں طالب علم ہموکاؤچ پر لیٹا موی دیکھ رہا تھا۔ ٹم وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے موی نہیں دیکھی تھی تاہم وہ پیٹرویلر کو پہچان گیا۔ اسکرین پر پیٹرویلر کسی چیز کی تلاش میں اپارٹمنٹ کا تیا پانچہ کر رہا تھا۔ ٹم بے خیالی میں اسکرین کو گھور رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ہیرسن کی کلاس کے مناظر تھے۔ وہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ دوسروں کی طرح سوچتا ہے اسے فخر تھا کہ وہ دوسروں سے مختلف ہے لیکن اسے احساس ہو رہا تھا کہ انگراہم کے سسٹم میں وہ ایک دانشمند ''کلون'' بنتا جا رہا ہے بلکہ دوسروں کے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔ سوائے کوئین کے۔

اسکرین پر پیٹر اب ٹیلی فون کی پلیٹ کھول رہا تھا۔ ٹم کے خیالات معاً منتشر ہو گئے۔ کیمرے نے کلوز اپ دکھایا۔ پیٹر نے فون کے اندر سے کوئی مختصر سی چیز برآمد کر لی تھی۔ ٹم کرسی پر سیدھا ہو گیا۔ کیمرا کے کلوز اپ کے باعث وہ مختصر شے کو بخوبی دیکھ رہا تھا... یہ جانی پہچانی چیز تھی۔

''ہے جو۔'' وہ بولا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟ پیٹر کیا تلاش کر رہا ہے؟''

جونیو نے نگاہ ہٹائے بغیر جواب دیا۔ ''اس نے اپارٹمنٹ میں بگ دریافت کیا ہے۔''

ٹم کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کا ذہن خیالات کا جنگل بنا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کھلی فضا میں کھڑا تھا۔ دسمبر کی سرد رات میں۔ اس نے زندگی میں بگ جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی۔ نہ انگراہم میں۔ وہ کڑیوں سے کڑیاں ملا رہا تھا۔ میڈیکل اسٹوڈنٹس کے لیے بگنگ کی کیا ضرورت تھی۔ کمرا نمبر 252 میں ویرن کی کیا دلچسپی تھی۔ یہ پُراسرار اور خوفناک چیز تھی۔ انہوں نے بگ ٹم کے کوٹ پر دیکھ لیا تھا۔ ٹم کو اب پتا چلا کہ وہ کوئی بگ انسٹرومنٹ تھا۔ ٹھیک بارہ گھنٹے بعد اٹلانٹک سٹی میں اس نے رقم بھی کھو دی تھی اور پن اسٹک بھی۔ رقم کا ڈراما تھا۔ وہ لوگ بگ کے پیچھے تھے۔ کیا انگراہم میں ہر چیز کی نگرانی ہو رہی ہے۔ یہاں کوئی پرائیویسی نہیں ہے لیکن آخر کیوں؟ اگر کوئین کا کمرا بگڈ تھا تو پھر اس کا بھی ہوگا۔ وہ پلٹا اور اپنے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

اس نے اپنے روم میٹ کیون کو قائل کر لیا کہ وہ ایک رات ہال میں یہاں کہیں اور گزارے کیونکہ وہ کچھ وقت کوئین کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں اور وومین کنٹری میں شور بہت ہوتا ہے۔ کیون رضامند ہو گیا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کوئین کا نام سن کر کچھ اور سمجھ بیٹھا تھا۔

''مزے کرو دوست۔'' کیون نے جاتے جاتے کہا۔ ٹم بمشکل مسکرایا اور اس کے نکلتے ہی کمرا لاک کر دیا۔

ٹم نے کمرے کی تلاشی لینی شروع کی۔ کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ تاہم اسے مایوسی ہوئی۔ وہ ہار ماننے والا نہیں تھا۔ بالآخر چھت کے دو بلبوں کی وائرنگ کے عقب میں اس نے اسٹک پن دریافت کر لی۔ جو تار میں احتیاط سے اٹکی تھی جس کا دیکھ لیا جانا ممکن نہیں تھا۔ وہ سنسنی محسوس کر رہا تھا۔ کیا کرے؟ شہادت اسے مل گئی تھی۔ ویرن کو رپورٹ کرنا تو خود کو خطرے میں ڈالنا تھا۔ پھر کس کو بتائے۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ انگراہم محض ایک میڈیکل کالج ہی نہیں ہے بلکہ یہاں کسی قسم کی خفیہ سرگرمیاں بھی جاری ہیں۔ طلبا کے ذہن میں خیالات پلانٹ کیے جا رہے ہیں۔ برین واشنگ یا ہپناٹائز؟ لیکن کس طرح... یہ بگ کافی نہیں ہے۔ کمروں میں مزید آلات بھی ہوں گے۔ لیکن کہاں وہ پہلے ہی کمرا بری طرح کھنگال چکا تھا۔ اس کی نظر بستر کے سرہانے پر گئی جو لکڑی کا بنا تھا۔ اس نے احتیاط سے بگ اس کی جگہ پر لگایا۔ وہ سننے والوں کو ہوشیار نہیں کرنا چاہتا تھا پھر اسکرو ڈرائیور لے کر وہ لکڑی کے سرہانے پر آ گیا۔

☆☆☆

''یو، چیف۔''

ویرن ''شاٹ گن نیوز'' سے نگاہ ہٹا کر ایلیٹ کی جانب متوجہ ہوا۔ جو کونسول کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ ویرن اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا ہے؟''

''کمرا نمبر 125 میں سے عجیب آوازیں آرہی ہیں۔''

''کیسی آوازیں؟''

''فرنیچر اِدھر اُدھر کرنے کی۔''

ویرن نے سوچا۔ ''بگ کام کررہا ہے؟''

''بگ کو کسی نے نہیں چھویا۔''

''تو کیا وجہ ہوسکتی ہے، کیا وہ کوئی چیز ڈھونڈ رہا ہے؟''

''پتا نہیں۔'' ایلیٹ نے کہا۔ ''تاہم پانچ منٹ قبل سینسنگ مُردہ ہوگیا تھا۔''

''کیا خیال ہے، کیا وجہ ہوسکتی ہے؟''

ایلیٹ نے ویرن کو دیکھا۔ ''میرے خیال میں ٹمپرنگ۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ بستر کے سرہانے میں؟''

''بالکل۔'' ایلیٹ نے سرہلایا۔ ''غالباً اس نے یونٹ کا پلگ نکال دیا ہے۔''

''کس نے؟''

''براؤن دی کڈ۔''

ویرن نے لرزتے ہاتھوں سے آنکھوں کو مسلا۔ کیا دو سال قبل والا واقعہ دہرایا جانے والا ہے۔ ''کرٹ کو بلاؤ اور لڑکے کو یہاں لاؤ۔''

''احتیاط کرو چیف۔'' ایلیٹ نے کہا۔ ''یہ ایک غلط فہمی بھی ہوسکتی ہے۔''

''جہنم میں جاؤ۔ یہ براؤن کڈ جب سے یہاں آیا ہے کوئی نہ کوئی پریشانی آتی رہتی ہے۔ ہمیں اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔''

ایلیٹ نے کرٹ کو بلالیا۔ اس نے ساری بات سن کر اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔ اس کا السر پریشان کررہا تھا۔ ٹربل ــــ

☆☆☆

اسٹیل بولٹ کھولنے اور ہیڈ بورڈ کو الگ کرنے میں ٹم کو ایک گھنٹا لگ گیا۔ جو کچھ اس نے دیکھا، نہ کبھی دیکھا تھا نہ وہ اسے سمجھ سکا۔ وائرز، سرکٹ بورڈ اور ایک چمکتی ہوئی سیاہ رنگ کی ڈسک۔ یقیناً یہ سارے خفیہ انتظامات ہر کمرے میں ہوں گے۔ اگر اس کی کارروائی کے نتیجے میں کہیں الارم بجا ہو تو کیا ہوگا۔ وہ خوف زدہ ہوگیا تھا۔ اسے یہاں سے نکلنا چاہیے۔ اس نے سوچا کہ کاش وہ یہ سب کچھ نہ کرتا وہ خود کو تنہا محسوس کررہا تھا۔ کوئی اس سمیت طلبا کے اذہان کو ٹمپر کررہا تھا۔ وہ کس طرح یہ برداشت کرسکتا تھا۔ صرف کوئین غیر متاثر لگ رہی تھی۔ شاید اس کے کمرے کے آلات میں کوئی خرابی تھی۔ تب ہی ویرن، کوئین کے کمرے پر منڈلاتا رہا تھا۔

اسے کوئین کو باخبر کرنا ہوگا۔ دونوں کے پاس ایک دوسرے کے کمرے کی ایک ایک چابی تھی۔ کوئین کے کمرے کی چابی اس نے جیب میں ڈالی۔ چلتے چلتے اس نے ایک نوٹ پیڈ اور قلم بھی رکھ لیا۔

☆☆☆

کوئین کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ چند لمحوں تک اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کیا ہوا۔ دوسری مدھم دستک نے اسے احساس دلایا کہ دروازے پر کوئی ہے پھر دروازہ کھل گیا۔ کوئین کو تعجب ہوا۔

''ٹم تم ہو؟''

ٹم نے دروازہ بند کرکے فوراً بتی روشن کی اور ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔ کوئین اسے دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی۔ ٹم ہراساں تھا... اس کی آنکھوں میں دہشت کی جھلک تھی۔

کوئین کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ کچھ بول نہ سکی۔

ٹم نے تیزی سے نوٹ پیڈ پر قلم چلایا اور اس کی آنکھوں کے سامنے کردیا۔ کوئین کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اس کا دماغ کام نہیں کررہا تھا۔

ٹم نے پھر لکھا۔ ''مجھے کار میں ملو۔''

دونوں ہی حیران و پریشان تھے... کیا ہورہا ہے... اور کیا ہونے جارہا ہے۔

☆☆☆

''کیا تم سن رہے ہو چیف؟'' ایلیٹ نمبر 125 سے بول رہا تھا۔

''ہم اس کے کمرے میں ہیں۔ تاہم وہ نکل چکا ہے۔ سارا کمرا ادھڑا پڑا ہے۔ ہیڈ بورڈ بھی... ہم اسے تلاش کرنے باہر جارہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، آؤٹ۔'' ویرن نے اتفاق کیا۔

بہت برا ہوا۔ اسے ایلسٹن کو بتانا پڑے گا۔ دو سال قبل کا بھیانک خواب خود کو دہرا رہا تھا۔ اس نے فون اٹھایا۔ اس کی انتڑیاں آپس میں الجھ گئیں جیسے پیٹ میں اینٹھن ہورہی تھی۔

☆☆☆

ٹم سیڑھیوں کی طرف بھاگ رہا تھا تب اسے احساس ہوا کہ کار کی چابیاں تو کمرے میں ہی رہ گئی ہیں۔ اسے رکنا پڑا۔

جب اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو کمرا تاریک تھا۔ کیا اسے روشنی کرنی چاہیے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے اس کا بازو پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا۔ اس نے چیخنا شروع کیا لیکن گردہ کے مقام پر لگنے والی خوفناک ضرب نے اس کی چیخ کو کراہ میں بدل دیا۔ اس کا منہ کھل گیا، خود وہ گھٹنوں کے بل زمین بوس ہوگیا۔ اس کے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے تھے اور منہ میں کوئی چیز ٹھونسی جارہی تھی۔ اس نے دیوانہ وار مزاحمت کی کوشش کی۔ لیکن اس کے ہاتھ عقب میں بندھ گئے تھے اور اب آنکھوں پر بھی ٹیپ لگا دیا گیا تھا۔ وہ بے بس تھا۔

☆☆☆

کوئین کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کوئی بہت خراب بات ہوگئی ہے یا ہونے والی ہے۔ یہ ایک پُراسرار بات تھی کہ سارے کمرے بگڈ ہیں، دیگر تفصیلات ٹم اسی لیے اسے کار میں بتانا چاہ رہا تھا۔ ٹم کی کار پارکنگ میں اپنی مخصوص جگہ پر تھی۔ اس نے کار میں جھانکا، کوئی نہیں تھا۔ کیا ہورہا ہے؟ ٹم کہاں ہے؟ سردی اور خوف نے مل کر اسے کانپنے پر مجبور کردیا۔ وہ ٹریک سوٹ اور جیکٹ میں تھی تاہم سردی کی شدت اثر انداز ہورہی تھی۔ اس نے ٹم کو دی ہوئی چابی رنگ میں سے منتخب کی اور لاک کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

☆☆☆

ٹم نے دہشت کو پرے دھکیلنے کی کوشش کی اور خود کو بحال کرنے لگا۔ یہ احساس ضروری تھا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ یہ اچھی بات تھی۔ دوسری بات وہ زخمی نہیں تھا۔ تیسری بات... اس نے اندازہ لگایا کہ وہ اب بھی کیمپس میں ہے۔ وہ لوگ جب اسے بے دست و پا کرکے وہیل چیئر میں لے کر روانہ ہوئے تھے تو وہ راستوں کا اندازہ لگا رہا تھا۔ جہاں لاکر اسے بازوؤں والی کرسی سے باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے بہترین اندازے کے مطابق وہ کسی تہ خانہ میں تھا اور یہ تہ خانہ سائنس سینٹر میں تھا۔

معاً کسی نے اس کے منہ پر سے ٹیپ کھینچ لیا۔ جب آنکھوں سے ٹیپ ہٹایا گیا تو ٹم کو تکلیف ہوئی۔ تاہم اب وہ بات کرسکتا تھا اور دیکھ بھی سکتا تھا۔ اس نے آنکھیں میچیں... ان کو بار بار کھول اور بند کیا تو اس کی نگاہ نے صحیح طرح کام کرنا شروع کردیا۔

''مسٹر براؤن... مسٹر براؤن۔'' ایک تھکی ہوئی آواز آئی جسے ٹم نے فوراً پہچان لیا۔ ڈاکٹر ایلسٹن سامنے آگیا۔ ٹم نے آنکھیں جھپکائیں۔

''تمہیں پتا ہے کہ ہم تمہارے ساتھ کیا کرنے والے ہیں؟'' ڈاکٹر نے سوال کیا۔

''ڈاکٹر تم اس سارے چکر میں ملوث ہو؟''

''کون سا چکر، براؤن! تم کیا سمجھ رہے ہو؟ یہاں کیا ہورہا ہے؟''

ٹم نے اطراف میں دیکھا... کمپیوٹرز، سرکٹس، تاریں، کونسول، اسپیکرز، ہیڈ فونز۔ ڈیٹیکٹر... یہ ان کا مرکزی کنٹرول روم تھا جہاں سے وہ انگراہم میں ہر جگہ کی نگرانی کرسکتے تھے۔ ٹم کا شک درست ثابت ہوا تھا۔ اسے اپنی جان واضح طور پر خطرے میں نظر آئی۔ ٹم کو بہت سے سوالات کا جواب مل گیا تھا۔ مزید برآں وہ بہت سے رازوں سے آگاہ ہوگیا تھا۔ اس نے پھر نگاہ ایلسٹن پر مرکوز کی جو مسکرا رہا تھا۔

''نہیں نہیں... مسٹر براؤن ہم تشدد نہیں کریں گے لیکن تمہیں اس وقت تک رکھیں گے جب تک ہم ٹارگٹ حاصل نہیں کرلیتے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

ٹم لیب کے چوہے کی طرح پھنس گیا تھا اور بخوبی آگاہ تھا کہ ایسی جگہوں پر چوہے، بلیوں کے ساتھ کیا کیا جاتا ہے۔ کیا ایلسٹن ایک ڈاکٹر، محقق اور استاد نہیں ہے؟

ایلسٹن نے پھر کہا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

ٹم کو معلوم تھا کہ ایسا اس کے ساتھ کیوں ہوا؟ پھر بھی اس نے سوال کیا۔ ''آخر تم اس حد تک کیوں چلے گئے؟''

ایلسٹن نے ویرن کی طرف دیکھا۔ ''اگر تم کو بگ نہیں ملتا تو تم اب بھی ایک اچھے طالب علم کی طرح ہوتے۔''

ٹم نے فیصلہ کیا کہ اسے کھل جانا چاہیے۔ ''ایسا پھر بھی نہیں ہوتا۔ دوسرے طلبا کے یکساں خیالات نے میرے اندر ہونے والی تبدیلی سے مجھے باخبر کیا۔''

''اس کا اشارہ لڑکی کی طرف ہے شاید۔'' ویرن نے کہا۔

ٹم نے فوراً ردِعمل ظاہر کیا۔ ''اگر اسے کچھ ہوا تو...''

''تو کیا کرلوگے؟'' ویرن نے منہ بنایا۔

''خاموش بیٹھو اور سنو۔ جب تم پوری کہانی سن لوگے تو تمہاری سوچ تبدیل ہوجائے گی۔'' ایلسٹن نے کہا۔ ٹم اسے گھورتا رہا۔ ایلسٹن نے آغاز کیا۔ ''مسٹر کلیڈرمین نے جب 'فاؤنڈیشن' کی بنیاد رکھی تو اس نے ہم خیال لوگوں کا

بورڈ بنایا۔ یہ لوگ بااثر اور حکومتی حلقوں میں اہم عہدوں پر فائز تھے۔ نہ صرف امریکا میں بلکہ امریکا سے باہر بھی۔۔۔ کلیڈرمین فارما، امریکا میں قائم کی گئی۔ سینیٹر نے دیوار کی تحریر قبل از وقت پڑھ لی تھی۔ نئی ڈرگ پالیسی زیرِغور تھی۔ اس کے پاس ہونے کے بعد کسی بھی دوائی کو مارکیٹ میں لانا اور بھی مشکل ہو جاتا۔ جب تک کوئی غیر معمولی آئیڈیا سامنے نہیں آتا۔ نئی پالیسی کا پروسس پیچیدہ اور طویل تھا۔ بلکہ طویل تر۔۔۔ بیمار دنیا کے لیے ادویات لانے کے لیے اس نے اک نیا خیال انگراہم کی شکل میں پیش کیا اور اسے عملی جامہ پہنایا۔

''اور یہ خیال جان کلیڈرمین کو کھرب پتی بنانے کے لیے کافی تھا۔'' ٹم نے زبان کھولی۔

''میں نہیں سمجھتا کہ مقصد پیسا تھا۔ درحقیقت وہ ایک انقلابی نظریہ رکھتا تھا۔ انسانیت کے لیے بیماریاں، جان لیوا عوارض، کسی آفت سے کم نہیں۔ اور عام بیوروکریٹس ان بیماریوں سے نمٹنے کے لیے ادویات کے ضمن میں سرخ فیتے کے سامنے کئی کئی سال نکال دیتے ہیں۔ مسٹر کلیڈرمین نے حیران کن طریقۂ کار وضع کیا، جس میں، میں ان کے ساتھ ہوں۔

'' ہر کوئی فیڈرل ڈرگ اتھارٹی سے شاکی ہے لیکن کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ میڈیکل سینٹر بنا کسی تفریق کے ہر ایک کو بہترین توجہ بلامعاوضہ فراہم کرتا ہے۔ سینیٹر نے میڈیکل سینٹرز، نرسنگ ہومز اور فارما کمپنی کو مربوط کیا۔ سب کو KMI کی چھتری کے نیچے اکٹھا کیا۔ KMI فاؤنڈیشن کو فنڈ دیتی ہے اور فاؤنڈیشن، انگراہم کو۔''

''بہت خوب۔'' ٹم نے پھر زبان کھولی۔ ''لیکن کہیں بھی بگس وغیرہ کی وضاحت نظر نہیں آتی۔''

''مسٹر براؤن! مجھے ذرا بتاؤ کہ کیا تمہیں آئیڈیا ہے کہ امریکا کی مارکیٹ میں نئی دوا لانے کی اس وقت کیا لاگت ہے؟''

''پچاس ملین۔'' ٹم نے ہوا میں تیر پھینکا۔

''اوہ کاش ایسا ہوتا۔'' ایلسٹن نے قہقہہ لگایا۔ ''230 ملین ڈالر۔۔۔ کیا سمجھے؟''

ٹم ہونق بنا رہا۔ وہ پوری کہانی سننا چاہتا تھا۔ اس نے پلکیں جھپکائیں۔ ''مگر تم پیٹنٹ کے بعد چند سال میں لاگت پوری کر لیتے ہو۔'' ٹم نے تکا چلایا۔

''اونہہ۔۔۔ کمپاؤنڈ رجسٹرڈ ہونے کے بعد صرف سات سال تو FDA سے اجازت لینے میں لگ جاتے ہیں۔ حقوق ملنے کے بعد آپ کے پاس دس سال ہوتے ہیں دوا کو مارکیٹ میں فروخت کے لیے۔

''لیکن منافع اصل نکتہ نہیں ہے۔ بات غیر معمولی انسانی زیاں کی ہے جسے کو مفید ادویہ سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ FDA سے اجازت کے لیے شیلف میں پڑی رہتی ہیں۔ دس ہزار تجرباتی کمپاؤنڈز میں سے محض 10 آگے جاتے ہیں اور ان میں سے بھی صرف ایک کو انسانوں پر استعمال کی اجازت ملتی ہے۔ پھر 10000 میں سے یہ ایک دوا مارکیٹ میں آتی ہے۔ مسٹر براؤن! کامیابی کا تناسب 1000 میں سے صرف ایک کو 10 برس میں 9999 کمپاؤنڈز کی لاگت بھی۔ ہے کوئی تجویز تمہارے پاس؟'' ڈاکٹر نے ٹم سے پوچھا۔

ٹم نے تھوڑی دیر سوچا پھر بولا۔ ''ابتدائی برسوں میں ناکام ہونے والے کمپاؤنڈز کی پہلے ہی چھانٹی کر دی جائے۔''

ایلسٹن کے دانت نکل آئے اور اس نے تالی بجائی۔

''بالکل ٹھیک۔ یہی کلیڈرمین کا فارمولا ہے۔ وقت اور پیسا دونوں کی بچت اور مریض کا بھی فائدہ۔''

''تو کیا تم لوگ براہ راست انسانوں پر تجربہ کرتے ہو؟''

''نہیں ایسا بھی نہیں ہے۔'' ڈاکٹر رکا پھر گویا ہوا۔ ''پہلے ہم جانوروں پر تجربہ کر کے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ فلاں کمپاؤنڈ زہریلا تو نہیں۔۔۔ پھر اسے انسانوں پر آزماتے ہیں۔''

ٹم ناقابلِ یقین انداز میں اسے گھور رہا تھا۔

''اصل مسئلہ کیا ہے؟'' ڈاکٹر نے بات آگے بڑھائی۔ ''اصل مسئلہ ہے انسانوں یا مریضوں کی سپلائی جن پر دوا کی افادیت کو پرکھا جا سکے۔ یہاں سے انگراہم کے گریجویٹس کا کام شروع ہوتا ہے۔''

ٹم کو کینٹین کا نوٹس بورڈ یاد آیا جس کی سرخی تھی۔ ''وہ لوگ اب کہاں ہیں؟'' تقریباً سب اندرونِ شہر یا انگراہم سے قریب میڈیکل سینٹرز اور نرسنگ ہومز۔۔۔

''ہم دوسروں کی طرح عام گریجویٹس پروڈیوس نہیں کرتے۔ مخصوص گریجویٹ۔۔۔ انگراہم گریجویٹ۔۔۔ جیسے عام اس بال کو خاص پہچان دی جاتی ہے۔ گیند پر ملک کا یا کلب کا نشان چسپاں ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر نے وضاحت کی۔ ''ایسے گریجویٹ ہماری ضرورت پوری کرتے ہیں۔''

''تو تم اعتراف کر رہے ہو کہ طلبا کی برین واشنگ کی جاتی ہے۔۔۔ انگراہم میں؟'' ٹم نے کہا۔

''نہیں نہیں۔۔۔ اسے صرف رویوں کی ایڈجسٹمنٹ کہا جاتا ہے۔ ہم تمہاری شخصیت نہیں بدلتے۔ اس ایڈجسٹمنٹ کی بنا پر انگراہم گریجویٹ ''بیکار'' مریضوں کو انگراہم میں ریفر کر دیتے ہیں۔''

''بیکار مریض؟''

''ہاں، جو ویسے ہی مرنے والے ہیں یا جن کا کوئی والی وارث نہیں ہے۔''

ٹم کو ڈوروتھی یاد آئی۔ کیا وہ محض ایک بے سہارا کے طور پر یہاں لائی گئی تھی جس پر تجرباتی دوا کو آزمایا گیا۔

اس کے دل میں نفرت کی لہر نے جنم لیا۔ ''میڈیکل کیئر کی راشننگ (راشن بندی) یہ سب سموک اسکرین ہے۔'' ٹم نے سوچا کہ اس وقت اسے انگراہم کے اسرار کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنی چاہئیں۔ یہی موقع تھا کیونکہ وہ لوگ اسے قابو کر کے بےفکر نظر آرہے تھے۔ انہیں بےفکر ہونا بھی چاہیے تھا۔ ٹم کو احساس تھا کہ کوئی کرشمہ ہی ان جنونیوں سے اس کی جان چھڑا سکتا ہے۔

''کلیڈرمین ایکویشن کیا ہے؟ اور اس سے متعلق سوالات کی تحریری ٹیسٹ میں شمولیت کا کیا مقصد ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

ایلسٹن نے دلچسپی سے ٹم کو دیکھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میرے اندازے کے مطابق اگر میں تمام سوالات کے جواب ٹھیک دیتا اور کلیڈرمین ایکویشن کے تین سوالات کے جواب نہ دے پاتا تو مجھے مسترد کر دیا جاتا اور میرے خیال میں تمام مسترد امیدوار کلیڈرمین ایکویشن کی وجہ سے ہی مسترد ہوئے تھے۔ کیا نہیں؟'' ٹم نے استفہامی نظر سے دیکھا۔

''تمہارا دماغ ضرورت سے زیادہ کام کرتا ہے۔'' ڈاکٹر نے اسے شاباشی دی۔ ''کلیڈرمین ایکویشن کچھ بھی نہیں ہے۔ اس لیے اس کا جواب بھی کسی کو نہیں معلوم۔''

''پھر میں نے ٹھیک جواب کیسے دیے؟''

''تمام امیدواروں کو ٹیسٹ سے قبل رات کیمپس میں گزارنی پڑتی ہے اور مقررہ وقت پر سب سو جاتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''سو جاتے ہیں یا بےہوش کر دیے جاتے ہیں؟''

''تم بہت ہوشیار ہو لڑکے۔'' ڈاکٹر نے اعتراف کیا۔ ''بےہوش تو نہیں البتہ اس رات کھانے میں ایک خاص دوا کی آمیزش کے باعث وہ نیند کی مخصوص حالت میں ہوتے ہیں۔ اس دوران میں ان کے دماغ میں کلیڈرمین ایکویشن کے جوابات داخل کیے جاتے ہیں۔''

''کس طرح؟ اور کیوں سب لوگ جواب نہیں دے پاتے؟'' ٹم نے مداخلت کی۔

''اس کا جواب طویل ہے مسٹر براؤن۔ بس یوں سمجھ لو کہ یہ ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم کی شاخ کا امتزاج ہے جسے "THAT" (دیٹ) کا نام دیا گیا ہے۔ ٹیلی ہپناٹک ایپٹی ٹیوٹ ٹیسٹ۔''

''میں نے کہیں نہیں پڑھا، نہ سنا۔''

''بالکل۔'' ڈاکٹر نے ٹم کی بات کاٹی۔ ''تم نے کیا، کسی نے بھی نہیں سنا۔ یہ انگراہم کی اپنی تحقیق ہے اور ''دیٹ'' پر مزید کام جاری ہے جس امیدوار کا دماغ ''دیٹ'' کو قبول نہیں کرتا وہ امیدوار کلیڈرمین ایکویشن کے جواب نہیں دیتا اور ہم اسے مسترد کر دیتے ہیں۔ تم لوگوں کے بستروں میں جدید قسم کے ''سینسرز'' اور ''اسپیکرز'' موجود ہیں۔ کنٹرول روم سے ریکارڈڈ ہدایات لہروں کی شکل میں دماغ تک پہنچتے ہیں۔''

''جناب آپ یہ سب کیوں۔۔۔۔'' ویرن نے ڈاکٹر کو ٹوکا۔

''ڈیئر ویرن! ہمارا کوئی نقصان نہیں ہے۔ مسٹر براؤن کا اتنا حق تو بنتا ہے کہ وہ اپنی آخری خواہش پوری کر لے۔''

ڈاکٹر کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ٹم کے بدن میں ایک بار پھر سرد لہر دوڑ گئی۔ اس نے مایوسی پر قابو پانے کی کوشش کی۔

''یعنی برین واشنگ۔۔۔۔''

''پھر برین واشنگ؟'' ڈاکٹر نے منہ بنایا۔ ''نہیں بیٹا۔۔ تمہاری یادداشت اور شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ صرف ''رویے کی ایڈجسٹمنٹ'' ہے۔ آسان الفاظ میں یوں کہو کہ ''انگراہم کے گریجویٹس کو انگراہم کے ''طبی نظریات'' سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔''

''سب لوگ جواب نہیں دے پاتے، اس کا مطلب ''دیٹ'' میں نقص ہے؟'' ٹم نے نیا شوشہ چھوڑا۔

''نہیں، ''دیٹ'' کے رزلٹ حسب توقع ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ ہم اس کو مزید مؤثر بنا رہے ہیں۔''

''کورین نے بتایا تھا کہ وہ تین میں سے ایک سوال کا جواب نہیں دے سکی تھی۔'' ٹم نے تجاہلِ عارفانہ سے کام

لیا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے اور یہی بات ہمارے لیے باعثِ تشویش تھی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ یا تو طالب علم تینوں جوابات دیتا ہے یا پھر ایک بھی نہیں۔'' ایلسٹن کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

ٹم نے اپنی مسکراہٹ کو دبایا۔ صرف وہ جانتا تھا کہ کوئین کو بھی تینوں سوالات کے جواب نہیں پتا تھے۔ وہ اس بات سے خوش تھا کہ انگرا ہم کو کچھ نہیں پتا اور وہ اس معاملے میں ابھی تک تشویش میں مبتلا ہیں۔ ڈاکٹر نے ''دیٹ'' کے متعلق جس مزید تحقیق و تجربات کا ذکر کیا تھا وہ یقیناً اسی نکتے سے متعلق ہوسکتا تھا۔ اگر وہ لوگ ''دیٹ'' میں الجھ گئے تو ''دیٹ'' میں خامیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ کیونکہ ''دیٹ'' پہلے ہی صحیح کام کر رہا تھا اور اصل بات صرف ٹم کو پتا تھی۔ اگرچہ کوئین اور میٹ بھی جانتے تھے کہ ٹم نے کوئین کے دو سوالات کے جواب دیے تھے۔ تاہم وسیع تناظر میں ٹم ہی جانتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' ایلسٹن نے چمکیلی آنکھوں سے اسے گھورا۔

''تم لوگوں کو ''دیٹ'' کی خامیاں تلاش کر کے ٹھیک کرنا چاہئیں۔'' ٹم نے دانستہ ان کو ''دیٹ'' میں چھیڑ چھاڑ کرنے کا مشورہ دیا۔ اسے یقین تھا کہ اس چھیڑ چھاڑ کے نتیجے میں ''دیٹ'' میں خرابیاں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ کیونکہ وہ لوگ تشخیص سے بے خبر تھے۔ ٹم کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا۔

''تم کیوں مشورہ دے رہے ہو؟'' ویرن نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

ٹم نے تیزی سے فیصلہ کیا۔ ''میں محسوس کرتا ہوں کہ شاید تم لوگ ٹھیک ہی کر رہے ہو۔'' وہ بولا۔ ''کیا تمام اسٹاف ملوث ہے؟''

''ظاہر ہے نہیں۔ صرف اہم افراد جانتے ہیں۔''

''ڈاکٹر کتنی اموات تمہارے ہاتھوں ہو چکی ہیں؟''

ڈاکٹر کا منہ بن گیا۔ ''میں کوئی ولن نہیں ہوں، میں اپنا کام پوری احتیاط سے کرتا ہوں جس کا مقصد انسانیت کی فلاح ہے۔''

'اونہہ، میں سب سمجھ رہا ہوں۔' ٹم نے دل میں سوچا اور بولا۔ ''میں اس چیز کو سراہتا ہوں۔''

''کیا تم ہمارے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہو؟'' ڈاکٹر نے گہری نظر سے اسے دیکھا۔

''میں غور کر رہا ہوں۔'' ٹم نے جواب دیا۔ ''آپ یہاں کیسے پہنچے؟''

''FDA کے پروٹوکول اور پالیسیز پر میرے کچھ تنقیدی آرٹیکل شائع ہوئے تھے۔ اس کے بعد مجھے آفر ہوئی اور میں انقلابی کام کرنے کے لیے انگرا ہم سے جڑ گیا۔''

''کیا مجھے شامل کیا جا رہا ہے؟'' ٹم نے چہرہ سپاٹ رکھتے ہوئے امید و بیم کی کیفیت میں تیسرا پتا پھینکا۔ ''لیکن مجھے پتا نہیں کہ یہ سارا نظام کس طرح کام کر رہا ہے؟''

ایلسٹن مسکرایا۔ ''ہم پہلے ہی کامیابیاں حاصل کر رہے ہیں... کتنی ہی بہترین ادویات اور کمپاؤنڈز دریافت کر چکے ہیں اور ان کو خفیہ طریقے پر آزما بھی چکے ہیں۔ کتنی زندگیاں بچا چکے ہیں... یہ دوائیں تحقیقات کے جنگل میں گم ہو جاتیں اگر ہم اپنے پروگرام کے تحت نہ چلتے۔''

''میں اس نظر سے کبھی نہیں دیکھ پایا تھا۔'' ٹم پُر امید تھا کہ کسی طرح ایلسٹن کے دل میں نرم گوشہ حاصل کر لے۔ ''مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں کچھ غلط سمجھ رہا تھا۔''

ایلسٹن نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں اسے پاگل پن نہیں سمجھتا۔ اگرچہ ہمیں رسک لینے پڑتے ہیں لیکن یہ ایک شاندار چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اگر تم ہمارے ساتھ نہیں ہو تو پھر ہمارے خلاف ہو۔ مسٹر براؤن! تم کیا چاہتے ہو؟''

معاً ٹم پھر خوف زدہ ہو گیا۔ وہ بہت کچھ جان چکا تھا اور انگرا ہم کا بھانڈا پھوڑ سکتا تھا۔ ایلسٹن غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ٹم نے سوچا کہ وہ یقیناً اس سے جان چھڑانے کی کوشش کریں گے یا پھر وہ ایلسٹن کو قائل کر لے کہ وہ ان کے پروگرام کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہے۔ ٹم کے پاس یہ واحد چانس تھا کہ وہ ماڈل اسٹوڈنٹ بنا رہے اور موقع ملتے ہی کام کر جائے۔ پھر اس نے بلند سیٹی بجائی اور بولا۔

''ٹھیک ہے مجھے اپنے ساتھ شامل سمجھو۔''

ایلسٹن نے ویرن کی طرف رخ پھیرا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے براؤن کے الفاظ پر؟''

ویرن نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔''

ٹم کے پیٹ میں آنتیں الجھ گئیں۔ ''میں جھوٹ نہیں بول رہا۔''

''تمہاری کرسی درحقیقت جھوٹ پکڑنے کی مشین ہے، بیٹا جی۔'' ویرن نے انکشاف کیا۔

ٹم کو مایوسی نے گھیرنا شروع کر دیا۔ ایلسٹن کے

[illegible] غصے کے آثار تھے۔

''[illegible]ہیں خود کو بچانے کے لیے انتہائی قدم اٹھانا [illegible] گا۔'' ڈاکٹر نے جیب سے ایک سرنج اور وائل نکالی [illegible] میں شفاف لیکوئیڈ بھرا تھا۔

[illegible] وقت نے ٹم کو بدحواس کر دیا۔ ''یہ کیا ہے؟ تم لوگ کیا کرنے جا رہے ہو؟'' وہ چیخا۔

ایلسٹن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سرنج بھر کر ٹم کی طرف بڑھا۔ ٹم نے خود کو آزاد کرانے کی ناکام کوشش کی۔ [illegible] اس کے بازو میں داخل کر دی گئی۔

ڈاکٹر نے ٹم کی آستین اوپر کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔

☆☆☆

گھڑی 5:32 کا وقت بتا رہی تھی۔ ٹم ابھی تک غائب تھا۔ اتنی دیر سے وہ کہاں ہے۔ کوئین کی پریشانی [illegible] جا رہی تھی۔ ٹم عجیب دکھائی دے رہا تھا۔ ہراساں اور گھبرایا ہوا۔ اس نے کوئین کو کار میں ملنے کے لیے کہا تھا۔ [illegible] اصل رہی تھی۔ کوئین کو خیال آیا کہ ٹم کے دیے ہوئے [illegible] اسے ساتھ رکھنے چاہیے تھے۔ وہ کار سے نکل آئی۔ [illegible] اسے مزید سرد لگی۔

کوئین پہلی منزل پر اپنے کمرے میں آ گئی۔ ٹم کے [illegible] ہوئے اشارے وہاں نہیں تھے۔ اس نے بستر کی چادر [illegible] پلٹ کر دیکھ لی۔ لاحاصل۔ وہ گم صم بستر پر بیٹھ گئی۔ کیا ٹم واپس آ کر وہ کاغذات لے گیا۔ وہ باہر نکلی اور سیڑھیوں [illegible] ہوتی ہوئی ٹم کے کمرے تک پہنچی۔ اس نے دستک کے ساتھ ٹم کو پکارا۔

''کوئین! کیا بات ہے؟'' کیون نے سر نکالا۔

''ٹم کہاں ہے؟''

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''رات تم نے اس کے ساتھ گزاری ہے، میں نے نہیں۔''

''کیا بکواس ہے، میں تو ابھی یہاں آئی ہوں۔''

کیون کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ''مذاق کر رہی ہو؟''

''مجھے سمجھاؤ، رات وہ میرے پاس آیا تھا چند منٹ کے لیے اور اس کا رویہ عجیب تھا۔''

''میں کیا بتا سکتا ہوں، اس نے رات کمرا مجھ سے [illegible] تھا لیکن اس نے رات یہاں نہیں گزاری... مجھے تو یہی لگا ہے۔''

کوئین کا دل پھڑ پھڑانے لگا۔ وہ واپس پارکنگ لاٹ کی جانب بھاگی اور دور سے ہی ٹھٹک گئی۔ ''گریفن'' پارکنگ سے غائب تھی۔

''ٹم!'' اس نے صبح کاذب سے سرگوشی کی۔ اسے علم تھا کہ کوئی جواب نہیں آئے گا۔ پھر بھی جواب کے لیے اسے اشک بار آنکھوں سے پکارا۔ ''ٹم!''

کوئین کا دن بڑی بے قراری میں گزرا۔ اس کا ذہن ٹم میں الجھا ہوا تھا۔ وہ کہاں ہو سکتا ہے اور اس نے ایسا کیوں کیا۔ وہ کسی بھی کلاس میں نہیں آیا اور پریکٹیکل بھی چھوڑ دیا۔ کوئین نے سیکیورٹی آفس میں پتا کیا مگر ویرن نے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ ''وہ اس مرتبہ شاید طویل ویک اینڈ پر گیا ہے، اکثر وہ رات کو غائب ہو جاتا تھا۔''

کوئین سمجھ رہی تھی کہ وہ غلط کہہ رہا ہے۔ وہ ٹم کو بطور گمشدہ طالب علم کے رجسٹر کرنے کے لیے بھی رضامند نہیں تھا۔ چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد شاید وہ ایسا کر سکتا تھا۔ کوئین غصے اور مایوسی کا شکار تھی۔

ڈنر کے بعد اس نے بے دلی سے ٹم کے گھر فون کیا۔ اس نے مسٹر اور مسز براؤن کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ چند سوالات کے جواب دیے۔ انہوں نے کوئین کا نمبر لے کر وعدہ کیا کہ اسے فون کریں گے۔

وہ اپنے تاریک کمرے میں بیٹھی تھی۔ وہ کائنات میں خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہی تھی۔ پھر اس نے کمرا لاک کیا۔ کرسی لاک کی ناب کے نیچے پھنسائی اور بستر میں گھس گئی۔ اس نے پورا کمبل اپنے اوپر لے لیا۔ وہ اس کے اندر چھپ کر رو رہی تھی۔ ایک بچی کی طرح روتی رہی... نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

کمرے کے دروازے پر کب سے دستک ہو رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ کمرا روشن تھا۔ نو بج چکے تھے۔ وہ ناہموار چال کے ساتھ دروازے تک گئی۔ کرسی ہٹائی اور دروازہ کھولا۔

''کوئین کلیری؟''

اس نے آواز پہچان لی۔ ''مسٹر براؤن؟''

مسٹر براؤن، ٹم کے والد اس کے بڑے بھائی لگ رہے تھے۔ وہ کچھ تھکے ہوئے اور فکرمند نظر آ رہے تھے۔ ویرن ان کے عقب میں موجود تھا۔

''یس۔'' مسٹر براؤن نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''کوئی اطلاع؟''

''نہیں کچھ نہیں۔''

''ویرن صاحب مجھے شیرف آفس تک رپورٹ لکھوانے کے لیے لے جانے کے لیے تیار ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم بھی... کیونکہ تم نے آخری بار ٹم کو دیکھا تھا؟'' مسٹر براؤن نے استفسار کیا۔

''کیوں نہیں، مجھے تھوڑا وقت دیجیے۔'' کوئین نے کہا۔

☆☆☆

ڈپٹی ٹیڈ ساؤتھ ورتھ، فریڈرک کاؤنٹی کے شیرف ڈپارٹمنٹ میں بیٹھا تھا۔ تینوں اس کے سامنے بیٹھے تھے اور وہ ایک فارم کی خانہ پری میں معروف تھا۔ وہ ایک پیشہ ور اور ہمدرد انسان دکھائی دیتا تھا۔ اس نے مسٹر براؤن سے سوالات کرنے شروع کیے۔ ٹم کا حلیہ، جسامت، کریڈٹ کارڈ نمبر، قریبی دوست... وغیرہ وغیرہ۔ مسٹر براؤن نے ٹم کا ایک فوٹو بھی ڈپٹی ساؤتھ ورتھ کو دیا۔

پھر وہ ویرن کی جانب متوجہ ہوا۔ انگراہم کے سیکیورٹی چیف نے شانے اچکائے۔ ''میں کچھ زیادہ نہیں جانتا، وہ اکثر رات باہر گزارتا تھا... ساتھی طالب علم کے ساتھ۔''

کوئین کے چہرے پر سرخی آئی۔ ساتھ ہی وہ حیران تھی کہ ویرن، ٹم کی آمد و رفت کے بارے میں کس قدر باخبر ہے۔

''واقعی۔'' مسٹر براؤن نے کہا۔ ''میرے لیے یہ نئی اطلاع ہے۔ تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''ہر طالب علم کے لیے باہر جانے کے لیے ایک کوڈ ڈ کارڈ ہوتا ہے جسے وہ گیٹ پر استعمال کرتا ہے۔ اس کے ریکارڈ سے ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ کون کب اور کتنی دیر باہر رہ کر آیا ہے۔''

''آپ کچھ نہیں کہیں گی؟'' ڈپٹی، کوئین کی جانب متوجہ ہوا۔

وہ لمحہ آ گیا جس کا کوئین کو ڈر تھا۔ اس کو کس حد تک بتانا چاہیے۔ یقیناً ان کی قربت اور الفت سے انہیں کوئی غرض نہیں ہے۔ بالآخر اس نے بتایا کہ کب ٹم اسے یہ بتانے آیا تھا کہ کمروں میں کیا کیا خفیہ آلات نصب ہیں... اسی وجہ سے اس نے تفصیل بتانے کے لیے کوئین کو کار میں پہنچنے کے لیے کہا تھا... اس کے آگے کیا ہوا سب اس نے بتا دیا۔ جب اس نے بات ختم کی تو آفس میں گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔

''بلنگ۔'' مسٹر براؤن نے سکوت کا پردہ چاک کیا۔ ''اس نے بتایا تھا کہ تمام کمرے بگڈ ہیں؟''

''ٹم نے لکھ کر بتایا تھا۔''

''وہ کاغذ تمہارے پاس ہیں؟'' ڈپٹی نے سوال کیا۔

''میں بتا چکی ہوں کہ کار میں دیر تک انتظار کرنے کے بعد میں واپس آئی تو کاغذات غائب تھے، بعد از اں ٹم کی کار بھی غائب ہوگئی۔''

مسٹر براؤن، ویرن کی جانب پلٹے۔ ''اس کا کیا مطلب لیا جائے گا۔ تم لوگوں نے کیا گورکھ دھندا پھیلایا ہوا ہے؟''

ویرن نے شانے اچکائے۔ ''پڑھائی اور ڈسپلن کا بہت دباؤ ہوتا ہے اور بعض اوقات طلبا گھبرا جاتے ہیں۔''

''ایسا پہلی بار نہیں ہوا ہے۔'' ڈپٹی نے یاد دہانی کرائی۔

مسٹر براؤن نے سیکیورٹی چیف کو گھورا۔ ''کیا مطلب؟ طلبا بغیر نام و نشان کے پہلے بھی غائب ہوتے رہے ہیں؟'' ٹم کے والد چراغ پا ہو کے بولے۔

ویرن کسمسایا۔ ''دو سال قبل ایسا ایک واقعہ ہوا تھا۔''

''پراکٹر نام تھا؟'' ڈپٹی نے کنپٹی کو مسلا۔

''پروسر، انتھونی پروسر۔''

''میری بات دھیان سے سنو۔'' مسٹر براؤن نے بلند آواز میں کہا۔ کوئین نے مسٹر براؤن کی آنکھوں میں طیش کی جھلک دیکھی۔ ''ٹم چند ہفتے قبل گھر آیا تھا۔ اس کے اوپر کوئی پڑھائی کا دباؤ نہیں تھا۔ اس نے زندگی میں یہ دباؤ کبھی محسوس نہیں کیا۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ اس کا گواہ ہے اور وہ کہتا ہے کہ کمرے بگڈ ہیں تو اس کے پاس اس کی بہترین وجہ ہو گی۔''

''مجھے یقین ہے کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' ڈپٹی نے تصدیق کی۔ ''مسٹر براؤن! میں رپورٹ لکھ کر ضروری کارروائی شروع کرتا ہوں۔ آپ کے ہوٹل کا نمبر میرے پاس ہے۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔''

''ساؤتھ ورتھ، ایک اور بات... میں جب انگراہم گیا تو میں نے وہاں غیر معمولی سیکیورٹی دیکھی۔ گارڈز، خاردار باڑھ، کیمرے... یہ کالج ہے یا کوئی جیل؟ میرے نزدیک یہ ایک اہم نکتہ ہے۔'' مسٹر براؤن نے کہا۔

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' ڈپٹی نے اطمینان دلایا۔

ویرن افسردہ انداز میں کرسی سے اٹھا۔ ''آیئے میں آپ دونوں کو ڈراپ کردوں۔''

مسٹر براؤن نے حرکت نہیں کی۔ وہ ڈیسک کے پاس کھڑا تھا اور آنسوؤں کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئین نے اس کے بازو کو چھوا۔ ''آیئے سر! ہم نہیں جانتے۔ شاید ٹم اپنے کمرے میں آ گیا ہو۔''

مسٹر براؤن ایک کمزور لیکن تشکر آمیز مسکراہٹ لبوں پر لانے میں کامیاب ہوئے۔ ''ہاں شاید...''

تاہم دونوں کو ہی یہ ایک خوش فہمی ہی لگ رہی تھی۔

☆☆☆

کوئین کھڑکی سے باہر کسی غیر مرئی نکتے کو تک رہی تھی۔ جب کسی نے دروازے پر دستک دی۔

مسٹر براؤن دو آدمیوں کے ساتھ تھے ایک تو ویرن تھا اور دوسرا ان کا آدمی تھا جسے وہ ڈان کے نام سے پکار رہے تھے۔ مسٹر براؤن نے کوئین کی اجازت سے ڈان کو کمرے کی تلاشی لینے کے لیے کہا۔ ڈان کوئی پروفیشنل تھا۔ تاہم اسے بگ یا کسی اور الیکٹرونک آلے کی علامت یا اشارہ نہیں ملا۔ اس نے کمرے کو اوکے کر دیا۔

''کوئی مائیکرو ویو ٹرانسمیشن، الیکٹرونک پلس، کچھ... کچھ نہیں۔'' ڈان نے اطلاع دی۔

کوئین پر مایوسی نے غلبہ پالیا۔ مسٹر براؤن سر ہلا کر ویرن کی طرف پلٹے جو کمرے سے باہر ہال میں تھا۔ ''مجھے معلومات دریافت کرنی ہے، تم اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو۔''

''یقیناً جناب، آپ کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔''

''شکریہ۔'' مسٹر براؤن نے کوئین کی جانب رخ کیا۔ ''کچھ معلوم ہوتے ہی میں تمہیں باخبر رکھوں گا۔'' انہوں نے کوئین کے بازو کو ہاتھ لگایا۔ ان کی مسکراہٹ دل شکن تھی اور ٹم سے گہری وابستگی کی عکاسی کر رہی تھی۔

ان کے جاتے ہی کوئین بستر پر گر گئی۔ اس کی نیلی آنکھیں پھر برسنے لگیں۔

☆☆☆

وہ اتوار کا دن تھا۔ کوئین اٹھ کر شاور لے چکی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ بہ عجلت دعا مانگتی ہوئی دروازے کی طرف گئی۔ دروازہ کھلنے پر اس نے مسٹر براؤن کو مسکراتے پایا۔ ''میرے خیال میں ہم نے اسے پالیا ہے۔''

معاً کوئین کے گھٹنوں سے جان نکل گئی۔ ''وہ... ٹھیک ہے؟'' وہ پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

''ہم نہیں جانتے، بالٹی مور کے جنوب میں ائرپورٹ پر اس کی کار مل گئی ہے۔ ائرلائنز کے دفتر سے پتا چلا ہے کہ جمعے کی صبح کو اس نے لاس ویگاس کا یک طرفہ ٹکٹ خریدا تھا۔''

''ویگاس؟'' کوئین نے سمجھنے کی کوشش کی۔

''مزید تفتیش پر معلوم ہوا ہے کہ اس نے ایوس AVIS سے ایک ہفتے کے لیے کار کرائے پر لی ہے۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ بس یہ اطمینان ہے کہ وہ زندہ ہے۔''

کوئین خاموش تھی، وہ کچھ بول نہ پائی۔

''میں لاس ویگاس جا رہا ہوں۔''

''وہ مل جائے تو مجھے مطلع کیجیے گا۔''

مسٹر براؤن سر ہلا کر رخصت ہوگئے۔

کوئین کرسی میں دھنسی بیٹھی تھی اور اپنے لرزتے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ذہن میں امید اور مایوسی کی جنگ جاری تھی۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اسے کام کرنا چاہیے۔

تھوڑی دیر بعد وہ چوتھے فلور پر تھی۔ اسے 9574 کے ڈیٹا کا تجزیہ کرنا تھا۔

وارڈ ''سی'' کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے عادتاً اندر جھانکا اور ششدر رہ گئی۔ وہاں کچھ تبدیلی تھی۔ ایک مریض کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک نیا آتش گزیدہ۔ کوئین رکی نہیں لیب کی جانب چلتی رہی۔ پتا نہیں اس نئے مریض پر کیا عذاب آیا تھا۔

☆☆☆

ویرن، ٹم براؤن کے والد کو ہانیٹر پر جاتے دیکھ رہا تھا۔ کرٹ لاس ویگاس سے کچھ دیر قبل بائی ائر واپس آیا تھا۔

''ٹم کا باپ کسی ماہر کو کمرا چیک کرانے لایا تھا۔''

''میں نے پہلے ہی سب ٹھیک کر دیا تھا۔'' ایلیٹ نے کہا۔

''اور مت بھولو کہ لڑکی کا کمرا چیک کرنے کا آئیڈیا کس کا تھا؟ ورنہ وہ کاغذات ان کے ہاتھ لگ جاتے یا لڑکی کو مل جاتے۔''

''اب ہر چیز اپنی جگہ پر ہے۔'' ویرن نے کہا۔

''بس ایک ڈپٹی ساؤتھ ورتھ مجھے کھٹک رہا ہے۔'' کرٹ نے کہا۔ ''وہ دو سال قبل بھی ''پروسر'' کے بارے میں بڑے پیچیدہ سوال کرتا رہا تھا اور ہمارے جوابات سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔''

''دیکھیں گے۔'' ویرن نے کہا۔ ''ہمارا منصوبہ اچھا تھا۔ ٹم کا باپ ویگاس کے راستے پر چل پڑا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ڈپٹی کا ذہن بھی اسی طرف مڑ جائے۔''

☆☆☆

حرکت اور سمت کا احساس نہیں تھا۔ وہ تاریکی میں تھا۔ کسی محدود جگہ پر۔ صرف زندگی کا احساس تھا۔ ٹم نے جانا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ تاہم ایسا لگ رہا تھا کہ وہ نیند سے بیدار ہو رہا ہے۔ مدھم آوازیں اس کے کانوں میں آ رہی تھیں۔ اینٹی سیپٹک کی بو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ٹم نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔

اسے یاد آنا شروع ہوا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ ایلسٹن کا فلسفہ سن رہا تھا۔ اس وقت وہ تہ خانے میں بندھا تھا پھر انہوں نے زبردستی اسے کوئی انجکشن لگایا۔ اس کے بعد وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

ٹم پھر آنکھیں کھولنے کی جدوجہد کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں نے روشنی کی کرنیں وصول کیں۔ اس کی جدوجہد میں اضافہ ہو گیا۔ دھندلے سائے اصل شکل اختیار کرنے لگے۔ وہ کامیاب ہو گیا۔ اس نے پتلیاں ادھر ادھر گھمائیں۔ وہ ایک چادر کے نیچے بستر پر پڑا تھا۔ ٹم نے کروٹ بدلنے کی کوشش کی لیکن اس کے جسم نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا بدن کسی سفید چیز میں لپٹا ہوا تھا... شاید سفید کپڑا تھا۔ نہیں... گاز... سفید گاز ڈریسنگ... DRESSING

'کیا وہ خواب دیکھ رہا ہے؟' اسے کسی قسم کا احساس نہیں تھا حتیٰ کہ اپنے بدن کو بھی محسوس نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے سرہانے ایک اسٹینڈ سے پلاسٹک کی بوتل لٹک رہی تھی۔ جس میں ٹیوب نکل کر اس کے بازو کی نس میں سوئی کے ساتھ منسلک تھی۔

'کیا اس کا کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہے؟'

وہ تنہا نہیں تھا وہاں اور بھی ایسے ہی یکساں بستر تھے۔ سفید... ''ممی'' کے مانند، اس کے ذہن میں دھماکا ہوا... وہ وارڈ ''سی'' میں تھا۔

ماضی قریب میں وارڈ کو اس نے باہر شیشے میں سے دیکھا تھا اور اب وہ خود وارڈ میں تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں پھر کھولیں۔ لیکن بے رحم حقیقت اپنی جگہ قائم تھی۔

وہ دہشت اور مایوسی سے جنگ کرنے لگا۔ وہ ایلسٹن کا ذاتی قیدی بن چکا تھا۔ وارڈ ''سی'' کا ایک اور بے چہرہ مریض۔ ایک اور سفید ٹیوب اس کی دائیں آنکھ کے قریب سے ناک کے نتھنے میں جا رہی تھی۔ یہ فیڈنگ ٹیوب تھی۔ جو حلق سے گزر کر معدے تک چلی گئی تھی۔

کوئین نے اسے 9574 کے بارے میں بتایا تھا۔ بظاہر اسے 9574 کا ڈوز دیا گیا تھا۔ ٹم نے محسوس کیا کہ 9574 نے پوری طرح اسے متاثر نہیں کیا تھا۔ یا اس کا اثر کم ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ نہ صرف آنکھیں کھول چکا تھا بلکہ پتلیوں کو بھی حرکت دے سکتا تھا اسے اپنے جسم پر قابو پانا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ گدے پر سیدھا تھا، ہتھیلی اوپر کی جانب تھی۔ کیا وہ اسے حرکت دے سکتا ہے۔ محض ایک ایک انگلی ہی سہی... اس نے جدوجہد شروع کر دی جس میں خیال کی قوت غالب تھی۔ وہ ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ معاً انگلی میں لرزش ہوئی۔ اس کا ذہن انگلی پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ ہتھیلی کی سب سے چھوٹی انگلی تھی۔ ٹم نے اسے آگے پیچھے حرکت دینی شروع کی... انگلی پر اس کا کنٹرول بڑھ رہا تھا۔ کسی بھی طرح اسے یہاں سے نکلنا پڑے گا۔

''گڈ مارننگ، نمبر 8۔ تم بیدار ہو گئے ہو؟''

وہ نرس تھی۔ گہری رنگت۔ براؤن آنکھیں۔ اس کی ناک اور چہرہ سرجیکل ماسک کے عقب میں پوشیدہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سرنج تھی جس میں کوئی شفاف سیال موجود تھا۔

''تمہاری دو بجے کی خوراک کا وقت ہو گیا ہے۔''

نرس نے اپنا کام کیا اور چلی گئی۔

ٹم اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس نے انگلی کو جنبش دی تاہم وہ بے جان ہو چکی تھی۔ 9574 کی تازہ خوراک نے اسے مردہ گوشت کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا تھا۔

وارڈ کی دیوار میں نصب شیشے کے عقب میں باہر کوئی کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں نے سلو موشن میں شیشے کو فوکس کیا۔ کوئین۔ ہاں وہ کوئین تھی۔ ٹم اندر ہی اندر تڑپ اٹھا۔ کیا وہ پہچان گئی ہے۔ نہیں وہ کیسے پہچان سکتی ہے۔ ٹم سر سے پیر تک سفید روئی میں لپٹا تھا۔ ٹم نے چیخنے کی کوشش کی۔ ہلنے جلنے کی سعی کی تاہم کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ وہ قطعی بے بس تھا۔ خوف... دہشت... مایوسی... پھر غصے نے اسے اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا۔ کوئی فائدہ نہیں۔ کوئین مڑی اور چلی گئی۔ ٹم کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔ اسے پتا تھا کہ اس کے رخسار پر ایک آنسو پھیل گیا ہے۔ تاہم رخسار نے پانی کی نمی کو محسوس نہیں کیا۔

☆☆☆

میٹ کرافورڈ اپنے نئے اپارٹمنٹ میں تھا۔ اس نے بار دو بار انکار کیا پھر نو بجے فون اٹھا لیا۔ وہ کوئین سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے ساری داستان معلوم ہو گئی تھی۔ ٹم کی خاندان سے میٹ خوب واقف تھا۔ تاہم یہ ساری کہانی ٹم کی عادات اور مزاج سے لگا نہیں کھاتی تھیں۔

کوئین نے تیسری گھنٹی پر فون اٹھایا اور میٹ کی آواز سن کر وہ اوپر تلے سوال کر ڈالے۔ ''میٹ! تم نے ٹم کو فون کیا؟ کیا اس کا فون آیا؟ کیا مسٹر براؤن نے ٹم کو تلاش کرایا؟''

''ایزی بے بی۔ ایسا کچھ نہیں ہوا ہے ابھی تک، میں نے تمہاری خیریت کے لیے فون کیا تھا۔'' وہ خاموش ہو گیا۔ دوسری جانب سے کوئین کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ میٹ جانتا تھا کہ دونوں کے درمیان ایک رشتہ پروان چڑھ رہا ہے۔

''میٹ میں ہراساں ہوں۔ مجھے خوف ہے کہ میں اسے اب کبھی نہیں دیکھ سکوں گی۔''

''میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں کہ تم اسے دوبارہ دیکھو گی۔'' میٹ نے کہا۔ ''کیا تم کرسمس پر آ رہی ہو؟''

''ممکن نہیں ہے۔ میں ایک پروجیکٹ پر کام کر رہی ہوں اور اگر ٹم واپس آیا تو میرا یہاں ہونا ضروری ہے۔''

میٹ، کوئین کو اس منحوس جگہ پر اکیلا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''کیا خیال ہے... اگر میں ملنے آؤں تو؟''

''یہ اچھا ہوگا۔ تاہم میں لیب میں مصروف رہتی ہوں۔ میں ٹھیک ہوں اور وعدہ کرتی ہوں کہ گھر پہنچتے ہی تم کو فون کروں گی۔''

دونوں کی گفتگو ختم ہو گئی لیکن میٹ بے کلی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ انگرا ہم جائے گا۔ ''ٹم تم کہاں ہو؟'' میٹ نے سرگوشی کی۔

☆☆☆

ٹم زندہ تھا اور نہیں بھی تھا۔ زماں و مکاں سے دور... اس کے ذہن میں اشتعال اور دہشت موجود تھے۔ بھیانک خواب بھی، تاہم وہ ان خوابوں میں کسی کو نہیں پہچانتا تھا۔ اسٹاف روٹین کے مطابق اس کا خیال رکھ رہا تھا۔ نرسز اس کے ساتھ متواتر باتیں بھی کرتیں لیکن ایسے جیسے گڑیا سے بات کر رہی ہوں جو جواب دینے سے قاصر ہے۔

وہ اپنے بدن کے بارے میں ہراساں تھا۔ اسے کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے بدن کے ساتھ کیا کیا جا رہا ہے۔ کیا وہ دوسروں کی طرح آتش زدہ ہے؟ کیا وہ اس کی کھال کے ساتھ کھیل رہے ہیں؟ وہ اپنے دماغ کے بارے میں پریشان تھا۔ اسے احساس تھا کہ خیالات کی ڈوریاں اس کے ارادے کی گرفت سے پھسل جاتی ہیں اور کچھ عرصے بعد وہ دماغ کے معاملے میں بھی لاچار ہو جائے گا۔

صرف ایک چیز تھی جو اس کے دماغ کو ایک لائن پر مرکوز کر رہی تھی۔ جو دوا اس کے اعصابی نظام کو تباہ کر رہی تھی، اس کے خلاف وہ نہایت چھوٹی فتوحات حاصل کر رہا تھا۔ اس نے سیکھ لیا تھا کہ 9574 کی خوراک کا اثر کب کمزور پڑتا ہے اور وہ اس وقت اپنی تمام تر توجہ اپنی انگلیوں پر مرکوز کر دیتا تھا۔ یہ انگلیاں ہی اس کی دنیا تھیں۔ وہ سست روی سے ان کو ارادے کے تابع کر رہا تھا۔

لیکن آج ایک نئی بات ہوئی۔ اسے اپنی بائیں ران کے بیرونی حصے میں مدھم تکلیف کا احساس ہوا۔ اس نے جلد ہی اسے نظر انداز کر دیا اور اپنی توجہ انگلیوں پر رکھی۔

''نمبر آٹھ بیدار ہے؟'' یہ ایلسٹن کی آواز تھی۔

''یس ڈاکٹر۔''

ایلسٹن۔ ڈاکٹر آرتھر ایلسٹن... ٹم کے اندر شدید خواہش بھڑکی کہ اچھل کر ڈاکٹر کا گلا پکڑ لے۔ تاہم وہ ہل بھی نہیں سکا۔ معاً ڈاکٹر کا چہرہ اس کے چہرے کے سامنے آیا۔

''ہیلو براؤن! میں معذرت خواہ ہوں لیکن یہ مجبوری تھی۔ میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں بچا تھا۔ تم فاؤنڈیشن کے لیے خطرہ بن گئے تھے۔ اور ہاں وارڈ ''سی'' سے نجات کا خیال دل سے نکال دینا۔''

ڈاکٹر کے چہرے کی جگہ نرس کے چہرے نے لے لی۔ ڈاکٹر نے اسے مارگریٹ کے نام سے پکارا تھا۔ نرس نے ٹم کو دائیں جانب کروٹ دلائی۔ تاہم ٹم کو محسوس نہیں ہوا۔ نظروں کا زاویہ بدلنے سے اسے پتا چلا کہ وہ اب دائیں کروٹ پر لیٹا ہے۔

''گڈ!'' ایلسٹن نے مارگریٹ سے کہا۔ ''اب ٹرے مجھے پکڑاؤ۔''

''ہم تمہاری کھال سے تازہ زخموں کی اسکن گرافٹنگ کریں گے... کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم سے پہلے بھی کچھ مسائل کھڑے ہوئے تھے۔ جیسے انتھونی پُراسرار۔ اس کا نمبر 5 تھا۔ اس نے دو سال ساتھ دیا اور ہمیں اسکن گرافٹنگ کی تحقیق میں زبردست مدد ملی۔ پھر وہ پاگل ہو گیا۔ اس کی تمام کھال ختم ہو گئی تھی۔ تاہم وہ زندہ ہے اور ہم اسے آخری سانس تک زندہ رکھیں گے تاکہ کچھ اور قسم کے تجربات کیے

جا سکیں۔ اس کے جاتے ہی تم آ گئے۔ کل ہم نے تمہاری ران کے ایک حصے سے کھال جدا کی تھی۔۔۔''

ٹم کا ذہن چیخ رہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے غیر ارادی طور پر اس نے ڈاکٹر کی بکواس سننی بند کر دی۔ اسے پتا نہیں چلا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ وہ تو ڈاکٹر کا نرخرہ دبوچنے کے چکر میں تھا۔۔۔

ڈاکٹر کی آواز پھر سماعت میں زہر گھولنے لگی۔ ''ہم لوگ قاتل نہیں ہیں۔ نہ صرف ہم نے انگراہم اور فاؤنڈیشن کو تمہارے خطرہ سے بچایا ہے بلکہ ایک طرح سے تم میڈیکل سائنس کی خدمت بھی کر رہے ہو۔ یہ ایک وجہ تھی تمہارے انگراہم میں آنے کی نمبر آٹھ۔ کیا نہیں تھی؟''

'لیکن خبیث انسان تو مجھے مار رہا ہے۔ ختم کر رہا ہے۔' ٹم کے ذہن میں ایک طوفانی لہر اٹھی۔ یہ موت سے بدتر ہے۔

☆☆☆

کوئین سائنس سینٹر کی طرف جا رہی تھی۔ بالٹی مور ریڈیو اسٹیشن نے برفانی طوفان کی اطلاع نشر کی تھی۔ پنسلونیا اور نیوجرسی زد میں تھے۔ میری لینڈ کو بھی معمولی خطرہ تھا۔

کوئین کو برف اور اسکیٹنگ پسند تھی۔ کرسمس سر پر تھا طلبا گھر جانے کی تیاریوں میں تھے۔ کوئین کو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

تم نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ٹم؟ اتنے قریب آ کر تم نے میرے ساتھ یہ کیا کر دیا۔ کیوں؟ ٹم آخر کیوں؟ وہ اپنے رنجیدہ خیالوں میں کھوئی کھوئی چل رہی تھی۔ جگہ جگہ کرسمس کے حساب سے سجاوٹ کی گئی تھی۔۔۔ وہ بالائی منزل پر پہنچ کر از خود وارڈ ''سی'' کے سامنے رک گئی۔ جب وہ سال بھر قبل پہلی بار یہاں آئی تھی تو اسے ایک غم ناک تجربہ ہوا تھا۔ وہ چیختی چلاتی نیلی آنکھیں اسے اب تک یاد تھیں جو کوئین سے بات کرنا چاہتی تھیں۔

کوئین کی نظریں وارڈ میں چکرا رہی تھیں۔ پھر اس کی نگاہ نمبر 8 مریض کے بستر پر جم گئیں۔ یہ بستر دور والی دیوار کی جانب تھا۔ کوئی مردانہ مریض تھا۔ کوئین نے روئی میں چھپے اس کے جسم کا جائزہ لیا۔ اس کی جسامت ٹم کی طرح ہی تھی۔ کوئین کے حلق سے آہ خارج ہوئی۔ وہ وہاں سے ہل نہ سکی۔

☆☆☆

کوئین! ہاں وہ کوئین تھی اور وہ براہِ راست اسے گھور رہی تھی۔ ٹم نے سوچا کہ کسی طرح چہرے کی روئی نوچ کر پھینک دے۔۔۔ تاہم یہ ممکن نہیں تھا۔ نہ وہ ہاتھ ہلا سکتا تھا۔ ٹم اندر ہی اندر تڑپ اٹھا۔ پہلے کی طرح کوئین چلی نہ جائے۔ قدرے فاصلے سے بھی ٹم نے کوئین کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں دیکھ لی تھیں۔ اس کا کلیجا کٹ گیا۔۔۔ وہ کیا کرے، کوئی اشارہ۔۔۔ اس کے ذہن میں شرارہ سے لپکا۔ ہاں ایک اشارہ تھا۔

☆☆☆

کوئین نے نمبر 8 کے پوشیدہ چہرے کو دیکھا۔ دفعتاً اسے احساس ہوا کہ وہ بھی کوئین کی جانب متوجہ تھا۔ گزشتہ سال کی تاریخ خود کو دہرا رہی تھی۔ یہ آنکھیں بھی کوئین سے کچھ کہنا چاہ رہی تھیں۔ کوئین کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

کوئین نے مریض کے دائیں ہاتھ کے پنجہ کو ہلتے دیکھا۔ انگلیاں مٹھی کی شکل اختیار کر رہی تھیں لیکن نہیں۔۔۔ انگوٹھا اور چھوٹی انگلی ویسے ہی سیدھی تھیں پھر یہ آدھی مٹھی دھیرے سے دائیں بائیں ہلی۔

کوئین کے دماغ میں جھماکا ہوا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ گھٹنے سن ہو گئے۔۔۔ وہ آواز کے ساتھ شیشے کی دیوار سے ٹکرائی۔ وہ ٹم کا ''ہوائی'' والا اشارہ تھا جو اس نے کوئین کو کیسینو میں بتایا تھا۔ کوئین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''کیا تم ٹھیک ہو؟ تمہارا چہرہ بھوت کی طرح سفید پڑ گیا ہے؟'' کوئین نے سر موڑا، ایک نرس نے اس کا بازو پکڑا ہوا تھا۔ ''ہاں میں نے بھوت دیکھا ہے۔'' کوئین نے سوچا۔

''کیا بات ہے؟'' نرس نے غور سے کوئین کو دیکھا۔ ''کیا تم ڈائی بیٹک ہو یا ہائپو گلوکومیا کی مریض ہو؟''

نہیں وہ ٹم نہیں ہو سکتا۔ وارڈ ''سی'' میں کیونکر ہو سکتا ہے؟

کوئین، نرس کو جواب دیتے دیتے رک گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے ہمیشہ کے لیے گھر بھیج دیا جائے گا۔

''میری ایک ٹانگ کے عضلات اکثر کھنچ جاتے ہیں۔'' کوئین نے بہانہ گھڑا۔ نرس نے اسے سہارا دیا۔ وارڈ ''سی'' کے دروازے کے قریب پڑی میز پر سے اس نے دو گولیاں برآمد کیں اور کوئین کے حوالے کیں۔ کوئین نے شکریہ ادا کیا اور کچھ دیر بیٹھ کر آہستہ آہستہ ڈاکٹر کلیہ سن کی لیب کی طرف چل پڑی۔ اس نے ڈاکٹر کو بتایا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ آرام کرنا چاہتی ہے۔ ڈاکٹر نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

واپس جاتے ہوئے اس نے وارڈ ''سی'' میں دیکھا۔

وہاں اور مارگریٹ نمبر 8 کے قریب کسی کارروائی میں مشغول تھیں۔ کوئین نے نمبر 8 کے ہاتھ کا وہ پنجہ دیکھا جس سے اس نے اشارہ کیا تھا۔ وہ ہاتھ اب قطعی بے جان تھا۔ اور مارگریٹ نے کوئین کو دیکھا۔۔۔ کوئین نے دوستانہ انداز میں ہاتھ ہلایا اور بمشکل خود کو آگے چلنے پر آمادہ کیا۔

کیا ہوا؟ کیا حقیقت ہے؟ اور کیا غیر حقیقی ہے؟ کوئین صورتِ حال پر غور کر رہا تھا۔۔۔ برف باری تیز ہو گئی تھی۔

☆☆☆

کوئین اپنے تاریک کمرے میں بستر پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی۔ وہ مریض ٹم ہے۔۔۔ وہ جتنا سوچتی اس کا یقین بڑھتا چلا جاتا۔ وہ ٹم کے سوا کوئی نہیں ہے۔ پہلا خیال کوئین کے ذہن میں آیا کہ ڈپٹی ساؤتھ ورتھ کو اطلاع دے لیکن اگر ان کو وہاں ٹم کے بجائے کسی کسان کا لڑکا ملا جو ٹریکٹر کے فیول ٹینک کے پھٹنے سے جھلس گیا تھا تو پھر کیا ہو گا؟ اسے خود کو اس قابل کرنا تھا کہ کہہ سکے کہ اس نے ٹموتھی [illegible] کا چہرہ دیکھا تھا۔

یہی واحد حل تھا۔۔۔ اسے آج رات ہی ٹم کا چہرہ دیکھنا تھا۔ کوئین نے فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

میٹ نے جلتی ہوئی آنکھوں کو مسلا، اس کے بازو دکھ رہے تھے اور انگلیاں اسٹیئرنگ وہیل سے چپک گئی تھیں۔ اب برف محض نہیں گر رہی تھی بلکہ ترچھی برسات کی طرح تھی۔ گاڑی کے اطرافی شیشے برف سے ڈھک گئے تھے۔

اسے رات موٹیل میں گزارنی چاہیے۔ صبح تک راستے بھی صاف ہو جائیں گے لیکن کوئین کہیں بالٹی مور کے لیے روانہ نہ ہو جائے۔ اس نے موبائل پر کوئین کے نمبر پنچ کیے۔ سگنل کلیئر نہیں تھے تاہم اس نے کوئین کی آواز پہچان لی۔

''کوئین، میں ہوں۔۔۔ میٹ۔''

''اوہ میٹ، خدا کا شکر ہے۔۔۔ میرے خیال میں ٹم یہاں ہے۔''

''کیا؟ وہ واپس آ گیا؟''

''نہیں۔۔۔ میرے خیال میں وہ کہیں گیا ہی نہیں تھا۔''

سگنل ٹوٹنے لگے، کچھ دیر دونوں کے درمیان اٹکی اٹکی بات چیت ہوئی پھر رابطہ بالکل نابود ہو گیا۔ میٹ کچھ بھی نہیں سمجھا۔۔۔ کسی نے ٹم کو انگراہم میں ہی چھپا رکھا

ہے۔ کیا ہو رہا ہے وہاں پر؟ کوئین کی آواز میں ہراس تھا، خوف تھا۔ لعنت ہو موسم پر۔ میں آج ہی وہاں پہنچوں گا۔ میٹ نے سختی سے دانت بھینچ لیے۔

☆☆☆

کوئین کی خواہش تھی کہ میٹ دوبارہ فون کرے۔ وہ شاید کار میں تھا۔ اگر یہ ٹھیک تھا تو وہ کچھ دیر انتظار کرے گی پھر اپنے مشن پر روانہ ہو جائے گی۔ کوٹ اور بوٹ چڑھانے کے بعد اس نے ''کی کارڈ'' اور پنسل ٹارچ سنبھالی۔ اگر ٹم وارڈ ''سی'' میں ہے تو وہ آج کی رات ضائع نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا انگراہم کے پوشیدہ اسراروں کا ادراک پختہ ہو چکا تھا۔ اسے جاننا تھا کہ آخر کیا ہو رہا ہے؟

کوئین نے براہِ راست سیدھا راستہ اختیار نہیں کیا اور عمارت کے عقبی راستے کا رخ کیا۔

وہ باہر ہی تاریکی میں رک گئی۔ ایمرجنسی ایگزٹ ڈور سے روشنی کی شعاع باہر تاریکی میں سرنگ بنا رہی تھی۔ کوئین نے چاروں طرف دیکھا پھر گہرا سانس لے کر قدم بڑھایا۔

کوڈڈ کارڈ استعمال کرتے ہوئے سیڑھیوں کے ذریعے وہ پہلی منزل پر آئی۔ یہاں ایک کونے میں اس نے بوٹ چھوڑ دیے۔ چوتھی منزل پر پہنچ کر اس نے اندر جھانکا۔ کوٹ پھنسا کر اس نے دروازے کو بند ہونے سے روکا۔ چھت کی اکثر بتیاں گل تھیں۔ نرسنگ اسٹیشن کی میز پر ریڈیو دھیمی آواز میں بج رہا تھا۔

کوئین نے پیش قدمی کی۔ وارڈ ''سی'' میں تاریکی تھی۔ وہ دیوار سے چپکی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ رات کی شفٹ میں وہاں دو نرسوں کو ہونا چاہیے تھا۔ اسے دھیمی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ تاہم میز پر کوئی نہیں تھا پھر یہ راز بھی عیاں ہو گیا۔ وہ آوازیں ادویات کے ریک کے عقب میں چھوٹے سے لاؤنج میں سے برآمد ہو رہی تھیں۔ یہ بہترین موقع تھا۔ وہ ہاتھ پیروں کے بل جھک کر وارڈ میں داخل ہو گئی۔ کوئین نے احتیاط سے دروازہ بند کر دیا۔

کوئین نے ''سرخ لکیر'' پار کر لی تھی۔ اب اگر وہ پکڑی گئی تو مصیبت میں پڑنے کا یقین تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن بے قابو ہونے لگی....

☆☆☆

ویرن کنٹرول روم میں تھا۔ اس کے معدے میں جلن ہو رہی تھی۔ اسے وقفے کی ضرورت تھی۔ گزشتہ ہفتے کی ٹینشن کے اثرات ابھی تک تھے۔ یہ جاب قبول کرتے ہوئے اسے اندازہ نہیں تھا کہ اسے کچھ نامناسب کام بھی کرنے پڑیں گے۔ اس کرسمس پر اسے براؤن والے معاملے میں الجھنا پڑ گیا۔ مزید یہ کہ ایلسٹن کی ہدایت تھی کہ مس کلیری پر سخت نظر رکھی جائے۔

ویرن نے جونہی اینٹی ایسڈ کی بوتل پکڑی، اسے ریکارڈر پر سرخ بتی آنکھ مارتی نظر آئی۔ اس کا مطلب کوئین کلیری نے فون پر بات کی تھی۔ ویرن نے فوراً ریوائنڈ کے بٹن کو ہٹ کیا۔ اس نے جو کچھ سنا، اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

وہ کوئین کے دوست میٹ کی ان کمنگ کال تھی۔ لڑکی اسے بتا رہی تھی ''کہ... ٹم کہیں نہیں گیا۔ وہ یہیں انگراہم میں ہے اور کسی نے اسے چھپایا ہوا ہے۔ وہ آج رات ٹم کو تلاش کرے گی اور اگر کوئین کو کچھ ہو جائے تو میٹ کو چاہیے کہ وہ ڈپٹی ساؤتھ ورتھ سے رابطہ کرے....''

ویرن نے سر پیٹ لیا۔ ریکارڈر پر ٹائمر نہیں تھا۔ بہت ممکن تھا کہ لڑکی اب تک وارڈ میں پہنچ چکی ہو۔ ویرن نے افراتفری میں وارڈ ''سی'' کے نرسنگ اسٹیشن کا نمبر ملایا۔

رات کی شفٹ ہیڈ نرس ڈورس نے جواب دیا۔

''میں ویرن بات کر رہا ہوں۔ کوئی وارڈ کے ارد گرد منڈلا رہا ہے؟''

''حیرت ہے۔'' ڈورس ہنس پڑی۔ ''ہمارے سوا یہاں کوئی نہیں ہے۔''

''وارڈ ''سی'' کو چیک کرو، فوراً۔''

''یس سر۔''

ویرن نے بات ختم کی اور کرٹ کو آواز دی۔

☆☆☆

کوئین کے ہاتھ میں پنسل ٹارچ لرز رہی تھی۔ وہ وارڈ کی عقبی دیوار کے ساتھ آٹھ نمبر کے مریض کی طرف جا رہی تھی جس نے اسے مخصوص اشارہ کیا تھا۔ کوئین بستر کے قریب پہنچی تو اسے وارڈ کے باہر سے فون بجنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ اس نے پھرتی سے مریض کے چہرے پر روشنی ڈالی اور انگلی سے ہک بنا کر بینڈیج کی پٹیوں کو ہٹایا... وہ ٹم نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے جلدی بینڈیج ٹھیک کی۔ وہ پریشانی کے عالم میں سوچ رہی تھی کہ وہ ٹم کا اشارہ سمجھنے میں کیسے غلطی کر سکتی ہے۔ اسے پورا یقین تھا۔ معاً اسے نیا خیال آیا اور اس نے مدھم روشنی میں مریض کی جسامت کا اندازہ لگایا وہ پستہ قد اور موٹا دکھائی دیتا تھا۔

[illegible] گئی کہ ٹم کے بستر کی جگہ بدل دی گئی ہے۔ [illegible] کرنے کے لیے مڑی تب اس نے وارڈ [illegible] پر ایک سایہ دیکھا۔ کوئین تیزی سے فرش پر [illegible]... اس کا دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔ کوئین خود پر [illegible] کوشش کر رہی تھی۔ یہ ایک مخدوش بلکہ خطرناک [illegible] حال تھی۔ چند سیکنڈ کے فرق سے وہ فی الحال بچ گئی تھی۔

☆☆☆

ٹم نے وارڈ کے باہر جانی پہچانی شبیہ کو دیکھا تو اسے [illegible] خواب دیکھ رہا ہے۔ لیکن جب وہ نسوانی سایہ وارڈ میں آیا اور پنسل ٹارچ کا استعمال شروع کیا تو ٹم کا ذہن چلا اٹھا... [illegible] خواب نہیں، حقیقت ہے... اسے حقیقت ہونا [illegible]... ہنسنا چاہتا تھا، وہ رونا چاہتا تھا۔ وہ خوشی سے چیخنا چاہتا تھا۔ کوئین آ گئی تھی، کوئین نے اس کا اشارہ دیکھ لیا تھا اور کوئین کو یقین تھا۔

ٹم نے بولنا چاہا... کوئین غلط سمت جا رہی تھی۔ وہ بتانا چاہتا تھا کہ اس کا بستر دوسری جانب کر دیا گیا ہے۔ میں [illegible] ہوں، میں ادھر ہوں... لیکن اس کے حلق سے آواز نہیں نکلی۔ اس کے جسم میں انجانا کرنٹ دوڑ رہا تھا۔ اسے [illegible] کو شکست دینی تھی۔ یہ اس کا پہلا اور آخری موقع تھا۔ کوئین کی موجودگی نے ٹم کے بدن میں انجانا ردِعمل پیدا کر دیا تھا۔ دفعتاً اس نے کوئین کو جھکائی دے کر غائب ہوتے دیکھا۔ اسی وقت وارڈ کی بتیاں روشن ہو گئیں اور ٹم کی [illegible] شروع ہونے سے پہلے ہی معدوم ہو گئی۔ وہ سمجھ گیا۔ ٹم [illegible] سب سے بھاری بھر کم نرس کو وارڈ میں داخل ہوتے دیکھا، اس کا نام ڈورس تھا۔ وہ چوکنی دکھائی دیتی تھی اور ایک [illegible] وارڈ کا جائزہ لے رہی تھی۔ کیا اسے شک ہو گیا ہے؟ کیا وہ کوئین کو تلاش کر رہی ہے؟ ٹم کا دماغ چکر کھانے لگا۔

کوئین نمبر 4 بیڈ کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ قطعی بے حس و حرکت۔ بظاہر ڈورس نے مطمئن ہو کر بتیاں گل کر دیں۔

ٹم کے دماغ میں پھر سے خاموش چیخیں بلند ہونے لگیں... میں یہاں ہوں... میری جان! میں اس طرف ہوں.....

شاید کوئین کی محبت نے ٹم کی خیالی رو کو پکڑ لیا تھا۔ وجہ کچھ بھی تھی... وہ سیدھی ٹم کی طرف آ رہی تھی۔ اس نے [illegible] روشنی ڈالی... اسے بینڈیج ہٹانے کی ضرورت نہیں تھی، آنکھیں ہی کافی تھیں وہ سکتہ زدہ سی ٹم کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ اسے آج احساس ہوا کہ آنکھوں کی زبان زیادہ معتبر ہوتی ہے۔ ٹم کا سینہ پھول پچک رہا تھا۔

کوئین نے اپنا چہرہ ٹم کی گردن میں چھپا دیا۔ ''اوہ ٹم!'' اس نے سسکی لی۔ سسکی میں غم و خوشی کی آمیزش تھی۔ ٹم کی آہیں اس کے سینے میں بکھر رہی تھیں۔ اسے لگا کہ یہ لمحہ اس کی زندگی کا سب سے یادگار لمحہ ہے۔ تاہم وہ بولنے سے قاصر تھا... شدتِ جذبات سے اس کا بدن لرز اٹھا۔ یہ ایک انوکھی بات تھی۔ اس کا ذہن چیخ رہا تھا۔ ''نکلو، یہاں سے جاؤ... خود کو محفوظ کرو... پولیس اور ایف بی آئی کو اطلاع دو۔ پہلے خود کو محفوظ کرو۔''

''میں جانتی تھی کہ تم مجھے اس طرح نہیں چھوڑ کے جا سکتے۔'' وہ ابھی تک ہچکیاں لے رہی تھی۔

ٹم نے کوئین کے شانے پر سے دوسری نرس کو دیکھا جو وارڈ کے باہر گزرتے ہوئے شیشے کی کھڑکی پر رک گئی تھی۔ وہ اچانک رکی تھی اور آنکھیں سکیڑ کر اندر جھانک رہی تھی۔ کوئین بے خبر تھی۔

''جاؤ۔'' ٹم تڑپ اٹھا اور دنگ رہ گیا۔ یہ اس کی آواز تھی۔ جذباتِ، شدت احساس اور ہیجان نے مل کر ذہن کی نامعلوم قوتوں کو متحرک کر دیا تھا۔ ٹم کا ذہن دوا کے اثرات سے تقریباً ختم ہو گیا۔

''تم بول سکتے ہو؟'' کوئین نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ سر اٹھایا۔ جبکہ ٹم کو احساس تھا کہ وارڈ کے سناٹے میں آواز گونج گئی ہے۔ اس نے باہر نرس کو غائب ہوتے دیکھا۔ اس نے پھر کہا۔ ''جاؤ۔'' ٹم کے ہونٹ اور زبان ہم آہنگ نہیں ہو پا رہے تھے اسی لیے وہ ایک لفظ پر اکتفا کر رہا تھا۔

''نہیں، تمہارے بغیر میں نہیں جا سکتی ....''

دفعتاً وارڈ کی بتیاں روشن ہو گئیں ....

☆☆☆

کوئین نے دیکھا کہ دونوں نرسیں وارڈ کے دروازے کے اندر منہ پھاڑے کھڑی تھیں۔

''کون ہو تم؟'' ڈورس نے پوچھا۔ ''یہاں کیا کر رہی ہو؟''

کوئین خاموش تھی پھر اچانک اسے خیال آیا کہ وہ دونوں اسے نہیں جانتیں کیونکہ وہ دن میں یہاں آئی تھی۔ اس وقت نرسیں دوسری تھیں۔ اسے جو پہلا خیال آیا اس نے وہی کہنا شروع کر دیا۔ خاموش رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ ''میں نے سوچا تھا کہ یہ لوگ اکیلے ہیں۔'' اس نے آواز کو پُرسکون

رکھنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی وہ دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے وہ خود کو نشے میں ظاہر کر رہی تھی۔ ''لیکن ان میں سے کوئی بولتا ہی نہیں۔''

نرسوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ڈورس بولی۔ ''تم انفیکشن اندر لے آئی ہو۔''

''اوہ نو۔'' وہ چہل قدمی کے انداز میں آگے بڑھتی رہی۔ ''میں باقاعدگی سے ہاتھ دھوتی ہوں... لیکن یہ بات نہیں کرتے... کیا تم بات کرو گی؟''

دونوں نے پھر نگاہیں چار کیں اور اس مرتبہ ہلکے بدن والی نرس بولی۔ ''آ جاؤ، ہم کافی اور بسکٹ کے ساتھ آپس میں بات کرتے ہیں۔''

کوئین ظاہر کر رہی تھی کہ وہ پوری طرح ہوش میں نہیں ہے۔ وہ ایک سوئی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ دونوں کے درمیان سے گزر گئی۔ وہ چلتی رہی، اس کا رخ ہال وے کی جانب تھا۔ موٹی ڈورس نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ''ادھر نہیں۔''

کوئین نے ایک جھٹکا مارا اور دوڑنا شروع کر دیا۔ اس کے عقب میں چیخ و پکار بلند ہوئی جسے اس نے نظرانداز کر دیا۔ سیڑھیوں کے دروازے میں اس کا کوٹ اٹکا تھا... اسے کارڈ استعمال کرنے کے لیے وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خوف زدہ تھی تاہم خطرے کے احساس نے ازخود جسمانی نظام کو نئی توانائی فراہم کر دی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اسے پکڑنا نرسوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ کمرے تک پہنچ کر شیرف آفس فون کر سکتی تھی۔ کوئین وارڈ ''سی'' کا راز جان چکی تھی۔ ٹم آزاد ہو جائے گا۔

دبلی پتلی نرس میز پر ہی فون پر رابطہ کر رہی تھی جبکہ موٹی نرس کوئین کے تعاقب میں تھی لیکن کوئین کی پھرتی کا مقابلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ ابھی کوئین آدھے راستے میں تھی کہ ایک جانب سے بھورے بالوں والا آدمی برآمد ہوا۔ وہ اسے فوراً پہچان گئی۔ جب ٹم کے ساتھ وہ اٹلانٹا سٹی جا رہی تھی تو اس شخص کو اس نے پارکنگ میں دیکھا تھا۔ وہ کیمپس کی سیکیورٹی کے آدمیوں میں سے تھا۔ اس نے کوئین کے شانے پر ہاتھ ڈالا، کوئین پھسلی اور رخ بدل کر دوسری جانب دوڑی۔ وہ ابھی تک جوتے فلور پر ہی تھی۔ جبکہ اسے کسی طرح سیڑھیوں تک پہنچنا تھا۔ تاہم بھورے بالوں والے نے مشکلات پیدا کر دی تھیں۔

کوئین نرسنگ اسٹیشن کی طرف لپکی جہاں دوسری نرس فون پر تھی۔ کوئین کو جھپٹتے دیکھ کر اس نے ریسیور نیچے رکھ دیا اور اس کا راستہ روکنے کے لیے تیار ہو گئی۔ کوئین نے جھک کر سیدھی ٹکر ماری اور نرس اچھل کر دواؤں کی ٹرالی پر جا پڑی۔ ٹرالی الٹ گئی اور بوتلیں، سرنجز وغیرہ فرش پر بکھر گئیں... بیشتر ٹوٹ گئی تھیں۔

بھورے بالوں والا قریب پہنچ گیا تھا۔ کوئین نے ایک ہاتھ میز پر ٹکا کر بہ آسانی اسے ڈاج دیا۔ وہ لڑکھڑایا پھر... کوئین کی سماعت سے تصادم اور گالیوں کی آواز ٹکرائی۔ اس نے ہال کی طرف واپس جانا چاہا لیکن دونوں نرسیں راہ میں حائل ہو گئیں۔ دونوں نے اس کے بازو پر ہاتھ ڈالا، چکنے فرش پر کوئین کے شوز پھسلے... اس نے جھٹکا دیا اور گرتے گرتے بچی اور کاؤنٹر کا سہارا لیا۔ کوئین نے دیکھا کہ نیچے شفاف سیال کی تین بوتلیں اس کے دائیں ہاتھ کے قریب تھیں۔ ایک بوتل اس نے موٹی نرس پر کھینچ ماری پھر دوسری نرس کو نشانہ بنایا... تیسری بوتل پھر موٹی نرس پر پھینکی وہ جھکی... بوتل اوپر سے ہوتی ہوئی فرش پر گر کر پاش پاش ہو گئی۔ تینوں بوتلیں ٹوٹ چکی تھیں۔ ان کے سنبھلنے سے قبل کوئین تیر کی طرح پھر ہال میں نکل گئی۔ وہ سیڑھیوں کی جانب جا رہی تھی۔ اسے بھورے بالوں والے سے خطرہ تھا لیکن اسے شاید چوٹ لگی تھی اور وہ سست پڑ گیا تھا۔

کوئین نے دروازے میں پھنسا اپنا کوٹ دبوچا اور سیڑھیوں پر اڑی جا رہی تھی۔ سانس پھول گئی تھی اور آنکھوں میں ہراس کے ساتھ جوش کی آمیزش تھی۔

وہ کارڈ استعمال کرتے ہوئے گراؤنڈ فلور پر آ گئی۔ پھر وہاں سے ایمرجنسی ڈور کے ذریعے کھلی خنک فضا میں پہنچ گئی۔ وہ کیمپس بلڈنگ کی جانب دوڑ پڑی۔ تب اسے احساس ہوا کہ بھورے بالوں والا اس کے پیچھے اور کافی قریب ہے۔ فیکلٹی آفس کی ایک کھڑکی روشن تھی۔ ''ڈاکٹر کلیرسن!'' اس کے ذہن نے سرگوشی کی۔ اس نے رفتار بڑھائی اور کیمپس کی جانب سے رخ پھیر لیا۔ وہ اچانک فیکلٹی بلڈنگ میں گھس گئی۔ اس کی لمبی ٹانگیں خوب ساتھ دے رہی تھیں۔ اندر آتے ہی اس نے دروازہ بند کیا۔ جوتے اتار پھینکے اور موزوں سمیت ایک دھماکے سے ڈاکٹر کے کمرے میں آن دھمکی۔

ڈاکٹر اچھل پڑا۔

''کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟'' ڈاکٹر اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔

''سیکیورٹی... میرے پیچھے ہے... مجھے چھپاؤ۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ ''شیرف ڈپارٹمنٹ فون... کرنا ہے... جلدی ــــ''

''[illegible] رہی ہو؟''

''ٹم براؤن وارڈ ''سی'' میں ہے۔ ایلسٹن اس پر [illegible]... پلیز کال شیرف...''

ڈاکٹر نے آنکھیں بند کر کے نفی میں سر ہلایا۔ ''[illegible]'' وہ بڑبڑایا۔ ''ٹھیک ہے تم اس الماری میں [illegible] میں شیرف کو فون کرتا ہوں۔'' ڈاکٹر کا چہرہ کشمکش کا [illegible] تھا۔

''[illegible] ڈاکٹر، شکریہ۔''

اس نے الماری میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ اسے ڈاکٹر کی آواز سنائی دے رہی تھی...

''شیرف آفس؟... ہاں میں ڈاکٹر کلیرسن، انگراہم سے بات کر رہا ہوں، میرے آفس میں ایک بہت خوف زدہ لڑکی موجود ہے... وہ کسی قسم کے خطرے میں ہے... جلدی کسی کو بھیجو۔ ہاں میں کمرا نمبر 107 فیکلٹی بلڈنگ میں ہوں... شکریہ۔''

کوئین نے سکون کی سانس لی اور آرام دہ حالت میں [illegible]... وہ انگراہم میں کسی پر بھروسا نہیں کر سکتی تھی۔ اسے [illegible] کے چند لمحے ملے تو اسے احساس ہوا کہ ڈاکٹر کلیرسن [illegible] ہو سکتا ہے۔ اگرچہ اس کا دل نہیں مان رہا تھا۔

اسے دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ کسی کا سوال [illegible]

''کہاں ہے وہ؟''

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ اس کی آواز بہت تھکی ہوئی [illegible]

کوئین نے اٹھنا شروع کیا۔ الماری کا دروازہ کھلا، اور اس کی چیخ بلند ہوئی... سامنے بھورے بالوں والا کھڑا [illegible] تھا۔

''نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔'' کوئین نے سوچا۔ معاً اس نے [illegible] چاہا لیکن بھورے بالوں والے نے سختی سے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ''بہت ہو گیا... لڑکی۔''

''اسے تکلیف مت پہنچاؤ۔'' کلیرسن نے کہا۔ اس کا [illegible] تھا۔

''مذاق کر رہے ہیں آپ، آپ کو پتا ہے اس نے [illegible] ہے۔'' وہ کوئین کو گھسیٹتا ہوا کمرے سے نکلنے [illegible] کوئین نے صدمہ اور غیر یقینی کیفیت میں ڈاکٹر کو دیکھا۔ ''[illegible] آپ بھی؟'' اس کی آواز لڑکھڑائی۔ ڈاکٹر اس سے [illegible] رہا تھا۔ اس کی نگاہیں میز پر تھیں۔

''کیوں کیا، ایسا؟ میں تو آپ کو دوست سمجھتی تھی؟''

بالآخر ڈاکٹر نے سر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر تکلیف اور رنج کی پرچھائیاں تھیں، آنکھوں میں پانی تھا۔ ''[illegible] نے کیا، مجھے کرنا تھا۔ یہاں جو سلسلہ ہے اسے ایسے ہی چلنا ہے...''

کوئین نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا پھر شدید غصے کی لہر نے ہر چیز کو تہ وبالا کر دیا۔ نازک سی لڑکی میں کہاں سے طاقت آئی اس نے سیکیورٹی والے کو دھکیلا اور بازو چھڑا لیا۔ چوہے بلی کی دوڑ پھر شروع ہو گئی۔ کوئین کو خبر نہیں تھی کہ وہ اب کہاں جائے۔ اس نے شانے پر سے عقب میں جھانکا بھورے بالوں والے کا چہرہ غضب کی شدت سے مسخ ہو گیا تھا۔ کوئین نے ساری طاقت اپنی ٹانگوں میں سمو دی تاہم چکنا فرش رکاوٹ بن رہا تھا وہ اب تک موزے بھی نہیں اتار سکی تھی۔ اس مرتبہ یہ بھاگ دوڑ جلد ہی ختم ہو گئی۔ سیکیورٹی والا سخت غصے میں تھا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے وہ پہلے ہی چوٹ کھائے ہوئے تھا۔ اس نے لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر گرا دیا اور فرش سے سر ٹکرایا۔ کوئین نے آخری چیز اس کی آنکھوں کی قاتلانہ چمک دیکھی۔ پھر اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

بالآخر میٹ کی چور کر دینے والی تھکن کا اختتام ہوا۔ وہ انگراہم کے گیٹ پر پہنچ گیا تھا۔ برف باری رک چکی تھی۔ گارڈ نے گیٹ ہاؤس کی کھڑکی سے مشکوک نظر اس پر ڈالی۔

''کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''ہاں، مجھے فرسٹ ایئر کی طالبہ مس کلیری سے ملنا ہے۔''

''وہ سب کرسمس بریک کے لیے گھروں کو روانہ ہو چکے ہیں۔''

''لیکن وہ نہیں گئی ہے، وہ میرا انتظار کر رہی ہے۔ کمرا نمبر 252 میں فون ملاؤ۔'' میٹ نے کہا۔

گارڈ نے شانے اچکائے اور فون اٹھایا۔ کچھ دیر بعد اس نے جواب دیا۔ ''کوئی فون نہیں اٹھا رہا ہے۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ سب جا چکے ہیں۔''

میٹ نے بے چینی محسوس کی۔ موبائل پر کوئین کی آواز میں خوف تھا۔ ''میں جانتا ہوں کہ وہ یہاں ہے۔ میری چند گھنٹے قبل اس کے ساتھ بات ہوئی ہے۔ شاید اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔''

''تم میری بات نہیں سمجھ رہے۔''

''اس کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ مجھے دیکھ لینے دو۔''

"میرا مشورہ ہے کہ دو میل مغرب میں کوالٹی ان میں رات گزارو اور کل آٹھ بجے آؤ۔"

"لیکن ....."

گارڈ نے کھڑکی بند کر دی۔ میٹ نے کار فون پر نمبر ملایا۔ بیل بجتی رہی... میٹ کے دماغ میں اس کے الفاظ گونج رہے تھے کہ "ٹم کو انگراہم میں چھپایا گیا ہے۔" میٹ نے آنکھیں مسلیں، وہ تھکن سے چور تھا۔ اس کا ذہن کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ ٹھیک ہے وہ صبح آئے گا۔

☆☆☆

ٹم نے جزوی طور پر کوئین کی بھاگ دوڑ دیکھی۔ اس نے سیکیورٹی والے کو بھی دیکھا۔ کوئین کو یہاں سے نکلنا ہے... لیکن اگر وہ پکڑی گئی... وہ کوئین کی جرأت اور جدوجہد سے متاثر تھا۔ اسے بھی کچھ کرنا ہے۔ 9574 کی دو بجے کی خوراک میں تاخیر ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کو متحرک کرنے کی شدید کوشش شروع کر دی۔ اس کی بائیں ران میں سخت تکلیف تھی۔ ٹم کو احتیاط برتنی تھی کیونکہ وارڈ کی بتیاں جلی رہ گئی تھیں۔ اس کی حرکت باہر سے کوئی دیکھ سکتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کئی اور مریض بھی کسمسا رہے تھے۔ کوئین کے فرار نے دوا کا شیڈول بگاڑ دیا تھا۔

دروازہ کھلا اور ڈورس ٹم کی طرف آئی۔ وہ اسے گھور رہی تھی۔ تمہاری دوست پاگل ہے۔ اس نے ساری دوائیں ضائع کر دی ہے لیکن فکر مت کرو ایلسٹن کے آتے ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ممکن ہے تمہاری دوست بھی یہیں آ جائے... کرٹ نے اسے پکڑ لیا ہے ....." ڈورس پلٹی۔

'اوہ نہیں، نہیں۔ کوئین یہاں نہیں آئے گی' تاہم ٹم کے لیے یہ اطلاع خوش کن تھی کہ فی الحال ان کے پاس فوری طور پر دینے کے لیے 9574 کا ڈوز نہیں تھا۔

دفعتاً وارڈ میں لرزش ہوئی، ٹم کو ایک لمحہ لگا، اس نے ہیلی کاپٹر کی آواز پہچان لی۔ اس وقت کون آیا ہے؟

ڈورس بھی بوکھلا گئی اور بتیاں بند کر کے باہر بھاگی۔

ٹم نے جدوجہد تیز کر دی۔ ڈورس کے واپس آنے سے پہلے پہلے اسے کھڑے ہو جانا تھا۔ وہ اعضا کو ہلا رہا تھا۔ ہتھیلیاں مسل رہا تھا۔ پٹھوں کا مساج کر رہا تھا۔ کوئین کے پکڑے جانے کی اطلاع نے اس میں نئی روح پھونک دی تھی۔

☆☆☆

"آرتھر کیا مجھے یہ بتانا پڑے گا کہ کلیڈ رمین کس قدر ناراض ہیں؟"

کوئین کی سماعت سے جانی پہچانی مدھم آواز ٹکرائی۔ اس کا سر دکھ رہا تھا۔ فضا میں سگار کے دھوئیں کی بو تھی۔ وہ پشت کے بل کسی کاؤچ پر لیٹی تھی۔

"نہیں، مجھے اندازہ ہے۔ آپ کی موجودگی اس کی دلیل ہے۔" یہ ایلسٹن کی آواز تھی۔ کوئین نے زور لگا کر آنکھوں میں جھری پیدا کی۔ ایلسٹن اور سینیٹر وھٹنی محو گفتگو تھے۔

کوئین نے دیکھا کہ سینیٹر اس کی جانب اشارہ کر کے کہہ رہا تھا۔ "دو سال میں یہ تیسرا طالب علم ہوگا جسے ہمیں غائب کرنا پڑے گا، جلد یا بدیر کسی جانب سے تحقیقات کا مطالبہ شروع ہو جائے گا۔ مجھے بتاؤ آرتھر کہ ہم کیونکر وضاحت کر سکیں گے کہ اس ایک سال میں دو طالب علم کہاں غائب ہو گئے؟"

"میں ....." ڈاکٹر ایلسٹن نے کچھ کہنا چاہا۔

"مجھے یہ پسند نہیں ہے لیکن اس لڑکی کو ختم کرنا ہی ہوگا۔" وھٹنی بول رہا تھا۔

کوئین ساکت پڑی تھی۔ ایک سابقہ یو ایس سینیٹر اور ایک قابلِ تعظیم پروفیسر اسے غائب کرنے کی ناگزیریت پر بات کر رہے تھے۔ کیا یہی حقیقت ہے؟

پھر ایک تیسری آواز آئی۔ "میرے خیال میں ہم حل نکال سکتے ہیں۔" یہ سیکیورٹی چیف ویرن کی آواز تھی۔ "ہم دو عدد غائب شدہ کو ایک بنا سکتے ہیں... ایک غیاب۔"

"ہم سن رہے ہیں۔" سینیٹر بولا۔

"میں ایلیٹ کو بالٹی مور بھیجوں گا کہ ایئرپورٹ سے براؤن کی کار لے آئے۔ میرا منصوبہ ہے کہ ہم ظاہر کریں گے کہ وہ واپس آیا تھا اور اپنی گرل فرینڈ کو ساتھ لے گیا۔"

"خوب، اچھا خیال ہے۔" سینیٹر نے کہا۔

"کہاں لے گیا، کار کہاں گئی؟" ڈاکٹر ایلسٹن نے سوال کیا۔

"کار آج رات تباہ ہو جائے گی۔" چوتھی آواز کرٹ کی تھی۔

"کیا مطلب؟" ویرن نے پوچھا۔

کوئین آنکھ کی جھری سے بھورے بالوں والے کو دیکھنے میں ناکام رہی۔

"کریش، کار کریش۔" کرٹ نے کہا۔ "ہم لڑکے کے خون میں تھوڑی سی دوا شامل کر دیں گے۔ دونوں عاشق برفیلی سڑک پر جاتے ہوئے پھسل کر کسی درخت سے ٹکرائیں

گے... فیول ٹینک پھٹے گا... بوم... م... اور کہانی ختم۔"

ایلسٹن اور سینیٹر نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

کوئین کی دھڑکنیں بے قابو ہو گئیں۔

اچانک وھٹنی نے کہا۔ "کیا تم سنبھال لو گے؟"

"کیوں نہیں۔" وہ بولا۔ "میں سب انتظام کر لوں گا۔"

کمرے میں سکوت طاری تھا۔ سکوت کا پردہ فون کی گھنٹی نے چاک کیا۔ ویرن نے بات کی اور ایلسٹن کو بتایا کہ ڈورس کو دوا چاہیے۔

"پہلے ہمیں اس معاملے کو نمٹانا ہے۔" سینیٹر وھٹنی بولا۔

"لیکن ہم قتل کی بات کر رہے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

وھٹنی گھوما۔ "بدترین مسئلوں کا جواب بدترین حل ہی ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر نے شانے اچکا کر سر ہلایا۔

کوئین کی شریانوں میں برف جمنے لگی۔

"ٹھیک ہے، کار واپس آنے کے بعد یہ معاملہ کرٹ کا ہے۔" سینیٹر نے اعلان کیا۔

☆☆☆

ٹم کے اعضا میں جان پڑ رہی تھی۔ اس نے فیڈنگ ٹیوب اور کلس میں سے سوئی نکال دی جو ٹیوب کے ذریعے اسٹینڈ میں لگی ڈرپ سے منسلک تھی۔

اس کے اعصاب پوری طرح قابو میں نہیں آئے تھے۔ تاہم وہ پہلے سے بہت بہتر محسوس کر رہا تھا اور کسی بھی امکان کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔

☆☆☆

نڈھال ہونے کے باوجود میٹ کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ موٹل روم میں لیٹا سڑک پر برف صاف کرنے والی مشین کی آواز سن رہا تھا۔ وہ جتنا سوچتا، اس کا یقین پختہ ہوتا جاتا کہ کوئین خطرے میں ہے۔ کسی بڑی مصیبت سے دوچار ہے۔ اس نے ان گنت بار اس ٹوٹی پھوٹی گفتگو کو ذہن میں دہرایا جو کار فون سے اس نے کوئین کے ساتھ کی تھی۔ کوئین کے آخری الفاظ جو اس کی سمجھ میں آئے تھے:

"شیرف... ساؤتھ ورتھ۔"

میٹ نے کمبل ایک طرف پھینکا اور بستر پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ "شیرف ساؤتھ ورتھ" اس نے فریڈرک کاؤنٹی فون بک اٹھائی اور شیرف کا نمبر ڈھونڈا۔ کچھ دیر بعد وہ نمبر ملا رہا تھا۔ جواب دینے والا کوئی ڈپٹی ہیرس تھا۔

میٹ نے ساؤتھ ورتھ کے بارے میں استفسار کیا۔

"ساؤتھ ورتھ، صبح آٹھ بجے مل سکیں گے، کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟"

میٹ ہچکچایا۔ پھر ساری داستان ہیرس کے گوش گزار کر دی... ہیرس اس معاملے سے آگاہ تھا لیکن میٹ کے ذریعے اسے کچھ نئی باتیں پتا چلیں۔

"ہمیں اب تک اتنا کچھ پتا نہیں تھا۔" وہ بولا۔

"لیکن کوئین نے ساؤتھ ورتھ کا نام لیا تھا۔ کیا تم اس کو کال نہیں کر سکتے؟" میٹ نے زور ڈالا۔

"میں کر سکتا ہوں، یہ کیس اس کے پاس ہے۔" پھر ہیرس نے میٹ کا نمبر لیا اور بات ختم کر دی۔

تین منٹ بعد میٹ کو کال موصول ہوئی۔

"کیا تم نے شیرف آفس فون کیا تھا؟" ایک خمار آلود آواز سنائی دی۔

"یس، ڈپٹی ساؤتھ ورتھ؟"

"ہاں، میں ہوں، شروع ہو جاؤ، میں سن رہا ہوں۔"

☆☆☆

دروازہ کھلا اور بتیاں روشن ہو گئیں۔ ٹم جم کر رہ گیا۔ ڈورس کے بجائے دوسری نرس ٹرالی کے ساتھ اندر آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر ٹم نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ موٹی نرس پر اس کی حکمتِ عملی کامیاب رہے گی یا نہیں۔ وہ ابھی مکمل فٹ نہیں تھا۔

"نمبر 8 لگتا ہے تم مصروف رہے ہو؟" وہ سیدھی ٹم کی جانب ہی آئی تھی۔ ٹم نے دیکھا کہ ٹرے میں آٹھ سرنجز قطار میں رکھی تھیں۔ وہ اس کے بستر کے قریب رک گئی اور حیرت سے فیڈنگ ٹیوب کو دیکھ رہی تھی جو نیچے پڑی تھی۔

"آہ، تم نے کیونکر کیا؟"

ٹم کا دایاں ہاتھ اور آئی وی لائن، شیٹ کے نیچے تھے۔

"میرے خیال میں حرکت واپس آ رہی ہے، دوسرے بھی کچھ بے چین ہیں۔ میں ٹھیک کر دیتی ہوں۔"

نرس حقیقی صورتِ حال سے بے خبر تھی۔ ٹم نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو ہلا کر اطمینان کیا۔

"دوائی کی اور نئی سپلائی آنے والی ہے۔" وہ بول رہی تھی۔ ٹم خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک سرنج آئی وی لائن میں چبھو کر خالی کر دی۔ نرس کو پتا نہیں تھا کہ آئی وی نیڈل ٹم کی نس میں نہیں ہے۔

اسی وقت ٹم نے بائیں ہاتھ سے اس کا یونیفارم پکڑ کر اسے اپنے اوپر کھینچا۔ دوسرا ہاتھ باہر آیا اور دائیں ہاتھ میں دبی ہوئی آئی وی نیڈل اس نے یونیفارم کے اوپر سے ہی

نرس کے پیٹ میں گھونپ دی۔ نرس کی چیخ نکل گئی، اس کی آنکھیں خوف اور تکلیف سے پھیل گئیں۔

وہ ہاتھا پائی کر رہی تھی اور چیختی جا رہی تھی۔ نرس کا چہرہ ٹم کے سینے سے لگا تھا اس کے ہلکے پھلکے وزن نے ٹم کا کام آسان کر دیا تھا۔ یک لخت وہ ڈھیلی پڑ گئی... 9574 نے کام شروع کر دیا تھا۔

ٹم نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ پھسل کر فرش پر جا گری۔ ٹم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ٹرالی کی ٹرے میں سے ایک سرنج اٹھائی اور دوبارہ ساکت لیٹ گیا۔ اسے امید تھی کہ ساتھی نرس کو آنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

☆☆☆

''ایلیٹ۔'' ویرن کی آواز آئی۔ ''کیا کار آ گئی ہے؟'' کوئین ابھی تک بے ہوشی کی اداکاری کر رہی تھی۔ حالانکہ اتنی دیر میں ان لوگوں کو اس کی جانب متوجہ ہونا چاہیے تھا۔ تاہم غیر متوقع حالات کے الجھاؤ نے سب کو پریشانی میں ڈال دیا تھا۔

''اسپتال کی پارکنگ میں کھڑی کر دی ہے۔'' ایلیٹ نے جواب دیا۔

''گڈ۔'' وحشی بولا۔ ''میں اب واشنگٹن جا رہا ہوں، تمام معاملہ سلجھتے ہی مجھے کال کر دینا۔ وہ ایلسٹن اور کرٹ کے قریب سے گزرتا ہوا باہر نکل گیا۔

''غرقاب ہوتے جہاز سے چوہا کودا۔'' ویرن نے تبصرہ کیا۔ ''وہ قبل از وقت اس ریاست سے نکلنا چاہتا ہے۔''

''تو کیا ہوا؟'' ایلیٹ نے کہا۔

''لڑکی اور براؤن کو کار کے حادثے میں ٹھکانے لگانا ہے۔'' ویرن نے انگوٹھے سے کوئین کی جانب اشارہ کیا۔

ایلیٹ غیر مطمئن نظر آ رہا تھا۔ ''میں نے ایسے کسی کام کے لیے معاہدے پر دستخط نہیں کیے تھے۔''

''ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں بچا ہے۔'' ڈاکٹر ایلسٹن نے کہا۔

کوئین عالم دہشت میں سب سن رہی تھی۔ اسے بھاگنے کا خیال آیا تاہم راستے میں چار آدمی حائل تھے... ممکن ہی نہیں تھا۔ اس احمقانہ کوشش کا انجام یہی ہوتا تھا کہ وہ اسے باندھ کر ڈال دیتے جبکہ اس وقت وہ کم از کم ہاتھ پیر استعمال کر سکتی تھی... اسے مناسب وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔

''ٹھیک ہے۔'' ویرن نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ خوش نہیں تھا۔ ''ایلیٹ اوپر جاؤ اور براؤن کو وہیل چیئر پر یہاں لے آؤ۔''

☆☆☆

''ایلی؟''

ٹم نے آنکھیں بند کر لیں۔ ڈورس وارڈ کے دروازے میں سے جھانک رہی تھی۔

''ایلی، کہاں ہو؟'' وہ اندر آ گئی تھی پھر وہ اچانک رک گئی۔

''اوہ نو، ایلی کیا ہوا تمہیں؟'' وہ پریشانی کے عالم میں نرس پر جھکی ہوئی تھی۔ ٹم نے آنکھیں کھولیں۔ اس کے ہاتھ میں سرنج خنجر کی طرح حملہ کے لیے تیار تھی۔ ٹم نے بلا تامل سرنج ڈورس کی پشت میں پیوست کرتے ہی دوا انجیکٹ کر دی۔

ڈورس سیدھی ہو گئی۔ وہ بوکھلاہٹ کے عالم میں ایک ہاتھ پشت پر لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی نظر ٹرالی پر پڑی۔ اس کو کھانسی آ گئی۔ ''اوہ نو....''

ٹم کہنی کے بل لیٹا تھا۔ ''تم؟'' ڈورس کی آنکھیں ابل پڑیں۔ ٹم نے جھپٹا مارا تاہم وہ بستر سے دور ہٹ گئی۔ وہ دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ بار بار پشت کی جانب جا رہا تھا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

''لعنت ہے، اگر وہ فون تک پہنچ گئی۔'' ٹم کو تشویش ہوئی۔ ٹم آہستہ آہستہ بستر پر بیٹھ گیا۔ چند لمحات کے لیے اسے چکر آیا۔ وہ رک گیا پھر دھیرے سے اس نے فرش پر قدم رکھے۔ اس کے گھٹنے بوجھل ہو رہے تھے۔ ٹم نے آہستگی سے وزن ٹانگوں پر منتقل کیا... اس کا ایک ہاتھ بستر پر تھا۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ معاً اس کی نظر غافل نرس کے سیکیورٹی کارڈ پر پڑی... ایسا کارڈ اس نے کوئین کے پاس بھی دیکھا تھا۔ فی الفور اس نے کارڈ پر قبضہ کیا۔ ٹم نے ٹرالی پر سے باقی ماندہ سرنج ایک ہاتھ میں لے لیں اور دوسرے ہاتھ میں کارڈ سنبھالا۔

اس کا بدن نسبتاً تیزی سے بحال ہو رہا تھا۔ وہ وارڈ سے باہر آیا تو ڈورس فرش پر پڑی تھی اور فون اپنی جگہ پر تھا۔ ٹم کو بجلی کا پٹر کی پھڑ پھڑاہٹ کی گونج پھر سنائی دی۔ وقت کم تھا۔ اگر کوئین پکڑی گئی ہے تو اسے سائنس سینٹر کے تہ خانے میں ہونا چاہیے۔ اس نے لفٹ کی جھری میں کارڈ داخل کیا۔ اس کی نظر شیشے میں اپنے عکس پر پڑی۔ وہاں اسے ایک بھوت نظر آیا۔ چہرے پر روئی ہٹی ہوئی تھی تاہم باقی جسم روئی میں لپٹا ہوا تھا۔ اور یہی اس کا لباس تھا۔

☆☆☆

ویرن کے پیٹ میں درد کی لہر اٹھی۔ اس نے کوئین کی

جانب دیکھا۔ کرٹ نے بے رحمی کا مظاہرہ کیا تھا۔ جب وہ ادھر لائی گئی تھی تو مردہ ہی لگ رہی تھی، تاہم تب نہیں اب سہی اسے مرنا ہی ہے۔
فون کی گھنٹی بجی، یہ ایلیٹ تھا۔ ''نئی افتاد آن پڑی ہے چیف۔'' ویرن کا منہ بن گیا۔ ''اب کیا ہے؟'' اس نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔
''وارڈ کی دونرسیں بے ہوش پڑی ہیں اور براؤن غائب ہے۔'' ایلیٹ نے دھماکا کیا۔
ویرن کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔
ایلسٹن کھڑا ہوگیا۔ ''کیا بات ہے؟''
ویرن نے ہاتھ ہلا کر اسے منہ بند رکھنے کا اشارہ کیا۔
''بدبخت، اسے تلاش کرو۔'' ویرن غرایا۔ ''ہم گراؤنڈ فلور سے شروع کرکے اوپر کی طرف جائیں گے۔'' اس نے فون بند کردیا اور ڈاکٹر کی جانب انگلی اٹھائی۔ ''تم نے مسئلہ اور خراب کردیا ہے۔'' ویرن بے قابو ہو رہا تھا۔ پے در پے ناقابلِ یقین واقعات نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔
''میرا کیا قصور ہے؟'' ڈاکٹر کا لہجہ کمزور تھا۔
''جناب براؤن غائب ہے۔'' ویرن نے ڈاکٹر کو گھورا۔
''ناممکن، وہ 9574 کے زیرِ اثر تھا۔''
''تھا۔'' ویرن چیخا۔ ''اسے اگلا ڈوز وقت پر نہیں ملا۔ ہم سب مارے جائیں گے۔''
''گڈ لارڈ... ہمیں عمارت سیل کر دینی چاہیے۔'' ویرن ہاتھ مسلتا ہوا بولا۔ کمرے کی فضا خراب ہوگئی تھی۔
گھنٹی پھر بجی۔ ویرن نے ہراس کے عالم میں فون کو گھورا۔ کسی نے فون اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ دو گھنٹیاں اور بجیں... بالآخر ویرن آگے بڑھا۔ وہ لابی کی سیکیورٹی ڈیسک کا برنی تھا جس کا انگراہم کے اصل معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ویرن نے سوچا کہ شاید اس نے براؤن کو دیکھ لیا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔
''دو آدمی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' برنی نے اطلاع دی۔
ویرن کا حلق خشک ہوگیا۔
''کون؟''
''مجھے ایک کا نام معلوم ہے... فریڈرک کاؤنٹی شیرف آفس کا ڈپٹی ساؤتھ ورتھ۔ وہ طلبا کے غیاب کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہے۔''
''اس وقت؟ تموتھی براؤن کے بارے میں؟''

''دوسرا! کوئی لڑکی ہے... کوئین کلیری۔''
ریسیور ویرن کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ ''میں آرہا ہوں۔'' اس نے فون بند کرکے ڈاکٹر کو گھورا اور سب کو نئی صورتِ حال سے باخبر کیا۔
''کلیری کے بارے میں ان کو کیسے پتا چلا؟'' ایلسٹن نے کہا۔
''پتا کرتے ہیں۔'' ویرن کی آواز سے زہر ٹپک رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس اعلان کررہی تھی کہ حالات ایک بدنما موڑ مڑ چکے ہیں۔
''کرٹ لڑکی پر نظر رکھنا۔'' ویرن نے کہا۔ ادھر کوئین سب کچھ سن رہی تھی... اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔
ویرن لابی میں دوسرے آدمی کو نہ پہچان سکا یا وہ بھول رہا تھا۔ بہرحال اس نے ایلسٹن کا تعارف ڈپٹی سے کرایا اور ساؤتھ ورتھ نے میٹ کو متعارف کرایا۔ ویرن کو یاد آیا کہ وہ کوئین کا دوست ہے جو کنکٹی کٹ سے کوئین سے بات کررہا تھا۔ وہ گفتگو اس نے تہ خانے کے ریکارڈر پر سنی تھی اور نرسوں کو وارڈ ''سی'' چیک کرنے کا حکم دیا تھا۔ تاہم ویرن تعجب میں تھا کہ میٹ اتنی جلدی یہاں کیسے پہنچ گیا۔

☆☆☆

کوئین کے حوصلے اور امید کو نئی زندگی مل گئی تھی۔ سب سے اچھی خبر براؤن کا فرار تھا۔ شیرف کی آمد نے اسے مزید خوش کن احساسات سے دوچار کردیا تھا۔ جسیم بھورے بالوں والا کرٹ کمرے میں اکیلا رہ گیا تھا اور دروازے سے باہر لابی کا جائزہ لے رہا تھا۔ معاً اس نے دروازہ بند کیا اور کوئین کی جانب رخ کیا۔ کوئین نے آنکھیں بند کرلیں۔
''چلو اٹھو، بے بی۔'' اس نے کوئین کا شانہ ہلایا۔ وہ ساکت پڑی رہی۔
''تمہیں چکھے بغیر ضائع کرنا حماقت ہوگی۔'' وہ کوئین پر جھک گیا۔ اس کے ہونٹ کوئین کی گردن پر تھے۔ کوئین نے آنکھیں کھولیں... کرٹ کا کان اس کے منہ سے ایک انچ دور تھا۔
کوئین نے اطمینان سے کان کے نچلے حصے میں دانت گاڑ دیے۔ اس نے جبڑوں کی پوری طاقت استعمال کی تھی۔ کان بری طرح دانتوں کے لاک میں پھنس گیا تھا۔ کرٹ کا نشہ ہرن ہوگیا۔ اس نے ایک اذیت ناک کراہ کے ساتھ سیدھا ہونا چاہا۔ تاہم کوئین نے اس کی شرٹ پکڑ لی۔ منہ میں خون کا ذائقہ گھل گیا۔ ایک زوردار جھٹکے سے کرٹ نے خود کو چھڑایا۔ کان کا ایک حصہ تقریباً الگ ہوکر

لٹک رہا تھا اور خون ٹپک رہا تھا۔
اس کا چہرہ اذیت اور غصے سے مسخ ہوگیا۔ کوئین نے اس سے بچ کر نکلنا چاہا لیکن کرٹ نے کسی مشتعل درندے کی طرح بروقت اسے دبوچ لیا۔ اس کی گردن تک خون میں تر ہوگئی تھی۔
''تو نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔'' وہ غرایا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ کوئین نے دونوں ہاتھ آگے کرلیے اور چیخنا شروع کردیا... کرٹ کے کندھے کے اوپر سے اس نے ایک چہرہ ابھرتا دیکھا اور اس کا منہ کھلا رہ گیا...

☆☆☆

ٹم لفٹ سے نکلا تو تہ خانے کے قریب تھا۔ وہ اتنا ہی تیز چل رہا تھا جتنا کہ اس کا جسم اجازت دے سکتا تھا۔ معاً اسے کوئین کی مدھم چیخیں سنائی دیں اور وہ احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر جاگنگ کے انداز میں دوڑنے لگا۔ وہ ایک دروازے تک پہنچا جس پر ''الیکٹرانکس'' لکھا تھا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ سیڑھیوں کے نیچے ایک کمرا تھا۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں ٹم کو باندھ کر رکھا گیا تھا۔ ایک طرف کاؤچ پر اس نے کرٹ کو دیکھا جو کوئین کو بے دست و پا کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ کوئین چیخ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خون تھا۔ ٹم کو نہیں پتا تھا کہ یہ خون خود کرٹ کا ہے۔ ٹم کے دماغ میں آگ لگ گئی۔ وہ حتی الامکان تیزی سے کرٹ کی پشت پر پہنچا۔ وہ عقب سے حملے کے لیے تیار تھا تاہم اسے خیال آیا کہ اس کا جسم خونی جدوجہد کے قابل نہیں ہے۔ اس نے بروقت خود پر قابو پایا۔ کوئین اسے دیکھ چکی تھی۔
ٹم نے ایک سرنج کی کیپ الگ کی... وہ جتنا زور لگا سکتا تھا، لگایا اور سرنج کرٹ کی پشت میں داخل کردی اور انگوٹھے کے زور سے دوا بدن میں انجیکٹ کردی لیکن سوئی پسلی سے ٹکرا کر اندر ہی مڑ گئی اور دوا اندر پھینکنے والا لیور جام ہوگیا۔ کرٹ دھاڑتا ہوا پلٹا اور اپنا دائیاں ہاتھ گھمایا۔ ٹم نے جھکائی دی لیکن یہ ایک سست دفاع تھا کرٹ کا ہاتھ اس کے سر سے ٹکرایا اور وہ مشینوں پر جا گرا۔ باقی سرنجز اس کے ہاتھ سے نکل کر بکھر گئیں۔
''تم دونوں کو ایک ساتھ دفن کروں گا۔'' کرٹ عالمِ غضب میں درندے کی طرح غرایا۔ شدتِ غضب سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، کان کے خون نے پھیل کر اسے ایک وحشت ناک عفریت کا روپ دے دیا تھا۔ اس نے ایک شدید اپرکٹ لگایا اور ٹم فرش پر جا پڑا... اس کی نظر دھندلا گئی۔ اس نے کرٹ کا دھندلا سایہ اپنے اوپر جھکتے دیکھا۔

☆☆☆

کوئین پر کچھ دیر سکتہ طاری رہا، پھر وہ حرکت میں آئی، کرٹ بری طرح ٹم پر تشدد کررہا تھا۔ وہ دفاع کے قابل نہیں تھا اور گٹھری کی صورت میں پڑا تھا۔
کوئین کو کچھ سجھائی نہیں دیا... دفعتاً اس کی نگاہ ایک سرنج پر پڑی۔ یقیناً یہ ٹم لے کر آیا تھا۔ ان میں جو کچھ بھی تھا یقیناً مہلک تھا... شاید... 9574 جب ہی ٹم نے سرنج سے حملہ کیا تھا جو اس وقت بھی کرٹ کی قمیص میں اٹکی ہوئی تھی، اس نے دیکھا کہ فرش پر ایسی ہی چند اور سرنج بھی پڑی تھیں۔ ایک ٹوٹ چکی تھی۔
کوئین نے دو سرنج اٹھالیں اور کرٹ کی طرف گئی جو بے رحمی سے ٹم کو وزنی بوٹوں سے مضروب کررہا تھا۔
''بس کرو۔'' وہ چلائی اور تیزی سے ایک سرنج کرٹ کی ران کے عقب میں خالی کردی۔ یہ آئی وی انجکشن نہیں تھا جو فوری طور پر خون میں شامل ہوجاتا۔ کوئین نے دوسری سرنج بھی استعمال کرنی چاہی تاہم کرٹ نے زخمی درندے کی طرح پلٹ کر وار کیا۔ کوئین پھرتی سے جھکائی دے گئی۔ اس کی نظر کھلے دروازے پر پڑی۔ ''ٹم میں مدد لے کر آتی ہوں۔'' وہ تیر کی طرح دروازے کی جانب گئی اور کرٹ کی جھپٹ سے بال بال بچی۔
ٹم خون آلود زخمی حالت میں پڑا تھا۔ ٹم کی حالت نے کوئین کی ٹانگوں میں نئی طاقت بھر دی تھی۔ اس کے عقب بھاری قدموں کی آواز تھی۔ لفٹ کی جانب وہ نہیں جاسکتی تھی۔ سیڑھیاں، سیڑھیاں کدھر ہیں۔ پھر اسے ایگزٹ کا نشان نظر آیا۔ دروازہ کھولنے میں جو لمحات ضائع ہوئے اس نے شکار اور شکاری کا فاصلہ کم کردیا تا۔ وہ پہلی لینڈنگ تک پہنچی تھی کہ کرٹ نے اس کا ٹخنہ پکڑلیا۔ کوئین ریلنگ سے لپٹ گئی۔ کرٹ نے اسے پھر پکڑلیا تھا۔
''نہیں۔'' کوئین کی چیخ بلند ہوئی۔ اس نے اندھا دھند اکلوتی سرنج کو کرٹ کے چہرے پر مارا... اسے نہیں پتا تھا کہ سوئی کہاں پر اور کتنی اندر گئی لیکن وہ دوائی انجیکٹ کر چکی تھی۔ کرٹ نے اس کا ٹخنہ چھوڑ دیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے جس میں صدمہ اور نفرت کا رنگ غالب تھا۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ پیچھے کی جانب سر کے بل سیڑھی پر گرا۔ ٹخ کی عجیب سی آواز آئی اور اس کا سر غیر معمولی زاویہ پر مڑ گیا۔ جسم کپکپایا اور پھر ساکت ہوگیا۔
کوئین پوری جان سے کانپ رہی تھی۔ تاہم جلد ہی

اس نے خود پر قابو پالیا۔ اسے فوراً لابی تک پہنچنا تھا۔

☆☆☆

ویرن آرام سے تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کلیری کے دوست میٹ کو زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ کوئین کے موبائل پر اس کی ٹوٹی پھوٹی بات چیت ہوئی تھی۔ ویسے بھی معاملہ اب ڈاکٹر ایلسٹن کے سپرد تھا جو اسے خوب صورتی سے سنبھال رہا تھا۔

برا لمحہ اس وقت آیا جب ڈاکٹر کلیرنن ایک دروازے سے برآمد ہوا۔ وہ عجیب حالت میں بیگانۂ ہوش و حواس لگ رہا تھا۔ ''کلیرنن!'' ایلسٹن نے کہا۔ ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

کلیرنن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کسی ''زومبی'' کی طرح چلتا ہوا ان کے قریب سے گزر کر لفٹ کی جانب چلا گیا۔ اس نے چار نمبر پنچ کیا تھا۔

''تم نے دیکھا۔'' ایلسٹن نے ساؤتھ ورتھ کو مخاطب کیا۔ ''اس وقت میں اکیلا ہی فیکلٹی ممبر نہیں ہوں۔''

''فائن۔'' ساؤتھ ورتھ نے جواب دیا۔ ''لیکن مجھے بلاتمہید سیدھی بات کرنی چاہیے۔ ویرن نے آپ کو اسی لیے بلایا کہ ٹموتھی براؤن واپس آ گیا تھا؟''

''ویرن نے یقیناً مجھے اطلاع دی تھی۔'' ایلسٹن نے غیر معمولی صبر کا مظاہرہ کیا۔ ''میڈیکل ایجوکیشن کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے مجھے براؤن سے سوالات کرنے تھے لیکن اسے کسی چیز سے غرض نہیں تھی، اس نے مس کلیری کو لیا اور اسکیٹنگ کے لیے چلا گیا۔''

''مجھے اس میں سے کسی بات پر یقین نہیں ہے۔'' میٹ نے مداخلت کی۔

ایلسٹن نے ڈرامائی انداز میں شانے اچکائے۔ ''مجھے نہیں پتا کہ نوجوان میں اور کیا بتاؤں۔ وہ دونوں ساتھ کار میں چلے گئے تھے۔''

''براؤن کب آیا تھا؟'' ساؤتھ ورتھ نے سوال کیا۔

''مڈنائٹ سے ذرا پہلے۔'' ویرن نے جواب دیا۔

''نہیں۔'' میٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کوئین نے کہا تھا...''

ایلسٹن نے ہاتھ بلند کیا۔ ''تم بھی تھکے ہوئے تھے، وہ بھی تھکی ہوئی تھی اور اپنے دوست کی آمد پر جذباتی حالت میں تھی۔ میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ ہم سب کو ایک اچھی نیند کی ضرورت ہے۔ ہم فریش ہو کر کل صبح آرام سے اس معاملے پر گفتگو جاری رکھ سکتے ہیں۔''

ساؤتھ ورتھ نے استفہامیہ نظروں سے میٹ کو دیکھا۔ میٹ نے غیر یقینی انداز میں سر ہلایا۔

ساؤتھ ورتھ نے کہا۔ ''ڈاکٹر کی بات میں نکتہ ہے، میں براؤن کی کار کے متعلق بلیٹن جاری کراتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میرا ذہن تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن اگر وہ دونوں یہاں نہیں ہیں تو ہو سکتا ہے کہ نہ ہوں۔''

ڈاکٹر نے ایک ہاتھ میٹ کے کندھے پر رکھا۔ ''چانا چاہیے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ان کو ڈھونڈ لیں گے۔ فریڈرک کاؤنٹی کا شیرف ڈپارٹمنٹ اپنی اعلیٰ کارکردگی کی پہچان رکھتا ہے۔''

''ٹھیک جا رہے ہو۔'' ویرن نے ڈاکٹر کے متعلق سوچا۔ تب ہی اس نے عقب میں تہ خانے کی سیڑھیوں کے اطراف سے ایک نسوانی چیخ سنی۔ ''نہیں!'' تاہم یہ آواز بہت مدھم تھی۔ خود اسے یقین نہیں آیا کہ اس نے کچھ سنا ہے۔ میٹ اور ساؤتھ ورتھ بیرونی دروازے کے قریب پہنچ چکے تھے۔

چلتے رہو... چلتے رہو... ویرن بڑبڑایا۔ اسے عقب میں دروازے کی آواز آئی۔ وہ مڑا... اسے یہی لگا کہ اس کے دل کی دھڑکن رک گئی ہے۔ بھیانک ترین خواب حقیقت بن گیا تھا۔ کلیری کے منہ پر اور کپڑوں پر خون لگا تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے چلا رہی تھی۔ ''میٹ! میٹ... میٹ... میٹ...ٹ...ٹ...'' وہ بلکتی ہوئی بچی کی طرح میٹ کی بانہوں میں سمٹ گئی۔ میٹ گھٹنوں کے بل اسے سمیٹ کر بیٹھ گیا... منہ بولے بھائی نے بہن کو پالیا تھا۔ نیلے کٹورے چھاجوں برس رہے تھے، کوئین کی ہچکیاں بندھ گئیں...

ڈاکٹر اور ویرن کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

یکلخت ساؤتھ ورتھ نے ڈاکٹر کو شانے سے پکڑ کر ڈیسک کی جانب دھکیلا۔ وہ کاؤنٹر سے چند قدم ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ پسٹل ساؤتھ ورتھ کے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر بھی ساؤتھ ورتھ نے سوال کیا۔

''اب کیا کہتے ہو تم لوگ؟''

''ایمبولینس بلاؤ۔'' کوئین نے سسکتے ہوئے کہا۔ ''ٹم زخمی ہے۔''

''کہاں ہے، مجھے بتاؤ۔'' میٹ نے بےقراری سے کہا۔ ''یہ خون کیسا ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں، ایمبولینس...''

''کوئی حرکت نہیں کرے گا۔'' ساؤتھ ورتھ الرٹ تھا۔

اس نے ریڈیو ریموٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اسی وقت ایلیٹ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی جو اس نے پیشہ ورانہ انداز میں دونوں ہاتھوں میں تھام رکھی تھی۔ ایلیٹ سخت ہیجانی کیفیت میں تھا۔ ''ساؤتھ ورتھ اپنی گن کاؤنٹر پر رکھ دو۔''

ساؤتھ ورتھ پُرسکون تھا۔ اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔

''جلدی کرو۔'' ایلیٹ نے پھر کہا۔ ڈپٹی گن سے دستبردار ہو گیا۔

''چیف اٹھا لو۔'' اس نے ایلسٹن کی طرف دیکھا۔

''اور مجھے بتاؤ کیا ہو رہا ہے؟ براؤن کنٹرول روم میں مرا پڑا ہے اور کرٹ سیڑھیوں پر ہے۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی ہے۔''

کوئین نے پھر رونا شروع کر دیا...

ایلیٹ نے ویرن کو دیکھا۔ ''آگے بڑھو، گن اٹھا لو۔''

''ضرورت نہیں ہے۔'' ویرن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''ایلیٹ کہانی ختم ہو گئی ہے۔''

ایلسٹن نے گھوم کر پسٹل اٹھا لیا۔ ''ویرن صحیح کہہ رہا ہے، ایلیٹ۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ڈپٹی میں یہ تھوڑی دیر کے لیے ادھار لے رہا ہوں، چند منٹ بعد تمہیں واپس مل جائے گی۔'' ایلسٹن لابی سے نکل گیا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

ایلیٹ کے چہرے پر الجھن اور خوف تھا۔

فائر کی آواز سن کر ویرن اچھل پڑا اور ایلیٹ کی الجھن بھی ختم ہو گئی تاہم اس نے فوری طور پر دوڑ لگا دی۔ ساؤتھ ورتھ نے ریڈیو پر ایمرجنسی طبی امداد طلب کی اور APB کو ایلیٹ کے بارے میں باخبر کیا۔ پھر اس نے ویرن کو ساکت رہنے کا اشارہ کیا۔ ویرن محض سر ہلا سکا۔ اس کی دنیا اجڑ گئی تھی۔

☆☆☆

کوئین، میٹ، اور ڈپٹی کے ساتھ تھی۔ ''ٹم نہیں مر سکتا، وہ زندہ ہے۔'' اس نے کہا۔ وہ میٹ کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ وہ لوگ جلد ہی کنٹرول روم تک پہنچ گئے۔ کوئین دروازے میں کھڑی رہ گئی۔ ''ٹم... ٹم...'' اس نے سرگوشی کی۔ ٹم دیوار کے ساتھ گٹھری کی شکل میں لیٹا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ جسم کے نیچے غیر فطری انداز میں دبا ہوا تھا تاہم قطعی بےحس و حرکت تھا۔

''ٹم؟'' وہ چیخ پڑی۔

نیم مردہ جسم کو جھٹکا لگا اور ایک ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھا کھڑا ہو گیا۔ ہوائی کا کیسینو والا اشارہ۔

کوئین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ آنسو بہائے یا ہنسنا شروع کر دے۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور ٹم کے زخم زخم بدن کو بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔

☆☆☆

''مس کوئین صرف چند سوالات اور۔'' ساؤتھ ورتھ نے کہا۔ کوئین کاؤنٹر پر اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ پولیس نے سیکیورٹی ڈیسک کو کمانڈ سینٹر میں تبدیل کر دیا تھا۔ کوئین اسپتال میں ٹم سے ملنے کے لیے بےقرار تھی۔

ٹم کو وہیل چیئر، پھر اسٹریچر کے ذریعے وہاں سے نکالا گیا تھا۔ اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ میٹ اس کے ساتھ گیا تھا۔ ایلسٹن اور کرٹ کے اجسام بھی جا چکے تھے۔ دونوں نرسیں اسپتال پہنچ گئی تھیں۔ ایلیٹ غائب تھا۔ ویرن کو ہتھکڑی لگ گئی تھی۔ وارڈ ''سی'' کے لیے نئی نرسوں کا بندوبست کیا گیا تھا... دیگر ضروری امور بھی نمٹائے جا رہے تھے۔ انگراہم پر پولیس کا قبضہ تھا۔

''کوئی اور بھی ہے جو براہِ راست اس معاملے میں ملوث تھا؟'' ڈپٹی نے اپنا سوال کیا۔

''ایک اور...'' کوئین کے حلق میں گرہ پڑنے لگی۔ ''ڈاکٹر کلیرنن۔ وہ فیکلٹی بلڈنگ میں ہوتا ہے۔'' اس نے کلیرنن کے بارے میں بتایا کہ وہاں آفس میں کیا ہوا تھا۔ ''اس کا پہلا نام کلیرنن ہے۔ کلیرنن ایمرسن۔ چوتھے فلور پر اس کی لیب ہے۔ جسے عموماً وہ لاک رکھتا ہے۔'' کوئین نے جیب سے کی رنگ نکالی۔ میرے پاس وہاں کی چابی ہے۔''

ساؤتھ ورتھ نے اسے دیکھا تھا لابی میں۔ جب ایلسٹن نے اعتراض کیا تھا۔ وہ ایک عمر رسیدہ آدمی تھا۔

کوئین چابی منتخب کر کے کھڑی ہو گئی۔

''رکو۔ میں دیکھتا ہوں۔''

''میں بھی ساتھ چلوں گی۔ میں اسے گرفتار ہوتا دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''اس نے تمہارے اوپر ظلم کیا ہے۔''

''ہاں، میں نے اپنی زندگی اس کے ہاتھوں میں دے دی تھی اور اس نے مجھے قاتلوں کے حوالے کر دیا۔''

کوئین نے ایمرسن کی لیب تک ساؤتھ ورتھ کی راہنمائی کی۔ ساؤتھ ورتھ نے کمرے کا تالا کھولا، کوئین اس کے پیچھے تھی۔

''وہ رہا۔'' کوئین نے ایک کمپیوٹر کی طرف اشارہ کیا۔ کلیرنن نے سر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔

''ڈاکٹر کلیرنن! سب کچھ ختم ہو گیا۔'' وہ بولی۔ وہ

آنسوؤں کوروکنے کی کوشش کررہی تھی۔اس کا غصہ اور انتقام پسپا ہورہا تھا۔وہ اداس کیوں ہورہی ہے؟اس نے سوچا۔

ڈاکٹر نے کوئی حرکت نہیں کی۔وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا اسکرین کو گھور رہا تھا۔کوئین نے دیکھا کہ شفاف سیال کی پلاسٹک بوتل کروم پول سے لٹک رہی تھی اور ٹیوب بذریعہ آئی وی ڈاکٹر کے بازو میں جارہی تھی۔کوئین نے دھیرے سے ڈاکٹر کو ہلایا...وہ ایک جانب لڑھک گیا۔

ساؤتھ ورتھ لپکا اور ڈاکٹر کے جسم کو فرش پر گرنے سے بچالیا۔کوئین منجمد کھڑی اسکرین کو گھور رہی تھی۔لکھا تھا: ”یہ جس سے متعلق ہے۔اس کے لیے ....“اگر میرا تخمینہ ٹھیک ہے تو 9574 کا یہ ڈوز درحقیقت ایل ڈی ہے۔“

”LD؟“ ساؤتھ ورتھ نے سوال کیا۔اس نے آہستہ سے ڈاکٹر کو نیچے لٹا دیا تھا...کوئین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”ہلاکت خیز خوراک (LETHAT DOSE)“ کوئین نے جواب دیا۔کوئین سمجھ گئی کہ اسکرین پر لکھا پیغام اس کے لیے تھا۔ڈاکٹر ضمیر کا بوجھ نہ اٹھا سکا تھا۔وہ اندر سے کوئین کے ساتھ تھا لیکن ”نظام“ کے ہاتھوں مجبور تھا۔

☆☆☆

”کوئی خبر؟“ کوئین نے میٹ سے پوچھا جو اسپتال میں ٹم کے کمرے میں داخل ہورہا تھا۔

وہ شفاف بستر پر ٹم کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔ٹم بری طرح زخمی ہوا تھا۔اس کی چھ پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں،سر اور ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ لگی تھی۔بائیں ران پر تیسرے درجے کا جلنے کا بڑا سا نشان تھا۔پھر بھی وہ اسپتال سے نکلنا چاہتا تھا۔کوئین اور خود اس کی حالت نے اسے روکا ہوا تھا۔

ٹم نے دن کا زیادہ حصہ نیٹ،پولیس اور ایف بی آئی کی معلومات میں اضافہ کرتے گزارا۔یہ ایک غیر معمولی کہانی تھی۔انگراہم کا مائنڈ کنٹرول سسٹم اور زندہ انسانوں پر تجربات...

ابتدا میں چند آفیسرز کو یہ فکشن ہی معلوم ہوا،تاہم ویرن کے کنٹرول روم اور رہائشی کمروں کی تلاشی سے برآمد ہونے والے جدید الیکٹرونک آلات کے علاوہ ویرن کے اعترافات کے بعد انہیں یقین کرنا پڑا کہ یہ ایک خوفناک حقیقت تھی۔

میٹ نے کرسی سنبھالتے ہوئے بالٹی مورسن کی کاپی لہرائی۔ KMI اور فاؤنڈیشن کے خلاف کچھ ثابت نہیں ہو سکا۔ان لوگوں نے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ان کا تعلق فنڈز کی فراہمی تک تھا۔

کوئین کے جسم میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔”تمہارا مطلب وہ بچ گئے ہیں؟“

”بالکل صاف...صرف ایک صورت ہے کہ کوئی رازداں ان کے خلاف اپنا پیٹ ہلکا کردے تو بڑی مچھلیوں پر ہاتھ ڈالا جاسکتا ہے اور یہ ممکن نظر نہیں آتا۔کیونکہ ویرن کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ایلسٹن اور کلیرسن ختم ہوچکے ہیں۔خاص طور پر ڈاکٹر ایلسٹن کو زندہ ہاتھ آنا چاہیے تھا۔“ میٹ نے وضاحت کی۔”اگر یہ کہ دونوں ڈاکٹرز نے کوئی شہادت تحریری شکل میں نہیں چھوڑی ہے۔“

”ایلیٹ پکڑا گیا؟“ ٹم نے سوال کیا۔

”نہیں،لیکن کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔وہ ویرن کی ٹیم کا حصہ تھا۔اس کی معلومات ویرن سے بھی کم ہوں گی۔“

”تو ہم کہاں کھڑے ہیں؟“ ٹم نے کہا۔

”تم دونوں اسٹار بن گئے ہو۔“ میٹ مسکرایا۔”چینلز اور اخبارات میں تمہاری تصویریں چل رہی ہیں۔ویسے امکان ہے کہ ایف بی آئی والے لگے رہیں گے۔اگر انہوں نے KMI کے میڈیکل سینٹرز پر دباؤ بڑھایا تو کوئی نہ کوئی کچھ نہ کچھ اگل دے گا جس کے بعد سارا نیٹ ورک تباہ ہوجائے گا۔“

کوئین نے ٹم کو دیکھا۔

”کیوں بار بار اسے دیکھ رہی ہو؟“ میٹ نے چھیڑا۔

”کیا مطلب ہے؟“ کوئین کے رخسار شہابی ہوگئے۔

”مطلب بھی بتاؤں؟“ میٹ شرارت سے مسکرایا۔

کوئین اسے مارنے کے لیے اٹھی۔

”نہ...نہ...اس کا ہاتھ نہ چھوڑنا۔“ میٹ نے ہنستے ہوئے کرسی چھوڑ دی۔تینوں بے ساختہ ہنس رہے تھے۔

☆☆☆

چند روز بعد بوڈاپسٹ کی ڈیٹ لائن سے اخبارات میں ایک خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی جس کا متن کچھ یوں تھا۔

ایسٹرن میڈیکل یورپین کینسر فاؤنڈیشن کے نام سے بوڈاپسٹ میں ایک نئے بین الاقوامی خیراتی ادارے کا افتتاح ہورہا ہے،ہنگری،چیکوسلواکیہ،رومانیہ اور پولینڈ میں میڈیکل سینٹرز کا سلسلہ بھی قائم کیا جائے گا جہاں مشرقی یورپ کے متاثرہ اور ضرورت مند مریضوں کے لیے جدید طبی سہولیات مفت فراہم کی جائیں گی۔

فرینک فرٹرا لجمین زی تنگ!

قاتل کون

سلیم انور

بہت سے اُمور نہ چاہتے ہوئے بھی انجام دینے پڑتے ہیں...کیونکہ ان کے ذریعے ہماری بہت سی ضروریات پوری ہوتی ہیں...ایک اَن دیکھے قاتل کی تلاش میں سرگرداں مفلس سراغ رساں کی کارستانیاں...ضمیر اور احساس کی چبھن اسے کبھی کبھی بے کل کردیتی تھی...

قاتل کون اور مقتول کیوں...کی کشمکش میں مبتلا کردینے والی الجھی کہانی

میں واٹرز اسٹریٹ پر واقع اوسلوز کے بار میں بیٹھا اخبار کے اسپورٹس...صفحے کا مطالعہ کررہا تھا۔اوسلو بار کے پیچھے اپنی خستہ حال کشن والی کرسی پر براجمان تھا۔وہ گاہے گاہے اخبار کے صفحۂ اول کی خبروں پر تبصرہ بھی کررہا تھا لیکن میں اس کے تبصروں کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے مطالعے میں مگن تھا۔

اتنے میں فلاپی ہیٹ پہنے ہوئے ایک عورت نے بار کا دروازہ کھولا اور قدرے تذبذب میں وہیں کھڑی رہی۔

دروازہ کھلنے سے صبح کی دھوپ بار میں در آئی۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔ ''کیا بین کرافٹ یہاں موجود ہے؟'' اس کی آواز میں ناز برداری تھی۔

یہ میں تھا۔ میں جو ایک فری لانس رپورٹر اور پرائیویٹ انویسٹی گیٹر ہوں۔ میں نے اس عورت کے سراپا کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس نے کلاسی کٹ کا ایک بالکل فٹ اسکائی بلیو سوٹ جیکٹ اور ڈارک بلیو شارٹ اسکرٹ پہنا ہوا تھا جس سے اس کی لمبی جاذبِ نظر ٹانگیں نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کے چست لباس سے اس کے جسمانی خطوط بالکل عیاں ہو رہے تھے۔

اس کے باوجود میں جواب دینے سے ہچکچا رہا تھا کہ مبادا وہ کوئی بل وصول کرنے والی نہ ہو جسے کسی کمپنی نے میری تلاش میں بھیجا ہو۔

وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ ''ویل، میں نہیں سمجھتی کہ میں نے تم دونوں سے کوئی مشکل سوال پوچھا ہے، جنٹلمین!''

''میں بین کرافٹ ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا میں تمہیں یہاں سے اٹھا کر واپس تمہارے دفتر لے جا سکتی ہوں کیونکہ مجھے تم سے لمبی کاروباری بات چیت کرنی ہے؟'' اس عورت نے بار میں قدم رکھے بغیر کہا۔

پھر وہ دروازے سے ہی پلٹ کر باہر نکل گئی۔ جب میں باہر نکلا تو وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی سڑک پار کر رہی تھی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ اس عمارت میں داخل ہو گئی جس میں میرا دفتر تھا۔ ہم چوں چوں کرتے ہوئے لکڑی کے زینے سے دوسری منزل پر پہنچے جس پر بیلارڈ ان کارپوریشن کا آفس بنا ہوا تھا۔ اس آفس کے سامنے سے گزر کر ہم تیسری منزل کا زینہ طے کرنے لگے۔ میرا دفتر تیسری منزل پر تھا۔

میں نے اپنے دفتر کے دروازے پر ایک نوٹس چسپاں کیا ہوا تھا جس میں، میں نے اپنے امکانی کسٹمرز کو یہ اطلاع دی تھی کہ اگر میں دفتر میں موجود نہ ہوں تو مجھے سڑک پار اوسلوز کے بار میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اب یہ نوٹس کسی نے اکھاڑ دیا تھا اور مڑا تڑا نیچے فرش پر پڑا ہوا تھا۔

میرے دفتر کے سامان میں لکڑی کی بنی ہوئی ایک بڑی سی میز تھی جو خستہ حال ہو چکی تھی اور جس کی درازیں بھی اٹکتی تھیں۔ ایک گھومنے والی کرسی تھی جو کبھی کبھار ہی گھومتی تھی۔ چند ٹوٹی پھوٹی فائلنگ کیبنٹس تھیں۔ میز کے سامنے ایک لکڑی کی کرسی تھی جو کبھی کبھار آنے والے ملاقاتیوں کے لیے تھی۔ ایک ریڈیو تھا جو ایک پرانے ائرکنڈیشنر کے برابر میں کھڑکی کے چھجے پر رکھا ہوا تھا اور جس کا پلاسٹک کا کیس چٹخا ہوا تھا۔

دفتر کی کھڑکی عقبی پارکنگ لاٹ کی جانب کھلتی تھی۔ میرا ایک کمرے پر مشتمل لیونگ روم دفتر سے ملحق تھا۔ تیسری منزل کا بقیہ حصہ مکڑی کے جالوں اور گرد سے اٹا ہوا تھا۔

میں میز کے پیچھے اپنی گھومنے والی کرسی پر جا بیٹھا۔ ساتھ ہی میں نے اس عورت کو مہمانوں کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس عورت نے کرسی کا جائزہ لینے کے بعد میری پیشکش مسترد کر دی۔ پھر اس نے اپنا فلاپی ہیٹ اتار دیا۔ میں اس کے بھرپور ہونٹوں، جھیل سی نیلی آنکھوں اور گھنی سرخ زلفوں کو دیکھتا رہ گیا۔

''میں سنتھیا کرافورڈ ہوں۔'' اس عورت نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''میری ماں کا نام مسز نورول مورٹن ہے اور وہ غائب ہیں۔ گزشتہ چھ ہفتوں سے ان کی کوئی خیر خبر نہیں ہے۔ ان کے شوہر کا دعوٰی ہے کہ اسے کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس شخص نے میری ماں کی دولت حاصل کرنے کے لیے انہیں قتل کر دیا ہے۔ میرے پاس کل چھ سو ڈالر ہیں۔ اگر تم یہ معلوم کر لو کہ میری ماں کے ساتھ کیا ہوا ہے تو میں تمہیں یہ ساری رقم دے دوں گی۔''

نورول مورٹن!

میں نورول مورٹن کو جانتا تھا۔ وہ اس بڑے مکان میں رہتا تھا جو اس نے شمالی کنارے پر تعمیر کیا تھا۔ یہ بات اس وقت میرے علم میں آئی تھی جب میں نے شکاگو ٹائمز کے لیے اس پر ایک اسٹوری لکھی تھی۔ وہ ایک ریٹائرڈ اسٹاک بروکر تھا۔

''کیا تم نے پولیس میں اس گمشدگی کی رپورٹ کی ہے؟'' میں نے سنتھیا سے پوچھا۔

''یقیناً کی ہے۔ لیکن وہ کچھ پتا نہیں لگا سکے ہیں۔ نورول مورٹن کا کہنا ہے کہ وہ بس اچانک چلی گئیں۔ اس کا کہنا ہے کہ انہوں نے جاتے وقت اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہی ہیں۔ میں فلوریڈا میں اپنی خالہ کے گھر کے علاوہ ان تمام لوگوں سے بھی معلوم کر چکی ہوں جہاں میرے خیال کے مطابق وہ جا سکتی تھیں۔ کسی کو بھی ان کے بارے میں کچھ علم یا خیر خبر نہیں ہے۔'' سنتھیا نے بتایا۔

میں اس کا چہرہ پڑھنے لگا تو اس نے اپنی نظریں پھیر لیں اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''کیا مسٹر مورٹن تمہارے باپ ہیں؟''

''نہیں، وہ میرا سوتیلا باپ ہے اور میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔''

''کیوں؟''

''سب سے پہلی وجہ یہ کہ اس نے میری ماں کی دولت کی خاطر ان سے شادی کی ہے۔ میرے باپ کے مرنے کے بعد میری ماں کو ورثے میں ڈھیر ساری دولت ملی تھی اور وہ کمینہ ایک سے زیادہ مرتبہ میرے ساتھ زبردستی کی کوشش کر چکا ہے۔''

''کیا تم شادی شدہ ہو؟''

''کبھی تھی۔'' سنتھیا نے کہا۔ ''لیکن ان تمام معاملات سے اس بات کا کیا تعلق ہے؟''

''اگر میں یہ کیس لوں گا تو مجھے کچھ پیشگی فیس درکار ہو گی۔'' میں نے کہا۔

اس نے اپنی نازک انگلیوں سے دستانے اتارے اور کہا۔ ''فی الوقت میں تمہیں تین سو ڈالر کا چیک لکھ کر دے سکتی ہوں۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

اس نے چیک لکھ کر مجھے تھما دیا۔

''کیا تمہارے پاس تمہاری ماں کی کوئی تصویر ہے؟''

وہ اپنا پرس ٹٹولنے لگی۔ اس نے جیبی بٹوے میں رکھی والی ایک تصویر نکال کر مجھے تھما دی۔ وہ ایک پختہ عمر عورت کی تصویر تھی جو کسی بھی طرح سنتھیا کی طرح نہیں لگ رہی تھی۔

''میں کوشش ضرور کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن مجھے یقین نہیں کہ میں زیادہ کچھ کر سکوں گا۔ گم شدہ افراد کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات ہم ان کے بارے میں کچھ زیادہ پتا نہیں لگا سکتے کیونکہ قتل کیے جانے کا امکان ہوتا ہے یا پھر وہ فرد خود کو ان معاملات سے اتنی دور لے جاتا ہے کہ کسی کو اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں رہتی۔''

یہ سن کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنا اسکرٹ درست کیا اور بولی۔ ''میری ماں اس چوہے کے ساتھ اپنی شادی پر خوش نہیں تھیں لیکن وہ مجھے یہ بتائے بغیر کہ وہ کہاں ہیں، کبھی یہاں سے کہیں نہیں جا سکتی تھیں۔''

☆☆☆

پولیس اسٹیشن پر میری اہم معلومات کا ذریعہ سراغ رساں اینڈریو براؤن تھا۔

میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا۔ ''ہم اس کا کوئی سراغ نہیں لگا سکے ہیں۔ اس کی مرسیڈیز کار بھی غائب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خود کہیں چلی گئی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں کبھی پتا ہی نہ چل سکے۔''

''اس نے اپنی ماں کو تلاش کرنے کے لیے میری خدمات مستعار لی ہیں۔ اس کی بیٹی کا خیال ہے کہ نورول مورٹن نے اس کی ماں کی دولت کی خاطر اسے قتل کر دیا ہے۔''

''ہاں، مجھے معلوم ہے۔ میں اس عورت سے متعدد بار گفتگو کر چکا ہوں۔ حقیقت میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا ہوں۔ وہ ایک پُرکشش عورت ہے۔'' اینڈریو براؤن کا اشارہ سنتھیا کی جانب تھا۔

پولیس اسٹیشن سے نکل کر میں بل کھاتی پہاڑی سڑک پر سے ہوتا ہوا اس علاقے میں پہنچ گیا جہاں نورول مورٹن کا بنگلا بنا ہوا تھا۔ میں اپنی پچانوے ماڈل کی کار کو بغلی گھومتی ہوئی سڑک پر چڑھا کر اس پارکنگ ایریا میں لے گیا جو مورٹن کے شاندار بنگلے کے سامنے بنا ہوا تھا۔

میں نے جونہی اپنی کار سے نیچے قدم رکھا ایک بڑا سا سیاہ رنگ کا کتا سرپٹ دوڑتا ہوا میری طرف آنے لگا۔ اس کے بھونکنے سے گرم موسم کے باوجود میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑ گئی اور میں کپکپانے لگا۔

گو مجھے خود پر یقین نہیں تھا، اس کے باوجود میں اسے بار بار چمکار رہا تھا۔ ''نائس ڈوگی، نائس ڈوگی۔''

اتنے میں بنگلے کے عقب سے ایک شخص دوڑتا ہوا نکلا اور وہیں سے چیخنے لگا۔ ''بیٹھ جاؤ الیگزینڈر، بیٹھ جاؤ۔''

اپنے آقا کا حکم سنتے ہی کتے کی رفتار کو بریک لگ گئے اور وہ میرے سامنے آ کر ایک بے زبان مجسمے کی طرح بیٹھ گیا۔

''یہ شاید تمہیں کاٹے گا نہیں لیکن لوگوں پر اس بری طرح سے بھونکتا اور اچھلتا ہے کہ ان کا پیشاب خطا کرا دیتا ہے۔'' اس شخص نے کہا۔

''اس کام کے لیے اسے مجھ پر بھونکنے یا اچھلنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا۔ میری نظریں بدستور اس کتے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بھی مجھے گھور رہا تھا۔

''میں گھر کے عقبی حصے میں گھاس تراشنے میں مصروف ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

میں نے چند سال قبل نورول مورٹن کا جب انٹرویو لیا تھا تو اس کے مقابلے میں وہ اب کچھ زیادہ بدلا ہوا لگ

رہا تھا۔ البتہ اس کی پیشانی پر سے کچھ بال کم ہو گئے تھے۔ اس کے دبلے پتلے چہرے کو اب مکمل داڑھی نے ڈھانپا ہوا تھا۔ اس نے بلیو رنگ کی جینز، ٹی شرٹ اور دوڑنے والے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ آخری بار جب میں نے اسے دیکھا تھا تو سلک سوٹ میں وہ بے حد خوش وضع دکھائی دے رہا تھا۔

''میں یہاں تم سے تمہاری گم شدہ بیوی کے بارے میں کچھ سوالات پوچھنے کے لیے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''وہ گم ہو چکی ہے، یہ درست ہے لیکن بس وہ اٹھی اور چل پڑی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی بیٹی نے تمہاری خدمات مستعار لی ہیں۔ ایسا ہی ہے نا؟''

یہ کہہ کر وہ پلٹا اور مکان کے اس حصے کی جانب چل دیا جدھر سے وہ نمودار ہوا تھا۔

''کتے کی پروا مت کرو۔ وہ اب تمہیں پریشان نہیں کرے گا۔ کم آن الیگزینڈر۔''

کتا اچھلتا کودتا اس کے ساتھ چل دیا۔ میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ لیکن میں اچھل کود نہیں رہا تھا۔

مکان کے عقب میں واقع احاطہ نصف ایکڑ میں پھیلا ہوا تھا جس کے کناروں پر پھولوں کی کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔ انواع و اقسام کے پھول جنہیں میں شناخت کرنے سے قاصر تھا، کثرت سے کھلے ہوئے تھے اور ان کے درمیان خودرو گھاس پھوس بھی دکھائی دے رہی تھی۔ سرخ اور گلابی رنگ کے گلاب.... اتنے بڑے اور خوش رنگ تھے کہ میں نے اس سے پہلے ایسے گلاب کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ گلاب ایک حصے میں مکمل طور پر چھائے ہوئے تھے۔

احاطے کے بائیں کنارے کے نزدیک بیٹھ کر چلانے والی گھاس کاٹنے کی مشین رکھی ہوئی تھی۔

''میرے پاس کہنے کے لیے مزید اور کچھ نہیں ہے۔ میں تم سے معذرت چاہوں گا۔ میں دھوپ کی شدت میں مزید اضافہ ہونے سے قبل اس گھاس کو تراشنا چاہتا ہوں۔'' مورٹن نے کہا۔

''پھولوں کی ان کیاریوں کی دیکھ بھال یقیناً تمہاری بیوی کرتی تھی۔'' میں نے کہا۔

مورٹن لان موور پر سوار ہو گیا اور اسے اسٹارٹ کر دیا۔ وہ لان موور کو چلاتا ہوا گھاس کے آخری سرے تک لے گیا جہاں مکئی کا ایک کھیت احاطے کی سرحد بنا ہوا تھا۔ پھر وہ پلٹا اور واپس میری جانب آنے لگا۔

جب وہ میرے نزدیک پہنچا تو میں نے چیخ کر کہا۔ ''بس ایک سوال اور، مزید کچھ نہیں پوچھوں گا۔''

مورٹن نے لان موور کا انجن بند کر دیا اور بولا۔ ''صرف ایک سوال۔ مزید کوئی بات نہیں ہوگی۔''

''پھولوں کی کیاریوں کے اس حصے میں دیگر حصوں کے مقابلے میں پھولوں کی ڈالیاں اونچی اور پھول زیادہ بڑے کیوں ہیں؟'' میں نے لہلہاتے شاداب گلابوں اور بڑھتی ہوئی گھاس پھوس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس بات پر مورٹن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے اپنی جینز کی پچھلی جیب میں سے ایک رومال نکالا اور اپنی پیشانی پونچھنے کے بعد رومال واپس اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر وہ مجھے گھورنے لگا۔ نفرت اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔ ''تمہیں یہ سوال کرنا تھا؟ تم نے اس سوال کے لیے مجھے روکا ہے۔ مجھے اس کم بخت باغیچے کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ ان تمام معاملات کی دیکھ بھال میری بیوی کیا کرتی تھی۔''

اس نے لان موور دوبارہ اسٹارٹ کیا، اسے میرے پیروں کے قریب سے گھمایا اور احاطے کے دوسرے آخری سرے کی جانب چل دیا۔

میں واپس پولیس اسٹیشن آ گیا اور سراغ رساں اینڈریو براؤن کے دفتر میں داخل ہو گیا۔

اینڈریو کے سامنے میز پر ایک فائل فولڈر کھلا ہوا تھا اور اس کی تمام تر توجہ فائل میں موجود کاغذات پر تھی۔ وہ ان کاغذات کا باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے مجھے نظر انداز کر دیا۔

میں بیٹھ گیا اور سکون کے ساتھ انتظار کرنے لگا۔ میں وہاں سے نکل جانے کی سوچ رہا تھا کیونکہ میں نے جو کچھ پلان کیا تھا اور جو کچھ میں کہنا چاہ رہا تھا، اس بارے میں، میں خود بھی پُریقین نہیں تھا۔ اگر میں غلط ہوتا تو مجھے بے وقوف قرار دیا جاتا اور میں اپنی یہ درگت بنتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

تب اینڈریو نے وہ فائل فولڈر ایک جانب کھسکا دیا۔ پھر اس نے اپنی میز کی اوپری دراز سے نصف پیا ہوا ایک سگار نکال کر سلگایا اور بولا۔ ''تو پھر؟''

''میرا ایک آئیڈیا ہے کہ مسز مورٹن کی لاش کو تم کہاں سے بازیاب کر سکتے ہو؟'' میں نے کہا۔

''تو پھر؟''

''میرا مذاق مت اڑاؤ۔ میرا خیال ہے کہ مورٹن نے اپنی بیوی کی لاش پھولوں کی ایک کیاری میں دفن کی ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔

اینڈریو نے اپنی گھومنے والی کرسی کا رخ قدرے گھما لیا، اپنے پیر میز پر رکھ دیے اور انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔ ''اس بات کا کھوج تم نے کس طرح لگایا، شرلاک ہومز؟''

میں اپنی کرسی پر تلملا کر رہ گیا۔ ''ایک مخصوص مقام پر گلاب اور گھاس پھوس دیگر کسی بھی حصے میں اُگے ہوئے پھولوں اور گھاس پھوس کے مقابلے میں زیادہ شاداب، بڑے اور بھرپور ہیں۔''

وہ مجھے دیکھ کر یوں مسکرانے لگا جیسے والدین اپنے ننھے بچے کی حرکتوں پر محظوظ ہوتے ہیں۔

''تو تمہارے خیال میں زمین میں دبی ہوئی وہ گلتی ہوئی لاش ان پودوں کو کھاد فراہم کر رہی ہے جس کے نتیجے میں یہ پودے دیگر پودوں کے مقابلے میں بہتر نشوونما پا رہے ہیں۔ کیا میں نے درست کہا؟'' اینڈریو نے کہا۔

''ہاں، میرا خیال تو یہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ایک احمقانہ خیال ہو۔''

''اس شخص کے پاس ایک بڑا سا کتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی غلاظت سے وہاں فارغ ہوتا ہو۔''

''ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہم پولیس والے بھی بعض اوقات حماقت کر جاتے ہیں۔ پھر بھی دیکھ لیتے ہیں۔''

ہم مورٹن کی رہائش گاہ پہنچ گئے۔ ہم نے احاطے کا معائنہ کیا۔ ہمیں کہیں بھی کسی قسم کی مشکوک مٹی دکھائی نہیں دی۔ سیزن کے لحاظ سے تمام پھول اپنے شباب پر تھے۔

''مجھے یاد پڑتا ہے کہ مرکب کھاد کا ایک ڈھیر بھی تھا، احاطے کی بائیں جانب۔ ہمارے پاس اس احاطے کو کھودنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔'' اینڈریو نے کہا۔

''ویل، یہ صرف ایک آئیڈیا ہے۔ گلاب احاطے کے بائیں جانب ہیں۔ مجھے وہاں کھاد کا کوئی ڈھیر نظر نہیں آ رہا۔'' میں نے کہا۔

☆☆☆

ایک ہفتے بعد دوپہر کے گیارہ بجے کے قریب سنتھیا میرے دفتر آئی۔ میں اس وقت اپنی میز پر ٹانگیں لمبی کیے کرسی پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھے اس کی آمد کا احساس ہونے میں

مجبوری

ایک شرابی ریلوے بکنگ آفس پر ایک شخص کو اپنے کندھے پر سوار کیے پہنچا اور ٹکٹ بیچنے والے سے کہا۔ ''مجھے روہڑی کا ایک ٹکٹ دے دو۔''

ٹکٹ بیچنے والے نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ اور بولا۔ ''اس شخص کا ٹکٹ نہیں لوگے جو تمہارے کندھوں پر سوار ہے؟''

''یہ شخص۔'' شرابی نے جواب دیا۔ ''یہ تو میرا بچہ ہے اور ابھی اس کی عمر چھ سال سے زیادہ نہیں ہوئی ہے۔''

''چھ سال سے کم عمر کا بچہ ہے؟'' ٹکٹ بیچنے والے نے کہا۔ ''کیوں بے وقوف بناتے ہو یہ شخص چھ فٹ لمبا ہے، اس کا وزن کم سے کم ستر کلو ہوگا اور اس کی داڑھی کسی حال میں بھی تین انچ سے کم نہیں ہے پھر بھی تم اسے بچہ کہہ رہے ہو؟''

شرابی نے کندھے پر سوار شخص کو زمین پر دے پٹکا اور آنکھیں نکال کر بولا۔ ''گدھے میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا اپنی داڑھی منڈھوا دو۔ اب مجبوراً مجھے تمہارا ابھی ٹکٹ لینا پڑے گا۔''

مشورہ

ایک صاحب نے نوجوان گداگر کا دستِ سوال دراز دیکھ کر ملامت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ہٹے کٹے اور جوان آدمی ہو۔ بڑھے ہوئے بال اور داڑھی ترشوا کر صاف ستھرے کپڑے پہن لو تو معقول آدمی نظر آؤ گے... تم کو آسانی سے کہیں بھی ملازمت مل جائے گی... بھیک کیوں مانگتے ہو؟''

''کچھ دینا ہے تو دو ورنہ چلتے بنو۔'' گداگر نے اس سے زیادہ زہریلے انداز میں جواب دیا۔ ''مجھے تمہارے مشوروں کی کوئی ضرورت نہیں... پہلے میں بھی ایمانداری سے سرکاری نوکری کرتا تھا... اب اس سے کئی گنا زیادہ کماتا ہوں... منہ اٹھا کر چلے آتے ہیں الٹے سیدھے مشورے دینے۔''

اوکاڑہ سے ثنا کا تعاون

دیر لگی اور میں بروقت اپنی ٹانگیں میز پر سے نہیں ہٹا سکا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں اس نے مجھے سوتے ہوئے تو نہیں دیکھ لیا۔

اس نے ایک اچٹتی نگاہ مجھ پر ڈالی اور میرے دفتر کی خستہ حالت پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے درحقیقت نتائج کی توقع تو نہیں تھی لیکن میں تمہارے علاوہ کسی اور کی خدمات حاصل کرنے کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔''

میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے اپنی ادا کردہ پیشگی فیس کا مطالبہ کرنے جارہی ہے۔ شاید میں اس کی فیس واپس کر دوں کیونکہ میں نے حقیقت میں کچھ زیادہ کارکردگی نہیں دکھائی تھی۔

گم شدہ لوگوں کے کیس ہمیشہ مشکل ترین ثابت ہوتے ہیں۔

سنتھیا میری میز کے مقابل خستہ حال کرسی پر براجمان ہوگئی۔ اس نے ایک بڑے سے پرس سے اپنی چیک بک نکالی اور چیک بھرنے لگی۔ پھر اس نے وہ چیک میری جانب بڑھا دیا۔ یہ چیک تین سو ڈالر کا تھا۔

''یہ کس لیے ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ وہ چیک ہے جس کا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ میں امید کررہی تھی کہ تم میری ماں کو زندہ تلاش کرلو گے۔ لیکن تم نے کم از کم اسے ڈھونڈ تو نکالا۔''

''میں نے؟''

''اس پولیس مین مسٹر براؤن نے مجھے بتایا کہ جب تم نے ان کے روبرو اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ میری ماں کی لاش کے بقایات کہاں مل سکتے ہیں تو انہوں نے تلاشی کا وارنٹ حاصل کرلیا تھا۔''

پھر وہ اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگی۔

''میں یہاں آتے ہوئے راستے بھر روتی رہی ہوں۔ اب کم از کم ماں کی گمشدگی کا معاملہ تو حل ہوگیا۔ پولیس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ نورول مورٹن کو مقدمے کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

''مجھے افسوس ہے کہ اس تلاش کا خاتمہ اس بات پر ہوا۔'' میں نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کے بعد کہا۔

اگلے روز میں نے سنتھیا کے دیے ہوئے دونوں چیک اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیے۔ جب میں بینک سے باہر نکلا تو مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔

میں نے اخبار میں نورول مورٹن کے حراست میں لیے جانے اور اس کے خلاف قتل کی فردِ جرم عائد کرنے کی خبر پڑھی۔

اس وقت مجھے واقعی حیرانی ہوئی جب چند روز کے بعد میں نے نورول مورٹن کو اوسلوز کے بار میں اپنے مقابل پایا۔ وہ ہوا کے طوفان میں ڈولتے ہوئے بحری جہاز کے مانند بار میں داخل ہوا۔

''میرا خیال تھا کہ پولیس تمہیں دھر چکی ہے۔'' میں بس اتنا ہی کہہ پایا۔

''میں ضمانت پر رہا ہوگیا ہوں۔ تمہاری وجہ سے وہ مجھے پھانسی پر لٹکانے جارہے ہیں۔ کیا اس کم بخت کتیا نے تمہیں بتا دیا تھا کہ اس نے لاش کہاں دفن کی تھی؟ کیا اس معاملے میں تم بھی اس کے ساتھ شامل ہو؟ تمہیں اپنے حصے کی رقم مل جائے گی؟''

''ایک منٹ ٹھہر جاؤ۔'' میں نے ہاتھ سے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ ''کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ سنتھیا نے اپنی ماں کو ہلاک کیا ہے اور اس کی لاش پھولوں کی کیاری میں دفن کردی تھی؟''

''ہاں، میں بالکل یہی کہہ رہا ہوں۔'' مورٹن نے کہا۔ ''اور میں یہ بات ثابت کرنے کے لیے تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں ہے۔''

''میں تمہیں معاوضہ دوں گا۔ کیا تم رقم نہیں لو گے اور اس معاملے کی تحقیق نہیں کرو گے؟''

مورٹن نے میری خدمات کے عوض دلکش رقم کی پیشکش کی جسے میں ٹھکرا نہ سکا۔

لیکن مجھے ایسا کوئی ثبوت نہیں مل سکا جس سے ظاہر ہو کہ اپنی ماں کا قتل سنتھیا نے کیا تھا۔

مقدمہ چلا اور عدالت نے نورول مورٹن کو اپنی بیوی کے قتل کا مجرم قرار دے کر سزا سنا دی تو اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس کی دی ہوئی رقم اپنے پاس رکھ سکتا ہوں۔

نورول مورٹن کی دی ہوئی رقم اپنے پاس رکھنے پر میرا ضمیر مجھے اکثر ملامت کرتا رہتا ہے۔ لیکن ضروریات ضمیر کی اس ملامت کو بے رحمی سے کچل دیتی ہیں۔ ایسے وقت میں میرے لیے یہ دلیل کافی ہوتی ہے کہ نورول کے کیس پر میں نے اپنا کام پوری طرح کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میں اس کے دعوے کے مطابق خوب رو سنتھیا کو اپنی ماں کا قاتل ثابت نہیں کرسکا۔

خوب صورت ڈوروتھی نے کار اضطراری طور پر [illegible] دی تھی۔ وہ اضطراری اعمال اور فیصلے اضطراری طور [illegible] کرلی تھی۔ وہ بہت سوچ کر، صفائی اور سکون سے کام کرنے کی عادی تھی۔ شاذ ہی اس کے جذبات اور احساسات اس کے اختیار سے باہر ہوتے تھے۔ وہ بخوبی آگاہ تھی کہ اس نے کار روک کر ہارن کیوں بجایا تھا۔

وہ سراغ رساں سارجنٹ جم کیری کو متوجہ کررہی تھی [illegible] سڑک کے کونے پر دکھائی دیا تھا۔

''میں اسپتال جارہی ہوں... کیا تم بھی...؟'' وہ اپنے مخصوص دلکش انداز میں مسکرائی۔

رنگوں کے انتخاب میں جم کیری کا اپنا ہی انداز تھا۔ اس کے بال تو قدرتی طور پر سرخی مائل بھورے تھے۔ تاہم لباس بھی ہمیشہ سرخی مائل بھورا استعمال کرتا تھا۔ یہی معاملہ جوتوں کے ساتھ تھا۔

وہ احتیاط سے کار کی جانب بڑھا۔ اس کا یہ محتاط انداز بھی اس کی عادت کا حصہ تھا۔

''ہیلو مس ڈوروتھی!'' اس نے اپنا سرخی مائل بھورا ہیٹ لمحہ بھر کے لیے اتارا۔ ''خوب، تم نے اچھا پہچانا۔ میں

سبز پنسل

ماہ نور

ذہن کی پیچیدہ گرہوں کو سمجھنا آسان نہیں... ایک سلجھتی ہے تو دوسری الجھ جاتی ہے... مسلسل کام کرنے والی اس مشین میں تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں... ایک ایسے ہی مریض کی ذہنی کیفیات و تبدیلیاں... وہ اپنے مرض سے بے خبر تھی...

ایک سراغ رساں کی ذہانت جس نے پنسل کے سہارے مجرم کی مکاری بے نقاب کردی...

بھی وہیں جا رہا ہوں بلکہ کچھ عجلت میں ہوں۔'' کیری نے بلا جھجک لفٹ کی پیشکش قبول کرلی۔

نشست پر جمنے کے بعد اس نے سرخی مائل بھورا سگار نکالا۔

ڈوروتھی نے رفتار تیز کی اور ایک ٹرک کو اوورٹیک کیا۔ ''ایلاڈ کی موت بھی پُراسرار نہیں تھی؟ پتا نہیں میں نے پُراسرار کا لفظ ٹھیک استعمال کیا ہے یا نہیں؟'' وہ بولی۔

''میں خوفناک کا لفظ استعمال کروں گا۔'' کیری نے جواب دیا۔ ''عموماً قتل کی وارداتیں خوفناک ہی ہوتی ہیں۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ ایک مریض تھا اور موت اسپتال میں ہوتی ہے۔ ایک مریض کو اس کے بستر پر ختم کر دیا گیا، اسپتال کی ساکھ بھی خطرے میں ہے۔'' ڈوروتھی کی آواز میں لرزش تھی۔

''ہاں۔'' کیری نے جواب دیا۔ ''تم اسپتال کے معاملات میں کافی دلچسپی رکھتی ہو۔ ظاہر ہے کہ تم نرسوں کی چیف ہو۔ تاہم میرا خیال ہے کہ تمہاری اصل دلچسپی ڈاکٹر ٹرینٹن کی قابلِ قدر ریسرچ ہے؟'' کیری نے اظہارِ خیال کیا۔

''نہیں، ایسا نہیں ہے۔ میں یقیناً ڈاکٹر کے تحقیقی کام کی قدر کرتی ہوں لیکن ڈاکٹر کی منگیتر نرس ڈیلا ہے۔''

اسی وقت ڈوروتھی نے سرخ بتی کا اشارہ توڑ ڈالا۔

کیری نے اپنے اندازے کے لیے معذرت چاہی۔

''ڈیلا کے لیے بدقسمتی کی بات ہے۔ کیونکہ وہ مشکوک افراد کی فہرست میں شامل ہے۔'' کیری نے محتاط انداز میں کہا۔ حالانکہ ڈیلا مشکوک افراد کی فہرست میں کچھ زیادہ ہی اوپر تھی۔

''نہیں۔'' ڈوروتھی نے بلند آواز میں حیرت کا اظہار کیا۔

''ایسا ہی ہے۔'' کیری نے وضاحت کی۔ کیونکہ مخصوص ''ہائپوڈرمک'' اسی نے مریض کو لگائی تھی۔ جس کے بعد اس کی زندگی مختصر ہوگئی۔''

''انٹرا ویسکولر کلاٹنگ۔'' نرس ڈوروتھی نے وضاحت کی۔ ''میرے علم میں تھا کہ ڈاکٹر ٹرینٹن بلڈ کلاٹنگ پر قابو پانے کے لیے نیا حل تلاش کر چکے تھے جس کا نام سینتھٹک سیفلن تھا۔ تاہم ڈاکٹر نے سیفلن کو متبادل کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ نہیں سنایا تھا۔'' ڈوروتھی نے اپنی معلومات کا مظاہرہ کیا۔ ''کیونکہ وہ تجرباتی طور پر ایسی دوا بھی بنا چکا تھا جو خون میں ''کلاٹ'' بنا دیتی ہے۔ اس نے دواؤں کی چھوٹی شیشیوں کی شناخت کے لیے انہیں مختلف رنگوں کے موم سے بند کیا تھا۔''

''میں جانتا ہوں۔'' سراغ رساں کیری نے کہا۔ ''کوئی ڈاکٹر ٹرینٹن کی لیب میں داخل ہوا تھا اور ڈیسک پر سے سینتھٹک سیفلن کی دوائی کا وائل (VIAL) اٹھا کر انجکشن بنایا اور قصداً مریض کو لگا دیا جبکہ ڈاکٹر ٹرینٹن نے جو ہائپوڈرمک تجویز کی تھی وہ دوسری تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈیلا نے جو دوا لگائی اور جس کے باعث مریض ہلاک ہوا، اس نے کوئی چیز ایسی دوا میں شامل کی جس نے عمر رسیدہ مریض کے خون میں کلاٹ بنا دیا، تم اسے بدن کے اندر گلا گھونٹنے کا نام دے سکتی ہو... تاہم میں اب تک وجہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ کیا دوا کی شیشی کے انتخاب میں نرس نے غلطی کی تھی؟''

ڈوروتھی کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ ساتھی نرس کی حرکت پر، پُریقین نہیں ہے۔ ''ممکن ہے ایسا ہو۔''

''مقصد یہ بھی ہوسکتا ہے۔'' کیری نے بات آگے بڑھائی۔ ''ڈیلا ڈاکٹر ٹرینٹن کی ایجاد کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے بے تاب ہو۔''

''تو پھر اسے دوا میں کچھ اور شامل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' ڈوروتھی نے اعتراض کیا۔

''ٹھیک اعتراض ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میرا خیال غلط ہو۔ تاہم میرا اندازہ ہے کہ ڈیلا کو غلط دوا کے انتخاب پر مجبور کیا گیا تھا۔'' کیری نے انکشاف کیا۔

''وہ کیسے؟'' ڈوروتھی نے حیرت کا اظہار کیا۔

''شیشیوں کا رنگ دار موم بدل دیا گیا تھا۔'' کیری نے اطمینان سے کہا۔

''کیا ہم پیالی میں طوفان نہیں اٹھا رہے۔'' ڈوروتھی نے اچانک موضوع تبدیل کرنا چاہا۔ ''یہ بات یقینی ہے کہ مریض کو ویسے بھی کچھ عرصے یا چند سال بعد انتقال کر جانا تھا۔''

ڈوروتھی نے پہلی بار اس قسم کی بات کی جبکہ وہ اس انداز میں پہلے بھی کئی بار سوچ چکی تھی۔ اس نے یہ بات ڈیلا کے دفاعی امکانات کو روشن کرنے کے لیے کہی تھی۔ تاہم اس کا الٹا اثر ہوا۔

کیری چونک اٹھا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈوروتھی، ڈاکٹر ٹرینٹن کی جانب جھکاؤ رکھتی ہے اور اس کی منگیتر ڈیلا سے اپنی رقابت کو وہ کیری سے پوشیدہ رکھنے میں ناکام رہی تھی۔

''میں سمجھا نہیں۔'' کیری نے کہا۔ ''اگر وہ ایک دن بعد بھی مرنے والا تھا تو یہ قتل کرنے کا جواز تو نہیں ہے۔'' وہ کچھ اور بھی کہنا چاہ رہا تھا تاہم اس کی محتاط طبیعت نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کردیا۔

اسی وقت سائرن کی آواز بلند ہوئی۔ ہیوی بائک پر پولیس سارجنٹ نے گاڑی سائڈ میں لگانے کا اشارہ کیا۔

ڈوروتھی نے فی الفور ہدایت پر عمل کر کے گاڑی روک دی۔

''مس! تم کیا سمجھتی ہو خود کو؟ اسپتال میں ملازمت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم سگنل توڑتی پھرو۔ یہ حرکت تم نے ہفتے میں تیسری بار کی ہے۔''

اس نے کہا۔ ''میں حق بجانب ہوں کہ...''

اچانک اس کی نظر کیری پر پڑی۔ ''میں نے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔ اس لڑکی کا خیال رکھیں جناب... اگلی بار میں نہیں چھوڑوں گا۔ میری ملازمت خطرے میں پڑتی ہے۔'' سارجنٹ نے اچٹتی نظر ڈوروتھی کے خوب صورت چہرے پر ڈالی اور بائک آگے بڑھا دی۔

''تم چالاک رہو۔'' کیری نے خشک لہجے میں کہا۔ ''کچھ پولیس والے نیم اندھے ہوتے ہیں۔'' کیری نے قصداً ڈوروتھی کی حمایت کی۔ نرس کی توجہ ٹریفک کی جانب تھی اس نے کار آگے بڑھائی۔ وہ کیری کے لبوں پر خفیف مسکراہٹ نہ دیکھ سکی۔

''سارجنٹ خاص طور پر میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔'' ڈوروتھی نے قہقہہ لگایا۔ پھر کیری کی جانب دیکھ کر دلکش انداز میں مسکرائی۔

☆☆☆

ڈوروتھی کے خیال میں وہ کیری کی تفتیش کے بیشتر پہلوؤں سے آگاہ ہو چکی تھی۔ چیف نرس کی حیثیت سے اسے ممکن حد تک ہر معاملے کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے تھا۔

وہ ڈاکٹر ٹرینٹن کی لیب میں پہنچی تو وہ اپنی ڈیسک پر سر دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا تھا۔

ڈوروتھی نے ربر سول کے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ ''میں بیان نہیں کرسکتی کہ اس حادثے سے میں کتنی رنجیدہ ہوں۔'' اس نے اظہارِ ہمدردی کیا۔

ڈاکٹر نے اس کی آواز سن کر سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں شب بیداری کے اثرات موجود تھے۔

''مجھے تمہاری تکلیف کا احساس ہے ڈوروتھی۔'' ڈاکٹر نے کمزور آواز میں کہا۔ ''ہم سب جانتے ہیں کہ ڈیلا کو اس کی ضرورت تھی نہ اس میں اتنی جرأت تھی کہ وہ اتنا بڑا قدم اٹھالے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ہمیں کسی طرح ثابت کرنا ہے کہ وہ بے قصور ہے۔''

ڈوروتھی، ڈاکٹر کی ڈیسک کے کونے پر بیٹھ گئی۔

''تم جانتے ہو ٹرینٹن، مجھ سے جو ہوسکا، میں کروں گی۔''

ڈاکٹر نے ڈوروتھی کے ہاتھ کی نرمی اور گرمی محسوس کی اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''بے شک، میں جانتا ہوں، تم ایک بہترین دوست ہو۔''

''دوست سے بھی زیادہ، بہت زیادہ۔'' ڈوروتھی نے سوچا اور لگاوٹ سے ڈاکٹر کی آنکھوں میں جھانکا۔

ڈاکٹر ایک لمحے کے لیے کھوسا گیا، پھر دونوں کا ارتکاز ایک ساتھ کوریڈور میں قدموں کی آہٹ نے منتشر کر دیا۔

سراغ رساں کیری کی شکل نظر آئی۔ اس کا مخصوص سگار سلگ رہا تھا۔ دھوئیں کے بادل کے عقب میں اس کا چہرہ دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔

ڈوروتھی فوراً ڈیسک سے اتر گئی۔

''ڈاکٹر میں نے ایک اہم چیز دریافت کی ہے۔'' کیری نے انکشاف کیا۔

''تم کافی کچھ دریافت کر چکے ہو اب تک۔'' ڈاکٹر نے غیر اہم لہجے میں کہا۔

کیری قدم بڑھاتا ہوا ڈاکٹر کی ڈیسک کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے محلول کی وائل برآمد کی جس کا سر، سرخ موم سے محفوظ کیا گیا تھا۔ کیری کے دوسرے ہاتھ میں ایک پنسل تھی۔ اس نے دھیرے سے مختصر ٹیوب نما کانچ کی وائل پر پنسل بجائی۔

''میں تمہاری تجرباتی ادویات واپس کر رہا ہوں جو خون کو گاڑھا کر کے اس میں پھٹکی (کلاٹ) بنا دیتی ہیں۔ اگر اسے مریض پر استعمال کیا جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ قاتل نے یہ وائل استعمال کی تھی۔ لیکن میں یہ نہیں سمجھ پایا کہ قاتل نے اسے سرخ موم سے کیوں سر بند کیا جبکہ تم نے کہا تھا کہ اسے سیل کرنے کے لیے سبز موم استعمال کیا گیا تھا؟''

ڈاکٹر ٹرینٹن نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔ ''سادہ سی بات ہے۔ یہ امر معمولی بھول چوک کی نشاندہی کرتا ہے۔ میری ڈیسک پر وائل کو سر بند کرنے کے لیے نیلا، سبز اور سرخ موم موجود ہوتا ہے۔ قاتل نے بے دھیانی میں استعمال کرنے کے بعد اسے سرخ موم سے سیل کر دیا۔''

کیری نے ایک پیڈ پر پنسل سے تکونی خاکہ بنایا پھر اچانک نگاہیں ڈاکٹر کے چہرے پر گاڑ دیں۔ ''یا پھر یہ ایک نہایت دھیان سے چلی گئی چال تھی تاکہ میری توجہ تم پر سے ہٹ جائے۔''

ڈاکٹر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ کوئی سخت بات کہنا چاہتا تھا تاہم خاموش رہا۔

''ڈاکٹر! میں تم سے اکیلے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔'' کیری نے اپنی پنسل ڈیسک پر چھوڑ دی۔ ڈوروتھی نے کمرا خالی کرنے کی تیاری کی لیکن کیری نے اسے روک دیا۔

''تم یہاں ٹھہر سکتی ہو۔ ذرا دیر کی بات ہے۔ ہم ہال میں بات کر کے آتے ہیں۔''

ہال میں پہنچتے ہی کیری نے ڈاکٹر کا بازو پکڑ لیا۔ ''آج کی تازہ ترین دریافت یہ ہے ڈاکٹر کہ مقتول ''ایلاڈ'' تمہارے انکل تھے۔ ان کی موت کا فائدہ براہِ راست تمہیں پہنچا۔ وہ ایک دولت مند آدمی تھے۔''

ڈاکٹر نے پھر شانے اچکائے۔ ''یہ بات میرے علم میں تھی۔''

''تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتائی؟'' کیری تڑخا۔

''خیر جواب کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی تمہیں چاہتا تھا اور اس کے پاس معقول وجہ تھی کہ وہ ایلاڈ کو ختم کر کے تم سے شادی کر لے۔ تم اب ایک دولت مند شخص ہو۔''

ڈاکٹر برداشت نہ کر سکا۔ ''یہ خلافِ حقیقت ہے، محض ایک مفروضہ... ڈیلا ایسی خوفناک حرکت نہیں کر سکتی اگر اسی منطق کو پیشِ نظر رکھا جائے تو سب سے بڑا محرک تو میرے پاس تھا۔''

کیری نے سر ہلایا۔ ''یقیناً تمہارے پاس مضبوط تر محرک تھا۔ میں ایک چیز نوٹ کر لوں۔'' کیری نے بات نامکمل چھوڑ کر ہاتھ جیب میں ڈالا۔

''میری پنسل کہاں ہے؟''

''وہ تم نے ڈیسک پر ہی چھوڑ دی تھی۔'' ڈاکٹر نے خشک لہجے میں کہا۔

''اوہ، ہاں... شکریہ۔'' کیری نے جواب دیا۔

کیری ایڑی کے بل گھوم کر دوبارہ لیب میں داخل ہوا۔

''نرس ڈوروتھی!'' اس نے دروازے سے ہی ہانک لگائی۔ ''پلیز میری سبز رنگ کی پنسل ڈیسک پر رہ گئی ہے... کیا تم مہربانی کرو گی؟''

''ہاں، کیوں نہیں۔'' ڈوروتھی نے اپنی مخصوص دلکش مسکراہٹ اچھالی۔

ڈوروتھی نے پنسل کیری کے حوالے کی تو اس وقت بھی دل موہ لینے والی مسکراہٹ اس کے چہرے پر سجی تھی۔

''سبز رنگ کا کتنا خوب صورت شیڈ ہے، مس ڈوروتھی؟'' کیری نے نرمی سے پنسل کو سہلایا۔

نرس جواباً پُرمقناطیسی انداز میں مسکرائی۔

دفعتاً کیری کا انداز یکسر تبدیل ہو گیا۔ وہ اچانک آگے بڑھا۔ اس کی آنکھیں عجیب سے انداز میں چمک رہی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھ نرس کے شانوں پر رکھ دیے۔ اس کے ہونٹ نرس ڈوروتھی کے کان کو چھو رہے تھے۔ اس نے سرگوشی کی۔ ''مس ڈوروتھی! وہ تم تھیں جس نے دوا کی شیشی تبدیل کی۔ بعدازاں ڈیلا نے غلط ڈوز مریض کو دیا۔ باالفاظ دیگر ڈیلا معصوم تھی۔ میں تمہیں ایلاڈ کے قتل کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔ قتل تم نے کیا۔ کیونکہ تم ڈیلا سے نفرت کرتی تھیں۔ تم، ڈاکٹر ٹرینٹن سے شادی کی خواہش مند تھیں۔ تمہیں خبر تھی کہ مقتول، ڈاکٹر کا انکل اور خاصا دولت مند شخص تھا۔ ڈیلا کو راستے سے ہٹائے بغیر تم ڈاکٹر تک نہیں پہنچ سکتی تھیں اور نہ ہی ڈاکٹر کے چچا کی دولت تک۔''

نرس بھڑک کر چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ''تمہارا دماغ چل گیا ہے؟''

''ہاں دماغ تو چلا ہے۔ تب ہی میں اصل قاتل تک پہنچ سکا ہوں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' نرس کی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔

''سادہ سی بات ہے۔'' میری پنسل کا رنگ سبز نہیں ہے بلکہ سرخ ہے۔ سڑک پر ٹریفک لائٹ بھی سرخ تھی۔ ڈاکٹر ٹرینٹن کی دوائی کی چھوٹی شیشی کو سربند کرتے ہوئے تم نے سرخ رنگ استعمال کیا تھا وہ خون میں کلاٹ بنانے والی دوا تھی۔ میرا مطلب ہے سرخ موم۔ ڈیلا نے سبز شیشی کو ہاتھ نہیں لگایا کہ وہ جانتی تھی کہ دوا مہلک ہے اور سیفلن سمجھ کر اس نے سرخ موم والی شیشی سے دوا لے کر انجیکٹ کر دی۔ تمہاری نایاب بیماری درمیانے اسٹیج پر تھی جس کے باعث تم اب تک لاعلم رہیں۔ تمہاری غلط فہمی تھی کہ ٹریفک سارجنٹ تمہاری زلف کا اسیر ہو چکا ہے۔'' کیری مسکرایا۔

''تمہاری بکواس میری سمجھ سے بالاتر ہے۔'' ڈوروتھی کا حسن ماند پڑ گیا۔

''تم خاص نوعیت کے ''کلر بلائنڈ'' کی مریضہ ہو اور اکثر اوقات سرخ و سبز رنگ میں تمیز نہیں کر پاتی ہو۔ پنسل کا تجربہ مجھے احتیاطاً کرنا پڑا تھا۔'' وہ بولا۔ ''اگر تمہارا مرض بڑھ چکا ہوتا تو تم کافی پہلے ٹریفک وائلنس میں پھنس چکی ہوتیں اور قتل جیسے کریہہ جرم سے بچ جاتیں۔''

ڈوروتھی نڈھال انداز میں نشست پر ڈھیر ہو گئی۔

شش انگشت

باہر نعیم

اس کے دائیں ہاتھ کی چھ انگلیاں تھیں... ایسے لوگ کہیں نہ کہیں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں... اور ہر شخص ان میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو جاتا ہے... لوگوں سے بچنے کے لیے اس نے اپنے ہاتھوں کے لیے فرمائشی دستانے مہنگے داموں بنوائے تھے...

ہاتھوں کی محبت میں مبتلا شخص کی عجیب و سنگین روداد

''وہ بلیک میلر تھا۔'' انسپکٹر شاہد نے کہا۔ ''میرے خیال میں اس کے ساتھ اچھا ہی ہوا۔ وہ اسی قابل تھا... جس نے بھی اسے قتل کیا وہ ہمارے شکریہ کا مستحق ہے۔ لیکن جرم تو جرم ہے۔ بلیک میلر تو گیا، تاہم قاتل رہ گیا۔ بلیک میلر کو مارنے والا قاتل ہی ہوتا...؟''

فیروز کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ پتلون کی جیب میں تھے۔ ایک ہاتھ دائیں جیب میں موجود سکوں سے کھیل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں استعجاب تھا۔ ''بلیک میلر؟'' اس نے سوال کیا۔ ''اخبارات میں قتل کا ذکر ہے لیکن بلیک میلر کا نہیں؟''

''دراصل ہم جن خطوط پر تفتیش کر رہے تھے... ضروری تھا کہ ہم بلیک میلنگ کی ہوا پریس کو نہ لگنے دیں۔ ورنہ ہماری مشکلات میں اضافہ ہو جاتا۔'' انسپکٹر شاہد نے وضاحت کی۔

''میں سمجھ گیا۔'' فیروز نے سر ہلایا۔ ''تاہم میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اختر کو بلیک میلر کے طور پر کیسے شناخت کیا گیا؟'' فیروز کی آواز میں تجسس تھا۔

شاہد نے جواب دیا۔ ”بہت سادہ... ہمیں وہ فہرست مل گئی تھی جس میں اس کے شکاروں کے نام، پتے اور دیگر تفصیلات درج تھیں۔ ان رقوم کا بھی ذکر تھا جو وہ اپنے پھنسائے گئے شکاروں سے وصول کرتا تھا۔ یہ بڑا اہم پرچہ تھا... انکشافات سے پُر۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو، انسپکٹر۔“ فیروز نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”تمہاری وضاحت نے میری یہ الجھن بھی دور کر دی ہے کہ آخر تم نے میرے دروازے پر دستک کیونکر دی... یقیناً میرا نام اور پتا تم نے مذکورہ فہرست میں دیکھ لیا ہوگا۔“ فیروز نے کہا۔

”تم ٹھیک سمجھے۔“ شاہد نے اقرار کیا۔ ”تم سے وہ خاصی موٹی رقم وصول کرتا رہا ہے۔“

”تم کہہ سکتے ہو۔“ فیروز نے کہا۔ ”اور مجھے کوئی شرمندگی نہیں ہے کہ میں اس کے مارے جانے پر خوش ہوں۔“

”فہرست میں جتنے لوگوں کے بھی نام موجود ہیں وہ سب فطری طور پر خوش ہیں۔“

”کیا تم سب سے مل چکے ہو؟“ فیروز نے سوال کیا۔

”نہیں، ابھی چند باقی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے اچانک جان چھوٹنے پر سب ہی خوش ہوں گے۔“

”تمہاری بات درست ہے۔“ فیروز نے اتفاق کیا۔

”اس ریڈی میڈ فہرست نے ہماری ایک اور مشکل آسان کر دی کہ ہمیں مشکوک افراد کو ڈھونڈنا نہیں پڑا۔“ شاہد بولا۔ ”ظاہر ہے کہ فہرست میں موجود ہر شخص مشکوک ہے۔“

”تمہاری یہ بات بھی ٹھیک ہے۔“ فیروز نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ ”تاہم لگتا ہے کہ تم ابھی تک قاتل تک نہیں پہنچ سکے ہو؟“

”ہاں، دراصل جس شام اختر کو قتل کیا گیا اور تلاشی کے دوران میں فہرست ہمارے ہاتھ لگی... ہم نے فہرست کے مطابق اختر کے شکاروں سے ملنا شروع کیا تو سب کے پاس جائے واردات سے دوری کے ثبوت تھے اور تمہاری طرح سب نے خوشی کا اظہار کیا۔“ انسپکٹر شاہد نے بتایا۔ ”کیا تمہارے پاس بھی اس شام جائے واردات سے عدم موجودگی کا ثبوت ہے؟“

فیروز چونک اٹھا۔ ”گزشتہ ہفتے کی شام؟“

”نہیں، جمعہ کی شام... رات دس اور ایک کے درمیان کسی وقت۔“ شاہد نے تصحیح کی۔

”ہاں، جمعے کی رات تھی۔“ فیروز نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ پھر مسکرایا۔ ”شاہد صاحب! میرے ساتھ بھی معاملہ دوسروں کی طرح ہے۔“

”مطلب... تم بھی کہیں اور مصروف تھے؟“

”ہاں، اس وقت میں جس خاتون کے ہمراہ تھا، وہ جائے واردات سے بہت دور رہتی ہے۔ تاہم مجھے افسوس ہے کہ میں اس کا نام نہیں بتا سکتا۔ اس عورت ہی کی وجہ سے میں اختر کے ہاتھوں بلیک میل ہوتا رہا۔ وہ ایک متمول عورت ہے۔ کوئی انتہائی مجبوری کی صورت پیدا ہو جائے تو میں نام پتا بتا سکتا ہوں۔“ فیروز بولا۔ ”تم میری پوزیشن سمجھ سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ انسپکٹر شاہد نے کہا۔ ”لیکن ایسی کوئی مجبوری آن پڑی تو تمہیں دوبارہ آنا پڑے گا۔“

”شکریہ، انسپکٹر! میں تیار ملوں گا۔ کوئی اور کلیو؟“

”صرف ایک۔ قاتل جاتے ہوئے کھڑکی پر خون آلود فنگر پرنٹس چھوڑ گیا تھا۔“ شاہد نے برملا اظہار کر دیا۔

”تم نے کہا، خون آلود انگلیوں کے نشانات؟“

”ہاں... کافی خون بہا تھا۔ اختر پر چاقو سے وار کیے گئے تھے۔“

فیروز کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔ ”شاید میں خود کو احمق محسوس کر رہا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”کیا فنگر پرنٹس قاتل کی شناخت کے لیے کافی نہیں ہیں؟“

انسپکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نشانات نہایت بھدے ہیں۔ وہ بری طرح خون آلود نہ بھی ہوتے، تب بھی مشکلات پیش آتیں۔“

”میں سمجھا نہیں، انسپکٹر شاہد؟“

”دراصل قاتل کے نشانات دستانوں کی وجہ سے مزید پریشانی کا باعث بن گئے تھے۔“

فیروز نے کہا۔ ”دستانے؟ پھر تو شناخت ناممکن ہے... ایسے نشانات کی کیا اہمیت ہے؟“

”اہمیت ہے۔ مشکل ضرور ہے، لیکن ناممکن نہیں۔ دستانوں کی موجودگی کے باوجود مجھے ایک اشارہ ملا ہے۔“

”میں اب بھی حیران ہوں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟“ فیروز کے سوالات جاری تھے اور شاہد بھی فراخ دلی سے جواب دے رہا تھا۔

”دستانے خاص نوعیت کے اور بیش قیمت تھے۔ اس کا اندازہ لگانے میں ہمیں خاصی جدوجہد کرنا پڑی۔ یہ مُنائی کی طرح بنائے گئے تھے۔ یہ عام کاٹن کی بنائی نہیں تھی بلکہ قیمتی ریشمی تار استعمال کیا گیا تھا۔ جدید فوٹوگرافی اور لیب میں جانچ کے بعد پتا چلا کہ یہ ہاتھ سے بنائے گئے تھے۔

یعنی کسٹم میڈ تھے... بالفاظ دیگر فرمائش یا آرڈر پر تیار کرائے گئے تھے۔ اور یہ کام کرنے کے لیے شہر میں دکانوں کی تعداد بہت کم ہے۔“

”تم نے مجھے چکرا دیا ہے، انسپکٹر۔“ فیروز نے پیشانی مسلی۔

”میں اس انکشاف پر خود بھی چکرا گیا تھا۔“ انسپکٹر نے قدرے سکون سے کہا۔ ”بہرحال ہمیں زرخیز لائن مل گئی تھی اور ہم نے تلاش شروع کر دی۔ بالآخر زیب النسا اسٹریٹ پر ہمیں وہ دکان مل گئی جو ہر قسم کے فرمائشی دستانے بھی تیار کر دیتی ہے۔“

”تو ایسے دستانے بہت سے گاہکوں کے لیے بنائے گئے ہوں گے؟“ فیروز نے خیال آرائی کی۔

”نہیں، بلکہ بہت کم... حتیٰ کہ ہمارے مطلوبہ دستانوں کی صرف ایک جوڑی بنائی گئی تھی۔ یہ آرڈر کئی برس قبل دیا گیا تھا۔ یہاں بھی ہم خوش قسمت رہے کیونکہ ریکارڈ اس وقت بھی موجود تھا اور آرڈر دینے والے کا نام و پتا بھی۔“ شاہد نے انکشافات کا سلسلہ جاری رکھا۔

”یقیناً یہ خوش قسمتی تھی۔ لیکن میری نہیں بلکہ تمہاری... یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ریکارڈ پر میرا نام اور پتا لکھا تھا۔“ فیروز نے جھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آخری بات۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”دائیں دستانے میں چھ انگلیوں کی گنجائش تھی۔ چھ انگلیوں کا عام سا دستانہ بھی تیار کیا جا سکتا تھا۔ بس ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اتنے اسپیشل دستانے تیار کرانے کی کیا ضرورت تھی؟“ شاہد نے تعجب کا اظہار کیا۔ تعجب میں سوال کا عنصر شامل تھا۔

”مزید گہرائی میں جانے کا کیا فائدہ؟“ فیروز نے کہا۔ ”اب تمہاری تمام تر تفتیش کا انحصار اس بات پر ہے کہ میں اپنے ہاتھ شو کروں؟“

”یقیناً، میں دیکھنا چاہوں گا۔“ شاہد نے دلچسپی سے کہا۔

فیروز کے دائیں ہاتھ نے جیب میں سکوں سے کھیلنا بند کر دیا۔

شاہد نے محتاط انداز میں ایک ہاتھ گن پر رکھ لیا۔

”میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔“ فیروز کے چہرے پر پژمردہ مسکراہٹ تھی۔

فیروز نے دھیرے دھیرے دونوں ہاتھ پتلون کی جیب سے باہر نکالے۔

اس کے دائیں ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں۔

شادی

میاں جی کا نام گواہوں میں شامل کر لیا گیا تھا۔ وہ پیش ہوئے تو مخالف وکیل نے ان پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ نام پتے کی تصدیق کے بعد اس نے پوچھا۔ ”تم نے کبھی شادی کی؟“

”جی جناب۔“ میاں جی نے تحمل سے جواب دیا۔

”کس سے کی؟“ اگلا وار ہوا۔

”ایک عورت سے۔“

”ظاہر ہے کہ عورت ہی سے کی ہی گی۔“ وکیل نے طنز سے کہا۔ ”کیا تم نے کبھی کسی مرد سے شادی کے بارے میں سنا ہے؟“

”جی جناب! بالکل سنا ہے۔“

”یہ کیا بے ہودگی ہے؟“ جج نے مداخلت کی۔ ”ایسا واقعہ کہاں پیش آیا؟“

”میری بیٹی نے ایک مرد ہی سے شادی کی ہے، جناب عالی۔“

شادی شدہ

سردار جی نینا سنگھ کے ساتھ سمندر کے کنارے ایک بینچ پر بیٹھے اس پر فدا ہوئے جا رہے تھے۔ ایک سپاہی کو وہ حرکتیں ناگوار گزریں تو وہ ان دونوں کے سر پر آ پہنچا اور کچھ یوں مکالمے ہوئے۔

”اوئے! یہ دن دیہاڑے کیا ہو رہا ہے؟“

”باتیں کر رہے ہیں... تجھے کیا تکلیف ہے؟“

”شرم نہیں آتی... باتیں ایسے ہوتی ہیں؟“

”چلا جا یہاں سے... میں پولیس کمشنر سے شکایت کروں گا کہ تم شادی شدہ لوگوں کو بلاوجہ تنگ کرتے ہو۔“

”تم شادی شدہ ہو؟“

”ہاں... ہم شادی شدہ ہیں۔“

”تو یہ راز و نیاز تم گھر پر کیوں نہیں کرتے... یہاں سیکڑوں لوگ آتے جاتے ہیں۔“

سردار جی نے ایک گہرا سانس لیا اور بولے۔ ”یہی تو مشکل ہے بھایا جی...! میری پتنی بڑی ظالم ہے اور اس کا آدمی غصے کا بہت تیز ہے۔ ذرا سی بات پر مرنے مارنے پر تل جاتا ہے... مجبوراً یہاں آئے ہیں۔“

کراچی سے جاوید کاظمی کی شوخی

جواری

احمد اقبال

تیرہویں قسط

زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان

شیکسپیئر کا کہا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ زندگی ایک اسٹ
ہے جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں... یہی اداک
زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے... جس میں خطرات ا
حادثات کی بازی پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جار
رہتی ہے... تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں... وہ زندگی کے ہر نومولو
کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے او
یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتۂ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہ
اور غیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے... خوشی... غم
نفع... نقصان... دوستی... دشمنی... محبت او
نفرت... سب ہار جیت کے وہ روپ ہیں جن سے ہ
انسان ایک جواری بن کے سامنا کرنے پر مجبو
ہوتا ہے... جواری... انسانی جذبوں ک
ردعمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے ج
نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر نئی بھ
لگتی ہے اور پرانی بھی... آپ بیت
بھی اور جگ بیتی بھی
تجسس اور حیرانی ک
سارے رنگ دکھلا
جادو اثر تحریر

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ایم اے پاس خاور سکھر جیل میں سزائے موت کا منتظر تھا۔ اس پر قتل کا جھوٹا الزام ایک گینگ لیڈر نادرشاہ کے ایما پر عائد کیا گیا تھا۔ وہیں ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار گاما رستم بھی پھانسی کا منتظر تھا۔۔۔ اس کے ساتھی جیل پر حملہ کر کے اسے چھڑا لے جاتے ہیں۔ گاما، خاور کو ساتھ لے جاتا ہے۔ خاور ایک پرانی غیر آباد حویلی میں پناہ لیتا ہے۔ خاور کو اس حویلی کے کھنڈر میں نورین ملی جو لباس عروسی میں تھی اور اپنے شوہر کو قتل کر کے آئی تھی۔ اس کی پرورش کرنے والے چچا نے نورین کی تمام جائداد اور دولت پر قبضہ کر لیا تھا اور زبردستی اس کو اپنے پاگل بیٹے سے بیاہ دیا تھا۔ پاگل چچازاد کی دست درازی سے بچنے کے لیے نورین نے اسے قتل کر دیا اور کھڑکی کے راستے آسیب زدہ مشہور حویلی میں آ گئی۔ کسی نے اسے دیکھا تو بدروح سمجھ کے بھاگ گیا۔۔۔ نورین یہاں سلمان خان نامی ایک شخص سے چھپ کر ملتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ وعدے کے مطابق وہ یہاں موجود ہوگا لیکن وہ نہیں آیا تھا۔ نورین پریشان تھی کہ صبح پولیس اسے قتل کے الزام میں گرفتار کر لے گی۔ وہیں اس کی ملاقات خاور سے ہوئی۔ اس کھنڈر کی دوسری منزل پر خاور کو سلمان کی لاش نظر آئی۔ وہ اپنا وعدہ نبھانے پہنچا تھا لیکن قتل ہو گیا تھا۔ تلاشی پر خاور کو اس کی جیب سے دس لاکھ نقد ملے۔ خاور نے اپنے کپڑے اسے پہنائے اور خود اس کے کپڑے پہن کے رقم جیب میں ڈال لی۔ اس نے اپنا حلیہ بدلا اور نورین کو برقع میں چھپا کر لے گیا۔ وہ اکیلا نورین کے گھر گیا تو اسے علم ہوا کہ نورین پر شوہر کے قتل کا الزام ہے جبکہ نورین نے نکاح نہ ہونے کے باعث اسے تسلیم نہیں کیا تھا۔ خاور نے نورین سے جھوٹ بولا کہ سلمان جو پہلے سے بے روزگار تھا، نوکری مل جانے پر دبئی چلا گیا تھا۔ باہر جانے میں خطرہ تھا کیونکہ خاور کے جیل سے فرار کی اطلاع کے بعد نادرشاہ نے اپنے کارندے اسے تلاش کرنے پر لگا دیے تھے جو کتوں کی طرح ہر جگہ اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ دوسرا خطرہ پولیس سے تھا جس کو خاور کے علاوہ نورین کی بھی تلاش تھی۔ خاور، نورین کو لے کر نکلا اور ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ تاہم وہاں غیر محفوظ ہونے اور نورین کی اچانک طبیعت خراب ہونے پر وہ ایک اسپتال میں آ گئے۔ خاور اور نورین وہاں سے نکلے۔ ہر بڑے ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ اور ائرپورٹ پر وہ پکڑے جا سکتے تھے چنانچہ انہوں نے پنجاب کا رخ کیا اور کئی مقامات پر ٹرین بدلتے رہے۔ اس کے باوجود نادرشاہ کے بندوں نے جو ویٹر کی وردی میں تھے، خاور کو پہچان لیا۔ ایک کو خاور نے چلتی ٹرین سے کودنے پر مجبور کر دیا۔ دوسرے نے نورین اور خاور کی حفاظت اور اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ جذباتی نورین اسے اپنا بھائی تسلیم کر چکی تھی۔ خاور بھی اسے معاف کرنے پر مجبور ہو گیا، اس کا اصل دشمن نادرشاہ تھا۔ خانپور کے ویٹنگ روم میں رات گزار کے وہ دونوں ایک پرائیویٹ کیری ڈبے سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ نازی نے انہیں رات بھر کے لیے کسی اجنبی قصبے کے باہر ایک کچے خالی گھر میں رکھا اور انہیں تسلی دی کہ صبح وہ لاہور کے مضافات میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن صبح جاگنے پر نادر شاہ کے آدمی آ گئے اور نورین اور خاور کو لے گئے لیکن راستے میں نورین نے جانے کیا کیا کہ گاڑی حادثے کا شکار ہو گئی۔ خاور بچ گیا مگر نورین کا پتا نہ چل سکا۔ خاور نے رحیم بخش نامی شخص کے گھر میں پناہ لے لی۔ مقامی چودھری رحیم بخش کی بیٹی سے شادی کا خواہش مند تھا۔ رحیم بخش کو قتل کر دیا گیا اور ریشم اور خاور کو چودھری کے گرگے اٹھا کر لے گئے۔ خاور کو قید کر دیا گیا تاہم وہ اکبر کے بھائی انور کے ساتھ رہا ہو گیا اور انور نے حویلی پر اپنا اختیار حاصل کر لیا۔ ریشم بھی حویلی میں ہی تھی۔ چودھری انور نے اکبر کو قید کر دیا۔ انور خاور کو لے کر شناختی کارڈ آفس گیا اور ملک سلیم اختر کے نام سے نیا شناختی کارڈ بنوا دیا۔ حویلی میں کوئی سازش ہو رہی تھی، ایک گارڈ کی موت کے بعد انور نے تمام گارڈ بدلنے کا فیصلہ کیا۔ ادھر اکبر کے سسر نے خاور عرف ملک سلیم کو زبردستی اٹھا لیا اور آستانے کے تہ خانے میں قید کر دیا۔ وہیں خاور کو نورین نظر آئی۔ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھی تھی۔ رات کو کچھ نامعلوم لوگوں نے آستانے پر دھاوا بول دیا۔ خاور وہاں سے بھاگ نکلا اور نورین کی تلاش میں نکل گیا۔ لیکن وہ جب نورین کے گھر پہنچا جہاں نورین فاطمہ کے نام سے رہ رہی تھی تو اسے وہاں موجود نہ پایا۔ نورین کا فرضی باپ اسے لے کر شہر چلا گیا تھا۔ ادھر شاہینہ نے ریشم کو زہر دے کر مارنے کی کوشش کی تاہم بروقت طبی امداد کے سبب اس کی جان بچ گئی۔ پیر اظہر علی کو قتل کے مقدمے کا سامنا تھا اور اپنی بیٹی کی کہیں اور موجودگی ثابت کرنے کے لیے اس نے روزینہ سے انور کا جعلی نکاح کر دیا اور اس نکاح کا خاور گواہ بنا۔ اکبر کو کسی نے زہر دے کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ حویلی کے معاملات گڑبڑ ہو گئے۔ تاہم پیر صاحب نے معاملات کو سنبھالا۔ اچانک ایک اور بری خبر ملی کہ انور کا نکاح نامہ تیار کرنے والے مولوی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ ریشم کو زبردستی اظہر شاہ کے پاس پہنچا دیا گیا اور کہا گیا کہ اس پر جن آتے ہیں۔ تاہم خاور نے ریشم کے تحفظ پر چودھری کو راضی کر لیا۔ ادھر شاہینہ نے خاور کو راتوں رات حویلی سے اٹھوا لیا۔ وہ اسے اکبر کے کسی ڈیرے پر لے گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ دواؤں کے اثر سے خاور کو مجبور کیا جائے اور اس کے دماغ سے نورین کا خیال مٹ جائے۔ خاور نے اس قید سے بھاگنے کی کوشش کی تاہم وہ زخمی ہو کر اظہر علی شاہ کے پاس پہنچا دیا گیا۔ خاور کو درگاہ کے تہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔ وہیں ایک ملازم آیا۔ اس نے تعویذ کی طرح کا کاغذ خاور کو دے کر کہا کہ اس میں ریشم کا پیغام ہے۔ وہ سلونی کا بھائی تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

جس نے سلونی کے بھائی کو نمونہ کہہ کے مخاطب کیا تھا، وہ سب سے اوپر والی سیڑھی پر نمودار ہوا۔ نمونے کی پیش قدمی اسی لیے رک گئی تھی۔ اب وہ ایک ایک قدم واپس ہوا کیونکہ سامنے والا نیچے آ رہا تھا۔ وہ پیر سائیں کے خاص مریدوں میں سے ایک تھا۔

مریدِ خاص کا درجہ پانے والوں کو عقیدت مندی اور جاں نثاری کی ہر آزمائش سے گزر کے یہ مقام حاصل ہوتا تھا۔ وہ سب دراز قد اور مضبوط جسم والے لوگ تھے جن کی

تعداد کا مجھے اندازہ بھی نہ تھا۔ وہ اپنا رعب و دبدبہ قائم رکھنے کے لیے بے رحم اور خطرناک نظر آنے کی کوشش کرتے تھے۔

پہلی سیڑھی سے آخری سیڑھی تک مریدِ خاص کی نظر مجھ پر رہی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ سلونی کے بھائی نے جو وقت غیر ضروری باتوں میں صرف کیا تھا، اس نے مریدِ خاص کو شک میں مبتلا کر دیا تھا۔ مجھ تک پہنچنے والا چھوٹی بی بی کا زبانی پیغام تو نہیں جان سکتا تھا لیکن ریشم کا رقعہ ضرور پڑھ سکتا تھا جو میں نے اپنی مٹھی میں دبا رکھا تھا۔ ابھی خود میں نہیں جانتا تھا کہ اس رقعے میں ریشم نے کیا لکھا ہے لیکن رقعے کا مجھ تک پہنچ جانا ہی خطرناک سازش کا ثبوت تھا۔ اس سے پیر سائیں کا جلال و عتاب سب پر نازل ہوتا۔ سب سے زیادہ سلونی کے بھائی پر جس نے نامہ بری کی۔

سلونی کے بھائی کی حالت خوف سے غیر تھی۔ نہ وہ مجھے خبردار کر سکتا تھا اور نہ کوئی خفیہ اشارہ۔ خود میں پریشان تھا کہ اب ریشم کی اس تحریر کو کیسے غائب کروں جو کسی فردِ جرم کی طرح میرے ہاتھ میں تھی۔ مریدِ خاص پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھ رہا تھا اور قدم قدم آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

وقت بہت کم تھا۔ بیس قدم کا فاصلہ گھٹ رہا تھا۔ انیس۔۔۔ اٹھارہ۔۔۔ سترہ۔۔۔ اور وقت ہر سکینڈ پر لگا کے اُڑ رہا تھا۔ آخر چند قدم باقی تھے کہ مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ میں ایک دم پلٹا اور رقعے کو منہ میں رکھ کے کموڈ پر پیشاب کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ اب مریدِ خاص کی طرف میری پیٹھ تھی اور وہ مجھے بڑی محنت سے کاغذ کے ایک ٹکڑے کو چبا کے تھوک سے نگلتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

کاغذ مشکل سے نیچے اترا تھا اور اس میں تھوڑا وقت لگ گیا تھا۔ اسی وقت میں نے مریدِ خاص کے غرانے اور مجھے ایک بھاری بھر کم گالی سے نوازنے کی آواز سنی۔۔۔

میں نے پلٹ کر مریدِ خاص کو اس کی عطا کردہ گالی سے دگنے وزن کی گالی دے کر بڑی فرحت محسوس کی۔ ”ہاتھ میں توپ اٹھا رکھی ہے اور آواز پھر بھی چوہے جیسی نکل رہی ہے۔“ میں نے اسے مفت مشورہ دیا کہ اس ریوالور کو ہاتھ کے بجائے کہیں اور رکھے یا والدہ ماجدہ کے پاس رکھوا دے۔

اس نے مجھے دانت پیس کر مُکا مارنے کی کوشش کی۔ میں غوطہ مار گیا اور اس کا ہاتھ میرے سر پر سے گزر گیا۔ نیچے جھکتے ہی میں نے اس کو قابو کرنے کے لیے اس جگہ پر ہاتھ ڈال دیا جو میرے سامنے تھی۔ وہ بے بس ہو کر بلبلایا اور پھر مجھے ساتھ لیتا ہوا دیوار سے بلڈوزر کی طرح ٹکرایا۔ سر کی چوٹ نے مجھے چکرا دیا۔ پھر ریوالور میرے سر پر گرز کی طرح لگا اور میں نیچے گر گیا۔۔۔ میرے حواس پھر بھی باقی رہے۔

”سنو۔۔۔ دیکھ لو۔۔۔ میں نے اسے کچھ نہیں دیا۔“ میں نے سلونی کے بھائی کی آواز سنی۔

مریدِ خاص نے جامہ تلاشی کے لیے مجھے جامے سے باہر کر دیا۔

”میں نے کہا تھا نا۔“

مریدِ خاص کے ایک زنانے دار تھپڑ اور گالیوں کی یلغار سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا نشانہ سلونی کا بھائی تھا جو میرے اوپر گرا۔۔۔ میں پھر بھی بے ہوش پڑا رہا۔

”باتیں کیا کی تھیں تو نے؟“

”میں نے کوئی بات نہیں کی خلیفہ۔ پیر سائیں کی قسم لے لو۔۔۔ اس نے پوچھا تھا کہ مجھے کیوں قید کیا گیا ہے اور پیر سائیں کی شان میں گستاخی بھی کی تھی۔ میں نے صرف یہ کہا کہ مجھے نہیں معلوم۔“

”پیر سائیں معلوم کر لیں گے تجھ سے۔“ مریدِ خاص نے مزید گالیوں کے ساتھ کہا۔ ”چل اٹھ۔“

سلونی کا بھائی اٹھا اور میں نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ پھر قفل لگنے کی۔ عقل نے مجھے روکا اور میں اسی حالت میں دم سادھے پڑا رہا۔ چند منٹ ہی ہوئے ہوں گے جو چند گھنٹوں کا جان لیوا عذاب بن گئے۔ بالآخر اوپر جانے والی سیڑھیوں کا دروازہ بند ہوا اور خاموشی چھا گئی تو میں نے پہلے آنکھیں کھول کے دیکھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے واش بیسن کے پانی سے گلاس بھر بھر کے اپنے جسم کو دھویا اور کپڑے پہن کر میرا اعتماد کچھ بحال ہوا لیکن میں نے یہ نہیں سوچا کہ اب کیا ہوگا۔ مجھے ریشم کے پیغام سے لاعلمی کا دکھ تھا۔ وہ تو یہ سمجھی بیٹھی ہوگی کہ پیغام پہنچ گیا۔ سلونی کے بھائی سے ملنے والا زبانی پیغام بہت حوصلہ افزا تھا اور اس سے زیادہ یہ خیال کہ روزینہ نے مجھے کھانا کھانے کی تاکید کی تھی۔ وہ شاہینہ کا نام لیتا تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔ کہیں اس نے نام لینے میں غلطی تو نہیں کی تھی۔ یہ سوال ازخود اپنی نفی کرتا تھا۔ میرے سوال پر سلونی کے بھائی نے واضح الفاظ میں روزینہ کا نام لیا تھا۔

وزیراں نے جذبات کی رو میں بہہ کر اندر کے وہ راز افشا کیے تھے جو کوئی بھی نہیں جان سکتا تھا۔ میں نے اس کی کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا جذباتی

استحصال کیا تھا اور اس نے مجھے سب بتا دیا تھا۔ مراد کے زندہ ہونے کا یقین کرنا میرے لیے بہت مشکل تھا۔ اس کے قتل کا مقدمہ سیشن کورٹ میں تھا جس میں پیر سائیں کو قاتل نامزد کیا گیا تھا لیکن وزیراں حلفیہ کہتی تھی کہ یہ سب ذاتی رنجش کا ڈراما ہے۔ یہ بات پیر سائیں کے علم میں بھی تھی مگر جب تک وہ مراد کو عدالت کے سامنے زندہ سلامت لا کے کھڑا نہ کریں مجرم وہی رہیں گے۔

مراد کہاں ہے؟ یہ اس کے ٹھیکے دار باپ کے سوا کوئی جانتا تھا تو وہ روزینہ تھی۔ بظاہر یہ بات ناممکن لگتی تھی لیکن میں نے چودھریوں کی حویلی میں وہ سب دیکھا تھا جو ناقابلِ یقین تھا۔

یہ سب جاننے اور دیکھ لینے کے بعد میرے لیے ناممکن کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ مراد کے ٹھیکے دار باپ نے بھی دشمنی کی ہو۔ پھانسی کا پھندا پیر سائیں کے گلے میں ڈالنا آسان نہ تھا مگر ان کا دشمن اور حریف بھی ٹکر کا تھا۔ اثر رسوخ میں بھی اور دولت مندی میں بھی۔ قانون بے چارہ تو خود ہی تماشا تھا اور خود ہی تماشائی۔۔۔ مکروفریب اور عداوت کے اس خونی کھیل میں ایک چشم دید گواہ مجھے بنا لیا گیا تھا جو کچھ بھی نہیں جانتا تھا مگر اسے عدالت میں پیش ہو کے کہنا تھا کہ جس دن مراد کا قتل ہوا، اس دن تو روزینہ چودھریوں کی حویلی میں انور کی منکوحہ بن کے آ چکی تھی۔ اس کے فرار یا اغوا کا کیس محض پیر سائیں کو رسوا کرنے کی مذموم سازش ہے۔ انہوں نے مراد کو قتل نہیں کیا۔ یہ جھوٹ مجھے حلف اٹھا کے بولنا تھا۔

میں نے وہ کھانا کھا لیا جو سلونی کا بھائی لایا تھا۔ اس تاکید کے ساتھ کہ میں خود کو بھوکا نہ رکھوں۔ اس خواہش کا اظہار روزینہ نے کیا تھا۔ آخر کیوں؟ میں بھوک ہڑتال کرتا تو اسے کیا فرق پڑتا۔۔۔ کیا وہ چاہتی تھی کہ میری جسمانی توانائی میں کمی نہ آئے؟ کیا مراد کے ساتھ فرار ہوتے وقت وہ مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہتی تھی اور ریشم کو بھی؟ مجھ سے اسے کیا ہمدردی؟ مگر ریشم والی بات سمجھ میں آتی تھی۔ روزینہ اپنے باپ کی ریشم سے دوسری شادی کے خلاف تھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ ریشم کو فرار کرا دے۔۔۔ اور ریشم کے ساتھ مجھے بھی۔۔۔ خود ریشم یہ چاہتی ہوگی کہ مجھے ساتھ لے جائے۔ اکیلی وہ فرار ہو کے بھی کہاں جاتی۔

اب یہ عجیب جنگ تھی۔ شاہینہ ہر قیمت پر مجھے اپنا بنا کے رکھنا چاہتی تھی، خواہ سلیم کی جگہ اس کا شریکِ حیات کوئی روبوٹ ہو۔۔۔ ایک مرد جسے دماغ بدل کے شاہینہ سے محبت کے لیے تیار کیا گیا ہو۔ دوسری طرف روزینہ تھی جو باپ کی عزت و ناموس کی پروا کیے بغیر مراد کے ساتھ فرار ہونے اور اپنی زندگی کو داؤ پر لگانے کے لیے تیار تھی۔ خواہ اس کا انجام مراد کے لیے دوبارہ حقیقی موت پر کیوں نہ ہو۔ اسے انور کی بیوی بننے سے مراد کے ساتھ مرنا قبول ہوگا۔ تیسری فریق ریشم تھی جو اتنی ہی مظلوم اور بے بس تھی۔۔۔ انور نے محبت کا سہارا چھین کر اسے کٹی پتنگ بنا دیا تھا۔ جو چاہے لوٹ لے۔ اس کی ڈور پیر سائیں نے تھام لی تھی۔ چوتھا جواری میں تھا جو ایک بار پھر اپنی زندگی داؤ پر لگا رہا تھا۔ نورین کے ساتھ ایک آزاد محبت کی لازوال خوشی سے معمور زندگی کی خاطر۔۔۔ میں نے سکھر جیل کی کال کوٹھری سے فرار اختیار کیا تھا تو بہت بڑا جوا کھیلا تھا۔ نہ کھیلتا تو اپنی زندگی کو پھانسی کے تختے پر ہار جاتا۔۔۔ جوا کھیلنے کا انجام فرار ہونے والوں پر فائرنگ سے ہلاکت پر بھی ہوسکتا تھا۔

زندگی کی وہ بازی میں جیت گیا تھا۔ شاید یہ دوسری بازی میں ہار جاؤں۔ چودھری کی حویلی اور پیر سائیں کے ڈیرے سے فرار ہونا زندگی کو داؤ پر لگانے کے مترادف تھا لیکن ہار ہوگی یا جیت۔۔۔ ہر جواری یہ سوچے بغیر ہی کھیلتا ہے۔۔۔ میں بھی آخری ہار تک کھیلنے پر مجبور تھا۔

شام سے رات ہوئی۔ میں اپنی قید گاہ میں چکر لگا کے اور اٹھتے بیٹھتے تھک گیا۔ میرے دماغ نے سوچنا چھوڑ دیا۔ دل نے اچھی امید چھوڑ دی اور آنکھوں نے آزادی کے خواب دیکھنا چھوڑ دیے۔۔۔ میری نظروں کے سامنے ایک انسانی تماشا جاری رہا۔ شیطان جیسی خصلت رکھنے والے سفاک لوگ یکے بعد دیگرے مظلوم اور بدحال عورتوں کے جسم پر قابض جنات اور بدارواح کو تشدد کے حربوں سے مجبور کرتے رہے کہ وہ قبضہ چھوڑ دیں۔ کسی بے بس اور مظلوم عورت کے جسم کا تڑپنا، اس کی دلخراش چیخ پکار مجھ پر بے اثر رہی۔

بالآخر رات آئی اور اس زنداں میں قبرستان جیسی ہولناک خاموشی طاری ہوگئی جس میں کبھی کسی کے کراہنے یا ہذیانی انداز میں ہنسنے سے بھی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ انجانے میں خود میں بھی اسی انجام کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ ذہنی مریض عورتوں پر جسمانی تشدد کے دہشت ناک مناظر سے متاثر نہ ہونا میری دماغی خرابی کی پہلی علامت تھی جس کا مجھے کوئی احساس نہ تھا۔ میں سچ مچ پاگل ہو جاتا تو تب بھی مجھے کوئی احساس نہ ہوگا۔ میری کوئی کوشش کارگر نہیں ہوسکتی تھی۔ صرف خدا کی ذات تھی جو میری اذیت و [illegible] کر سکتی تھی۔ رہائی سے یا موت سے۔۔۔ قیدِ حیات و بندِ غم۔۔۔ اصل میں دونوں ایک ہیں۔

جیسے قیدی ہر روز کے معمولات کا عادی ہو جاتا ہے، میں بھی تھا۔

قتل کے بعد میں چودھری اکبر کے تہ خانے والی نجی جیل میں رہا تھا لیکن صرف چوبیس گھنٹے۔۔۔ دوسری بار مجھے پیر سائیں اٹھا کے لے گئے تھے اور میں اپنے موجودہ قید خانے میں پہلی بار لایا گیا تھا۔ تیسری اسیری کا شرف مجھے شاہینہ کی محبت نہ قبول کرنے پر حاصل ہوا تھا اور وہاں سے پھر جوا اور شروع ہوا تھا۔ اس جیل سے میرا تعارف نیا نہیں تھا۔ یہاں میں دوسری بار آیا تھا۔

ہر قید کا تجربہ مختلف تھا۔ کبھی سزا کی وجہ بغاوت تھی۔۔۔ کبھی محبت تو کبھی نفرت۔۔۔ تاہم اپنے اعمال کی سزا بھگتنے کے لیے مجھے زندہ رکھنا ضروری سمجھا گیا تھا اور جسم و جان کے رشتے کے لیے خوراک کی فراہمی کبھی بند نہ ہوئی تھی۔ ہمیشہ کھانے کے وقت پر کھانا ضرور مل جاتا تھا۔ یہ پہلا تجربہ اس لحاظ سے مختلف رہا کہ وہ رات کچھ کھائے پیے بغیر گزری۔ شام کی طلب کو میں بھوک کا نام نہیں دے سکتا تھا۔ وہ رات میں نے سوتے جاگتے گزار دی۔ صبح آئی تو دوسرے قیدیوں کو خوراک فراہم کی گئی۔

میں ان سب کو الگ الگ طریقے سے سوکھے پاپے چائے میں ڈبو کر کھاتا دیکھتا رہا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میرے پیٹ میں بھی مروڑ سے اٹھ رہے ہیں۔ خالی معدہ گڑگڑانے لگا تھا۔ دوپہر تک میں نے پانی سے پیٹ بھر لیا اور کیا۔ پھر شاید تخیری ہوگئی اور واش بیسن کے نل نے بھی جواب دے دیا۔ شام تک میری خودی اور خودداری کا گراف نیچے چلا گیا اور میں نے آتے جاتے ہر حکم کے غلام سے کہا کہ مجھے کچھ کھانے کو دیا جائے۔۔۔ سب نے ایک ہی طرح مجھے نظرانداز کیا۔ میری طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا جیسے ان کے کانوں تک میری آواز ہی نہیں پہنچی۔

میں نے صرف سنا اور پڑھا تھا کہ بھوک اور پیاس کو انسان بہت سب برداشت کر سکتے ہیں۔ زیادہ مضبوط قوتِ ارادی رکھنے والے ایک ہفتہ گزار سکتے ہیں۔ عملی تجربہ اس کے بالکل مختلف ثابت ہو رہا تھا۔ بھوک سے میرے اعصاب جواب دینے لگے اور دوسری رات میں نے جاگتے ہوئے گزاری۔ میں چلاتا رہا۔ ”ارے کوئی ہے۔۔۔ مجھے کچھ کھانے کو دو۔“ میری پکار پر کچھ قیدی ہنسے۔۔۔

ایک جوان اور خوب صورت عورت اِدھر اُدھر دیکھتی میرے قریب آئی۔ ”کیا کھاؤ گے؟“ اس نے یوں پوچھا جیسے وہی یہاں کے کچن کی انچارج ہو۔

”کچھ بھی۔“ میں نے کہا۔ ”تم کیا لا سکتی ہو؟“

”سب کچھ۔“ اس نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔ ”لیکن میری ایک شرط ہے۔“

اس کی شرط اور شرط کے الفاظ یہاں درج نہیں کیے جا سکتے۔ یہ اس کا فریبِ خیال تھا جس سے وہ دل کو بہلا رہی تھی کہ وہ مجھے پلاؤ زردہ اور قورمہ لا دے گی لیکن اس کے بعد مجھے بھی اس کی طلب پوری کرنی ہوگی۔ میں نے اسے ذلیل کیا اور ایسے الفاظ کہے جو شرمناک تھے۔ اس کی خواہش سے بھی زیادہ۔۔۔ نارمل ہوتا تو میری زبان پر وہ الفاظ کبھی نہ آتے۔ جواب میں اس نے ہسٹریا اور پاگل پن کی کیفیت میں بہت کچھ کہا اور کیا۔ پھر ایک غلام آ گیا اور اس کے حکم پر عورت کو بے لباس کر کے الٹا لٹکا دیا گیا۔ وہ رات بھر چلاتی رہی۔ فریاد اور منت سماجت کرتی رہی۔ باقی سب بے حسی سے دیکھتے رہے۔

صبح میں نیم جاں اور بے سدھ پڑا تھا جب میرے کانوں نے وہ الفاظ سنے جو کسی مژدۂ جاں فزا کی طرح تھے۔ ”ملک صاحب! کچھ کھا لو۔“

اگرچہ ہر لفظ میں حقارت، تمسخر اور تذلیل تھی مگر میں بڑی پھرتی سے اٹھ بیٹھا۔ کھانا واقعی میرے سامنے تھا، اگر خشک روٹی کے چوتھائی ٹکڑے اور جھاگ دیتی لسی سے بھرے گلاس کو جس پر ملائی تیر رہی تھی، کھانا تسلیم کیا جاتا۔۔۔ میں نے روٹی کے ٹکڑے دانتوں سے کترے اور لسی کا گلاس ایک سانس میں خالی کر دیا۔ مجھے یہ خیال بھی نہ آیا کہ اس کھانے میں اس مرض کی دوا نہ ہو جو شاہینہ کی لغت میں محبت لکھا ہوا تھا۔ وہ میرے احساس، جذبات اور خیالات کو جدید دواؤں سے بدلنا چاہتی تھی تاکہ میں نورین کو بھلا کے اس کے عشق میں گرفتار ہو جاؤں۔ اس کے نزدیک یہ ممکن تھا۔

جب میں نے پھر آنکھیں کھول کے دیکھا تو منظر بدلا ہوا تھا لیکن نیا نہیں تھا۔ اسی کمرے میں ایک رات وزیراں نے چاہت کے فریب میں مبتلا ہو کے مجھ پر عالمِ بے خودی میں اندر کے سربستہ راز کھول دیے تھے۔ یہ جرم ایسا ہی تھا جیسے ملک کے خفیہ ادارے کا سربراہ اپنی ٹاپ سیکرٹ فائلیں دشمن کے حوالے کر دے اور وہ بھی تابناک مستقبل کے وعدوں پر اعتبار کر کے۔۔۔ معلوم نہیں وزیراں کو اس

غداری کے جرم کی کیا سزا ہوئی تھی؟

یقیناً لسی میں میرے ہوش و حواس مختل کرنے والی کوئی چیز تھی۔ بے ہوشی میں مجھے واپس یہاں منتقل کردیا گیا تھا۔ شاید یہ گزشتہ رات کی بات تھی اور اب دن طلوع ہوئے بہت دیر ہوچکی تھی۔ میں نے خود کو سنبھالا اور غسل کر کے وہ نیا لباس پہنا جو باتھ روم میں پہلے سے موجود تھا۔ اب میں نے سوچنا لاحاصل سمجھ کے چھوڑ دیا تھا۔ میرے اختیار میں کچھ نہیں تھا تو یہی بہتر تھا کہ جو ملے قبول کرلو۔ مزاحمت یا جارحیت سے اپنی مشکلات بڑھانے سے کیا فائدہ۔ پھر بھی ایک سوال ضدی فقیر کی طرح سامنے موجود رہا۔ جیل میں نافرمان اور باغی کو چکی میں بند کردیا جاتا تھا۔ ایک ایسے پنجرے میں جہاں وہ نہ سیدھا لیٹ سکے اور نہ کھڑا ہوسکے۔ کیا مجھے یہی تین دن کا عذاب نافرمانی پر دیا گیا تھا؟

میری جیلر تھی شاہینہ۔۔۔ ایک ضدی، سخت مزاج اور ہٹ دھرم عورت جو بیک وقت مجھ سے محبت اور نفرت کا سلوک کرنے پر قادر تھی۔ اسے اب مجھ پر رحم آگیا تھا یا اس نے محسوس کیا تھا کہ میرا دماغ درست کرنے کے لیے اتنی سزا کافی ہے۔ میرا سلوک نفرت کا ہونے سے اس کے جذبات نہیں بدلے تھے۔ وہ بہر حال میری محبت کی دلدل میں پوری طرح دھنس چکی تھی۔ اس کا اعتراف وہ کرچکی تھی کہ مجھے دیکھتے ہی ایسا ہوا تھا۔ لو ایٹ فرسٹ سائٹ۔۔۔ پہلی نظر میں محبت جس کا مجھے کوئی تجربہ نہ تھا چنانچہ میں یہ سمجھنے پر مجبور تھا کہ۔۔۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔۔۔ نورین کا عشق آج چودھویں کے چاند جیسا تھا۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو ایک خوشبو کا تعارف تھا۔ پھر جیسے نئے چاند کی عمر کے ساتھ اس کی تابانی بڑھتی ہے، ایسے ہی پسند سے چاہت اور محبت کے بعد عشق کی وارفتگی تک سارے مرحلے رفتہ رفتہ طے کیے تھے۔

غسل کے دوران میں مجھے بازو پر ایک جگہ ہلکی سی ٹیس محسوس ہوئی اور میں نے غور سے دیکھا تو شانے اور کہنی کے درمیان ہلکا سا نیلگوں نقطہ نظر آیا۔۔۔ اسے چھونے سے پھر ٹیس اٹھی تو مجھے شک نہ رہا کہ یہ انجکشن کی سوئی کا نتیجہ ہے۔ اس احساس نے میرے جسم میں سنسنی سی دوڑا دی۔ کیا سچ مچ مجھے نورین کے مجنوں سے شاہینہ کے عاشق میں بدلنے کا عمل شروع ہوچکا ہے۔

اس پورے عمل کی وضاحت شاہینہ کرچکی تھی اور کسی حد تک میں بھی جانتا تھا کہ برین واشنگ آج کی میڈیکل سائنس میں ایک پراسس ہے تو ایسا میرے ساتھ ہونے والا تھا جب میں حیران ہو کے سوال کروں گا کہ نورین؟ کون نورین؟ اس نام کی کسی لڑکی سے میں آج تک ملا نہیں تو اس سے محبت کا کیا سوال۔۔۔ میں تو اپنے پچھلے جنم سے صرف اور صرف شاہینہ سے محبت کرتا ہوں۔ شاہینہ کا خبیث باپ یہ کام اپنے پیری مریدی کے دھندے میں کر رہا تھا۔ بیٹی نے مجھے چن لیا تھا۔ یہ باپ کا ہنر تھا جو اس نے ورثے میں لیا تھا۔

سخت مایوسی اور اندر ابلتے غم و غصے کے ساتھ میں بالکل سیدھا بیٹھا اپنے سامنے کی دیوار کو گھورتا رہا جس میں ماضی کے عکس کچھ دھندلا رہے تھے اور مستقبل کے مناظر ابھرنے لگے تھے۔ میں اور شاہینہ ہر منظر میں ساتھ تھے۔ پھر اس میں ہمارا گھر آگیا، ہمارے بچے آگئے جو مجھے پاپا اور شاہینہ کو ماما کہہ رہے تھے۔ جب پیر سائیں نمودار ہوئے تو یہ بچے دوڑ کر ”نانا۔۔۔ نانا“ کہتے ہوئے اس کی گود میں چڑھ گئے۔ مجھ پر لرزہ طاری ہونے لگا۔ میری ذہنی کیفیت ایسی تھی کہ ریوالور ہوتا تو میں اپنی کنپٹی پر رکھ کے فائر کردیتا۔ مشین گن ہوتی تو سامنے آنے والے ہر شخص کو گرا دیتا۔

جب کسی نے میرے سامنے ناشتے کی ٹرے رکھی تو میں جیسے پہاڑ کی چوٹی پر سے نیچے گرا۔ آج کی حقیقت سے مقابل ہونا ایسا ہی تھا۔ ناشتا لانے والی اٹھارہ بیس سال کی نوعمر لڑکی تھی جس کی شکل و صورت تو واجبی تھی لیکن اس کے پُرشباب بدن کے سارے نشیب و فراز اور قوس و خم اتنے بھرپور تھے کہ نظر کو کھینچتے تھے اور قید کرلیتے تھے۔ یہ وہی خادمہ تھی جس سے میں وزیراں کے ذریعے غائبانہ تعارف حاصل کرچکا تھا۔ اس وقت میری خلوت میں اس کی باریابی ممنوع تھی۔

جب وہ جانے لگی تو میں نے کہا۔ ”کون ہو تم۔۔۔ نام بتاؤ اپنا؟“

اس نے میرے سوال کو اپنی طرف اٹھنے والا پہلا قدم شمار کیا۔ ”میں مرجان ہوں جی۔۔۔ آپ مجھے گھنٹی بجا کے کسی بھی وقت بلا سکتے ہیں۔“

”وزیراں کہاں گئی؟“

اس کا چہرہ سپاٹ اور آنکھیں ویران ہوگئیں۔ ”وہ چلی گئی۔ اس کی جگہ میں ہوں آپ کی خدمت کے لیے۔“

”وزیراں کہاں چلی گئی، اوپر۔۔۔ دوسری دنیا میں؟“

”نہیں جی۔۔۔ اب وہ کچن میں نہیں ہے۔ اسے اب مریدوں کے سپرد کردیا گیا ہے۔“

”سپرد کردیا گیا ہے؟“

”ہاں جی۔۔۔ یہ سزا ہے اس کی۔“

”اس کا جرم کیا تھا؟“

”یہ تو نہیں معلوم مجھے۔۔۔ اس کا سر مونڈ دیا گیا ہے اور بھویں بھی صاف کردی گئی ہیں۔۔۔ وہ درگاہ کی خدمت کرنے والوں کے ساتھ رہتی ہے، دن رات۔“

میرے دل میں ایک انگارہ سا اتر گیا۔ ساتھ رہنے کا مطلب اگر سزا ہو تو یہ سزا کیا ہوگی۔۔۔ یہ میں اندازہ کرسکتا تھا۔ ”کیا میں وزیراں سے مل سکتا ہوں؟“

”مشکل ہے جی۔۔۔ لیکن آپ اسے دیکھ سکتے ہیں۔ کل سے عرس ہوگا تو وہ دھمال کرے گی۔ آپ کی خدمت کے لیے میں جو ہوں۔“

”اس خدمت گزاری کے بعد اگر تمہارے لیے بھی وہ سزا ہو جو آج وزیراں بھگت رہی ہے۔۔۔ تو تم کیا کرو گی؟“

”کیا کروں گی جی۔۔۔ بھگت لوں گی وہ سزا بھی۔“ اس نے بڑے دکھ سے کہا اور پلٹ کر چلی گئی۔

مجھے اندازہ تھا کہ ناشتا کرنے کے بعد کیا ہوگا لیکن میں ہوشیار رہنے کے عذاب سے بھی گزر چکا تھا۔ ایک احساسِ شکست ابھی سے مجھ پر اثر کر رہا تھا۔۔۔ جو ہونا ہے ہوگا۔ میری مزاحمت سے ہونی کو انہونی میں نہیں بدلا جاسکتا۔ یہی سوچ کے میں نے ناشتا ختم کردیا۔ خلافِ توقع مجھ پر غنودگی غالب نہیں آئی۔ جب دروازہ کھلا تو میرا خیال تھا کہ مرجان آئی ہوگی جو برتن اٹھائے گی لیکن وہ شاہینہ تھی۔ شریفانہ انداز میں اس نے دوپٹے کو سر اور سینے پر ڈال رکھا تھا۔ اس کا لباس بھی شریفانہ تھا۔ میں اسے دیکھتا رہا اور وہ میرے سامنے آکے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

”میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ تمہیں روحانی علاج کے مرکز پر منتقل کردیا گیا تھا۔“

”اب پتا چل گیا ہے تو معافی کا کیا سوال۔۔۔ تم حکم دو۔۔۔ بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔۔۔ تم مالک ہو یہاں۔۔۔ اور میں ایک سزا یافتہ۔“

”ایسا نہیں ہے سلیم۔۔۔ رفتہ رفتہ تمہیں یقین آجائے گا کہ میں کتنی مجبور ہوں۔ میں نے اپنی زندگی تمہارے نام کردی ہے۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ محبت آدمی کو کتنا مجبور بنا دیتی ہے۔“

”واقعی۔۔۔ تم بھی مجبور ہو کر مجھے کسی غلام کی طرح [illegible] میں رکھو اور اس کی نفرت کو محبت میں بدلنے کے لیے اذیت اور تشدد کے تمام حربے آزماؤ۔۔۔ جسم تو پہلے ہی تمہارے اختیار اور استعمال میں ہے۔ اس کے دل و دماغ کو مطیع کرنے کے لیے وہ سارے طریقے آزماؤ جو میڈیکل سائنس میں چوہوں، گنی پگ اور خرگوشوں پر آزمائے جاتے ہیں۔ خوب ہے تمہاری مجبوری۔۔۔ جیسے قاتل کہے کہ میں مجبور ہوں۔۔۔ مجھے بہتے خون کی مہک سے سکون ملتا ہے۔“

میں نے اس کا چہرہ زرد پڑتا دیکھا پھر اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی اتر آئی۔ ”مجھے سمجھنے کی کوشش کرو سلیم، میں تو ایک پُرسکون، محفوظ اور خوشیوں سے بھرپور زندگی چاہتی ہوں۔ اپنے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔۔۔ بالآخر تمہیں اس کا یقین آجائے گا، تم خود تسلیم کرو گے۔“

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ہاں، جیسے مداری کی ڈگڈگی پر بندر اپنے کرتب دکھاتا ہے۔۔۔ روبوٹ چلتا ہے۔“

وہ کچھ دیر ٹینشن میں دوپٹے کو اپنی انگلی پر لپیٹتی کھولتی رہی پھر نظر اٹھائے بغیر بولی۔ ”میں نے اباجی سے بات کرلی ہے۔“

”کس بارے میں؟“

اس کے گالوں پر تھوڑی سی لالی آگئی۔ ”یہی۔۔۔ اپنے اور تمہارے مستقبل کے بارے میں۔“

اچانک مجھے خیال آیا کہ دریا میں رہ کے مگرمچھ سے بیر کی پالیسی مجھے کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔ درپردہ حالات ایک امید دلاتے تھے کہ شاید مجھے ایک بار پھر اس قید سے رہائی مل جائے۔۔۔

میں نے کہا۔ ”کیا کہا تم نے پیر سائیں سے؟“

”میں نے کہا کہ میں اپنی زندگی میں ان کے فیصلے کو ایک بار تسلیم کرچکی ہوں تاکہ ناخلف نہ کہلاؤں۔ حالانکہ وہ فیصلہ مجھے قبول نہ تھا اور بعد میں بہت پچھتائی کہ اس سے بہتر ہوتا اگر میں نے تیسرا راستہ اختیار کیا ہوتا۔۔۔ نہ اقرار کا نہ انکار کا۔۔۔ فرار کا راستہ۔“

”تم نے کہا کہ۔۔۔ گھر سے بھاگ جاتیں؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پیر سائیں نے میری بات کا مطلب یہی لیا اور بہت دکھی ہوئے۔ کہنے لگے کہ میں بھی کیسا بدقسمت باپ ہوں۔ چھوٹی سے پہلے بڑی بیٹی نے میرے منہ پر کالک ملنے کا سوچا تھا۔ پھر میں نے کہا کہ میرا ہرگز یہ ارادہ نہیں تھا، میں یہ گھر نہ چھوڑتی۔۔۔ دنیا کو چھوڑ دیتی۔ عاقبت خراب کرتی تو اپنی۔۔۔ پیر سائیں چپ ہو گئے۔ ان کو معلوم ہے کہ یہاں سے رخصت ہو کے

چودھریوں کی حویلی گئی تو میری زندگی کو اکبر نے کیسا جہنم بنایا۔۔۔ بولے کہ اب جو گزر گئی اس پر خاک ڈالو۔ آئندہ کے لیے کیا سوچا ہے؟ میں نے انہیں صاف بتادیا کہ میں کیا چاہتی ہوں وہ چپ ہو گئے۔''

''اگر انہوں نے تم سے کچھ نہیں کہا تو یہ میرے لیے کون سی اچھی خبر ہے۔ اتنی ہی خاموشی سے وہ ساری خرابی کی اصل وجہ دور کر دیں گے۔۔۔ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔''

وہ مسکرائی۔ ''بعد میں خود انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔۔۔ اور میں نے صاف کہا کہ میری خوشی اسی میں ہے اور اس طرح وہ ماضی کے ایک غلط فیصلے سے ہونے والے نقصان کی تلافی بھی کر سکتے ہیں۔ میں نے یقین دلایا کہ میرا ارادہ کوئی غلط قدم اٹھانے کا نہیں ہے جس سے ان کی عزت پر حرف آئے۔ میری خواہش ہے کہ میری خوشی میں ان کی خوشی بھی شامل ہو۔۔۔ پھر وہ مان گئے۔''

''میں نہیں مان سکتا۔''

''تم بھی مان جاؤ گے۔ مجھے معلوم ہے۔'' وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔

''میرا مطلب تھا، پیر صاحب میرے جیسے بے نام و نسب اور لاوارث سے رشتہ کیسے جوڑ سکتے ہیں؟ ان کے خالص خاندانی خون میں یہ نامعلوم خون شامل ہو۔''

''جب وہ تم سے بات کریں گے تو تمہیں خود ہی سب معلوم ہو جائے گا کہ ان کی رضامندی کا مطلب اور مقصد کیا ہے۔''

''تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ اب میں بھی مان جاؤں؟''

''یہ تمہارے سوچنے کی بات ہے کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔۔۔ انکار یا اقرار۔''

''تم نے یہ راستہ کیوں اختیار کیا شاہینہ۔۔۔ تم تو مجھے اپنانے کے لیے دوسرا طریقہ آزما رہی تھیں؟''

''آج بھی اگر تم عقل کی بات مانو تو دیکھو کہ خوش نصیبی کی کتنی بڑی لاٹری تمہارے نام کھلی ہے۔ تم ایک وہم کا پیچھا کر کے کیا پاؤ گے۔ جس میں نورین کا وجود اب تمہارے دماغ کے سوا کہیں نہیں۔ وہ تمہیں کہاں ملے گی؟ اور ساری دنیا میں خوار ہو کے تم بالآخر پچھتاؤ گے کہ تم نے شاہینہ کا دل توڑا۔۔۔ کیا پتا اس وقت شاہینہ کہاں ہو۔ ہو نہ ہو۔۔۔ تم پلٹ کر آئے بھی تو یہ وقت پلٹ کے کہاں آئے گا۔'' وہ ایک دم اٹھی اور میری طرف دیکھے بغیر باہر نکل گئی۔

اس وقت مجھے پہلی بار اس پر ترس آیا۔ اس کی فطرت میں شکست قبول نہ کرنے کی صلاحیت اور اپنی خواہش اور خوشی کے لیے ناجائز کو بھی جائز تسلیم کرنے کی عادت اپنی جگہ۔۔۔ اس وقت وہ مجھے اپنی جذباتی بے بسی میں اس نوخیز لڑکی جیسی لگی جس کو محبت کی پہلی بازی ہارنے سے جان ہارنا آسان لگتا ہو۔۔۔ میں اس کی شخصیت کا وہ روپ دیکھ رہا تھا جو کسی نے نہ دیکھا تھا۔ ایک سعادت مند بیٹی۔ وفادار بیوی اور خاندانی بہو کی حیثیت سے اس نے کسی کو انگشت نمائی کا موقع نہیں دیا تھا۔ شاید وہ سچ کہتی تھی کہ اس کے جذبات کی پُرسکون بلکہ جامد زندگی میں ہلچل میرے آنے سے پیدا ہوئی تھی اور اس کے بعد جو طوفان اٹھا تھا اس میں وہ محبت کے سوا سب کچھ بھول گئی تھی۔ اس نے تمام خاندانی، معاشرتی اور اخلاقی قدروں کو بالائے طاق رکھ کے مجھ سے تعلق قائم کیا تھا۔ یہ تعلق اس کی مجبوری بن گیا تھا۔ پھر اس نے ازدواجی زندگی کے بندھن بھی کاٹ دیے تھے اور تمام خطرات کی دیواریں پھاند کر میرے قدموں میں آگری تھی۔

جنگ کے قوانین میں دشمن کی جیل سے فرار ہونے کی کوشش کرنا ہر سپاہی کا فرض بنتا ہے۔ جرم شمار نہیں ہوتا۔ میں بھی سمجھتا تھا کہ جب تک نورین میرے خیالوں میں زندہ ہے اور میرا یقین بحال ہے، میں اس کی زبردستی کے خلاف لڑوں گا اور اس کے ناجائز قبضے کے خلاف مزاحمت جاری رکھوں گا۔ اب ایک نئی امید مجھے نیا حوصلہ دیتی تھی کہ شاید اب صبر کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں۔ مجھے جب موقع ملے گا، میں بھاگ جاؤں گا۔۔۔ بعد میں شاہینہ مرے یا جیے۔۔۔ مجھے کیا۔

اس روز پیر سائیں کی آمد نے میرے انتظار کی بے چینی کو ختم کیا۔ وہ اپنے محافظوں کے ہمراہ بڑی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے نمودار ہوئے اور میری گستاخ خاموشی کی پروا نہ کرتے ہوئے خود سلام کر کے میرے پاس بیٹھ گئے۔ ان کے اشارے پر محافظ دروازہ بند کر کے نکل گئے۔

''ملک! میں تم سے ایک خاص بات کرنے آیا ہوں۔'' انہوں نے خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد کہا۔

''آپ کی ہر بات خاص ہوتی ہے پیر سائیں۔۔۔ کیونکہ آپ عام آدمی نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔

''جو بات میں کہنے والا ہوں۔۔۔ اس میں تمہاری بھلائی ہے۔''

''آپ ساری دنیا کے لیے بھلائی چاہتے ہیں۔'' میں نے طنز سے کہا۔

''چند ماہ پہلے تم ایک اجنبی تھے۔ ایک لاوارث شخص جس کے ماضی اور حال کا کچھ پتا نہ تھا۔ تم تعلیم یافتہ تھے مگر تمہارے خاندانی حسب نسب اور گزشتہ زندگی کے بارے میں شکوک تھے۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ تمہاری خاندانی شرافت از خود سامنے آنے لگی۔ تمہاری نیت اور اعمال سے۔۔۔ تم نے چودھریوں کی حویلی میں اپنی صلاحیت اور فطرت سے سب کو متاثر کیا۔ اس حد تک کہ تم اس خاندان کے ایک فرد شمار ہونے لگے اور سب کے لیے قابلِ اعتماد ہو گئے۔''

''مجھے اس اعتراف کے پردے میں۔۔۔''

''پہلے میری بات سنو۔'' انہوں نے غرا کے کہا۔ ''محمود چودھری پہلے یہی چاہتا تھا کہ تمہیں حویلی سے رخصت کر دیا جائے۔ پھر انور تمہارا طرف دار ہوا اور اب میں بھی قائل ہو گیا ہوں کہ تم شریف اور خاندانی ہو۔۔۔ گزشتہ بار جب تم یہاں آئے تھے۔۔۔ تو یہ طے تھا کہ واپس حویلی نہیں جاؤ گے۔ کسی کو معلوم نہیں ہوگا اور تم دوسری دنیا میں پہنچا دیے جاؤ گے لیکن پھر کچھ اسباب ایسے پیدا ہو گئے کہ آج تم پھر میرے مہمان ہو۔''

''آپ مہمانوں کو اسی طرح رکھتے ہیں؟'' میں نے تلخی سے کہا۔

''غلط فہمی کی بنا پر بہت کچھ ہوا جو غلط تھا۔'' پیر سائیں نے کہا۔ ''اب میں نے اس کی تلافی کا سوچا ہے۔ یوں سمجھو خوش قسمتی کے سارے دروازے تم پر کھل گئے ہیں۔''

''وہ کیسے پیر سائیں؟''

''میں نے تمہیں باقاعدہ اپنی فرزندی میں قبول کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور یہ فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کے کیا ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں پیر سائیں۔''

''تمہیں علم ہے کہ خدا نے ہمیں اولادِ نرینہ سے محروم رکھا۔ اس کی مصلحت وہی جانے۔ ہم نے اپنی بڑی صاحب زادی کا رشتہ اپنے بھائی کے بیٹے اکبر سے طے کیا تھا لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ہماری بدقسمت بیٹی صرف دو سال بعد بیوہ ہو گئی۔ اکبر کو حاسدوں اور بدخواہوں نے مروا دیا۔''

میں نے کسی بات سے اختلاف نہیں کیا۔ یہ نہیں کہا کہ اولادِ نرینہ کے متعلق ان کا سرکاری بیان جھوٹ ہے اور اس گھر کے بھیدی نے بتایا ہے کہ ان کا اکلوتا بیٹا قاسم انہیں چھوڑ کے چلا گیا ہے اور شاید اب کبھی واپس نہ آئے۔ خود پیر صاحب اس گھر کے بھیدی کو نمک حرامی کے شک میں سزا بھی دے چکے تھے۔ بڑی ڈھٹائی سے وہ میرے سامنے یہ بیان دے رہے تھے کہ اکبر کو حاسدوں نے مروایا۔ سچ اگر مجھ سے نہیں چھپا ہوا تھا تو ان کے علم میں بھی تھا۔

پیر سائیں نے فرمایا۔ ''ہم نے استخارہ فرمایا۔ پھر بشارت ہوئی کہ ہم اپنی بیوہ بیٹی شاہینہ کا عقدِ ثانی تم سے کر دیں۔''

میں گویا چونکا۔ ''مجھ سے؟''

''ہاں، یہ عین شرح کے مطابق ہوگا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔۔۔ اور تم نے بھی اپنی شریکِ حیات کو ایک حادثے میں گنوا دیا ہے۔ ہم نے اپنے ذرائع سے تصدیق کرالی ہے۔ وہ حادثے کے وقت تمہارے ساتھ تھی۔ اللہ رب العزت ہی قادرِ مطلق ہے۔ اس نے تمہیں بچا لیا اور وہ ڈوب کے مر گئی۔''

میں نے اداس چہرہ بنا کے کہا۔ ''یہ تصدیق کہاں سے حاصل کی آپ نے؟''

''ہمارے عقیدت مند ہر جگہ ہیں۔ انہوں نے سراغ لگایا تو پتا چلا کہ ایک نوجوان عورت کی لاش نہر میں بہتی ہوئی آئی تھی۔ آگے ایک گاؤں کی عورتیں نہر کے کنارے کپڑے دھو رہی تھیں اور نہا رہی تھیں۔ سب سے پہلے لاش انہیں کنارے پر نظر آئی۔ لاش پانی میں تھی مگر ایک شاخ میں الجھ کے رک گئی تھی۔ ایک لہر نے اسے آگے بڑھایا جو کسی بھینس کے پانی میں اترنے سے اٹھی تھی۔ لاش عورتوں کے درمیان سے گزری تو وہ دہشت زدہ ہو کے بھاگیں۔ ایک تو وہیں گر گئی تھی۔ بعد میں مردوں نے لاش کو نکال کے دفنا دیا۔ تم چاہو تو اس کی قبر بھی دیکھ سکتے ہو اور ان لوگوں سے بھی مل سکتے ہو۔''

میں نے مزید غم زدہ چہرہ بنا لیا۔ ''کیا فائدہ پیر سائیں۔'' مجھے یہ جھوٹ پر مبنی قصہ سنانے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ میں نورین کے خیال سے بھی تائب ہو جاؤں۔ خود شاہینہ مجھے مسلسل یقین دلانے کی کوشش کرتی رہتی تھی کہ نورین صرف میرے خیالوں میں زندہ ہے۔ وہ زندہ ہوتی تو خود مجھ تک پہنچ جاتی۔ پیر سائیں کی اسٹوری بھی بیٹی کے موقف کی تائید میں تھی اور ان جیسے روحانی مرتبے کے شخص کو جھوٹا کون کہہ سکتا تھا۔ وہ بھی اس کی ہمت نہیں رکھتے تھے جو جانتے تھے کہ پیر سائیں کا سارا کھیل جھوٹ اور مکروفریب پر مبنی ہے۔ ان میں سرفہرست وہی بیٹی تھی جس

کے لیے وہ مجھے منتخب کرنے کی خوش خبری لائے تھے۔

میری خاموشی کا مطلب انہوں نے یہ نکالا کہ وہ مجھے قائل کرنے میں کامیاب رہے ہیں اور میں نے انکار نہیں کیا تو یہ میری رضامندی ہے۔

''بیوہ سے عقد سنت رسولؐ بھی ہے اور تم دونوں کا دکھ بھی ایک جیسا ہے۔ دونوں کو رفاقت کے سہارے کی ضرورت ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا آپ نے اپنی صاحبزادی سے بھی دریافت فرمالیا ہے؟''

''ہم نے اس سے عقد ثانی کی بات کی تھی اور اسے تقریباً رضامند پایا تھا۔ اس کی ماں نے اور بہن نے بھی سمجھایا تھا کہ زندگی اکیلے نہیں گزاری جاسکتی۔ ہم نے بھی گھر میں تمہارے متعلق رائے کو اچھا پایا۔ تم ایک صالح اور باعمل نوجوان ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ شاہینہ تمہیں قبول کرلے گی اور تم دونوں بشرط زندگی ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہو گے۔''

''اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو میں کیا کہوں؟''

''اب ہم بتادیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں مصلحت ہے اور انسان کی فلاح ہے۔ وہ مسبب الاسباب ہے جس نے تمہیں بچایا اور یہاں پہنچایا۔ ایک حادثے نے تمہاری تقدیر سنوار دی۔ اب تم غور کرو تو قدرت کے انتظام کے فضائل خود تم پر عیاں ہو جائیں گے۔ تم ایک عالی نسب خاندان کے فرد ہو جاؤ گے۔ تمہیں شاہینہ جیسی ہمہ صفت شریکِ حیات ملے گی تو اسے تم جیسا مخلص شوہر۔''

''اور آپ کو ایک اور بیٹا۔'' میں نے کہا۔

پیر سائیں اس شاک کو جھیل گئے۔ ''ایک اور۔۔۔؟''

''میرا مطلب تھا، دو بیٹیوں کے بعد۔''

انہوں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''ہمارے بعد جو بھی ہے، وہ تمہارا ہوگا۔ نصف اس کا شاہینہ کی ملکیت ہوئی لیکن ہماری روحانی وارث کوئی بیٹی نہیں ہوسکتی تھی۔ تم وہ سب ہم سے حاصل کر سکتے ہو۔ روحانی تربیت سے یہ سلسلہ جاری رکھ سکتے ہو اور عقیدت مندوں کے اس دائرے کو ہزاروں سے لاکھوں مریدوں تک پھیلا سکتے ہو۔''

میں نے اپنی حکمتِ عملی بدل دی تھی۔ مخالفت، جارحانہ طرزِ عمل اور منہ پر کڑوا سچ کہنے سے مجھے فائدہ نہیں ہوسکتا تھا۔ منافقت کے اس کھیل میں منافقت ہی کامیابی کی ضامن تھی۔ حالات کو اپنے حق میں بہتر بنانا ضروری تھا۔

فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کے میں ایک دم اٹھا اور میں نے پیر سائیں کے پاؤں پکڑ لیے۔ ''میں ہرگز اس قابل نہیں پیر سائیں۔۔۔ آپ نے پتھر کو ہیرے کی توقیر دے کر مجھے خرید لیا ہے۔ مجھے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہیں آتا۔''

پیر سائیں نے میرے سر پر دستِ شفقت رکھا اور اٹھا کے مجھے سینے سے لگالیا۔ ''نکاح کی تقریب سادہ ہوگی۔ اس کے بعد ہم بہت جلد تمہاری روحانی جانشینی کا اعلان کریں گے۔ ایک جشن میں تمہاری دستار بندی ہوگی اور ہمارے مریدین تمہارے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ اللہ تمہیں توفیق دے کہ تم ہمارے صحیح جانشین ثابت ہوسکو۔''

میں نے پیر سائیں کے لہجے میں چھپے جذباتی ارتعاش کو ان کی آواز میں بھی محسوس کیا۔ ایک پیر نے جواری بن کے بہت کچھ داؤ پر لگایا تھا جس میں سب سے اہم عزتِ نفس تھی۔ یہ ایک مشکل ترین فیصلہ تھا جو انہوں نے بیٹی کی محبت میں اس کے اصرار پر کیا تھا۔ ان کو حسب نسب کی دیوار گرا کے میرے پاس آنا پڑا تھا۔ میں انکار کردیتا تو ان کا سارا غرور خاک میں مل جاتا لیکن وہ میری زندگی کا بھی آخری دن ہوتا۔

میرے اقرار نے حالات کو یوں بدل دیا جیسے ایک سوئچ دبا کے کوئی اندھیرے کو روشنی میں بدل دے۔ پیر سائیں نے دروازے سے باہر کھڑے سلونی کے بھائی کو حکم دیا کہ وہ کھانا میرے ساتھ کھائیں گے۔ جب وہ کچھ دیر بعد کھانا لے کر آیا تو واپس جاتے جاتے اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور تعویذ کی طرح لپٹا ہوا کوئی کاغذ صوفے کے پیچھے گرادیا۔ میری نظر کے ساتھ پیر سائیں نے بھی پلٹ کے دیکھا مگر اتنی دیر میں نامہ بر غائب ہوچکا تھا۔

میں اب ایک نئے پیغام کا مضمون جاننے کے لیے بے قرار تھا لیکن پیر سائیں کی عقابی نظر تاڑ لیتی کہ دال میں کچھ کالا ہے تو بنا بنایا کھیل بگڑ بھی سکتا تھا۔ وہ تفصیل سے مجھے بتا رہے تھے کہ آگے مرحلہ وار کیا ہوگا۔ اب ان کے اور میرے درمیان رشتے کی نوعیت بدل گئی تھی تو وہ قدرے بے تکلف ہو گئے تھے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں بتایا کہ وہ میرے ماضی کے حوالوں میں کیا کچھ شامل کریں گے جن سے مجھے ایک ہم پلّہ داماد ثابت کیا جائے۔ یہ فرما رہے تھے کہ ان کی جانشینی میرے روحانی درجات کو کتنا بلند کردے گی اور نصف وراثت میں میری نصف بہتر کو کتنا دنیاوی مال متاع حاصل ہوگا اور میری دنیاوی طاقت میں یہ دولت کتنا

اضافہ کرے گی۔

جاتے وقت پیر سائیں نے پھر مجھے گلے لگا کے شفقت سے میرا ماتھا چوما۔ اب ان کے اظہارِ محبت میں سسرانہ التفات بھی شامل تھے۔ نکلتے نکلتے ان کو کچھ یاد آیا تو پلٹ کے انہوں نے دروازہ بند کردیا۔ ''بیٹا سلیم! آنے والی جمعرات سے عرس کا سالانہ جشن شروع ہوگا۔''

یہ اطلاع تھی یا خوش خبری جس نے مجھے چونکا دیا۔ میرے حساب سے اتوار گزرا تھا اور جمعرات تک کم سے کم تین دن کی مہلت تھی۔ اگر اس وقفے میں اپنی رہائی کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو سہرا میرے گلے میں پڑ جائے گا جو تمام عمر کا طوقِ غلامی ہوگا۔ مجھے شک نہیں یقین تھا کہ انہوں نے میرے ماضی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرلی ہوں گی۔ اب ٹرمپ کارڈ ان کے ہاتھ میں تھا۔

''کس سوچ میں پڑ گئے برخوردار! میں نے کچھ پوچھا تھا؟'' پیر سائیں کی آواز مجھے جلاد جیسی لگی جو پھانسی سے پہلے آخری خواہش پوچھے۔

''جی۔'' میں نے چونک کے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اسے خواب سمجھوں یا حقیقت۔''

وہ مسکرائے۔ ''اگر کل پرسوں نکاح کی تقریب کرلی جائے تو جمعرات کو ہم تمہیں اپنا جانشیں نامزد کرنے کا اعلان کرسکتے ہیں۔''

''جی۔۔۔ بالکل۔۔۔ جیسی آپ کی مرضی۔'' میں نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔ ''اگر اتنی عجلت مناسب ہے تو۔''

''نیک کام میں تاخیر کیسی۔'' انہوں نے پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور بہت سی دعائیں دہرائیں۔

دروازہ بند ہوا تو میں نے اندر سے کنڈی لگا کے صوفہ کھسکایا اور اس کے پیچھے سے کئی بار تہ کیا ہوا کاغذ نکال لیا۔ میرے ہاتھوں نے بڑی بے تابی سے اس کو کھولا۔ اس پر ٹیڑھے میڑھے حروف میں دو سطریں لکھی گئی تھیں۔

''مخالفت مول لینے سے نقصان ہوگا۔ بہت جلد ہم اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہوں گے۔''

یہ بہت مختصر اور مبہم بات تھی۔ بہت جلد سے کچھ واضح نہیں ہوتا تھا۔ میرے پاس تو مشکل سے دو دن کی مہلت تھی۔ پیغام دینے والے نے اپنا نام بھی نہیں لکھا تھا۔ میں صرف اندازے کی بنیاد پر کہہ سکتا تھا کہ یہ ہمت ریشم نے کی ہوگی لیکن یہ روزینہ کا پیغام بھی ہوسکتا تھا۔ اس سے وزیراں کی فراہم کردہ معلومات کی تصدیق ہوتی تھی کہ پیر سائیں کے ڈیرے سے فرار کی منصوبہ بندی مکمل ہوچکی ہے۔ کب اور کیسے؟ اس کا میں صرف اندازہ کرسکتا تھا۔ اگر واقعی مراد زندہ ہے تو پھر فرار کی ایک اور کوشش روزینہ کرے گی اور اپنے ساتھ ریشم کو بھی لے جائے گی۔ ریشم کی تحریر میں نے کبھی دیکھی نہیں تھی۔ یہ اطلاع دینے والی وہ خود بھی ہوسکتی تھی۔ کامیابی یا ناکامی خدا کے ہاتھ میں تھی۔ مجھے ناکامی کے امکانات بہت زیادہ نظر آتے تھے اور ناکامی کا دوسرا نام موت تھا۔

اس مختصر پیغام کے پہلے جملے کا تعلق مجھ سے تھا اور میں پہلے ہی اس پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ میری امیدیں اب سلونی کے بھائی سے وابستہ ہوگئی تھیں۔ وہ درمیان کا آدمی تھا۔ ظاہر ہے اس نے بھی اپنی زندگی کو داؤ پر لگا رکھا تھا۔ اس خفیہ مراسلت میں اس کا کردار عیاں ہوجاتا تو اسے اپنی صفائی میں ایک جملہ کہنے کی مہلت نہ دی جاتی۔

میرے دماغ میں سوالات ایک قطار باندھے جواب طلب تھے۔ اس کی فکر کس کافر کو ہوگی کہ انجام کامیابی اور زندگی پر ہوگا یا ناکامی اور موت پر۔ یہ کوشش کب ہوگی اور کیسے؟ اس کی پلاننگ میں ماسٹر مائنڈ روزینہ کا ہوسکتا تھا اور اس کی بیک پر مراد۔۔۔ لیکن ریشم بھی معاون اور مشیر کی حیثیت سے شامل ہوگی۔ میری شدید خواہش تھی کہ کسی طرح مجھے تفصیلات کا علم ہوجائے تو میں اپنی عقل کے گھوڑے دوڑاؤں اور کوئی خامی ہو تو نشاندہی کروں۔

مجھے یہ کرید بھی تھی کہ کیا سلونی اپنے بھائی کی مدد کررہی ہے؟ اس کے ساتھ رنگیلا ہے یا نہیں؟ یہ بات یقینی لگتی تھی کہ ہمارے ساتھ سلونی کا بھائی بھی فرار ہوگا حالانکہ یہ لازمی نہ تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ پہلے کی طرح درگاہ پر رہنے کو ترجیح دے اور کوئی خطرہ مول نہ لے۔ اپنی ذات کو شک سے بالاتر رکھے اور محفوظ رہے۔ وہ بہن کی مدد کرنے پر راضی ہوگیا تھا۔ یہی کافی تھا۔ وہ پیر سائیں کے لیے عقیدت مندی کے جذبات سے مغلوب نہ ہوتا تو یہاں کیوں پڑا رہتا۔

شام تک میری حیثیت بدل گئی۔ میں قیدی سے سرکاری مہمان بن گیا۔ اب میں اس گھر کا ہونے والا داماد تھا۔ میرا شمار مالکوں میں کیوں نہ ہوتا۔ یہ معرکہ سر کرنا شاہینہ کے لیے یقیناً آسان نہ تھا۔ وہ دہری جنگ لڑ رہی تھی۔ ایک میرا دل جیتنے کے لیے اور دوسری اپنے باپ سے اپنی بات منوانے کے لیے۔۔۔ بیٹیوں کی ضد کے آگے باپ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ شاہینہ کو بیوہ ہونے کی حیثیت سے ہمدردی کا فائدہ الگ حاصل تھا اور اس نے باپ کو یہ

احساس بھی دلا دیا تھا کہ اس کی اکبر کے ہاتھوں تذلیل اور ذہنی وجسمانی اذیت باپ کی غلطی تھی جس نے اس پر ایک غلط فیصلہ مسلط کیا۔ وہ خود کو فرماں بردار ثابت کر چکی تھی۔ اب بال باپ کے کورٹ میں تھی کہ ایک بار میں نے زندگی تباہ کرنے والے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ وہ عذاب اس نے کیسے جھیلا۔ شاید اس نے خوب بڑھ چڑھ کے اور نمک مرچ لگا کے بتایا ہوگا اور پھر مطالبہ کیا ہوگا کہ اب تلافی کا وقت ہے۔ مجھے میری زندگی کی خوشی بھی آپ دیں اور پیر سائیں نے بہت غور وخوض کے بعد اپنا فائدہ بھی دیکھا تو سر جھکا دیا۔

مجھے اس گیسٹ روم میں منتقل کر دیا گیا جو وی آئی پی مہمانوں کے لیے مختص تھا۔ شاہانہ طرز سے آراستہ اس مہمان خانے میں سب کچھ تھا اور جو نہیں تھا وہ میرے اشارۂ ابرو پر فراہم کیا جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ میری آزادی کی بھی حد ہے۔ سونے کے پنجرے سے نکل کے آزادی کے افق کی جانب پرواز کر جانا ممکن نہ تھا۔ پیر سائیں جانتے تھے کہ کسی کو آزمائے بغیر اس کو مکمل خود مختار نہیں بنایا جا سکتا۔ جب تک وہ دل سے قائل نہیں ہوں گے کہ میں نے یہ فیصلہ صدقِ دل سے کیا ہے ان کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے نہیں، مجھ پر نگرانی ہوگی۔ وہ شاہینہ کا باپ تھا۔ اس سے زیادہ معاملہ فہم اور چالباز۔۔۔ اس نے میرے پیروں میں دہری زنجیر ڈالی تھی، ایک بیٹی سے رشتے کی۔۔۔ دوسری لالچ کی۔۔۔ ابھی وہ دیکھے گا کہ یہ جیت اس کی ہار اور رسوائی کا سبب نہ بنے۔

رات کا کھانا پھر پیر سائیں نے میرے ساتھ ہی کھایا۔ درحقیقت یہ ایک اور فیصلہ کن ''اِن کیمرا'' میٹنگ تھی۔ اس نے اپنی کامیابی پر بیٹی کو مبارک باد دی یا نہیں اور اس اہم خاندانی فیصلے پر دوسروں نے کیا ردِعمل ظاہر کیا۔ یہ غیر اہم تھا کیونکہ پیر سائیں کے فیصلے سے انحراف کا یہاں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں بھی پوچھنا چاہتا تھا مگر میری ہمت نہ ہوئی۔

پھر پیر سائیں نے ایک دھماکا کیا۔ ''تمہارا شاہینہ کے ساتھ نکاح پرسوں رکھا گیا ہے۔ اس میں صرف گھر کے افراد شریک ہوں گے۔ اس کی اطلاع میں نے انور کو اور اس کے باپ کو بھی دے دی ہے۔ اب وہ آتے ہیں یا نہیں۔۔۔ یہ ان کا معاملہ ہے۔''

میں نے دل میں اٹھنے والے طوفان کو دبا کے کہا۔ ''جی۔''

''ہونے کو یہ نیک کام کل بھی ہو سکتا تھا لیکن ایک زیادہ اہم معاملہ درمیان میں آ گیا۔ ہمارے اپنے اور ریشم کے نکاح کا جس کا فیصلہ ہم بہت پہلے کر چکے تھے۔''

اگرچہ یہ کوئی ایٹمی دھماکے جیسا انکشاف نہیں تھا۔ پیر سائیں کے عزائم کی خبر مجھ تک وزیراں کی معرفت پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ پھر بھی اس اطلاع کا اثر میرے حواس گم کرنے کے لیے کافی تھا۔

پیر سائیں نے میری ذہنی غیر حاضری کے ردِعمل کو نوٹ کر لیا۔ ''لگتا ہے تم بھی دوسروں کی طرح اس فیصلے سے ناخوش ہو؟''

میں نے سنبھل کر کہا۔ ''کون دوسرے؟''

''وہی سب۔۔۔ شاہینہ کے علاوہ۔۔۔ جن سے رشتہ ہے۔'' پیر سائیں نے اپنی شریکِ حیات یا دوسری بیٹی کا نام لینے سے گریز کیا۔ ''لیکن پہلی بات تو یہ کہ ہم کوئی ایسا کام نہیں کر رہے ہیں جو شریعت کے خلاف ہو لیکن زیادہ اہم یہ ہے کہ ایسا نہ ہم زبردستی کر رہے ہیں اور نہ بلا جواز۔۔۔ محض ہوس پر شرع کا پردہ ڈالنا ہوتا تو ہم بہت پہلے عقدِ ثانی کر سکتے تھے اور دو کے بجائے اب تک چار کو زوجیت کا شرف عطا کر چکے ہوتے۔ ہم تمام شرعی تقاضے پورے کرنے کے اہل ہیں، یعنی انصاف اور کفالت۔''

''آپ بالغ اور خود مختار ہیں۔'' بلا ارادہ میرے منہ سے ایک طنزیہ جملہ نکل گیا۔

''ہم نے ضرورت کا جواز تمہارے سامنے بھی رکھا تھا اور واضح الفاظ میں ریشم کو بھی بتایا تھا۔ ہماری۔۔۔ شریکِ حیات ہمیں اولادِ نرینہ دینے کے قابل نہیں رہی۔ لیکن ہم اولادِ نرینہ پیدا کرنے کے ناقابل نہیں ہوئے اور ماشاء اللہ خود ریشم نے برضا و رغبت ہم سے رشتے پر رضامندی ظاہر کی۔''

''یعنی وہ اس رشتے سے خوش ہے؟'' میں نے لہجے کی تلخی کو دبانے کی پوری کوشش کی۔

''خوش نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ عورت کو زندگی میں آسائش اور تحفظ چاہیے۔ الحمدللہ وہ بھی سمجھتی ہے کہ اسے یہاں تحفظ۔۔۔ آزادی اور مالی فراغت ہوگی۔ وہ ایک معمولی کاشت کار کی بیٹی ہے اور اس کے باپ نے یہ تھوڑی سی زمین بھی خیرات میں حاصل کر لی تھی۔''

اس وقت میں پوچھ سکتا تھا کہ اس عقدِ ثانی اور ان کی خواہش یا ریشم کی ''کوشش'' سے خدا نے ان کو اولادِ نرینہ سے نواز دیا تو پھر میری جانشینی کا مستقبل کیا ہوگا؟ کیا میرے

پاس اس عہدے کا چارج تب تک رہے گا جب تک آپ کی اپنی اولاد میری جگہ لینے کے قابل نہیں ہو جاتی؟ یہ سوال قاسم کے حوالے سے بھی کیا جاسکتا تھا کہ بفرضِ محال وہ لوٹ آیا تو کیا میری گدی نشینی خود بخود ختم ہو جائے گی؟ لیکن اس کا فائدہ کوئی نہ ہوتا۔ مجھے کب اس گدی پر بیٹھنا قبول تھا کہ میں اتنی دور کی بات کروں۔

پیر صاحب کے رخصت ہوتے ہی شاہینہ ایسے نمودار ہوئی جیسے موقع کے انتظار میں دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ اس نے اپنے پیچھے دروازہ کنڈی لگا کے بند کیا تو میں نے کہا۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟''

جواب دیے بغیر وہ آ کے مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کی جذباتی کیفیت غیر تھی۔ وہ اپنے چہرے سے روشنی کی طرح پھوٹتی خوشی کے باوجود رو رہی تھی۔ ظاہر ہے یہ بھی خوشی کے آنسو تھے۔ ''تھینک یو سلیم۔۔۔تم نے رضامندی ظاہر کر کے مجھے اپنا بنا لیا۔ تمام عمر کے لیے خرید لیا۔ دیکھنا تمہارے احسان کا بدلہ میں کیسے چکاتی ہوں۔ تمام عمر تمہیں احساس رہے گا کہ یہ محبت تمہیں دنیا کی کوئی دوسری عورت نہیں دے سکتی تھی۔''

میں نے اسے بڑی مشکل سے الگ کیا۔ احساس تو مجھے آج بھی تھا کہ وہ دیوانگی کی حد تک میری محبت میں گرفتار ہے۔ اس میں کوئی منفی جذبہ نہیں۔۔۔ کوئی خود غرضی یا فریب نہیں۔ اداکاری یا جھوٹ نہیں۔ اتنی ہی محبت میں نورین سے کرتا تھا لیکن میرے مقابلے میں شاہینہ نے اپنے جذبات کو شرم و حیا، مصلحت یا خوف کی لگام نہیں ڈالی تھی۔ اس نے اپنے حقیقی جذبات کا کھل کر یا شاید بے شرمی سے اظہار کرنے میں کسی اخلاقی یا معاشرتی پابندی کو حائل نہیں ہونے دیا تھا۔

شاہینہ مجھ سے الگ ہو کے بیٹھی تو اس کے رخِ روشن پر حیا کی لالی اور آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ میں نے اب دیکھا کہ آج میرے سامنے آنے سے پہلے اس نے بڑا اہتمام کیا تھا۔ وہ بے داغ سفید لباس میں تھی جو اس کے سانچے میں ڈھلے ہوئے بدن سے یوں چپکا ہوا تھا کہ کہیں ایک شکن تک نہ تھی۔ اس کے جسم کی نرم و ملائم ریشمی جلد کی طرح۔۔۔ اس میں ایک بھرپور عورت اپنے وجود کی ساری رعنائی کے ساتھ مقابل آئی تھی۔ یہ بڑی حیرانی کی بات تھی۔ دستِ قدرت نے حسن کے شاہکار کہاں کہاں تخلیق کیے۔

شاہینہ کے سیاہ مچلتے پھسلتے سیاہ بال اس کے چہرے پر بار بار سایہ فگن ہو جاتے تھے جنہیں وہ بڑی ادا سے پیچھے کرتی جاتی تھی۔ اس نے آرائشِ حسن میں بھی اہتمام سے کام لیا تھا جس کی شاید اسے ضرورت نہ تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' اس نے شرما کے پوچھا۔

''دیکھ رہا ہوں کہ تم کتنی بے قدری کا شکار رہو۔ اکبر کی ناقدری کو تم نے مجبوراً بھگتا۔ اب کیا ہے جو تم خود کو مجھ تک محدود کرنے پر مجبور ہو، جاؤ یہ دنیا تمہاری ہو گی۔ کون ٹھہرے گا تمہارے مقابل۔''

وہ خوش ہو کے بولی۔ ''ایک ہی بات بار بار کہلوانا چاہتے ہو مجھ سے؟ میں نے تمہیں پا لیا تو سب کچھ پا لیا۔''

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''اسے تم پانا کہتی ہو؟ حاصل کرنے کو۔۔۔تحویل میں لینے کو؟''

''جب اباجی نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تمہیں یہ لڑکا ملک سلیم کیسا لگتا ہے، اگر میں اس کے ساتھ تمہارے رشتے کی بات کروں۔۔۔تو میں نے بڑی مشکل سے اپنی زبان کو روکا ورنہ پتا نہیں کیا کچھ کہہ جاتی جو بے شرمی کہلاتا۔ میں نے اس وقت روایتی مشرقی لڑکی بن کے سر جھکا لیا تھا، آج جب انہوں نے بتایا کہ تم نے مجھے قبول کر لیا ہے تو میں خوشی سے پاگل ہو گئی تھی۔ بس ہوش میں رہی ورنہ دل تو بے قابو تھا۔ میرا یقین غلط نہ تھا۔ مجھے پتا تھا کہ محبت کی بالآخر جیت ہو گی۔ تم میرے بن جاؤ گے۔''

''نہ بنتا تو تمہارے پاس دوسرے طریقے تھے۔۔۔ جسمانی طور پر ہی نہیں، ذہنی طور پر بھی اپنا غلام بنانے کے۔''

''لیکن میں نے ایسے ہی تمہیں جیت لیا۔ وہ نورین جو اَب اس دنیا میں ہی نہیں۔۔۔ کب تک تم پر اپنا تسلط برقرار رکھ سکتی تھی۔ کیا اباجی نے تمہیں بتا دیا ہے کہ وہ اپنے ذرائع سے تصدیق کرا چکے ہیں۔''

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''تمہیں کوئی ڈر نہیں کہ وہ تصدیق غلط ثابت ہوئی۔۔۔ یا میں نے پیر سائیں کی قید سے رہائی کے لیے ان کی ہر بات مان لی ہو۔۔۔ خوشی خوشی۔۔۔ آزادی اور خود مختاری حاصل کرتے ہی میں بھاگ گیا۔۔۔ پھر کیا ہوگا؟''

''ایسا نہیں ہوگا۔''

''تم جذبات سے مغلوب ہو اس لیے عقل مفلوج ہو گئی ہے تمہاری۔۔۔ یہ سب میری چال بھی ہو سکتی ہے۔۔۔اداکاری بھی۔''

''جب تم میرے ہو گئے تو میرے رہو گے۔۔۔

مجھے پورا یقین ہے۔''

''تم مجھے مصنوعی طریقوں سے محبت کے لیے سدھا لو گی؟''

''اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میری محبت خود تمہیں اسیر کر لے گی۔ مکڑی کے جالے کی طرح۔۔۔ تمہیں احساس ہی نہیں ہوگا اور تم مجھ سے زیادہ بے اختیار اور بے بس ہو جاؤ گے۔۔۔ جیسے پنجرے کا پنچھی جو دروازہ کھلا رہ جائے تب بھی اُڑ کے آسمان کی طرف پرواز نہیں کرتا۔۔۔ لوگ رشتوں میں بندھ جاتے ہیں۔۔۔ وہ خون کا ہو یا گھر کی دیواروں کا یا گلی محلے گاؤں اور شہر کی مٹی کا۔۔۔''

''تم بے حد ذہین بھی ہو۔۔۔ ذہین لوگ زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ اکبر سے نفرت کے ردِعمل نے تمہیں کس انتہا تک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں اکبر نہیں ہوں جو حویلی کا قیدی تھا۔''

''تم میرے قیدی ہو۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ''تمہیں کیا معلوم کہ تمہیں اپنا بنا کے رکھنے کے لیے میں کس انتہا تک جا سکتی ہوں۔''

''کیا کرو گی تم اگر میں بھاگ گیا؟''

''اول تو تم بھاگ نہیں پاؤ گے۔''

''جیسے اب میری نگرانی پر پہرے دار ہیں۔۔۔ یہ رہیں گے۔''

''وہ تو ہر وقت ہر جگہ موجود رہتے ہیں۔۔۔ میں بھی ان کی نظر میں ہوں۔ وہ پیر سائیں کے بھی آگے پیچھے ہوتے ہیں۔۔۔ پھر تم دیکھو گے کہ میں کیسے تمہیں بے بس کرتی ہوں۔۔۔تم خود مجھ سے دور نہیں رہ سکو گے۔ جیسے نشے کا عادی نشے سے دور نہیں رہ سکتا۔ تم ہر گھڑی ہر لحظہ میری ضرورت محسوس کرو گے۔ لیکن مجھے پیر سائیں پر بھروسا ہے۔۔۔ انہوں نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔۔۔ میں خود کو کتنا بھی چالاک اور عقل مند کیوں نہ سمجھوں۔۔۔ ان کے سامنے بچی ہوں۔ وہ خود میرے مستقبل کی حفاظت کریں گے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ۔۔۔ میں بھاگ کے کہیں نہیں جا سکتا۔''

اس نے کچھ سوچ کے اقرار میں سر ہلا دیا۔ ''کہاں جاؤ گے تم آخر۔۔۔ اس ملک سے چلے جاؤ تو شاید کچھ مشکل ہو لیکن تمہارا سراغ لگانا ان کے لیے ناممکن نہیں۔۔۔ اچھا۔۔۔ میں چلتی ہوں۔ فضول باتوں میں دماغ مت کھپاؤ۔۔۔ اپنی یعنی میری اور تمہاری اس زندگی کے لیے اچھا سوچو۔۔۔ جو آنے والی ہے۔''

''ٹھہرو۔۔۔ مجھے کچھ اور بھی بات کرنی تھی۔۔۔ یہ تمہارے والد ریشم کے ساتھ وہی کر رہے ہیں۔۔۔ جو تم نے میرے ساتھ کیا۔''

''غلط۔۔۔ریشم خوش ہے۔''

میں نے کہا۔ ''قید میں خوشی کا اظہار مجبوری ہوتا ہے۔''

''وہ کبھی قید میں نہیں تھی۔ اس کی حیثیت مہمان جیسی رہی ہمیشہ۔۔۔ میری ماں کو کبھی شبہ نہ تھا کہ وہ ان کی سوکن بھی بن سکتی ہے۔''

''اگر وہ مہمان ہے۔۔۔ اور میں بھی مہمان ہوں۔۔۔تو کیا ہم ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں مل سکتے۔۔۔کل میں ملوا دوں گی۔''

''کل تو اس کا نکاح ہوگا، کسی وقت۔''

''شام کو۔۔۔ یا رات کو۔۔۔ دن میں کل عرس کی تقریبات کا آغاز ہوگا۔''

''عرس تو جمعرات کو ہونا تھا۔''

''ہاں، وہ آخری دن ہوگا۔۔۔ لنگر کھلے گا۔ تمہاری دستار بندی ہوگی اور تمام لوگ تمہارے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ دیکھو، آج میں تم سے آخری بار چھپ کر ملنے آئی ہوں۔ بڑا رسک لیا ہے میں نے۔۔۔ اب جمعے کی رات کو ملیں گے۔ کبھی نہ بچھڑنے کے لیے۔'' اس نے ایک دم اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال کے مجھے یوں چوما۔۔۔ جیسے مجھ پر واجب تھا کہ اسے چوموں۔۔۔ پھر وہ لہرا کے باہر نکل گئی۔

میں بے وقوفوں کی طرح ساکت بیٹھا دیوار کو گھورتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب میرے یا کسی کے کرنے کے لیے کیا رہ گیا ہے۔ درمیان میں ایک رات ہی تو ہے جو کچھ گزر چکی ہے اور جو باقی ہے وہ بھی گزر جائے گی۔ ریشم کا نکاح پیر سائیں سے ہوگا اور کل کی رات اس کے لیے شبِ عروسی ہوگی۔ پھر ایسی ہی ایک رات میرے لیے آئے گی۔۔۔ یا لائی جائے گی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کوئی خود اپنے پیروں میں زنجیر ڈالے یا کوئی اور۔۔۔ قید تو کہلاتی ہے۔

میری وہ پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ کچھ میرے اپنے ہی خیالوں کا انتشار تھا کچھ انتظار۔۔۔ میں نے فرض کر لیا تھا اور اس کو یقین بنا لیا تھا کہ آج کی رات فیصلہ کن ہے اور کل ریشم کے پیروں میں نکاح کی زنجیر بھی پڑ جائے گی تو گویا عمر قید شروع ہو جائے گی۔ ابھی تک نہ مجھے

سلونی کا بھائی نظر آیا تھا اور نہ کسی کا اشارہ ملا تھا کہ چلو۔۔۔ عمل کی گھڑی آگئی ہے۔

رات گزری اور صبح کے اجالے نے کھڑکیوں کے شیشوں پر دستک دی۔ میں نے پردے ہٹا کے دیکھا اور پھر دروازے کے باہر جھانکا۔ بظاہر کہیں بھی کوئی پہرے دار نہ تھا لیکن اس کا یہ مطلب نکالنا کہ میں جہاں چاہوں جا سکتا ہوں غلط تھا۔

سورج نہ جانے کہاں طلوع ہوا۔ میں نے توافق کو روشن ہوتا دیکھا اور آسمانوں میں پرواز کرتے آزاد پرندوں کو دیکھا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے پردے کو چھوڑ دیا۔ مرجان میرے سامنے دست بستہ حاضر ہوئی اور پیر سائیں کا پیغام دیا۔ ”آپ کا ناشتے پر انتظار ہو رہا ہے۔“ اور میری راہ نما بن کے آگے آگے چلنے لگی۔ پیر سائیں کی درگاہ کا رہائشی حصہ بھی اتنا چھوٹا نہ تھا جتنا محسوس ہوا۔ مجھے ایک اور اعزاز سے نوازا گیا تھا جو میرے خیال میں غلامی کی زنجیر کی ایک اور کڑی تھی۔ ایک دروازے سے داخل ہوتے ہی میں نے اس پوری فیملی کو دیکھا جس کا ایک فرد ہونے کا اعزاز زبردستی مجھے دے دیا گیا۔

ایک دسترخوان کے گرد جو قالین پر بچھا ہوا تھا، پیر سائیں بالکل سامنے دوزانو بیٹھے تھے۔ ان کے دائیں ہاتھ پر دونوں بیٹیاں تھیں اور بائیں طرف ان کی موجودہ اور آئندہ شریکِ حیات۔۔۔ ان سب کی نظر مجھ پر مرتکز تھی۔ خوش آمدید کہنے والی حقیقی مسکراہٹ صرف شاہینہ کے چہرے پر تھی۔ پیر سائیں کا چہرہ غرور اور عیاری کی فتح مند مسکراہٹ سے روشن تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے ریشم نے ایک آنکھ کو خفیف سا دبا کے مجھے کوئی خفیہ پیغام دیا ہے۔ پھر یہی اشارہ شاہینہ کی نظر نے بھی کیا۔ میں چپ چاپ دسترخوان کے دوسرے کنارے پر پیر سائیں کے روبرو بیٹھ گیا۔

”اب تم اس خاندان کے ایک رکن ہو۔ کھانا ہم سب ساتھ کھاتے ہیں، تم پر اندر آنے جانے کی کوئی پابندی نہیں۔ یہ تمہارا ہی گھر ہے۔“ پیر سائیں نے فرمایا۔

میں نے مصنوعی بشاشت کے ساتھ کہا۔ ”آپ کی عنایت ہے۔“

ریشم کی بشاشت نے مجھے حیران کیا۔ ”بھئی کچھ تو مسکراؤ۔۔۔ یہ کیا منہ لٹکائے بیٹھے ہو۔“

ہنسی میں اس کا ساتھ شاہینہ اور اس کی بہن نے دیا۔ پیر سائیں صرف شفقت سے مسکرائے۔ ان کی بیوی کے چہرے سے اداسی اور خفگی نہ گئی۔ میں اس پر حیران تھا کہ میں اور میرا اسسرا اپنی اپنی ہونے والی بیویوں کے رُوبرو تھے جو روایت کے خلاف تھا۔ یہاں تو اچھے خاصے تعلیم یافتہ اور روشن خیال سمجھے جانے والے بھی منگنی کے بعد لڑکے اور لڑکی کا پردہ کرا دیتے تھے، خواہ وہ بچپن کے ساتھی اور کزن ہی کیوں نہ ہوں۔ جبکہ پیر سائیں کے گھر میں سب کچھ اس کے برخلاف ہو رہا تھا۔

شاہینہ مصلحت کے تحت چپ تھی ورنہ اس کی آنکھیں بول رہی تھیں اور اس کے لب ہی نہیں آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں اور خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ روزینہ خوب چہک رہی تھی اور اپنی ہونے والی ہم عمر دوسری ماں سے وہ مذاق کر رہی تھی۔ اس کی ماں کے دل میں رقابت، حسد، غصے اور دکھ کی آگ بھڑک رہی تھی۔

مجھے ریشم کے ساتھ روزینہ کا رویّہ بھی عجیب اور اپنی توقعات کے برعکس لگا۔ میرا خیال تھا کہ ریشم بہت مغموم اور خفا ہوگی۔ اس زبردستی کے خلاف سراپا احتجاج نظر آئے گی۔ ایسا ہی روزینہ کا تھا۔ وہ ایسے ہنس بول رہی تھیں اور یوں مذاق کر رہی تھیں جیسے ان کو پیر سائیں سے نہ گلہ ہے نہ رنجش۔۔۔ کیا یہ اداکاری تھی؟ میں نے سوچا۔ ان دونوں کو مل کے پیر سائیں کی عزت کا جنازہ نکالنا تھا۔ قبل از وقت وہ پیر سائیں کو شک بھی نہیں ہونے دینا چاہتی تھیں کہ وہ کیا قیامت ڈھانے والی ہیں۔ کیا یہ بھی میری خوش فہمی تھی؟ میں نے سوچا۔

ناشتا ختم ہونے تک باہر سے ڈھول ڈھمکے کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ پیر صاحب نے معذرت کی۔ ”گرد و نواح سے مرید پہنچنے شروع ہو گئے ہیں۔ میں لباس بدل لوں۔“ وہ جاتے جاتے پلٹے اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”پتر سلیم! تم بھی تیار ہو جاؤ۔ تمہیں میرے ساتھ کچھ تقریبات میں شامل ہونا ہے۔“

انہوں نے پہلی بار ”پتر“ کہہ کے اپنی دانست میں غیریت کی ساری دیواریں ڈھا دی تھیں۔ مجھے سکھا دیا تھا کہ میری روحانی تربیت اور جانشینی کے مراحل آج ہی سے شروع ہو جائیں گے۔ پیر سائیں کی بیوی نمبر دو وہاں ان کے حکم کی تعمیل میں مجبوراً بیٹھی تھی۔ ان کے جاتے ہی وہ بھی اپنی ناراضی کے ساتھ واک آؤٹ کر گئی۔۔۔ شاہینہ نے بڑی شوخی سے مجھے آنکھ ماری اور شرم و حیا کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھ گئی۔

میں نے کہا۔ ”میں بھی چلتا ہوں۔“

روزینہ چہکی۔ ”ایسے کہاں دولہا بھائی! تمہیں تو سسر

محترم نے کچھ اور حکم دیا تھا۔“

پھر ریشم بولی۔ ”جایئے لباس فاخرہ بدلیے چھوٹے پیر سائیں۔“

”کون سا لباس فاخرہ؟“

”آؤ میرے ساتھ۔“ روزینہ نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ میں ایک کوریڈور سے گزرا جس میں قالین بچھا ہوا تھا اور ابھی تک چھت سے آویزاں چار فانوس روشن تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ کون سا بیڈروم کس کا ہے۔ آخری کمرا پیر سائیں کا تھا۔ ایک شان و شوکت والی خواب گاہ جس میں پچیس سال بعد پرانی اور ناکارہ ہو کے دل و نظر سے اتر جانے والی عورت کی جگہ نئی چمکتی دمکتی، پُرکشش جوان عورت قابض ہونے والی تھی۔

”اس الماری میں جو کپڑے ہیں، تمہیں بھی استعمال کرنا ہوں گے۔ یہ پیر سائیں کی روحانی وارڈروب ہے۔ جو اچھا لگے پہن لو۔۔۔ اس میں فٹنگ کا کوئی چکر نہیں۔۔۔ سب فٹ ہوں گے۔“

وہ جانے لگی تو میں نے کہا۔ ”ریشم کا کون سا کمرا ہے؟“

”ساتھ والا۔“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”شاہینہ کا کمرا نہیں پوچھو گے؟ وہ دوسری طرف ماتحت والے کمرے میں ہے۔“ وہ شوخی سے مسکرائی اور باہر چلی گئی۔

میرا دماغ چکرا گیا۔ یہ تو ثابت ہو گیا تھا کہ مجھے گھر کے داماد کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے بلکہ گھر داماد کی۔ ریشم کو بھی پیر سائیں کی زوجیت کا اعزاز حاصل ہونے والا تھا۔ اپنی یا ریشم کی مجبوری میں کوئی شک نہ تھا۔ عجیب بات ریشم کا رویّہ تھا۔ یہاں تو کسی کے رویّے سے ذرا بھی شک نہیں ہوتا تھا کہ کوئی ناخوش ہے۔ روزینہ نے مراد کے ساتھ اور ریشم نے میرے ساتھ فرار ہونے کا پروگرام فائنل کر لیا ہے۔ آج تو ریشم کا نکاح تھا، کسی فرمانبردار مولوی کو پیر سائیں کی خدمت میں حاضر ہو کے دو بول پڑھنے اور پڑھوانے تھے اور بس۔۔۔ مگر اس کے بعد کیا رہ جائے گا؟ ریشم ساری عمر کے لیے ان بولوں کی زنجیر نہیں توڑ سکے گی۔ میں مرد تھا۔۔۔ شاہینہ سے نکاح کے دو بول میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ کیونکہ طلاق کے تین بول اس رشتے کو ختم کرنے کے لیے کافی تھے۔ میں تو دس سیکنڈ میں رہائی حاصل کر سکتا تھا، ریشم ایک نکاح کے بعد دوسرا نکاح کیسے کر سکتی تھی؟

لباس بدل کے مجھے خود پر ہنسی بھی آئی۔ غصہ بھی اور شرم بھی۔ یہ میں کیا کر رہا تھا؟ کس شیطانی چکر میں پڑ کے خود

کو رسوا کر رہا تھا۔۔۔ اور یہ سب کرنے کے بعد بھی کیا میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا؟ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔

میں باہر نکلا تو ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور مجھے ریشم کا مسکراتا چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے مجھے اشارے سے بلایا اور دروازہ کھول کے پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے اس کے بیڈ روم کو دیکھا، بے شک وہ معزز مہمانوں کی طرح رہتی تھی۔ کسی قیدی کی طرح نہیں جسے جبراً اٹھا کے لایا گیا تھا۔

میں حیرت زدہ سا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''ریشم! کیا ہے یہ سب؟''

وہ میرے مقابل کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔ ''وہی جو نظر آ رہا ہے۔''

''مجھے یقین نہیں آتا۔ تم خوش ہو یہاں۔۔۔ اپنی خوشی سے کر رہی ہو پیر سائیں سے عقدِ ثانی۔۔۔ انور سے پیار۔۔۔''

اس نے برہمی سے میری بات کاٹ دی۔ ''مت لو اس کمینے کا نام میرے سامنے۔۔۔ دھوکے باز۔۔۔ اسے کیا معلوم پیار کیا ہوتا ہے۔۔۔ عورت جب کسی مرد کا ہاتھ تھامتی ہے تو سہارے کے لیے۔۔۔ تحفظ۔۔۔ رفاقت اور عزت کے لیے۔۔۔ کیا دیا اس نے مجھے؟''

''اور یہاں پیر سائیں سے تمہیں سب ملے گا؟''

''ملے گا کیا مطلب۔۔۔ مل چکا ہے۔''

''ریشم! ایک بات پوچھوں۔۔۔ تمہارے خیالات میں یہ تبدیلی کیسے آئی۔۔۔ کیا یہ بھی انجکشن اور دوائیں۔۔۔''

''بکواس مت کرو۔'' اس نے دوپٹا ٹھیک کیا اور مجھے آنکھ ماری۔۔۔ میں کنفیوز ہو گیا۔

''اس کا کیا مطلب ہے ریشم؟ میں نے کچھ اور سنا تھا۔''

اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''ٹھیک سنا تھا تم نے۔'' وہ نیچے سے کچھ اٹھانے کے لیے جھکی۔ ''یہاں کیمرے اور مائک لگے ہوئے ہیں۔''

''مجھے یقین نہیں آتا۔''

وہ سیدھی ہو کے اونچی آواز میں بولی۔ ''قصور تمہاری سمجھ کا ہے۔۔۔ آخر کیا سنا تھا تم نے؟''

''یہی۔۔۔ کہ آج تمہارا نکاح ہے۔''

''ہاں ہے۔۔۔ بلکہ تھا۔ میں نے پیر سائیں سے کہا کہ پہلے تمہارا نکاح ہوگا اور تمہاری گدی نشینی کا اعلان ہوگا۔۔۔ میری شرط یہی تھی۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ ''یعنی۔۔۔ تم نے مجبور کیا پیر سائیں کو؟''

''ہاں۔'' وہ زور سے بولی۔ ''کیا ہے بچے۔۔۔ پاؤں میں کوئی چیونٹی کاٹ رہی ہے؟'' وہ پھر نیچے جھکی اور سرگوشی میں بولی۔ ''تم تیار رہو۔ ہم آج ہی نکل جائیں گے شام تک۔'' وہ پھر سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔

اب ریشم کی سرگوشی کا مطلب میری سمجھ میں آنے لگا تھا۔ پہلی بار دوپٹا ٹھیک کرنے کے بہانے اس نے اپنا چہرہ کیمروں سے چھپا لیا تھا اور مجھے آنکھ ماری تھی تو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ نیچے جھک کر سرگوشی کا مقصد بھی کچھ اور نہ تھا۔ نہ کیمرا لب ہلتے دیکھے۔۔۔ نہ مائک تک آواز پہنچے۔۔۔ یہ بات میری سمجھ میں آتے ہی سب کچھ بدل گیا۔ گھڑی کی سوئی مخالف سمت میں چل پڑی۔ میری سمجھ میں سب آ گیا۔ ریشم کے ساتھ روزینہ اس کھیل میں شریک تھی جس کا مقصد ہی اپنے آس پاس سب کو بلف کرنا تھا۔ جو ظاہر تھا، وہ باطن کے بالکل برعکس تھا۔ شاید وہ اوور ایکٹنگ کر رہی تھی۔ صرف مجھے ایسا لگا تھا۔ پیر سائیں اور ان کے آس پاس وہ سب جو محافظ کا کردار ادا کر رہے تھے، ان کے اصل عزائم کا اندازہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اچانک وہ ہو جاتا جس کا کسی کو گمان بھی نہ تھا۔ ان کی حکمتِ عملی یہی تھی۔

زیادہ دیر تک ریشم کے کمرے میں رکنا بھی خلاف مصلحت تھا۔ ریشم بہتر جانتی تھی کہ کیمرے کی نگاہ میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ چار کیمرے بہ آسانی ہر پہلو سے پورے کمرے کی منظر کشی کر سکتے تھے جس سے کوئی بھی گوشہ نہ بچے۔ معلوم نہیں ریشم پر یہ راز کیسے کھلا تھا۔ گھر کے اندر کی پرائیویٹ گفتگو سننے اور تصاویر دیکھنے کی ذمے داری سیکیورٹی عملے کو نہیں دی جا سکتی تھی۔ بعد میں پیر سائیں خود یہ کارِ خیر کرتے ہوں گے۔ کس نے کیا کہا اور کیا حرکت کی۔

روزینہ اور شاہینہ کی حیثیت گھر کے بھیدی جیسی تھی۔ وہ تمام خفیہ کانوں اور آنکھوں کو دھوکا دے سکتی تھیں۔ جب میں کسی روک ٹوک کے احساس کے بغیر باہر جا رہا تھا تو یہ سوچ رہا تھا کہ آخر اپنے ہی گھر والوں کے خلاف جاسوسی کا ایسا نظام قائم کرنے کی ضرورت پیر سائیں کو کیوں محسوس ہوئی؟ کیا وہ اپنی بیوی یا بیٹی پر بھی بھروسا نہیں رکھتے تھے؟ شاید ایسا روزینہ اور مراد کی محبت کے حادثے کے بعد ہوا۔ ایک بار جو اعتماد کی غلطی سے ہوا دوبارہ نہ ہو۔ پیر سائیں کی

عقابی نظر اور آوازِ غیب سن لینے والے کانوں کی دہشت قائم رہے۔

اب مجھے ہر لحظہ یہ خیال تھا کہ میری نقل و حرکت بھی کسی کیمرے کی نظر میں ہوگی۔ شاید مہمان خانے میں جاسوسی کی ضرورت نہ تھی چنانچہ وزیراں نے جو کچھ مجھ سے کہا، سنا نہیں گیا۔ جو اس نے کیا اس کی اجازت تھی۔ وہ غالباً صرف شک و شبہے کی وجہ سے سزا کاٹ رہی تھی۔ میری عقل حیران تھی کہ اس سخت گیر نظام کی موجودگی میں روزینہ اور ریشم نے فرار کا منصوبہ کیسے بنا لیا؟ اگر واقعی مراد زندہ تھا تو دوسری موت سے خود کو کیسے بچائے گا؟ شاہینہ سمجھا چکی تھی کہ میں اس قید سے نکل جاؤں تب بھی بالآخر میرا واپس لایا جانا یقینی ہے۔ میں زمین کے نیچے چلا جاؤں یا آسمان سے اوپر۔۔۔ اس کے بغیر میرا چھپ کر رہنا ناممکن ہوگا۔ جلد یا بدیر میرا سراغ لگا لیا جائے گا۔ شاید وہ مجھے ڈرا رہی تھی۔ اتنی بڑی دنیا میں کون کہاں ملتا ہے جہاں چھ ارب انسان سیکڑوں شہروں اور لاکھوں قصبوں میں بستے ہیں۔

باہر نکل کے میں نے کھلے آسمان کو دیکھا اور ایک نئی تازگی اور نئے حوصلے کو جسم میں اترتا محسوس کیا۔ میرے سامنے درگاہ کا طویل و عریض چبوترا تھا جس پر ٹائل چمک رہے تھے۔ سارے ٹائلز سبز رنگ کے تھے۔

عقیدت مندوں کی دیوانگی آج بھی وہی تھی جو پیر سائیں کے مرنے کے بعد ہوگی۔ نذرانے چڑھانے والے چادر کے علاوہ دروازے کے پاس رکھے کنگ سائز مقفل فولادی صندوق میں بھی اپنی حیثیت سے بڑھ کر نقد اور سونے کے زیور ڈال رہے تھے۔

اچانک میں نے ہر نظر کو اپنی جانب اٹھتا ہوا محسوس کیا۔ وجہ فوراً ہی میری سمجھ میں بھی آ گئی۔ وہاں بہت سے محافظ مریدوں اور مراد پانے والوں کے۔۔۔ بے ہنگم ہجوم کو کنٹرول کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ کوئی مجھ سے سوال کرتا، ایک دروازے سے پیر سائیں نے اندر قدم رنجہ فرمایا۔ ان کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے مریدِ خاص تھے جنہوں نے ان کو ایک حفاظتی حصار میں لے رکھا تھا۔

ایک نعرہ جو وہاں ہر طرف سنائی دے رہا تھا، میری سمجھ میں صرف ''سائیں'' آتا تھا۔

پیر سائیں سیدھے میری طرف آئے۔ مریدوں اور محافظوں کے سامنے انہوں نے مجھے گلے لگایا تو یہ سب کے لیے ایک غیر متوقع منظر تھا۔ میرے شانوں کے گرد اپنے بازو حمائل کیے۔ وہ مجھے ایک شاہانہ طور پر آراستہ تخت کی طرف لے گئے جو درگاہ کے آخری عقبی حصے میں اس جگہ کے پیچھے تھا جو فی الحال ایک خالی مرقد تھا۔۔۔ اس کے تین طرف کٹہرا سا تھا جس کی جالی سنہرے رنگ کی تھی یا سونے کی۔۔۔ یہ اندازہ کرنا میرے لیے مشکل تھا۔ تختِ شاہی شاید دس فٹ لمبا چوڑا ہوگا۔ بالکل پیچھے سنہری قالین پر سبز مخمل کے دو گاؤ تکیے ہمارے منتظر تھے۔ مگر اس سے پہلے کہ ہم تکیوں کے سہارے پر تشریف فرما ہوتے، پیر سائیں نے مجھے عین درمیان اپنے مقابل بٹھا لیا۔

آنکھیں بند کر کے اور جھومتے ہوئے انہوں نے کچھ پڑھنا شروع کیا۔ وقفے وقفے سے وہ حق اللہ کی صدا بلند کرتے تھے اور آنکھیں کھول کر مجھ پر کچھ پھونکتے تھے۔ چاروں طرف مؤدب محافظ اپنے پیچھے موجود بے ہنگم ہجوم کو خاموش رکھنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے لیکن نہ وہ حیران تھے اور نہ ان کی آنکھوں میں کوئی سوال تھا۔ وہ جانتے تھے کیونکہ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ انہوں نے اپنے لیے گدی نشیں کا انتخاب کر لیا ہے۔۔۔ یہ سب ڈراما اسی طرح ہونا تھا۔ صحیح وقت پر ایک مرید سبز غلاف والی چاندی کی تھالی میں دستار کے ساتھ نمودار ہوا۔ جو دستارِ فضیلت پیر سائیں کے سر پر تھی، وہ سفید تھی۔ میرا لباس ان کے لباس کی طرح سفید ہی تھا لیکن میرے سر کے لیے سبز دستار کا انتخاب ہوا تھا۔ یہ سب درجہ بندیاں ایک ڈسپلن اور الگ الگ درجات کی نشاندہی کا ذریعہ تھیں۔ پیر سائیں نے کھڑے ہو کر دستار کو میرے سر پر رکھا۔ اس کے ساتھ ہی نعرے بلند ہوئے۔ پھر میں ان کے ساتھ دائیں ہاتھ پر بیٹھ گیا۔

اب سامنے سے مریدوں نے آنا شروع کیا۔ وہ دائیں طرف کے ایک دروازے جیسے حصے میں تین سیڑھیاں چڑھ کے داخل ہوتے تھے اور پیر سائیں کے قدموں میں گھٹنوں کے بل جھک کر ان کے ہاتھ چومتے تھے۔۔۔ میرے لیے سرکاری اعلان کوئی نہیں ہوا تھا لیکن دیکھنے والے سمجھ گئے تھے کہ میرا رتبہ اور مقام کیا ہے۔۔۔ وہ میرے ہاتھ بھی چومنے لگے۔ سخت بیزاری کے باوجود میں اس رسم کو نبھانے پر مجبور تھا۔ یہ سلسلہ شاید دو گھنٹے چلا۔ باہر اب شور بڑھ گیا تھا۔ ڈھول پیٹے جا رہے تھے اور گھنگروؤں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ دروازے سے چادر چڑھانے والوں کے غول ناچتے گاتے اندر آتے تھے اور وہاں کی رسم سے فارغ ہو کے قدم بوسی کے لیے پیچھے حاضر ہو جاتے تھے۔

اچانک میرے سامنے ایسے ہی دیہاتی لوگوں کا ایک

گروپ آیا جو سب کی طرح سائیں سائیں چلا رہے تھے۔ اس میں نوجوان بوڑھے سب شامل تھے۔ جب وہ پیر سائیں کی قدم بوسی کے بعد میری طرف جھکے تو ان میں سے ایک نے جیسے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''ملک صاحب! ریڈی۔۔۔'' میں نے نہ چونکنے کی پوری کوشش کی لیکن خود کو نہ روک سکا۔ تاہم پیر سائیں کی نظر نے میرا چونکنا نہیں دیکھا۔ مجھ سے دو لفظ کہنے والا کوئی دیہاتی جوان تھا۔

وہ پلٹ کے غائب ہو چکا تھا جب مجھے یاد آ گیا کہ وہ رنگیلا تھا۔ اسے دیکھے زمانہ ہو گیا تھا اور میرے سامنے آج وہ بالکل مختلف روپ میں آیا تھا اس لیے میں فوراً نہ پہچان سکا تھا۔ ایک دم میرے وجود میں سنسنی سی پھیل گئی۔ اب تک جو واہمہ تھا، وہ حقیقت ثابت ہو رہا تھا۔

عورتوں کا ایک غول قدم بوسی کے لیے اوپر چڑھا۔ یہاں وہ پردہ رائج نہیں تھا جو ضرورت یا فیشن کے طور پر شہروں میں عام ہے یہاں عورتیں صبح سے شام تک گھر اور باہر کے سارے کام کرتی تھیں۔

اچانک سلونی سامنے آ گئی۔ میں نے خود کو بڑی مشکل سے قابو میں رکھا۔ اس نے اپنا روپ بدلا ہوا تھا۔ وہ میلے کچیلے مزدور یا جفاکش عورت جیسے کپڑوں میں تھی۔ اس نے بالوں کو بھی دوپٹے کے اندر باندھ رکھا تھا اور چہرے پر نہ جانے کیا تھوپا تھا کہ اس کا اجلا رنگ سیاہی مائل سانولا ہو گیا تھا۔ اس نے ناک میں چاندی کی بہت بڑی نتھ پہن رکھی تھی اور کالے بازوؤں پر پلاسٹک کی رنگ برنگی چوڑیاں۔ جب اس نے میرے پیروں کو جھک کر ہاتھ لگایا تو مجھے آنکھ ماری اور صاف کہا کہ ملک صاحب۔۔۔ آج نکلنا ہے۔۔۔ اس سرگوشی کو وہاں کے شور میں کون سن سکتا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ نکل گئی۔ میں ہکا بکا بیٹھا رہا کہ انتظامات تو مکمل نظر آتے ہیں لیکن امکانات معدوم۔۔۔ اس بھرے میلے میں سب کی نظریں بچا کے ہم فرار ہونے کا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں؟

منتظمین نے اب لنگر کی تیاری شروع کر دی تھی۔ کھلے میدان میں جگہ جگہ دیگ کے لیے گڑھے کھود کر لکڑیاں جلائی جا رہی تھیں۔ نہ جانے کون ثواب میں شریک ہونے کے لیے بڑے بڑے ڈرم گدھا گاڑیوں پر رکھ کے لاتے تھے۔ ان میں دودھ کا شربت تھا جس کو گڑ سے میٹھا کیا گیا تھا۔ درگاہ کے منتظم ہر ڈرم میں سردائی ڈالتے جا رہے تھے۔ یہ چہار مغز بھنگ اور نہ جانے کس کس چیز کا مرکب تھا جو بڑی بڑی کونڈیوں میں گھوٹا جا رہا تھا۔ یقیناً یہ نشہ آور شراب تھی جو شراب جیسی تند تو نہ تھی مگر خمار ضرور پیدا کرتی تھی۔ اس سے مریدوں کی مستی اور خود فراموشی بڑھ جاتی تھی۔

اچانک پیچھے سے کسی نے آ کے پیر سائیں کے کان میں کچھ کہا۔ پیر سائیں نے سر ہلایا اور میری طرف دیکھ کے فرمایا۔ ''برخوردار سلیم! تم کو ریشم نے یاد کیا ہے۔''

میں نے امید کی سنسنی محسوس کی۔ ابھی نماز ظہر تک دو گھنٹے تھے۔ اس دوران میں پیر سائیں کو اسی کاروبار میں مصروف رہنا تھا۔ اس میں ان کا دل کیسے نہ لگتا۔ فی گھنٹا ہزاروں لاکھوں نقد بھی آ رہے تھے اور زیور کی صورت میں بھی۔ آمدنی عام دنوں کے مقابلے میں کئی سو گنا ہو رہی تھی۔

میں پیچھے سے نکلا اور اندر پہنچ گیا۔ یہ راستہ ایک دروازے تک جاتا تھا جو ہر وقت اندر سے بند رہتا تھا۔ محافظ ہاتھوں میں بندوق تھامے اندر باہر موجود رہتے تھے۔ وہ صورت سے ہی سفاک اور خونخوار نظر آتے تھے۔

باہر کے محافظ نے سینے پر ہاتھ رکھ کے سر جھکایا اور دروازہ کھل گیا۔ اندر کے محافظ نے بھی ایسی ہی سلامی پیش کی۔ پیر سائیں کی رہائش گاہ کا نقشہ اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس کا مہمان خانہ اوپر تھا جس میں پہلے میرا قیام رہا تھا۔ ذاتی رہائش گاہ نیچے تھی۔ چھت میں تقریباً دس فٹ اوپر روشن دان تھے۔ ان سے دھوپ کی روشنی زیادہ آتی تھی۔ ہر کمرے کے کسی ایک روشن دان میں اندر کی ہوا کو باہر پھینکنے والا پنکھا تھا چنانچہ نیچے کسی قسم کی تاریکی یا گھٹن محسوس نہیں ہوتی تھی۔ باہر نکلنے کا ایک راستہ میں نے ابھی استعمال کیا تھا۔ اگر دیگر راستے موجود تھے تو مجھے نظر نہیں آئے تھے۔

میرے سامنے ہی ایک خادمہ جگ بھر کے وہ ٹھنڈائی لائی جو اس وقت عوام و خواص سب پی رہے تھے۔ چہار مغز، بادام پستے اور دیگر میوا جات کے علاوہ اس کا جزو خاص بھنگ تھی۔

گھر کے اندر متعدد خادمائیں تھیں۔ کسی ملازم کو اندر قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ میں اپنی دھن اور اپنے خیالات کے گرداب میں غوطہ زن سیدھا ریشم کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک کسی نے میرا راستہ روک لیا۔ یہ وزیراں تھی۔ میں اسے دیکھ کر دکھ اور شرمندگی کے شاک سے پتھر کا بت بن گیا۔ جو عورت میرے سامنے کھڑی تھی نمونۂ عبرت تھی۔ اس کا سر ہی نہیں پلکیں اور بھویں تک صاف تھیں۔ وہ عجیب ڈراؤنی چیز لگ رہی تھی۔ مزید یہ کہ ٹاٹ کی ایک بوری درمیان میں سوراخ کر کے اس کے گلے

میں پہنا دی گئی تھی۔ بوری کے سائڈ کے دو سوراخوں میں سے اس کے ڈنڈے جیسے بازو باہر نکلے ہوئے تھے۔

''کیا دیکھ رہے ہو ملک صاحب! کیسی لگ رہی ہوں میں؟'' وہ تلخی سے بولی۔

میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ ''آئی ایم سوری!''

''کیا؟ یہ جملہ بہت لوگ بولتے ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے نا کہ مجھے افسوس ہے۔ افسوس کیا تمہیں۔۔۔ افسوس تو مجھے ہے کہ تمہاری باتوں میں آ گئی اور اب ساری عمر اس کی سزا کاٹوں گی۔ یہی میرا پہناوا ہو گا۔ سردی گرمی۔''

میں نے کہا۔ ''میں پیر سائیں سے بات کروں گا۔'' میں نے کہا اور کنی کترا کے نکل گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ظلم کا شکار ہونے والی اس عورت کے لیے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس کی زندگی ایسے ہی گزرنی تھی۔

ریشم کے کمرے کا نقشہ دیکھ کر میں وزیراں کو ایک دم بھول گیا۔ وہ ایک سفید برقع ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ ''لو۔۔۔ یہ تمہارا ہے۔''

''میرا برقع۔'' میں نے حیرانی سے سوال کیا مگر برقع لے لیا۔

''بس زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا ہے۔''

''آدھے گھنٹے بعد کیا ہو گا؟''

''ہم نکل جائیں گے۔۔۔ سب کچھ ہمارے پلان کے مطابق جا رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پلان تو ٹھیک ہے لیکن اندر باہر اتنے لوگ ہیں۔۔۔ ہر طرف۔''

''یہی تو فائدہ ہے۔''

''اور یہ جو قدم قدم پر محافظ اسلحہ لیے کھڑے ہیں؟''

ریشم مسکرائی۔ ''ابھی کچھ دیر میں سب لیٹ جائیں گے۔ ان کو سردائی میں نیند کی دوا ڈال کے دی گئی ہے۔''

''نیند کی دوا کہاں سے آئی؟''

''روزینہ نے لا کر دی۔ اپنے باپ کے کمرے سے۔۔۔ وہاں ہر قسم کی دوائیں ہیں۔''

''اوہ۔'' میں نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا۔ باپ سے صرف بڑی بیٹی نے ہی نہیں سیکھا، چھوٹی نے بھی ڈاکٹری پڑھ لی ہے۔ یہ برقع تو چھوٹا ہے۔''

''اس سے لمبی عورت نہیں ملی۔ ٹخنوں تک کافی ہے۔ ذرا جھک کے چلنا۔'' ریشم نے باہر جھانکا۔

''باقی لوگ کہاں ہیں؟ شاہینہ، اس کی ماں؟''

''وہ سو چکے ہیں۔'' ریشم نروس اور ٹینس ہونے کے باوجود مسکرائی۔ ''ابھی دو گھنٹے کی نیند پکی ہے۔ ظہر کی نماز پڑھ کے ہی پیر سائیں تشریف لائیں گے۔ تب تک ہم بہت دور نکل جائیں گے انشاءاللہ۔''

''مگر کیسے ریشم؟''

''تم دیکھتے جاؤ۔۔۔ روزینہ غائب ہے اور کسی کو معلوم نہیں۔''

''مگر ہم جائیں گے کہاں؟''

''فضول سوال مت کرو، پہلے یہاں سے تو نکلیں۔ اللہ کی دنیا بہت بڑی ہے۔ چلو برقع پہن کے دکھاؤ۔''

میں نے تعمیل کی۔ اب سارا پلان رفتہ رفتہ میری سمجھ میں آنے لگا تھا۔ اندر سے نکلنے کی صورت روزینہ نے پیدا کی تھی۔ اس نے سب راستہ روکنے والوں کو خوابِ غفلت میں پہنچا دیا تھا۔ باہر نکلنے کے لیے واقعی یہ سب سے موزوں وقت تھا۔ معلوم نہیں مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا تھا۔ باہر ہم جیسے بہت تھے، ہم بہ آسانی ان میں شامل ہو سکتے تھے۔ کون کدھر سے آیا تھا اور کدھر جا رہا ہے اس کا نوٹس کون لے گا۔ باہر سے مدد کرنے والوں میں تین افراد کا کردار اہم تھا۔ ایک مراد کا جو دوسری بار جان کی بازی لگا رہا تھا۔ دوسری سلونی اور تیسرا اس کا دائمی پرستار مشتاق احمد دیوانہ عرف رنگیلا۔۔۔

ریشم مجھ سے پہلے یہاں لائی گئی تھی اور اسے گھومنے پھرنے کی زیادہ آزادی حاصل تھی۔ عورت کا حسن و شباب عام حالات میں مرد کے جسم کی طلب سے زیادہ کچھ نہیں بنتا مگر وہی عورت اگر دماغ سے بھی کام لے تو اس طلب کو مرد کی مجبوری اور معذوری بنا کے اس کے ذہن کو بھی تابع بنا سکتی ہے۔ جیسا کہ ریشم نے انور کے ساتھ نہیں کیا تھا مگر پیر سائیں کے ساتھ بڑی ہوشیاری سے کیا تھا۔ انور خود اس کی کمزوری تھا اور معاملہ محبت کا ہو تو ہر عورت کی جذباتی کمزوری بنتا ہے۔ پیر سائیں کی بھٹکتی نظر اور بدلتی نیت کو اس نے فوراً محسوس کر لیا ہو گا۔ یہ ایک حیرت انگیز لیکن عام مشاہدہ ہے۔۔۔ عورت کی کوئی چھٹی حس اسے خبردار کر دیتی ہے کہ اس پر کسی کی نظر پڑ رہی ہے۔ اس نظر کا پیغام ہمیشہ ایک ہی رہتا ہے۔

ریشم راستوں سے واقف تھی۔ دو جگہ مجھے گھر کے ملازم انٹا غفیل ملے۔ ایک خادمہ کچن کے اندر فرش پر پڑی تھی۔ دوسری دروازے کے باہر۔۔۔ ریشم نے دو کمروں میں جھانک کے دیکھا اور سر ہلا کے اطمینان کا اظہار کیا۔ یہ

شاہینہ کے اور اس کی ماں کے کمرے تھے۔ وہ بھی نیند یا بے ہوشی میں تھیں۔ مجھے بڑی کمینی سی خوشی ہوئی کہ اپنے باپ کی شیطانی سائنس کی ماہر جو مجھے نفرت کرنے والے انسان سے محبت کرنے والا روبوٹ بنانا چاہتی تھی خود اس کا شکار ہوئی۔ لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔

اوپر جانے والا دوسرا راستہ کچن سے گزرتا تھا۔ یہ ایک طرح سے چور دروازہ تھا۔ چور دروازے چوروں کے لیے نہیں بادشاہوں کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ پیر سائیں کو ایسا برا وقت آنے کی امید کہاں ہوگی۔ شاید یہ چور دروازہ چوری چھپے ان کو خواب گاہ تک لانے لے جانے کے لیے استعمال ہوتا ہوگا۔ آج یہ ہم چوروں کی طرح نکل بھاگنے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔

اوپر اچانک میرا مقابلہ ایک محافظ سے ہوگیا۔ یہ پہلے دروازے کے محافظوں جیسا لمبا تڑنگا۔۔۔ باریش اور سفاک ہونے کے ساتھ مسلح بھی تھا۔ وہ پوری طرح مستعد اور ہوش وحواس میں تھا۔ ریشم آگے تھی۔ ایک موڑ کاٹتے ہی مجھے زینہ نظر آیا اور اس سے پہلے وہ محافظ جس نے بے وقوف ہونے کے باوجود خطرے کو دیکھ یا محسوس کرلیا تھا۔

"رک جاؤ۔۔۔ کون ہو تم؟" اس نے غرا کے کہا اور اپنی بندوق کا رخ ہماری طرف کرلیا۔

اس وقت ریشم نے بڑی عقل مندی سے اس کی توجہ ہٹا دی۔ اس نے نقاب اٹھا کے کہا۔ "پاگل ہوگئے ہو تم۔۔۔ گھر والوں پر بندوق تان رہے ہو۔"

ذرا سی دیر کے لیے وہ کنفیوز ہوا مگر پھر سنبھل گیا۔ "یہ باقی کون ہیں چھوٹی بیگم صاحب۔۔۔ ان سے کہیں اپنے چہرے دکھائیں۔"

میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ میں برقع سمیت اس کے اوپر جا گرا اور اسے یوں لپیٹ لیا جیسے مکڑی اپنے جالے میں شکار کو بے بس کرتی ہے۔ میری ساری کوشش یہ تھی کہ وہ فائر نہ کر پائے ورنہ آواز باہر بھی جائے گی اور باہر کھڑا ہوا دوسرا محافظ بھی مستعد ہوا تو راستہ نہیں دے گا۔ وہ نیچے گرا تو میرے ایک گھٹنے سے اس کی گن دبی رہی۔ دوسرے ہاتھ کی کہنی مار کے میں نے اس کا جبڑا توڑا۔ وہ بلبلایا ہی تھا کہ میں نے اس کا سر برقع کے دامن میں لپیٹ کر زور سے زمین پر مارا۔ میرا برقع پہن کے لڑنے کا سابقہ تجربہ کوئی نہ تھا۔

جب حریف ساکت ہوگیا تو میں نے غور سے دیکھا کہ کہیں وہ دو منٹ بعد ہی تو کھڑا نہیں ہو جائے گا لیکن اس کی حالت بتاتی تھی کہ وہ کافی دیر بےسدھ پڑا رہے گا۔ ایسی حالت میں اس کو مزید بے ہوش کرنے کی کوشش کرتا تو وہ پھر کبھی نہ اٹھتا۔

اتنی دیر میں ریشم نے اس کی بے خوابی کا سبب دریافت کرلیا تھا۔ جو روحانی کمپچر اسے بھی بھیجا گیا تھا، وہ تا حال ایک بڑے گلاس میں اپنی جگہ رکھا ہوا تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ اس مشروب کو پینے سے کچھ نشہ محسوس ہوتا ہے یا وجہ کوئی اور تھی کہ اس کا گلاس وہیں بھرا رکھا تھا۔ بدبخت پی لیتا تو آرام سے لیٹا ہوتا۔ یوں مار کھا کے نہ لیٹتا۔ باقی عقیدت مند کیسے چین کی نیند سو رہے تھے۔

میں نے ہی اس فرض شناس کی جیب میں سے اندر کی طرف لگنے والی چابی نکالی۔ ایک دروازے کے لاک میں چابی دونوں طرف سے لگتی تھی۔ اس قفل کو یوں نہیں کھولا جا سکتا تھا کہ آہٹ بھی نہ ہو۔ لیکن صرف دروازہ کھلنے کی آواز سے باہر کا محافظ چوکنا نہیں ہوسکتا تھا۔ ایسا تو ہوتا تھا۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ دروازہ کھولنے پر وہ مجھے لیٹا ہوا نظر آیا ورنہ میں اسے برقع کے اندر کھینچ کر سلاتا۔ وہ اندر والے محافظ جیسا فرض شناس نہیں تھا اور اس نے ایک نہیں دو گلاس اپنے مٹکے جیسے پیٹ میں انڈیلے تھے۔ میں نے اسے بھی کھینچ کر اندر ڈالا اور پھر دونوں کی چابیاں اپنے قبضے میں کرلیں۔

چند قدم چلنے کے بعد مجھے ایک کنواں دکھائی دیا جو استعمال میں نہ تھا۔ دونوں چابیاں میں نے اس میں اچھال دیں۔ یہ درگاہ کے گرد پھیلا ہوا باغ تھا جس میں پیڑ لگائے جا رہے تھے۔ زیادہ تر پیڑ قد آدم ہوگئے تھے۔ اگلے چند سالوں میں درگاہ کے گرد گھنا جنگل بنتا نظر آ رہا تھا۔ باغ میں تھوڑے فاصلے پر کوئی بوڑھا مالی آبیاری کر رہا تھا مگر اس کو پانی کسی ٹیوب ویل سے مل رہا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کے ہم تینوں کو دیکھا اور کوئی اہمیت نہ دی۔

ہم چکر لگا کے اس طرف آ گئے جہاں سے بہت کم مرید آ رہے تھے، ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اکثریت سامنے سے آنا پسند کرتی تھی۔ ریشم کے مقابلے میں روزینہ زیادہ نروس تھی اور اسے روکا نہ جاتا تو وہ بھاگنے لگتی۔ ریشم حوصلے سے کام لینے کی تلقین میں لگی ہوئی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی۔ "اللہ پر بھروسا رکھو۔" بالآخر ہم اس ریلے میں شامل ہو گئے جو درگاہ کی طرف آ رہا تھا۔ ریلا اب صبح کے مقابلے میں سمٹ گیا تھا جیسے برسات کا دریا برسات کے بعد سمٹ کے نالا بن جائے۔ درگاہ پر ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔ فارغ ہو کے واپسی اختیار کرنے والوں کی تعداد ابھی بہت کم تھی مگر

پکی سڑک کا فاصلہ جیسے پل صراط کا راستہ بن گیا تھا۔

کچا راستہ جو پہلے پیدل چلنے والوں کے قدموں نے تنگ سی پگڈنڈی کی صورت میں تراشا ہوگا۔ ایک کچی سڑک بن گیا تھا جس پر سائیکلوں سے زیادہ تانگے وغیرہ آ جا رہے تھے۔

میں نے اپنی رفتار کم رکھی تھی۔ کچھ برقع نے بھی مجبور کر رکھا تھا، کچھ مجھے دونوں لڑکیوں کا خیال تھا۔ ہم سڑک سے ہٹ کر چل رہے تھے جہاں درخت کم تھے جھاڑیاں زیادہ۔۔۔ میں آگے تھا اور ناک کی سیدھ میں جا رہا تھا۔ پھر پیچھے سے ریشم کی آواز آئی اور میں نے مڑ کے دیکھا۔ وہ مجھے درختوں کے درمیان ایک چھوٹی سی کچی پگڈنڈی پر آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ میں پلٹ کے پیچھے گیا۔

"یہ ہم کہاں جا رہے ہیں آخر؟" میں نے کہا۔

"خود مجھے نہیں معلوم تو تمہیں کیا بتاؤں۔" ریشم بولی۔

روزینہ نے کہا۔ "بس تھوڑی دور جانا ہے۔"

"مجھے تو پیاس لگ رہی ہے۔" ریشم بولی۔

"یہاں تو پانی کہیں بھی نہیں ہے۔" روزینہ بولی۔ "چلتی رہو صبر سے۔"

"اب تک پیر سائیں کو پتا چل گیا ہوگا۔"

روزینہ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "اب پیچھے کیا ہوتا ہے۔ واپسی کے لیے مت سوچو۔۔۔ آگے کی فکر کرو۔۔۔ کیا ہوگا کیا نہیں، یہ ہم بہت فکر کر چکے اب۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔ اچھی بات یہ ہے کہ ہم نے جو سوچا تھا، سب اسی طرح ہوا۔ کہیں معمولی سی بات غلط ہو جاتی۔۔۔"

وہ بولی۔ "ہوئی تو تھی۔ سلیم نے نمٹ لیا اس سے۔۔۔ ہم کیا کرتے؟"

میں نے کہا۔ "داد دیتا ہوں میں تمہاری پلاننگ کی اور ہمت کی۔۔۔ کسی بھی مرحلے میں بھانڈا پھوٹ سکتا تھا لیکن تم دونوں نے وہ کمال کیا جس کی تم سے امید نہ تھی۔۔۔ کم سے کم میرا یہی خیال تھا کہ لڑکیوں کے پاس ایسی منصوبہ بندی کی عقل ذرا کم ہوتی ہے۔"

"عورتیں سب کچھ کرسکتی ہیں۔ تم مرد کرنے نہیں دیتے۔ مجھے معلوم ہے عورتیں جہاز اڑا رہی ہیں اور پہاڑوں پر جھنڈے گاڑ رہی ہیں۔" ریشم بولی۔

میں نے ٹینشن کم کرنے کے لیے ہنس کر کہا۔ "ہاں مگر کاکروچ آ جائے جہاز میں تو چیخ مار سکتی ہیں۔۔۔ کاکروچ کو نہیں۔ اور پہاڑ کے راستے میں چھپکلی مل جائے تو وہیں سے واپس دوڑیں گی۔"

ریشم خفگی سے بولی۔ "کوئی نہیں۔۔۔ تم ہمیں بدنام کرتے ہو۔"

"ایمان داری کی بات یہ ہے کہ تم نے کمال کردیا۔ تمہیں جو کرنا تھا اس کا الٹ ظاہر کرتی رہیں۔۔۔ پیر سائیں کو دھوکے میں رکھا آخر وقت تک۔۔۔ اور بڑے صحیح وقت کا انتخاب کیا۔"

اچانک ہمارے سامنے ایک کچا سا احاطہ آ گیا۔ مشکل سے چند گز چوڑا اور لمبا۔۔۔ اینٹوں کے چار ستونوں پر قائم چھت گر چکی تھی مگر آدھے ادھورے ستون کھڑے تھے۔ گھاس پھوس کی چھت کے ملبے میں کنوئیں کی منڈیر نظر نہیں آتی تھی۔ روزینہ کے اشارے پر میں نے آگے بڑھ کے دیکھا تو مجھے اندازہ ہوگیا۔ یہاں چاروں طرف جھاڑیاں تھیں اور وہ پگڈنڈی جس پر چل کے ہم آئے تھے چند گز دور ہونے کے باوجود یہاں سے نظر نہیں آتی تھی۔

روزینہ اور پھر ریشم نے برقعے اتار کے ہاتھ میں سنبھال لیے۔ یہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔۔۔ شاید سفید برقعے درختوں اور جھاڑیوں میں زیادہ نمایاں ہوتے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے روزینہ کی طرف دیکھا۔ "اب کیا کرنا ہے؟"

"یہ گھاس پھوس ہٹاؤ۔" روزینہ نے کہا۔

میں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا منزل مراد اس ملبے میں ہے مگر اس خیال سے خاموش رہا کہ روزینہ برا نہ مان جائے۔ اس ملبے کو ہٹانا آسان نہ تھا۔ گھاس پھوس کی چھت کا وزن کم ہوگا مگر فریم میں سرکنڈے، بانس کے ٹکڑے اور خشک ہو جانے والی ٹہنیاں بھی استعمال کی گئی تھیں۔ جو گھاس اس فریم کے ساتھ باندھی گئی تھی، وہ بھی کانٹوں جیسی ہوگئی تھی اور مسلسل دھوپ اور بارش میں سیاہ پڑ گئی تھی۔ میں نے احتیاط سے اس کو کھینچا اور اس کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو الگ کرنے لگا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ یہ خس وخاشاک کی چھت گری نہیں، گرائی گئی ہے۔ اس کے ٹکڑے ایک دوسرے کے اوپر رکھے گئے تھے۔

آخری ٹکڑا ہٹانے تک میرے ہاتھوں اور کلائیوں سے کہنی تک خراشیں آئیں۔ رفتہ رفتہ وہ سارا ڈھیر الگ ہوگیا۔ تب میں نے زمین کی گہرائی میں اترتا غار دیکھا۔ اس کی چوڑائی کنوئیں کے قطر کے برابر نہیں تھی۔ یہ کسی دھنسی ہوئی قبر کا دہانہ لگتا تھا۔ میں نے اندر جھانکا تو کنوئیں کی

گہرائی کی طرف اندھیرے میں گم ہونے والی سیڑھی دکھائی دی۔

میں نے پھر روزینہ کی طرف دیکھا۔ ”کیا ہم اس اندھیرے غار میں اتریں گے۔۔۔ یا یہ اندھا کنواں ہے؟“

روزینہ نے مجھے ایک ٹارچ تھمادی جو اس کے بیگ میں تھی۔ یہ بیگ ابھی تک برقع کی وسعت میں گم تھا۔ ٹارچ کا بٹن دبا کے میں نے روشنی کا رخ نیچے کیا تو مجھے ایک گہرے تاریک خلا کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ یہ تقریباً آٹھ فٹ قطر کی گہرائی تھی جس کی تہ میں روشنی گم ہورہی تھی۔ نہ جانے کتنی دہائیوں یا شاید صدیوں سے استعمال ہونے والے کنوئیں میں پانی نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو اوپر سے پڑنے والی ٹارچ کی لائٹ اس میں منعکس ہوکے چمکتی۔۔۔ اوپر والے حصے کی گولائی میں سے آس پاس کے درختوں کی جڑیں نکلی ہوئی تھیں اور کچھ کو روشنی اور ہوا ملی تھی تو ان میں پتے پھوٹ گئے تھے۔ باقی خشک جنگلی گھاس تھی۔

کنوئیں کا جائزہ لینے کے بعد میں نے پلٹ کے روزینہ کی جانب دیکھا۔ ”کیا مجھ سے توقع کی جارہی ہے کہ میں اس غار میں اتروں؟“

تو دونوں نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ ”تمہیں ساتھ لانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا۔“

”اگر دیگر مقاصد کی وضاحت بھی کردی جاتی۔۔۔“

”وہ کردیں گے مناسب وقت پر۔۔۔ دیکھو یہاں کہیں رسی بھی ملے گی۔“ ریشم نے ہاتھ سے کسی خاص سمت میں اشارہ کیا۔

”اگر تمہیں معلوم ہے تو اٹھالاؤ۔“ میں نے کہا۔

”ڈر رہے ہو نامرد ہوکے بھی۔۔۔ یہ سوچو ہم دو لڑکیاں اگر اکیلی گئیں اور مل گیا کوئی شیر آگے سے۔۔۔“

”وہ اتنا لذیذ گوشت کھا کے یقیناً خوش ہوگا۔ مگر اب تم نے مرد ہونے کا طعنہ دیا ہے تو میں جاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

ایک خاصا بڑا رسی کا رول مجھے تھوڑا سا تلاش کرنے پر نظر آگیا۔ اس کا رنگ بھی سبز تھا چنانچہ جنگل میں اس پر مشکل سے نظر پڑتی تھی۔ یہ آدھا انچ موٹی نائلون کی رسی اتنی مضبوط تھی کہ اس سے ہاتھی بھی جھول سکتا تھا اور اس کی لمبائی بھی سو گز سے زیادہ ہی ہوگی یعنی تقریباً نصف فرلانگ۔۔۔ میں اسے اٹھا کے واپس آیا تو دونوں لڑکیاں ایسے سہمی بیٹھی تھیں جیسے میری غیر حاضری کے مختصر وقفے میں آدم خور شیر ان سے مل کے اور یہ کہہ کے جاچکا ہے کہ ابھی تو بھوک نہیں ہے۔۔۔ شام کو آؤں گا۔۔۔ میں نے رسی کو ایک درخت کے تنے سے باندھا اور دعا مانگی کہ جب میں زمین کی گہرائی کا سفر کروں تو نہ رسّی ٹوٹے اور نہ درخت گرے۔

بلاشبہ یہ ایک خطرناک ایڈونچر تھا۔ ایسے اندھے کنوئیں اگر کسی قسم کی زہریلی گیس سے نہ بھرے ہوں تب بھی سائٹ کی دیواروں میں سے سانپ بچھو جیسے جاندار ہیلو کہنے کے لیے نکل سکتے ہیں۔ مسئلہ سارے مردوں کی عزت کا تھا چنانچہ میں نے دونوں لڑکیوں کو خدا حافظ کہا۔

ہاتھ میرے صرف دو تھے۔ ان کو رسی پر گرفت کے لیے استعمال کرتا تو ٹارچ کیسے پکڑتا۔۔۔ ٹارچ منہ میں دبا کے سرکس دکھاتا تو شاید ٹارچ گر کے مجھ سے بہت پہلے نیچے پہنچ جاتی۔۔۔ میں نے اسے ایک ڈوری کے ساتھ گلے میں یوں باندھا کہ وہ آن رہے تو اس کا رخ نیچے کی طرف ہو۔۔۔ پھر میں نے جھولتے ہوئے دونوں پیروں کو کنارے پر جمایا۔۔۔ ایک دو اینٹیں نکل کے نیچے خلا میں گم ہوگئیں۔ ان کے گرنے سے پانی کا چھپاکا نہیں ہوا۔ ہلکی سی دھمک سنائی دی جس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ کنواں خاصا گہرا تھا۔ میں پیروں کو زور لگا کے جھٹکا دیتا تھا۔ پھر نیچے پھسلتا تھا اور پاؤں دوبارہ گولائی کے کسی حصے پر ٹک جاتے تھے۔ نچلے حصے میں اینٹیں ابھی تک مضبوطی سے قائم تھیں۔

میں آدھے سے زیادہ خلائی سفر کرچکا تھا۔ ایک جگہ چاروں طرف پڑنے والی دھندلی روشنی میں مجھے واضح طور پر کسی سانپ کا سر نظر آیا جو گویا کھڑکی سے باہر منہ نکالے دیکھ رہا تھا کہ باہر یہ کیا ہورہا ہے۔۔۔ ضرور اس کی بیوی نے مجبور کیا ہوگا۔ مگر وہ صلح پسند سانپ تھا کہ برا مانے بغیر واپس اندر چلا گیا۔ ابھی میں آخری گہرائی سے چند فٹ اوپر ہی تھا کہ مجھے اینٹوں کی چنائی میں ایک دروازہ سا نظر آیا۔ دروازے کی مضبوطی کے لیے اوپر ایک محراب سی تھی جس کے گرد دہری اینٹیں چنی گئی تھیں۔

فرش پر ملبا تھا اور اس میں اوپر سے گری ہوئی اینٹیں بھی پڑی تھیں۔۔۔ پھر قدم جما کے ٹارچ کی روشنی میں ہر طرف کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے ایک ڈھانچا دیکھا۔ وہ کسی انسان کا ڈھانچا تھا جو دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ خون میری رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ ایسے ڈھانچے میڈیکل اسٹوڈنٹس ہاسٹل کے کمروں میں ڈیکوریشن پیس کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

اس ڈھانچے نے مجھے لرزا کے رکھ دیا۔ ایک دم میرے خیال میں بہت ہی دردناک باتیں آئیں کہ نہ جانے وہ کون بدبخت تھا۔ اس کا نام کیا تھا۔ خاندان کیا تھا، وہ خود گرا تھا یا اسے گرایا گیا تھا۔ شامتِ اعمال تھی یا سزا۔۔۔

اپنا سر جھٹک کے میں نے وقت ضائع کرنے والے خیالات سے چھٹکارا پایا۔ یہاں میں اس کی المناک وفات کی تفتیش کرنے یا اس کا مرثیہ لکھنے نہیں آیا تھا۔ میں نے چھ سات فٹ اوپر سیڑھیوں کو دیکھا جو دروازے سے شروع ہو کے نہ جانے کدھر جا رہی تھیں۔ یہ کوئی معما نہیں تھا۔ پرانے وقتوں میں قافلوں کے لیے ایسے کنوئیں بنائے جاتے تھے۔

اس جگہ کے انتخاب کی وجہ مجھے سمجھ آگئی۔ اب گدھے گھوڑے کی جگہ ریشم اور روزینہ اسی راستے سے اتر کے نیچے آئیں گی۔ میں اوپر چڑھا اور نشیبی راستے کی طرف دیکھا تو مجھے روشنی نظر نہ آئی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کو ایک فرلانگ یا دوسو گز کی ڈھلوان ہونا چاہیے تھا۔ سیڑھیاں اوپر جا کے اندھیرے میں غائب ہو جاتی تھیں۔ ٹارچ لے کر میں نے سیڑھیاں چڑھنا شروع کیں۔ اندر تازہ ہوا کم تھی۔ مجھے گھٹن سی محسوس ہونے لگی مگر میں نے اوپر کی طرف اپنا سفر جاری رکھا۔ آدھے گھنٹے بعد راستہ بند ہوگیا۔ میں زمین کی سطح تک پہنچ گیا تھا مگر باہر نکلنے کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

ٹارچ کی روشنی ڈالنے سے مجھے عین سر کے اوپر لکڑی کا تختہ نظر آیا۔ لکڑی نئی پلائی ووڈ تھی۔ اس کو میں نے ہاتھوں کا زور لگا کے اٹھایا تو تختہ آسانی سے اٹھ گیا۔ دن کا اجالا پوری قوت کے ساتھ اندر آیا تو میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ باہر نکل کے میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو مجھے سوگز کے فاصلے پر جنگل کے رنگ سے الگ شوخ نیلے، سرخ اور زرد رنگ کی جھلک دکھائی دی۔ یہ روزینہ اور ریشم تھیں جو بے فکری سے وہیں بیٹھی گپ لگا رہی تھیں۔ مجھے سخت طیش آیا۔ میری مردانگی کو ایکسپلائٹ کر کے انہوں نے مجھے کیسی خطرناک مہم پر روانہ کر دیا تھا کہ میرا مرحوم ہوئے بغیر دنیا میں واپس آ جانا معجزہ تھا۔

میرے نزدیک پہنچتے ہی وہ دونوں کھڑی ہوگئیں۔

''مل گیا راستہ۔''

''نہیں۔'' میں نے جل بھن کے کہا۔ ''چلو اب تم دونوں جا کے دیکھو۔''

''گڈ۔'' روزینہ نے اطمینان کا اظہار کیا۔ ''میں تمہیں بالکل صحیح جگہ پر لے آئی تھی۔ بس اب چلو۔''

''جگہ تو میری بھی دیکھی ہوئی تھی۔'' ریشم نے کہا۔ ''چلو۔''

''یار! مجھ سے یہ سروے کیوں کرایا گیا تھا؟'' میں نے احتجاج کیا۔

''ابھی پتا چل جائے گا۔'' روزینہ بولی۔ ''اس کے بغیر نیچے اترنے کا راستہ کیسے دریافت ہوتا؟''

''ہم وہاں بالکل نہیں رہ سکتے۔'' میں نے اعلان کیا۔ ''اندھیرا ہے، کوڑا کچرا اور ملبا ہے اور ایک ڈھانچا ہے۔''

''ڈھانچا؟'' ان دونوں نے بڑے اشتیاق سے ایک ساتھ کہا۔ ''کس کا؟''

''میرا بھی ہو سکتا تھا۔ اس سے پوچھا تھا مگر اس نے نام پتا شناختی کارڈ نمبر کچھ نہیں بتایا۔''

''ہم بھی دیکھیں گے۔'' ریشم بولی۔ ''کبھی ڈھانچا دیکھا نہیں میں نے۔''

مجھے کافی مایوسی ہوئی کہ لڑکیاں ذرا دہشت زدہ نہیں تھیں۔ ''جلدی چلو۔۔۔ وقت نہیں ہے، سورج ڈھل چکا۔''

روزینہ برقع اور ایک پلاسٹک شاپنگ بیگ سنبھالے آگے تھی۔ دوسرا شاپنگ بیگ ریشم نے مجھے تھما دیا۔ ''اس میں کھانا ہے اور پانی۔''

میں ان کے پیچھے چلنے لگا۔ روزینہ کو جیسے اچانک کچھ یاد آیا۔

''اس کنوئیں کو پھر ڈھانپ دو۔ کسی کو نظر نہ آئے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا مطلب؟ اوپر سے بھی تازہ ہوا کے آنے کا راستہ بند کر کے ہم سوفٹ نیچے بیٹھ جائیں؟''

''کوئی نہیں بیٹھے گا وہاں۔ تم چلو۔'' ریشم نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔

''کیا حرج تھا اگر یہ پلان مجھ سے اتنا خفیہ نہ رکھا جاتا؟'' میں نے خفگی سے کہا۔

''مجھے کہاں معلوم تھا۔'' ریشم بولی۔ ''روزینہ کو بھی بس اتنا ہی معلوم تھا کہ کنوئیں پر پہنچنا ہے۔''

''اور پھر؟''

''تم نے جو راستہ دیکھا اوپر آنے کا۔۔۔ اس کا پتا چلانا تھا۔'' ریشم بولی۔

''صرف اس کے لیے چنا گیا مجھے؟ میں نہ ہوتا پھر؟''

''فضول سوال مت کرو، چلو۔'' ریشم نے مجھے ڈانٹا۔

''تمہاری وجہ سے ابھی تک ہم نے بھی کھانا نہیں کھایا۔'' روزینہ بولی۔ ''بس کھاتے ہیں، وہاں پہنچ کے۔''

میں خاموش رہا۔ مجھے اب کوفت ہو رہی تھی کہ میں

تعمیلِ حکم کے سوا کچھ بھی کرنے سے قاصر ہوں۔ وہ جگہ جہاں سے کنوئیں کی تہ تک اترنے کا طویل زینہ تھا سوگز کا فاصلہ تھا۔ زمین کی سطح پر اس کے آثار ایک شکستہ دیوار کی صورت ہی باقی تھے۔ یہ پہلے تین طرف سے بنی ہوئی تین فٹ اونچی دیوار ہوگی۔ چوتھی طرف سے مویشی نیچے لے جائے جاتے ہوں گے۔ بیچ کے خلا پر پلائی ووڈ کا تختہ رکھا گیا تھا اور اسے چھپانے کے لیے تختے پر مٹی اور خشک پتے پھیلا دیے گئے تھے۔ تختہ میں نے زور لگا کے ہٹا دیا تھا اور اب ایک طرف پڑا تھا۔

روزینہ پورے پلان سے زیادہ باخبر تھی۔ احتیاط کے پیشِ نظر اس نے ریشم کو بھی تفصیلات سے آگاہ نہیں کیا تھا ورنہ وہ بھی اس علاقے کے ہر چپے سے واقف تھی۔ اس کی زندگی بھی یہاں کی خاک چھانتے بسر ہوئی تھی۔ پلان میں ریشم کا رول بھی اہم تھا لیکن ایک بار جان کی بازی لگا کے ناکامی کا صدمہ اٹھانے والی روزینہ دوسری بار خود اپنے سائے پر بھی اعتماد کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔

روزینہ نے جھک کر زمین کے شگاف میں جھانکا اور پھر ادھر اُدھر دیکھنے لگی جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہو۔ اس کی نظریں مراد کی جستجو کر رہی تھیں۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ کیا ہم زمین کے اندر اتر جائیں گے اور وہیں روپوش رہیں گے؟ ایک طرف سے کنوئیں کا منہ میں نے بند کیا تھا۔ دوسری طرف سے نیچے تاریکی میں اتر کے وہاں پہنچنا جہاں نہ جانے کب سے ایک انسانی ڈھانچا منتظر تھا کہ صورِ اسرافیل پھونکا جائے تو وہ بھی اٹھ کر میدانِ حشر کا رخ کرے۔ کیا ہم زندہ انسان وہاں روپوشی کا ایک دن بھی گزار سکتے تھے جہاں ایک گھنٹا گزارنا محال تھا؟

''وہ۔۔۔ وہ دیکھو۔'' روزینہ نے مخاطب کر کے ایک طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ ''وہ پیڑ۔''

میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے سر ہلایا۔ ''یہاں تو پیڑ ہی پیڑ ہیں ہر طرف۔۔۔ تم کس کی بات کر رہی ہو؟''

''وہ جو ٹنڈ منڈ دوشاخہ ہے۔ اس کے ساتھ شیشم کا ایک ہی درخت ہے۔ اس پر چڑھ جاؤ۔'' وہ بولی۔

درخت مجھے نظر آ گیا تھا لیکن اس پر چڑھنے کی ضرورت میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ''کیا اوپر کسی شاخ پر وہ ہے؟ تمہاری منزلِ مراد۔۔۔ جس کے ساتھ شاد باد رہنے کی آرزو تمہیں یہاں لائی ہے۔''

اس نے میرے غیر سنجیدہ رویے کا سخت برا مانا۔ ''مراد کوئی بندر نہیں ہے کہ درخت پر چڑھا بیٹھا ہو جسے میں اتار کے نہیں لا سکتی۔''

اب ریشم نے میرا ساتھ دیا۔ ''پھر کیا ہے۔۔۔ بتاؤ نا۔''

''اوپر کہیں کچھ سامان چھپایا گیا ہے۔ وہ اتار لاؤ۔'' روزینہ بولی۔

''کیسا سامان؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ مجھے بھی نہیں معلوم۔ کوئی فرنیچر یا مشینری تو ہوگی نہیں۔۔۔ نیچے لاؤ گے تو میں بھی دیکھوں گی۔'' وہ رکھائی سے بولی۔ ''جلدی کرو۔۔۔ وقت نہیں ہے۔''

میں نے اور ریشم نے ایک جیسا برا منایا تھا لیکن اپنی بات پر اڑے رہنا بیکار تھا۔ میں درخت تک گیا اور تھوڑی سی کوشش سے اس کے تنے پر قدم جما کے اوپر پہنچ گیا۔ دونوں خواتین کی مدد کے بغیر یہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا۔ انہوں نے مجھے اپنے دوپٹے دیے جن کو میں نے جوڑ کے پانچ گز کی رسی بنالی۔ رسی کو سب سے نیچے والی شاخ کے اوپر سے گزارا اور پھر اس کی مضبوطی چیک کر کے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ میرے پیر تنے پر جمے ہوئے تھے اور میں دوپٹے کی رنگین ڈور کے سہارے خود کو اوپر کھینچ رہا تھا۔ اگر گرہ کھل جاتی تو میں بھد سے نیچے گرتا۔ رسی کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ دونوں دوپٹے نائلون کے تھے۔

اوپر پہنچ کے میں نے طنز سے کہا۔ ''میں مزید احکامات کا منتظر ہوں خاتون۔''

روزینہ بولی۔ ''دیکھو۔۔۔ کہیں کوئی بنڈل ہے۔ بوری یا گتے کا باکس۔''

میں نے سر کو دائیں بائیں گھمایا تو ذرا اوپر سبز پتوں میں کوئی سفیدی سی چمکتی دکھائی دی۔ یہ ایک ڈوری تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے اسے کھینچا تو کوئی گرہ کھل گئی۔ اوپر سے کوئی چیز پتوں پر سے گزر کے دھم سے نیچے گری۔ اس کا سائز کافی بڑا تھا مگر یہ سب انتظام کرنے والے نے بہت باریکی سے تمام ممکنات کو سامنے رکھا تھا۔ اوپر سے نیچے تک راستہ صاف تھا اور ڈور کھینچنے میں مجھے کوئی مشکل بھی پیش نہ آئی۔ اچھی بات صرف یہ ہوئی کہ وہ بنڈل دونوں میں سے کسی ایک خاتون کے سر پر گرتا تو سر نہ ٹوٹتا۔۔۔ گردن ٹوٹ جاتی اور خواتین کی تعداد جو ابھی مجھ سے دگنی تھی، پچاس فیصد کم ہو کے میرے برابر رہ جاتی۔

بلندی سے پستی کی جانب سفر بہت آسان تھا۔ میں چاہتا تو اوپر سے کود بھی سکتا تھا مگر اس کرتب میں کم سے کم یہ خطرہ ضرور تھا کہ میرا ٹخنا اتر جائے۔ رنگین دوپٹوں کا سہارا

لیے بغیر میں ایک شاخ سے لٹکا اور زمین پر اتر آیا۔ خواتین اب اس بنڈل کو کھول رہی تھیں جو ایک گتے کا ڈبا تھا۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی جب اس کے اندر سے کچھ برتن۔۔۔ کچھ کھانے پینے کا سامان اور کچن کی ضرورت کی چیزیں برآمد ہوئیں۔ مجھے نادیدہ مسٹر مراد کی دماغی صلاحیت پر شک ہونے لگا۔

''یہ کیا ہے خاتون؟ کیا ہم اس کنوئیں کی تہ میں طویل عرصے قیام کا ارادہ رکھتے ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''ذرا ایک نظر نیچے جا کے دیکھ لو۔ وہ مردہ بھی مجبوری میں وہاں قیام پذیر ہے۔ وہ تمہارا اٹیچ باتھ والا بیڈ روم نہیں ہے نہ تمہارا مراد رہ سکتا ہے وہاں۔۔۔ اور نہ ہی۔۔۔''

''مراد احمق نہیں ہے۔'' روزینہ خفگی سے بولی۔

''عام طور پر جو بہادر اور نڈر ہوتے ہیں، افلاطون نہیں ہوتے۔''

''ہمیں صرف یہ اسباب نیچے پہنچانا ہے اور بس۔''

ریشم کو اس بیان نے مطمئن نہیں کیا۔ ''یعنی ہم اس سامان کو نیچے چھوڑ کے واپس آجائیں گے؟ اس کا مقصد؟''

''وہ بھی سمجھ میں آجائے گا۔ چلو تھوڑا تھوڑا سامان سب اٹھاؤ۔'' اس نے بکھر جانے والے پلاسٹک کے برتن سمیٹ کر واپس ایک شاپنگ بیگ میں ڈالے۔

''اس میں۔۔۔ اسٹوو ہے۔۔۔ مٹی کا تیل ہے شاید۔ اور یہ ماچس۔'' ریشم نے دوسرے بیگ کی تفصیل بتائی۔ ''یہ آٹا۔۔۔ اور پیکٹ میں کچھ۔۔۔ نمک مرچ۔۔۔ چائے کی پتی۔۔۔ چینی۔''

باکس میں سے برآمد ہونے والی سب سے بھاری چیز پانی کی دو بوتلیں تھیں۔ مٹی کا تیل بھی پلاسٹک کی بوتل میں تھا اور اوپر سے گرنے کے باوجود کوئی بوتل پھٹی نہیں تھی۔ میں نے دونوں بوتلیں اٹھالیں اور تقریباً کچن کا پورا سامان اٹھائے ہم نیچے روانہ ہوئے۔ ریشم سب سے پیچھے تھی اور ٹارچ کی روشنی سے آگے کا راستہ دکھا رہی تھی۔ سیڑھیاں رفتہ رفتہ نشیب کی جانب لے جا رہی تھیں۔ ہر سیڑھی چار یا چھ انچ اونچی تھی۔ ان کے کنارے ٹوٹ گئے تھے اور کہیں کہیں سے اینٹیں بھی اکھڑی تھیں مگر راستہ دشوار نہ تھا۔

یہ دس پندرہ منٹ کا سفر تھا جو ایک بار پھر اس ڈھانچے کے مرقد یا ابدی گھر پر تمام ہوا۔ یہ عجیب لڑکیاں تھیں کہ ڈھانچے سے خوف زدہ ہونے کے بجائے قریب سے جھک کر اس کا معائنہ کرنے لگیں۔ اندر بڑی عجیب سے گھٹن اور بو تھی جس میں سانس لینا بھی دشوار تھا۔

''یہ کوئی عورت ہے۔'' روزینہ نے بالآخر فیصلہ دیا۔

''تم نے پوچھا اس سے؟'' میں نے کہا۔

''گلے میں چین ہے اور یہ دیکھو۔۔۔ ہاتھوں میں دو چوڑیاں۔۔۔ اور یہ پڑے ہیں اس کے کلپ۔''

ریشم بولی۔ ''اس کے لمبے بال کہاں گئے۔۔۔ بال تو رہتے ہیں دس بیس سال۔۔۔ میں نے سنا تھا۔''

''آپ دونوں ماہرین آثار قدیمہ یہ ریسرچ چھوڑ کے بتائیں کہ اب کیا کرنا ہے۔ کیا میں کچن سیٹ کر کے رات کے کھانے کی تیاری کروں؟''

''سامان کو یہاں پھیلانا ہے جیسے ہمارے استعمال میں تھا۔ اور ہم نے یہاں قیام کیا تھا۔'' روزینہ بولی اور سامان کو کنوئیں کی دیوار کے ساتھ رکھنے لگی۔ اس نے ریشم کی مدد سے اینٹوں کو ہٹایا۔ ملبا صاف کیا اور جگہ بنائی۔ بات اب کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔

''بس اب چلو۔'' روزینہ نے ٹارچ لائٹ میں گھڑی دیکھی۔ ''وقت ہو گیا ہے۔''

''یعنی ہر کام ایک ٹائم شیڈول کے مطابق ہو رہا ہے؟'' میں نے کہا۔

روزینہ جواب دیے بغیر اوپر کے راستے پر ہو لی۔ ریشم نے مجھے صبر کا اشارہ کیا اور ہم روزینہ کے پیچھے ہو لیے۔ اوپر جاتے جاتے خواتین کا سانس پھول گیا۔ خود میں تھکن محسوس کرنے لگا تھا۔ کشیدگی کے علاوہ میں جسمانی مشقت میں بھی مصروف رہا تھا۔ دوبارہ زمین سے سر نکالا تو باہر دن کا اجالا دم توڑ رہا تھا۔ سورج غروب ہونے میں دیر تھی لیکن اس جنگل میں تاریکی کچھ پہلے اترنے لگی تھی۔

روزینہ نے زمین کو دیکھا اور مسکرائی۔ ''وہ آگیا۔''

''کون آگیا۔۔۔ ہیرو؟'' میں نے چڑ کے کہا۔

''یہ دیکھو۔'' اس نے زمین پر ٹارچ کی روشنی ڈالی تو اس پر ٹائروں کے پرنٹ واضح تھے۔ روزینہ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسی وقت قریب کی ایک جھاڑی میں سرسراہٹ سی ہوئی اور ایک کارٹون برآمد ہوا۔ وہ ایک دراز قامت اور بانس جیسا پتلا شخص تھا جس کے لمبے لمبے بال تھے۔ اس نے اوپر صرف ایک واسکٹ پہن رکھی تھی جو سامنے سے کھلی ہوئی تھی۔ نیچے اس کی لمبی سی نیکر میں سے پتلی پتلی ٹانگیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اوپر اس کے چہرے پر مونچھیں ہرگز اس قابل نہ تھیں کہ ان کو تاؤ دیا جائے مگر وہ یہی کر رہا تھا۔

''تم چھوٹے ہو؟'' روزینہ نے کہا۔

اس نے سر ہلایا۔ ''یہ نام ہے ہمارا۔۔۔ ہم چھوٹے

نہیں ہیں۔''

روزینہ میری طرف پلٹی۔ ''تم دونوں جیپ میں میرے ساتھ چل سکتے ہو' جہاں تک چاہو۔ یہاں رکنا چاہو تو تمہاری مرضی۔''

''یہ کیا ہے روزینہ؟'' ریشم برہمی سے بولی۔ ''ہم ساتھ ہیں۔''

''میں تمہارے ساتھ نکلی تھی مگر آگے ہمارے اپنے اپنے راستے ہیں۔ نہ میں تمہیں ساتھ رکھنے کا رسک لوں گی۔ نہ تمہیں یہ خطرہ مول لینا چاہیے تاکہ الزام کسی پر نہ آئے۔ سب اپنی اپنی زندگی کے خود ذمے دار ہوں گے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تم کس جیپ کی بات کر رہی ہو؟ مجھے تو یہاں گدھا گاڑی بھی نظر نہیں آرہی۔''

چھوٹے نے کہا۔ ''وہ اُدھر ہے۔ جدھر ہم چھپے ہوئے تھے۔ ہم اُدھر سے آئے تھے۔'' اس نے مخالف سمت میں ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''آپ نے ٹائر کے نشان دیکھے تھے؟ وہ ہم نے آگے مٹا دیے۔''

بات مشکل تھی مگر میں نے سمجھ لی۔ یہاں تک آنے کا ثبوت ٹائر کے نشانات کی صورت میں موجود تھا، آگے جیپ کہاں گئی؟ یہ پتا نہیں چلتا تھا۔ نہ واپس جانے کا سراغ ملتا تھا، نہ کسی اور سمت جانے کا۔۔۔ یہ نشانات اس نے ایک لمبے ڈنڈے والے برش سے مٹائے تھے جو اس نے بعد میں دکھایا۔ یہ کافی محنت طلب کام تھا مگر اس نے مٹی پر برش پھیرا تھا اور اس پر خشک پتے پھیلا دیے تھے۔ جیپ اب جھاڑیوں میں چھپی ہوئی تھی اور وہاں سے آگے جاتی تو اس کا سراغ نہ ملتا۔ سراغ لگانے والا یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا کہ جیپ یہاں تک تو آئی تھی پھر شاید پرواز کر گئی۔

روزینہ کے جواب سے ریشم مایوس اور خفا تھی۔ وہ ساتھ نکلی تھیں اور خیال یہی تھا کہ ساتھ رہیں گی۔ میرے خیال میں یہ ریشم کی غلطی اور غلط فہمی تھی۔ روزینہ اور مراد کی اپنی زندگی تھی اور خود مجھے کسی کی رفاقت کا پابند ہونا منظور نہ تھا۔

مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ مراد کی پلاننگ ''فول پروف'' رہی۔ جب ہم گھنی جھاڑیوں اور درختوں سے گزر کر سو گز دور جیپ تک پہنچے تو خاصے محفوظ تھے۔ تعاقب کرنے والوں کو دھوکا دے کر غلط مفروضات میں الجھانا اس منصوبے کی خاص بات تھی۔ یہ پیر سائیں کا علاقہ تھا۔ ہمارے فرار کا راز افشا ہوتے ہی ان کے جلال کا آتش فشاں پھٹے گا۔ وہ اپنے مریدوں کو حکم دیں گے کہ اس علاقے میں چیونٹیوں کی طرح پھیل جائیں اور زمین کے اوپر یا اندر ہم جہاں بھی ہوں نکال لائیں۔ شاید روزینہ کا نام باغی اور مفرور افراد میں شامل نہ ہو حالانکہ یہ پھر اپنا ہی خون تھا جو دوسری بار کالک بن کر ان کے چہرے پر ملا گیا تھا۔ وہ ریشم کے تریا چلتر پر بھی چراغ پا ہوں گے کہ عورت ذات ناقص العقل۔۔۔ ان کے مقابلے میں کل کی چھوکری۔۔۔ ہیچ اور بے مایہ۔۔۔ ان کو بے وقوف بنا کے نکل گئی۔ ان سے عقد کی سعادت اور نتیجے میں حاصل ہونے والی دولت اور عزت پر تھوک کر چلی گئی۔ خیر، ان کے غیظ و غضب سے بچ کر کوئی کہاں جا سکتا ہے۔

جیپ ہر طرف سے بند تھی۔ روزینہ آگے بیٹھی۔ میرے ساتھ ریشم رہی۔ چھوٹو نے بڑی مہارت سے جیپ کو جھاڑیوں میں سے گزارہ۔ اس خفیہ مقام کا سراغ دینے والے جیپ کے نقش قدم یعنی ٹائروں کے نشان اس نے پہلے ہی مٹا دیے تھے۔ کھلی جگہ پر آ کر اس نے پھر پیچھے دیکھا اور ڈنڈے والے برش سے خشک پتوں اور ٹہنیوں کو ایسے پھیلایا کہ کسی کو کچھ نظر نہ آئے۔

''اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' ریشم نے سوال کیا۔

تم جہاں کہو گی تمہیں پہنچا دیا جائے گا۔ مجھے کہاں جانا ہے، یہ چھوٹو کو معلوم ہو گا، مراد نے مجھے بھی نہیں بتایا کہ وہ کہاں ہے۔''

''ابھی نہ سہی۔۔۔ کبھی مراد ملے گا تو میں اسے دو باتوں پر خراجِ تحسین دوں گا۔ ایک اس کے جذبۂ عشق کی استواری پر۔۔۔ جو ایسے مشکل اور نامساعد حالات میں برقرار رہا۔ دوسرے اس کی ہمت اور وفائیت پر۔۔۔ اس نے ہار نہیں مانی اور تمہارا ساتھ نہیں چھوڑا۔''

روزینہ مسکرائی۔ ''میں نے بھی تو اس کی خاطر سب چھوڑ دیا۔''

''ایک بات میری طرف سے پوچھنا۔ آخر وہ کب تک تمہارے ساتھ دربدر ہو گا؟ تم ساری عمر خانہ بدوش تو نہیں رہ سکتے۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ نازوں کا پلا اور ان کا واحد سہارا۔''

''ہم بہت جلد واپس لوٹیں گے۔۔۔ تم دیکھنا۔''

''اس کا باپ تو مجبور ہے۔ وہ اس کا اکلوتا وارث ہے اور ہمارے معاشرتی معیار پر تمہاری کامیابی اس کی فتح ہے۔ رشتے سے انکار پر اس کی توہین ہوئی تھی۔ بیٹا بزور بازو لڑکی کو اٹھا لایا۔ ناک تو کٹی پیر سائیں کی۔ ایک بار بدنامی پر پردہ ڈال لیا تھا، جھوٹ سے سچ کو دبا دیا تھا لیکن

مراد جب تمہارے ساتھ فتح کا جھنڈا لہراتا واپس آئے گا تو ان کے پاس اپنی عزت بچانے کا وہی روایتی طریقہ ہو گا۔۔۔ جان دینا یا جان لینا۔''

روزینہ چپ رہی۔ ''ہم ابھی واپس نہیں جائیں گے۔''

میں سمجھ گیا۔ روزینہ نے صاف نہیں کہا تھا کہ پیر سائیں کون سا ہمیشہ کی زندگی لکھوا کر لائے ہیں۔ مراد اور میں زندگی کی دوڑ میں آغاز کی لکیر پر ہیں۔ وہ وہاں پہنچ گئے ہیں جہاں ریس ختم ہونے کی لکیر ہے۔ جیپ نہ جانے کس طرف جارہی تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس سے مجھے اندازہ کرنا ممکن ہوا کہ ہم بھی مغرب کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ میری الجھن ریشم نے ختم کی۔

اس نے ایک کاغذ کا پرزہ روزینہ کو دیا۔ ''ہمیں اس پتے پر پہنچا دو۔''

میں نے کہا۔ ''یہ کس کا پتا ہے؟''

''سلونی کا۔'' ریشم نے مختصر جواب دیا۔

''میں نے ان دونوں کو درگاہ میں دیکھا تھا۔''

''ہاں، وہ اپنا کام کر کے نکل گئے تھے۔ ان کے بھائی نے یہ پتا دیا۔''

''آج انہوں نے کیا کام کیا؟''

''اندر جو شربت تقسیم ہوا اس کے بھائی نے وزیراں کی مدد سے فراہم کیا تھا۔ تم نے وزیراں کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔''

میں نے شرمندگی سے کہا۔ ''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب ہو جائے گا۔ میں نے صرف ہمدردی ظاہر کی تھی۔''

ریشم سے پہلے روزینہ بولی۔ ''صرف ہمدردی؟ اتنے پارسا مت بنو۔''

''میں اپنی خود غرضی کا اعتراف کر رہا ہوں۔ پارسا تو وہ بھی نہیں تھی۔''

''اسے جس جرم کی سزا دی گئی، وہ وزیراں نے نہیں کیا تھا اور سزا بہت بھیانک تھی۔''

''یہ سلونی کا بھائی کیوں رہتا ہے درگاہ پر۔۔۔ نام کیا ہے اس کا؟''

''خوش نصیب۔۔۔ مگر کہتے سب نمونہ ہیں۔ چھوٹا تھا جب گھر سے بھاگ آیا تھا۔۔۔ سب نے اس کا استحصال کیا۔''

''تمہارا مطلب ہے۔۔۔ جسمانی استحصال؟''

ریشم نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ ''اب وہ بائیس سال کا جوان ہے۔ اس کے اندر بھی انتقام کی آگ بھری ہوئی ہے۔ ابھی وہ ہمارے ساتھ جاتا تو شک ہوتا۔ لیکن وہ کچھ عرصے بعد وزیراں کے ساتھ نکل جائے گا۔''

''وزیراں کے ساتھ؟''

''ہاں، وہ دونوں شادی کر لیں گے۔''

''مگر وزیراں عمر میں اس سے دس بارہ سال بڑی ہو گی۔''

روزینہ نے پلٹ کے کہا۔ ''تم بھی سب مردوں کی طرح سوچتے ہو کہ لڑکی دس سال چھوٹی ہو یا بیس سال یا چالیس سال۔۔۔ مرد اس کے باپ کے برابر ہو یا دادا کے۔۔۔ فرق نہیں پڑتا، مگر عورت کے معاملے میں الٹا سوچتے ہو۔'' ریشم بھی اس کی ہم نوا بن گئی۔

میں نے کہا۔ ''مجھے نشانہ مت بناؤ میں بات کر رہا تھا سلونی کے بھائی کی۔ اگر وہ محض انتقام لینے کے لیے یا ترس کھا کے وزیراں سے شادی کر رہا ہے تو اور بات ہے لیکن کسی غرض کے بغیر چاہتا ہے وزیراں کو تو میں اس کی تعریف کروں گا۔ اس کی بہن بھی تو رنگیلا کے ساتھ ہی گھر بسانا چاہتی ہے۔''

''صرف چاہنے سے تو سب نہیں ہو جاتا۔'' ریشم نے ایک آہ بھری۔

جیپ اچانک ایک جگہ رک گئی۔ مجھے آس پاس اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ روزینہ نے کہا۔ ''خدا حافظ۔''

''کیا ہم پھر ملیں گے؟'' ریشم بولی۔

''پتا نہیں۔ ملنا ہوا تو تقدیر پھر یہاں لے آئے گی۔''

ریشم نے کہا۔ ''مگر یہ میرا پتا نہیں ہے۔''

''چلو تم آ جانا۔۔۔ تمہیں تو میرا پتا معلوم ہے۔ میرا میکا اور سسرال تم نے دونوں دیکھے ہیں۔'' روزینہ مسکرائی۔

''شاید اس راستے پر میرا کبھی پلٹ کے جانا نہ ہو۔ اب کون ہے میرا وہاں دشمنوں کے سوا۔۔۔ خدا حافظ۔''

جیپ غرائی اور آگے بڑھ گئی۔ وہ ایک خستہ حال کچی سڑک تھی جس پر رات کے وقت ٹریفک بالکل نہ تھی۔ ہر طرف اندھیرے میں درخت تیز ہوا سے جھوم رہے تھے اور ان کی سائیں سائیں کی گونج سے فضا معمور تھی۔

''شاید بارش ہو گی۔'' ریشم بولی۔

''اور ہم یہاں بھیگتے رہیں، بھوکے پیاسے۔'' میں نے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ آؤ میرے ساتھ۔''

''تم جانتی ہو یہ کیا جگہ ہے؟ پہلے آ چکی ہو یہاں؟'' میں نے کہا۔

''مجھے سلونی نے سمجھا دیا تھا۔'' وہ ایک کچے راستے پر ہو لی۔ جو سامان ہم پیچھے چھوڑ آئے، اس میں سے صرف ٹارچ ریشم کے پاس رہ گئی تھی۔ وہی اب راستہ دکھانے میں کام آ رہی تھی۔

''اس نے کہیں ملتان کا پتا دیا تھا۔'' میں نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

''سیدھا وہاں جانے میں خطرہ تھا، اس کے لیے بھی۔۔۔ اب تک پیر سائیں کے جاسوس ہر طرف پھیل چکے ہوں گے۔'' وہ چلتے چلتے رک گئی۔

''راستہ بھول گئی ہو؟'' میں نے کہا۔

ریشم نے ٹارچ لائٹ سے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ ''وہ۔۔۔ ہم پہنچ گئے۔۔۔ یہی جگہ ہے۔''

میں نے ایک خستہ حال پرانا ڈاک بنگلا دیکھا۔ اس کا برآمدہ اور آدھے سے زیادہ رہائشی حصہ کھنڈر بن چکا تھا۔ صرف طرزِ تعمیر سے اس کی قدامت کا اندازہ ہوتا تھا۔ انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں افسران کے لیے ہر جگہ ایسے ڈاک بنگلے تعمیر کیے تھے جہاں دورے پر جانے والے۔۔۔ شکار کے لیے آنے والے اور محکمۂ جنگلات کے افسر قیام کر سکیں۔ یہاں ان کے لیے رہائش کے علاوہ آرام اور کھانے پینے کے سارے لوازمات ہر وقت مہیا رہتے تھے۔

''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''دیکھتے ہیں۔'' ریشم ٹارچ کی روشنی میں اس مونیل طرز کی سو سال سے زیادہ پرانی عمارت کو دیکھتی رہی جس کا نصف سے زیادہ حصہ ملبے کا ڈھیر ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ عمارت کا ایک چکر لگایا۔

''اگر اندر جانے کا راستہ مل گیا تب بھی یا تو رات کو ہمارے میزبان بھوت ہوں گے۔۔۔ اور چڑیلیں جو ہمارا خون پی جائیں گی اور کلیجا چبائیں گی۔ وہ ایسا ہی کرتی ہیں اور کچھ نہ ہوا تو رات کو بارش میں باقی عمارت ہم پر گرے گی اور ہم بھوکے پیاسے مسافر اس میں دفن ہو جائیں گے۔ قسمت کی خوبی دیکھیے۔''

ریشم نے میری بات کا اثر قبول کیا تھا یا نہیں۔ اس کا مجھے اندازہ نہ ہوا کیونکہ میں اس کی صورت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ''یہ۔۔۔ ادھر سے آؤ۔'' اس نے ایک دروازے کے خلا کا رخ کیا۔

میں اس کا ساتھ نہ دیتا تو کیا کرتا۔ باہر بادل کی گرج کے ساتھ بارش شروع ہو گئی تھی۔ میں اس کے پیچھے اندر پہنچ گیا۔ ایک خالی خستہ حال دیواروں والے کمرے میں دروازوں کی جگہ دو خلا دکھائی دے رہے تھے۔ ریشم نے پہلے ایک میں جھانکا۔ مایوسی کی تحریر صاف اس کے چہرے پر پڑھی جا سکتی تھی۔ ''ایسی بھی کیا احتیاط۔ یہاں سے ہمیں ساتھ لے جاتا رنگیلا تو کون سی قیامت آ جاتی۔''

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے میں دوسرے دروازے کے خلا سے گزر کے ایک صاف ستھرے کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ ریشم کی زبان پر جیسے یکلخت تالے پڑ گئے تھے اور میں بھی ہکا بکا کھڑا تھا کیونکہ کمرے کے فرش پر ایک خاصی بڑی دری بچھی ہوئی تھی۔ دو تکیے بھی موجود تھے اور درمیان میں کھانے کے ڈھکے ہوئے برتن ایسے رکھے تھے جیسے کوئی ابھی سجا کے گیا ہو۔ خالص فلمی ماحول میں ہماری یہ خاطر مدارات کوئی لالٹین والا سو سالہ بوڑھا چوکیدار ہی کر سکتا تھا جس کی حسین بیٹی نے کھانا بنایا ہو۔ ایسا میں کئی فلموں میں دیکھ چکا تھا۔

''یہ انتظام ہمارے لیے ہے۔'' ریشم بولی۔

''اس میں سلونی کا کوئی کمال نہیں۔ یہ دعوت بھوتوں کی طرف سے ہے۔''

''بھوت؟ کیسے بھوت؟'' ریشم نے ایک لالٹین اور ماچس دریافت کی اور وہیں بیٹھ کے اسے جلانے لگی۔

''ایسی ہر جگہ بھوت بلکہ ان کا قبیلہ آباد ہوتا ہے۔''

وہ ہنسی۔ ''میں کسی جن بھوت پر یقین نہیں رکھتی۔ آخر بھوت ہمارے لیے دسترخوان کیوں سجائیں گے؟''

''بھئی پہلے ہم کھانا کھائیں گے۔۔۔ پھر بھوت ہمیں کھائیں گے تو یہ کھانا بھی گیا تو انہی کے پیٹ میں۔۔۔ بھوکے فاقہ زدہ انسانوں کو کھانے کا فائدہ۔''

''اب بیٹھ جاؤ۔'' اس نے ٹارچ بجھا دی تو لالٹین کی دھندلی روشنی میں ہمارے اپنے سائے بے رنگ دیواروں پر لرزنے لگے۔

میں نے جوتے اتارے تو میرے پیروں کو بہت آرام ملا۔ میں تکیے پر نیم دراز ہو گیا۔ ریشم نے کمرے کے ایک اور دروازے یعنی دیوار کے خلا سے گزر کے مجھے مطلع کیا۔ ''یہاں بالٹی میں پانی بھی ہے۔''

''یہ گوروں کے وقت کا ہوگا۔''

''کیا فضول بات ہے۔ یہ سب سلونی کا انتظام

ہے۔"
میں نے کہا۔ "ایسا ہے تو پھر تمہاری یہ سہیلی پاگل ہے اور جو اس کے پیچھے پاگل ہے اس کا تو نام ہی پاگل ہے۔"
ریشم آگے دوسرے تکیے کے سہارے بیٹھ گئی۔ "کون رنگیلا؟"
میں نے کہا۔ "سلونی نے بتایا تھا مجھے کہ نام مشتاق احمد تھا۔ کالج میں پڑھتا تھا تو شاعری کرتا تھا۔ ایف اے نہیں کر سکا۔ رکشا چلاتا تھا اس وقت بھی اور نام کے ساتھ دیوانہ لکھتا تھا۔ رکشا کے پیچھے بھی مشتاق احمد دیوانہ۔۔۔ ایم اے ڈی۔۔۔ میڈ۔۔۔ میڈ معنی پاگل۔۔۔ دیوانے کا رکشا مشہور تھا۔"
باہر بجلی چمکتی تھی تو روشنی دیواروں پر یوں پڑتی تھی جیسے شعلوں کا رقص۔۔۔ بادلوں کی گرج کے درمیان بڑے زور سے کڑاکا ہوا۔۔۔ "اف۔۔۔ میرا دل چاہتا ہے باہر جا کے نہاؤں۔"
"عجیب چیز ہو تم۔۔۔ تمہیں ڈر نہیں لگتا کسی چیز سے؟"
وہ اٹھ بیٹھی۔ "میں اس موسم میں رات کو بھی باہر نکل جاتی تھی۔ ابا نے ایک بار مجھے قبرستان میں پکڑا اور اپنے ساتھ لے آیا کہ چڑیل مشہور ہو جائے گی۔ میں نے کہا کہ میں تو خود چڑیلوں کو دیکھنے آئی ہوں۔ آج تک کوئی جن بھی عاشق نہیں ہوا مجھ پر۔۔۔ ابا بہت بگڑا کہ پاگل ہو گئی ہے مگر یہ سچ ہے۔ نہ مجھے چڑیل سے خوف آتا تھا نہ جن بھوت سے۔۔۔ تم نے سلونی کو پاگل کیوں کہا تھا؟"
میں ہنس پڑا۔ "یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔ یہاں سارا انتظام کیا اور خود غائب ہے۔۔۔ ہمیں ساتھ لے جاتی تو کیا تھا۔"
"خطرہ تھا سلیم۔۔۔ اگر پیر سائیں کے چھوڑے ہوئے کتے ہماری بُو سونگھتے یہاں پہنچ جاتے تو وہ بھی ماری جاتی۔ چلو کھانا کھا لو۔۔۔ مجھے بھوک لگنے لگی ہے۔"
میں اٹھ بیٹھا۔ "پیر سائیں اگر کسی جن کو بھی حکم دیتے۔۔۔ ان کے تابع تو شاہ جنات بھی ہے تو وہ بھی یہاں نہیں آسکتا تھا۔ یہ کمرا ہے اس قابل کہ اسے سی آئی اے والے لے جائیں۔ میں تو قائل ہو گیا، کیا دھوکے کا جال بچھایا ہے اس نے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ فرار ہونے والوں کا سراغ لگاتے ہوئے ان کے مرید اس کنوئیں میں اتر جائیں۔ وہاں ان کو یقین آجائے گا کہ مفرور ملزمان یہاں قیام کر چکے ہیں۔ کھانا پانی سب یہ ثابت کرے گا۔ ان کے یہاں سے نکلنے کا راستہ بھی مل جائے گا مگر آگے کچھ نہیں۔"
کھانا بہت پر تکلف نہیں تھا اور اتنا برا بھی نہیں تھا۔ گزر جانے والے سال میں میرے شب و روز پر آزمائش بھی رہے تھے اور پر آسائش بھی۔۔۔ میں نے تو جیل کا کھانا بھی کھایا تھا جو انسان تو کیا جانور بھی پسند نہ کرتے لیکن مجبوری سب سکھا دیتی ہے اور جسم کی ضرورت مجبوری بن جاتی ہے۔ انور کے ساتھ رہ کے میں نے رئیسوں کی زندگی بھی گزاری تھی اور آج پھر بے گھر تھا۔
گزر جانے والی رات سے گزرتی رات بہت مختلف تھی۔ قرار کی زندگی میں بھی آزمائش تھی اور فرار کے شب و روز میں بھی۔۔۔ اب میں بھی خاموش تھا اور خود ریشم یادِ ماضی میں گم تھی۔۔۔ وہ زمانہ تو جیسے بہت پیچھے رہ گیا تھا جب میں ہر نوجوان کی طرح خواب دیکھتا تھا۔
ریشم نے اچانک پوچھا۔ "کس خیال میں گم ہو؟"
میں چونکا۔ "کچھ نہیں۔ سوچ رہا تھا کہ وقت کی کروٹ آدمی کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ کل جو گزر گیا، کتنا مختلف تھا اور کل جو آنے والا ہے، اس کا کچھ پتا نہیں۔ نہ خواب میرا ساتھ دیتے ہیں اور نہ ارادے۔۔۔ پھر سوچنا کیا۔"
"تم نورین کے بارے میں سوچ رہے تھے۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "میں دیکھ رہی تھی۔"
میں نے خفت سے کہا۔ "ٹھیک کہا تم نے۔۔۔ اس کا خیال نہ ہوتا تو میں ملک سلیم اختر کی حیثیت سے لائف میں کب کا سیٹل ہو جاتا۔۔۔ انور نے بھی بہت مجبور کیا تھا اور شاہینہ سے سمجھوتا کر لیتا تو کیا میری حیثیت انور سے کم ہوتی؟"
"شاید زیادہ ہوتی۔"
"مجھے تو پیر سائیں نے اپنی جانشینی بھی سونپ دی تھی۔ بہت عیش کی زندگی ہوتی میری۔ کسی چیز کی کمی نہ ہوتی مجھے۔"
"سوائے نورین کے۔"
"ہاں اگر میں انور جیسا بن سکتا تو نورین بھی مل جاتی۔ کچھ سب میرے ہاتھ میں ہوتا تو شاہینہ کیا کر سکتی تھی۔ یہاں کا چلن یہی ہے اس عمر میں پیر سائیں کا دل تم پر آگیا اور انہوں نے کسی کی پروا کیے بغیر عقد ثانی کا فیصلہ کر لیا تو ان کی بیوی صبر کا کڑوا گھونٹ پینے کے سوا کیا کر سکی؟ اور انہیں بھی چھوڑو۔۔۔ انور کے لیے محبت کیا تھی؟ جذبات کا

کھیل۔۔۔ اس کھیل میں جیت ہوئی عقل کی۔۔۔ اس نے پوری کوشش کی آخر تک کہ تمہیں بھی حاصل کر لے اور اس جاگیر سے بھی محروم نہ ہو جو روزینہ کے ساتھ اس کی ہوتی۔"
"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔" وہ آہستہ سے بولی۔
میں نے کہا۔ "میں تمہارا دل نہیں دکھانا چاہتا تھا انور کے ذکر سے۔"
"میں نہ پاگل ہوں نہ تمہارے جیسی۔۔۔ کتنی عیاشی کی ہوتی میری بھی زندگی۔۔۔ اگر میں انور سے سمجھوتا کر لیتی مگر محبت کیا جاگیر تھی کہ تقسیم کر لی جائے۔"
"انور ایسا ہی سمجھتا ہے۔"
"ہاں ابھی تو میں تمہاری مجبوری کا بوجھ بن گئی ہوں۔۔۔ ہے نا یہی بات۔"
"تم میری ذمے داری ہو۔۔۔ یہ بات تمہیں سمجھ لینی چاہیے۔"
"کیا ہے تمہارے پاس خود اپنی ذمے داری نبھانے کے لیے۔۔۔ پریشانی تو ہو گی مگر میری فکر مت کرنا۔۔۔ میں خود بھی بہت کچھ کر سکتی ہوں۔"
مجھے ہنسی آئی۔ "تم کیا کام کر سکتی ہو؟"
اس نے خفگی سے کہا۔ "میں کون سا کام نہیں کر سکتی۔۔۔ بتاؤں؟"
"بس بس۔۔۔ مجھے معلوم ہے تم کیا کرتی رہی ہو۔۔۔ لیکن کسی بھائی کے ہوتے تمہیں تو ایسی فکروں میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج میں خالی ہاتھ ہوں تو کیا۔"
وہ اٹھ بیٹھی۔ "سلیم! آج بھی خالی ہاتھ نہیں ہو تم۔۔۔ وہ جو نوٹ تم نے نکالے تھے دریا میں سے۔۔۔ اور پھر انہیں سکھایا تھا۔ وہ سب ہیں۔"
"ہیں کہاں۔۔۔ تھے۔ انہیں میں اپنے ساتھ لے گیا تھا مگر وہ سب حویلی میں رہ گئے۔"
"یہی بتا رہی ہوں میں تم کو۔۔۔ میں نے وہ سب سلونی کے حوالے کر دیے تھے کہ سنبھال کے رکھے۔ کتنی رقم تھی سب؟"
"نو لاکھ سے کچھ اوپر۔۔۔ لیکن وہ تو میں نے بہت چھپا کے رکھی تھی۔۔۔ اپنے بیڈ کے نیچے۔"
"سلونی کو وہیں سے ملی تھی۔ صفائی کے دوران۔۔۔ تمہارا جو گدا تھا فوم کا۔۔۔ وہ بہت دب گیا تھا پرانا ہو کے۔۔۔ اس کی جگہ نیا ڈالا گیا تھا۔ تمہیں پتا نہیں چلا؟"
"اکثر تو یہ ہوتا تھا کہ میں بیڈ پر گرتے ہی سو جاتا تھا یا

شکوہ

خاتون خانہ نے قدرے غصے سے نئی نوجوان ملازمہ سے کہا۔
"میں جب بھی کچن میں آتی ہوں، تمہیں کوئی کام کرتے نہیں دیکھا، تم بس بیٹھ کر فلمی رسالے ہی پڑھتی رہتی ہو۔"
"بیگم صاحبہ! ایک تو آپ چپلیں ایسی پہنتی ہیں کہ آواز ہی نہیں آتی ......؟" ملازمہ نے الٹا شکوہ کیا۔

آگ

ایک آدمی کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تو وہ بھاگنے لگا۔ اس کے پیچھے ایک اور آدمی دوڑتا ہوا آرہا تھا۔ اتنے میں کسی نے پہلے والے آدمی کو کمبل اوڑھا دیا اور آگ بجھ گئی۔ اس کے پیچھے بھاگنے والا آدمی بھی آگیا اور کہنے لگا۔
"آگ تو بعد میں بھی بجھائی جا سکتی تھی، پہلے مجھے ایک سگریٹ تو سلگانے دیتے ......"

شرم

ایک شخص سڑک پر جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ... گنڈیریاں بھی چوس رہا تھا۔ دوسرا شخص اس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا اور چوسی ہوئی گنڈیریاں جو کہ پہلا شخص پھینک رہا تھا، انہیں اٹھا کر چوسنے لگتا......
اتنے میں پہلے شخص نے اسے دیکھا اور کہا۔
"ارے کتنے کنجوس ہو پھینکی ہوئی گنڈیریاں چوس رہے ہو، شرم نہیں آتی۔"
دوسرا شخص بولا۔ "شرم تو تمہیں آنی چاہیے، چوسنے کے بعد...... ایک قطرہ رس تک نہیں چھوڑا۔"

بوش

ایک سردار جی نے مالٹوں کی ریڑھی لگائی، دس دن تک مالٹے نہیں بکے اور سوکھ کر چھوٹے ہو گئے، گیارھویں دن سردار جی مالٹوں کو پانی لگاتے ہوئے بولے۔ "او نئیں بکناتے نہ بکو، پر ہوش وچ تے آؤ۔"

کراچی سے نہال کاظم کی سوغات

واقعی مجھے تبدیلی کا احساس نہیں ہوا۔ یہ کب کی بات ہے؟''
''یہ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ سلونی کے جانے سے چند روز پہلے میں نے سب اس کے حوالے کر دیا تھا۔''
''کیوں؟ مجھے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا؟''
''وہ دراصل۔۔۔ اس وقت تم نے بھی یہ طے کر لیا تھا اور میں نے بھی۔۔۔ کہ جیسے بھی ہو حویلی سے نکلنا ہے۔ سلونی جاتے وقت اپنا پتا دے گئی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اس کے پاس امانت رکھوا دوں۔ ہم نکلیں گے تو کام آئے گی۔ اور اب دیکھ لو ہم اس کے انتظار میں بیٹھے ہیں یہاں۔۔۔ صبح وہ آئے گی اور ہمیں لے جائے گی۔۔۔ ہاں تمہیں بتایا نہیں یہ میری غلطی تھی۔''
''وہاں رہتے ہوئے مجھے خیال بھی نہیں آتا تھا۔ ساری ضروریات انور پوری کرتا رہا۔ تم نے کیا کیا، وہ غلطی آج ایک نیکی ثابت ہو رہی ہے۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔''
''سلونی بڑی مخلص اور اچھی لڑکی ہے مگر اتنی ہی بدقسمت بھی ہے۔ ساری عمر وہ دوسروں کے کام آتی رہی۔ وہ مدد نہ کرتی تو میں پیر سائیں کی قید سے کیسے نجات پاتی۔ وہ تمام عمر کے لیے مجھے قید کر لیتا۔ نکاح کی زنجیر میرے پیروں میں ڈال دیتا۔ اسے شرم بھی تو نہیں آتی۔ اب میں کیا بتاؤں۔۔۔ وہاں عورتوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ اس کی بیوی، بیٹی سب جانتی ہیں لیکن اسے روکے کون۔۔۔ اس کی ہوس ہی ختم نہیں ہوتی۔''
''سلونی کے بھائی نے مجھے بھی خبردار کر دیا تھا اور میں تیار تھا لیکن سمجھ نہیں آتا تھا کہ آخر یہ سب کیسے ہوگا۔ مجھ پر بھی احسان ہے ان کا۔۔۔ ورنہ جیسے تم اس بڈھے کھوسٹ فراڈ پیر کے شکنجے میں تھیں، مجھے اس کی بیٹی نے اپنے جال میں قید کر لیا تھا۔ میں کیا بتاؤں کیسی عورت ہے وہ۔۔۔ ہوس میں باپ سے بھی دو قدم آگے۔۔۔ اور ایک بات شاید تمہیں معلوم نہ ہو۔۔۔ تم تو انور ہی کو بڑے بھائی کا قاتل سمجھتی ہو نا۔۔۔ کہ اس نے جاگیر کے لالچ میں یہ خون کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکبر کو خود اس کی بیوی نے زہر دیا تھا۔۔۔ ریشم۔۔۔ تم نے سنا؟''
لیکن ریشم باتیں کرتے کرتے سو گئی تھی۔ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر بدحال تھی۔ عام طور پر خواتین اس معاملے میں زیادہ خوش قسمت ہیں کہ وہ پریشان یا فکرمند ہوں تب بھی بے خوابی کا شکار نہیں ہوتیں۔ نیند ان کو تازہ دم کر دیتی ہے۔

بارش اور گرج چمک تھم چکی تھی اور باہر سے سیکڑوں مینڈک ایک ساتھ گا کے اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ ڈاک بنگلے کے کھنڈر میں جھینگر اپنا راگ الاپ رہے تھے۔ لالٹین ابھی روشن تھی ورنہ اندر مکمل تاریکی میں یہ جگہ زیادہ آسیب زدہ لگتی۔ میں نے گزر جانے والی رات کا تصور کیا پھر شاہینہ کے اور پیر سائیں کے بارے میں سوچا تو میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ پیر سائیں کے اندر غصے، بے بسی، توہین اور انتقام کے جذبات کا آتش فشاں کیسے ابل رہا ہوگا اور شاہینہ اپنی ساری ہوشیاری، عیاری اور چالاکی کے باوجود اس شکست پر کتنی تلملا رہی ہوگی۔ اس کا بازی جیت لینے اور اپنے عزائم میں کامیابی کا سارا غرور خاک میں مل گیا تھا۔ اب باپ بیٹی گلے مل کے روئیں اور ایک دوسرے کو تسلی دیں کہ وہ فرار ہو کے کہاں جا سکتے ہیں۔ بہت جلد وہ دست و پابستہ واپس لائے جائیں گے۔
جب میری آنکھ کھلی تو بے در و دیوار کے اس گھر میں ہر طرف سے اجالا اندر آ رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو اندازہ ہوا کہ اس ویرانے کی بے آرامی میں بھی جسم نے توانائی حاصل کرنے کے لیے نیند کی ضرورت پوری کر لی تھی۔ باہر دھوپ تھی اور نیلا آسمان چمک رہا تھا۔
میں نے ریشم کو آواز دے کر جگایا۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔ ''کیا سلونی آ گئی ہے؟''
''نہیں، ابھی تو نہیں۔۔۔ لیکن آنے والی ہوگی۔''
ہم نے رات کے بچے ہوئے کھانے کو ناشتے کے طور پر کھایا اور باہر آ کے سلونی کے آنے کا انتظار کرتے رہے۔ ایک دھلا دھلایا جنگل دھوپ میں زیادہ نکھر آیا تھا اور بھیگے ہوئے درختوں سے بخارات کی صورت میں عجیب سی مہک پھیل رہی تھی۔
میں نے ریشم کے ساتھ گرد و نواح کا سارا علاقہ دیکھا۔ وہ کچی سڑک بھی دیکھی جس پر سفر کر کے ہم اس جگہ پہنچے تھے۔ ابھی تک اس طرف کوئی ٹریفک نہ تھی۔ کوئی تانگا ریڑھا، بیل گاڑی یا سائیکل بھی ادھر سے نہیں گزری تھی۔ شاید اس راستے کو صرف ڈاک بنگلے تک آنے جانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہوگا۔
انتظار کا وقت طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔ میں بار بار گھڑی دیکھتا رہا۔ وقت تھا کہ جیسے ٹھہر گیا تھا۔ بالآخر خود ریشم نے کہا۔ ''بہت دیر کر دی اس نے۔۔۔ اللہ خیر کرے۔ سلونی کو معلوم ہوگا کہ یہاں ایک رات گزارنا بھی مشکل ہے۔۔۔ یہاں تک اس نے سب انتظام کر دیا تھا۔''

''میری سمجھ میں تو اس کی منطق بھی نہیں آتی۔ اس میں کسی کے لیے کیا خطرے کی بات تھی۔ ادھر سے ابھی تک کوئی نہیں گزرا۔ اور اس کھنڈر میں تو بھوت بھی نہیں ہیں۔ وہ یہاں رنگیلا کے ساتھ انتظار کرتی اور ہمیں لے جاتی۔ کوئی ضرورت نہیں تھی اس تمام اہتمام کی جو اس نے ہمارے قیام کے لیے کیا۔''
''ہاں مگر رات بھی گزر گئی۔ اب تو آنا چاہیے اسے۔۔۔ آخر اس کا ٹھکانا کتنی دور ہوگا اس جگہ سے؟''
میں نے کہا۔ ''یہ اندازہ ہے۔۔۔ کہ ہم ملتان کے قریب ہوں گے۔ تمہارے پاس سلونی کا ایڈریس ہے؟''
''مجھے زبانی یاد ہے۔''
''کہیں ایسا تو نہیں کہ پیر سائیں کے ڈیرے یا چودھریوں کی حویلی میں کسی کو معلوم ہو۔۔۔ انور کو شک تھا کہ وہ چوری چھپے نکلی تھی انور کو بتائے بغیر۔''
''مگر اس نے بڑے چودھری، اس کی بیوی اور شاہینہ سے اجازت لی تھی۔ مجھے معلوم ہے۔''
''اب مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا ہے۔ یہاں تو کسی کا پہنچنا ناممکن تھا مگر ایسا نہ ہو کہ سلونی کا سراغ مل گیا ہو۔ وہ اپنا ایڈریس ایک کاغذ کے پرزے پر لکھ کے دے گئی تھی۔ وہ تمہارے پاس تھا۔''
''ہاں لیکن پتا یاد کر کے میں نے اسے پھینک دیا تھا۔''
''کہاں پھینک دیا تھا؟''
''یہ تو مجھے یاد نہیں مگر وہ کسی کے ہاتھ نہیں لگ سکتا تھا۔''
''تمہیں جلا دینا چاہیے تھا اس پرزے کو۔ خیر، اب بہتر یہی ہے کہ ہم خود اس کے پاس پہنچ جائیں۔ جا کے دیکھ لیں کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ اتنی غیر ذمے داری کا ثبوت کبھی نہ دے گی۔''
''اگر ہم بھی پکڑے گئے پھر؟ سلونی تک پہنچنے والے اسی انتظار میں ہوں گے۔''
''فکر مت کرو، ہم پہلے جائزہ لیں گے۔۔۔ دور سے۔۔۔ چلو۔''
''مگر ہم جائیں گے کیسے۔۔۔ یہاں سے ملتان تک۔''
''پیدل۔۔۔ یار ہم کوئی قطب شمالی پر تو نہیں رہتے ہیں۔ آگے مل جائے گی کوئی نہ کوئی سواری بھی۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔

ہمیں کون سا سامانِ سفر سمیٹنا تھا۔ ہر چیز جہاں تھی وہیں پڑی رہی۔ ریشم نے ایک بیگ ضرور اٹھا لیا اور میں نے پانی کی بوتل ساتھ رکھ لی۔ اس کچے راستے پر سے ٹائروں کے نشان بھی گزشتہ رات کی بارش نے مٹا دیے تھے۔ جگہ جگہ پانی جمع تھا اور کچے راستے پر بھی کیچڑ سے بچ کر چلنا ضروری تھا۔ ریشم پر بھی عجیب سی مایوسی سوار تھی۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ سلونی بلاوجہ دیر کرنے یا رکنے والی نہیں تھی۔ وہ انتہائی ذمے دار عورت تھی۔
پیدل چلتے ہوئے میں اپنے خیالوں میں گم تھا اور نہ جانے ریشم کیا سوچ رہی تھی۔ وہ کچا راستہ بروقت ایک سڑک سے جا ملا ورنہ شاید ریشم رونا شروع کر دیتی۔ تھکن کے علاوہ اس کا موڈ سخت خراب تھا۔ اس خیال نے میرے ساتھ اسے بھی ڈسٹرب کیا تھا کہ سلونی کسی مشکل میں گرفتار ہوگی۔ اس نے رنگیلا کے ساتھ مل کر ہماری رہائی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس کے بغیر شاید ہم نکل بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ بات ناممکن نہیں تھی کہ کسی نے اسے پہچان لیا ہو یا رنگیلا کو۔۔۔ رنگ روپ بدل لینے کے باوجود ان کے چہرے وہی تھے اور میں نے انہیں شناخت کر لیا تھا۔ سلونی کا ایک بھائی درگاہ پر تھا اور یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہوگی۔۔۔ شک ہو جانے کی صورت میں اس بھائی سے سلونی کے بارے میں پوچھ گچھ کی جا سکتی تھی۔ اسے مجبور کیا جا سکتا تھا کہ وہ اپنی بہن کا پتا بتائے۔ شک براہِ راست اس کے سوا کسی اور پر نہیں جاتا تھا۔
اس سڑک پر پہلے ہمیں سامنے سے آنے والا ایک سائیکل سوار ملا۔ وہ ریشم کو دیکھنے میں ایسا محو ہوا کہ اسے اپنی سمت کا ہوش نہ رہا اور ہم تو خیر بچ گئے مگر وہ سڑک سے اتر کے پانی سے بھرے ایک گڑھے میں اتر گیا۔ اس کے حلق سے کچھ ''حق'' جیسی آواز نکلی۔ پھر ہم نے دیکھا تو ہنس ہنس کے ہمارا برا حال ہو گیا۔ پتلا کیچڑ اس کے کپڑوں پر اور منہ پر پھیل گیا تھا اور وہ گڑھے میں یوں بیٹھا تھا جیسے اپنے باتھ روم کے ٹب میں ہو۔ اس کی سائیکل کا پچھلا پہیا پانی سے باہر آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ شرمندگی میں خود پر ہنسنے کے سوا وہ کیا کر سکتا تھا۔
''مجھے تو لگتا ہے ملتان تک پیدل جائیں گے ہم۔۔۔'' ریشم نے فریادی لہجے میں کہا اور قدرت کو شاید رحم آ گیا کہ اسی وقت پیچھے سے کسی ٹرک کے انجن کی غراہٹ سنائی دی۔ ہم رک گئے اور ٹرک کو قریب آتا دیکھنے لگے۔ یہ

عام لوڈنگ میں استعمال ہونے والا پرانا ٹرک تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا جو مٹھی میں دبا کے سگریٹ پی رہا تھا۔ ہمارے اشارے کے بغیر ٹرک قریب آ کے رک گیا۔

ڈرائیور نے ریشم کو گھورتے ہوئے سر لگایا: ''کدھر جانا ہے کڑیے؟''

میں نے کہا۔ ''ملتان۔''

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔ ''ملتان! یہ کس نے بتایا ہے کہ یہ سڑک تمھیں ملتان پہنچا دے گی؟''

میں نے گڑبڑا کے کہا۔ ''ملتان کو ادھر ہی ہونا چاہیے۔''

وہ پھر ہاتھ ملا کے ہنسے۔ ''لوکر لوگل۔۔۔ ہونا چاہیے ادھر۔۔۔ مگر کیا کریں۔۔۔ بے وقوفوں نے دوسری طرف بنا دیا۔''

''تم تو خیر سے بڑے سیانے ہو کہ پیدل ہی چل پڑے۔'' ڈرائیور نے انجن کو ریس دی۔ ''ساری دنیا کا چکر لگا کے آؤ گے تو ملتان دو سو کلومیٹر پیچھے ملے گا۔ جاؤ رب راکھا۔''

میں نے گھبرا کے پیچھے دیکھا۔ ''دو سو کلومیٹر۔۔۔ پیچھے۔''

دوسرے نے سگریٹ کا لمبا کش لیا۔ ''یار شہری لوگ ہیں اور لگتا ہے ان کی گاڑی کہیں خراب ہوگئی راستے میں۔''

''جب ہی تو اپنی ووہٹی کو لے کر چل پڑا پیدل۔۔۔ پر بابو۔۔۔ ادھر جنگل میں تم آئے کیوں تھے جہاں سے کوئی گزرتا بھی نہیں؟''

ڈرائیور بولا۔ ''ارے بے وقوفا۔۔۔ نئی نئی شادی ہو گی۔ نظر نہیں آتا۔۔۔ یہ لوگ جاتے ہیں سیر کرنے۔۔۔ کیا کہتے ہیں اسے۔۔۔ ہنی مون۔''

میں نے کہا۔ ''تم اپنی بکواس بند کرو تو میں بتاؤں کہ نہ میری گاڑی خراب ہوئی ہے نہ یہ میری ووہٹی ہے۔ یہ بہن ہے میری۔''

''اچھا جی غلطی معاف۔''

میں نے کہا۔ ''اب یہ بتاؤ کہ تم ہمیں ملتان لے جا کے چھوڑنے کا کیا لو گے؟''

''بابو کرایہ پوچھ رہا ہے۔'' ڈرائیور نے اپنے ساتھی کو دیکھا۔

''بندہ لگتا تو پیسے والا ہے مگر کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا گناہ ہے۔ چل آج نیکی کرتے ہیں۔ ان کو لے جاتے ہیں ملتان۔''

''ہمیں واپس جانا پڑے گا۔۔۔ سوچ لے۔''

''کوئی نہیں یار۔ آج نقصان کا سودا ہی سہی۔۔۔ بلا، آجاؤ اوپر۔''

میں نے کہا۔ ''ملتان تک جانا ضروری نہیں۔ راستے میں جہاں بھی کوئی سواری ملتان کی ملے وہاں اتار دینا۔۔۔ بس ہو یا ویگن۔۔۔ یا ٹیکسی۔''

جو شخص ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا، نیچے اتر آیا۔ ''بلا جی آپ آگے میں اور بابو پیچھے تشریف رکھتے ہیں۔''

''میں بھی پیچھے رہوں گی۔'' ریشم بولی۔

''او نہ جی۔۔۔ آپ آرام سے بیٹھو، پیچھے کھڑا رہنا آپ کے بس کی بات نہیں۔ راستہ بہت خراب ہے۔''

میرے اشارے پر ریشم ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں دوسرے شخص کے ساتھ پچھلے حصے میں کھڑا ہو گیا۔ نہ جانے کیوں مجھے شک ہو گیا تھا کہ ان دونوں نے شراب یا سستی چرس پی رکھی ہے جو ٹرک ڈرائیور تھکن سمجھ کے استعمال کرتے ہیں۔ میرے ساتھ کھڑا ہوا شخص سیدھا کھڑا ہونے سے بھی قاصر تھا جب ٹرک نے کئی بار ریورس میں جا کے مخالف رخ میں چلنا شروع کیا تو اونچی آواز میں ایک پنجابی گیت گانے لگا۔ آ سینے نال لگ جا ٹھاکر کے۔۔۔ وہ انتہائی بے سرا تھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ کیا واہیات گانا ہے۔''

''واہیات؟ وہ کیا ہوتا ہے جی۔۔۔ خیر سے فلم دیکھی ہے آپ نے؟ نہیں؟ میں نے دیکھی ہے۔''

اس سے بات نہ کرنا ہی بہتر تھا۔ فکر مجھے ریشم کی تھی۔ ڈرائیور بھی مجھے اسی قماش کا آدمی لگتا تھا جسے شریف بہرحال نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ واپسی پر ہم پھر اس ڈاک بنگلے کے پاس سے گزرے جہاں ہم نے رات گزاری تھی۔ ایک خلش سی مجھے اور تھی۔ سورج کی سمت کچھ اور بتاتی تھی کہ ملتان ادھر نہیں ہو سکتا۔ ہم غلط سمت میں نہیں جا رہے تھے۔

اچانک میں نے ریشم کے چلانے کی آواز سنی۔ ''بدمعاش۔۔۔ غنڈے روکو ٹرک۔'' لیکن اس کے ساتھ ہی ٹرک کچے راستے پر اتر گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ ریشم کی ڈرائیور کے ساتھ کشمکش جاری ہے۔ میرے کچھ کہنے یا کرنے سے پہلے اس شخص نے جو میرے ساتھ کھڑا اپنا بے سرا راگ الاپ رہا تھا، اپنی ڈب سے ایک خنجر نکال لیا۔ ''چل اتر تھلے نئیں تے۔۔۔''

میں نے اسے آگے کچھ بولنے کی مہلت ہی نہ دی۔

ایک جھٹکے میں خنجر بھی ہوا میں اُڑا تھا اور وہ خود بھی۔ اس کے بعد وہ بھی نیچے کود گیا۔ جسے میں نے پھینکا تھا، وہ ایک درخت کے تنے سے ٹکرایا تھا اور سر پکڑے وہیں بیٹھا کراہ رہا تھا۔

یہ صورت حال میرے لیے انتہائی غیر متوقع تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عام دیہاتی نظر آنے والے ڈاکو بھی ہو سکتے ہیں اور غیب سے ملنے والی مدد پر خوش ہونا ہمیں مہنگا پڑ سکتا ہے۔ یہ تو بہت بعد میں پتا چلا کہ وہ ٹرک بھی انہوں نے کسی سے چھینا تھا۔ ایک سے میں نے بہ آسانی نمٹ لیا تھا، ابھی دوسرے سے نمٹنا باقی تھا۔ ٹرک گڑھے میں دھنسا ہوا تھا کہ مٹی ملے پانی کا ریلا اوپر اٹھا۔ ریشم اتنی دہشت زدہ تھی کہ ادھر دیکھے اور انجام کی پروا کیے بغیر دروازہ کھول کے باہر چھلانگ لگا چکی تھی۔ چھینٹے اس پر ضرور آئے تھے مگر وہ خود اس دلدل میں نہیں گری۔

ڈرائیور کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ آخری وقت میں اسے اندازہ ہو گیا کہ ٹرک اس کے کنٹرول سے باہر ہو کر گڑھے میں جا رہا ہے۔ اس نے اسٹیئرنگ اور بریک سے روکنے کی کوشش بھی کی ہوگی۔ ایسا ہر ڈرائیور کے ساتھ ہوتا ہے۔ مختصر ترین مہلت میں وہ پہلے حادثے سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر اسی ایک لمحے میں اس کی چھٹی حس خبردار کر دیتی ہے کہ کوشش سے کچھ نہیں ہوگا۔ اس لمحے کے آخری حصے میں خود حفاظتی کا ردِعمل سامنے آتا ہے۔ جسم خود اپنے آپ کو بچاتا ہے۔

ڈرائیور نے چھلانگ ماری اور اُدھر ٹرک پانی میں گیا، ادھر وہ گڑھے سے باہر گرا۔ مجھے پہلے دشمن سے نمٹنے میں چند لمحوں کی تاخیر ہو گئی۔ ٹرک کا اگلا حصہ نیچے گیا تو پیچھے میں تھا اور میرے ہاتھوں نے سر کے اوپر لگی ہوئی فولادی فریم پکڑ لیا۔ یہ فریم ٹرک پر بارش کی صورت میں مال کو بچانے کے لیے ترپال کو سپورٹ کرتا ہے۔ ٹرک ساکت ہوا تو میں نے خود کو درخت کے اوپر لٹکتا پایا۔ ٹرک کے فرش پر اتر کے میں نے پہلے ریشم کو دیکھا۔ بدحواس ہونے کے باوجود وہ کھڑی ہوئی تھی اور چلا رہی تھی۔ ''سلیم۔۔۔ سلیم۔۔۔ تم ٹھیک ہو؟''

میں نے دوسری طرف چھلانگ ماری۔ ڈرائیور کو چند لمحوں کی مہلت مل گئی تھی۔ اس نے اپنے ساتھی کا انجام دیکھا اور خطرے کو محسوس کرتے ہی ڈب میں سے اسلحہ نکال لیا۔ یہ ایک پرانا ریوالور تھا۔ گھبراہٹ میں وہ پیچھے ہٹا اور ریوالور میری طرف تان لیا۔ اس کے ہاتھ ہی نہیں آواز بھی کانپ رہی تھی۔

''رک جاؤ ادھر ہی۔۔۔ نہیں تو میں گولی مار دوں گا۔'' اس نے غیظ و غضب میں ایک گالی اگلی۔ میں نے ریشم کی آواز سنی جو مجھے خبردار کر رہی تھی۔

یہ جوڈو کراٹے کے اصولوں کی بنیادی تربیت کا اصول ہے کہ تمھیں مشتعل نہیں ہونا چاہیے لیکن یہ میری فطرت تھی۔ مخالف اور نامساعد حالات میں میری جسمانی توانائی میری عقل کے تابع ہو جاتی تھی۔ جو ایسا نہ کر سکے وہ اس سپاہی جیسا ہو جاتا ہے جس کے پاس بندوق ہو۔ وہ اسے چلا بھی سکتا ہو مگر نشانہ نہ لے سکتا ہو۔ میں نے ریشم کی چیخ پکار بھی نہیں سنی اور فائر ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ میرے سامنے کا حریف خوف زدہ اور نروس تھا۔ جو اسلحہ اس کے ہاتھ میں تھا، اس کا استعمال کیے بغیر وہ مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے غوطہ مارا اور اسی وقت فائر کی آواز سنائی دی۔ گولی دائیں بائیں یا میرے سر کے اوپر سے گزر گئی ہوگی۔ محفوظ ہونے کا یقین آتے ہی میں جھکے جھکے آگے بڑھا اور دشمن کے پیٹ میں اندھے بھینسے کی طرح گھس گیا۔

ضرب المثل

پارس ناتھ سے چکی بھلی، جو آٹا دیوے پیس
دو کڑھ نر سے مرغی بھلی، جو انڈے دیوے بیس
مطلب: بے فیض سے وہ شخص اچھا جس سے لوگوں کو فائدہ ہو۔

☆☆☆

آٹھ گاؤں کا چوہدری، بارہ گاؤں کا راؤ
اپنے کام نہ آئے تو، ایسی تیسی میں جاؤ
مطلب: کبھی وقت پر کوئی شخص کام نہ آئے تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

☆☆☆

بھاٹ بھٹیاری بیسوا، تینوں جات کجات
آنے کا تو آدر کریں، جاتے نہ پوچھیں بات
مطلب: مطلب کے وقت قدر کرنے اور بعد میں بھول جانے والوں کے لیے۔

(داجل سے ذاکم علی گورچانی کا تعاون)

وہ پستول کوری لوڈ کر کے پھر نشانہ لے رہا تھا جب میرے سر کی ٹکر نے اس کے قدم اکھاڑ دیے۔ وہ پیچھے کی طرف گرا تو میں اس کے اوپر تھا۔ میرے ہاتھ خودبخود اس کی گردن کے گرد شکنجہ بن گئے اور میں نے مسلسل کئی بار اس کے سر کو زمین پر مارا۔ عادت کی مجبوری تھی یا انسانی جبلت کہ میرے منہ سے بھی گالیاں نکل رہی تھیں۔ پھر ریشم نے میرا کالر پکڑ کے کھینچا۔ "بس کرو۔ کیا اسے مار ڈالو گے؟" وہ چلائی۔

میں بے سدھ ہو جانے والے ڈرائیور کو چھوڑ کے کھڑا ہو گیا۔ اس کا ریوالور اٹھانے کے بعد میں نے ریشم کو دیکھا۔ "تم ٹھیک ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟" وہ دیوانہ وار میرے ہاتھوں، بازوؤں اور سینے کو ٹٹول کر دیکھنے لگی۔

میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ "خدا کا شکر ہے تمہیں کچھ نہیں ہوا۔ چوٹ تو نہیں آئی کہیں؟"

وہ ہچکیاں لینے لگی۔ "یہ بدمعاش ہمیں کہاں لے جا رہے تھے۔ ادھر تو نہیں ہے ملتان۔"

"نہیں۔ اللہ نے بچا لیا ہمیں۔ رونا بند کرو اب۔"

"ہم پیدل جائیں گے واپس۔۔۔ ملتان تک۔" وہ بولی۔

میں اسے چھوڑ کے ٹرک میں چڑھا۔ اس کا چھوٹا سا دروازہ کھلا ہوا تھا اور چابیاں اگنیشن کے سوئچ میں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے دروازہ بند کر کے انجن اسٹارٹ کیا اور ریس دے کر ٹرک کو گیئر میں ڈال دیا۔ اس کے طاقتور انجن نے زور لگایا تو اگلے پہیے گھومے اور ٹرک آگے بڑھا۔ اگر وہ اپنی جگہ پر گھومتے رہتے تو نرم مٹی اور کیچڑ میں زیادہ دھنستے جاتے۔ پہیے تھوڑا سا اوپر اٹھے اور ٹرک ایک دم گڑھے سے باہر آ گیا۔

میں نے ریشم کو اشارہ کیا۔ "آؤ۔۔۔ اپنی جگہ۔"

وہ قریب آ کے بولی۔ "سلیم! ہم کسی اور مصیبت میں نہ پڑ جائیں۔ چھوڑو ٹرک کو یہیں۔۔۔ ہم پیدل چلتے ہیں۔"

"تم فکر مت کرو۔ بیٹھو میرے ساتھ۔" میں نے کہا۔ ٹرک کو اسٹارٹ چھوڑنے کے بعد میں نیچے اترا۔ پستول والا تو بے سدھ ترچھا پڑا تھا اور ابھی اس کے ہوش میں آنے کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ دوسرا سنبھل گیا تھا مگر اس نے ہتھیار ڈال دینے میں عافیت جانی تھی۔ وہ خنجر کو شمشیر آبدار کی طرح لہراتا اپنے استادِ محترم کی مدد کے لیے نہیں اٹھا تھا۔ میں نے ڈرانے کے لیے اس کا نشانہ لیا تو اس کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ چلانے لگا۔ "او جی مینوں نہ مارنا۔ میں یتیم مسکین تے بے قصور ہوں۔ اس کمینے نے مجھے ٹرک چھیننے پر مجبور کیا تھا۔"

میں نے اسے ریوالور سے اشارہ کیا۔ "چپ کر کے سیدھا کھڑا ہو جا۔ جو میں پوچھوں سچ سچ بتاتا ہے، ورنہ۔۔۔ تیرے جسم میں سوراخ کر دوں گا۔"

وہ ہاتھ جوڑ کے سیدھا کھڑا ہو گیا مگر ایسے ہلتا رہا جیسے سردی سے کانپ رہا ہو۔ "یہ سچ ہے جی۔۔۔ میں نے ایسا کام کبھی نہیں کیا۔"

"اب بتا ملتان کدھر ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے مخالف سمت میں اشارہ کیا۔ "آپ ٹھیک جا رہے تھے۔ اس کمینے نے کہا کہ کڑی سوہنی اے۔۔۔ تے بندہ وی شہری لگدا اے۔"

"ٹرک کس سے چھینا تھا؟"

"ادھر جی۔۔۔ لودھراں سے آگے۔ اس میں گھی کے ڈبے بھرے ہوئے تھے۔"

میں نے کہا۔ "ڈبے کہاں گئے؟ اور ڈرائیور کے ساتھ تم نے کیا کیا؟ اسے مار تو نہیں دیا؟"

اس نے سر جھکا لیا۔ "ڈبے تو جی۔۔۔ آدھی قیمت پر دے دیے ایک دکان پر۔" اس نے جیب میں سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکالا۔ "یہ بیس ہزار ہیں پورے۔"

ان کی پوری واردات سامنے آ گئی تھی۔ انہوں نے گودام یا فیکٹری سے گھی سپلائی کرنے والے ٹرک ڈرائیور کو مار کے سارا مال آدھی قیمت پر کسی لالچی دکاندار کے حوالے کر دیا تھا۔ اسی رقم سے انہوں نے شراب پی ہوگی اور اب ٹرک میں نہ جانے کہاں جا رہے تھے کہ نشے میں ریشم کو دیکھ کے شیطان غالب آ گیا تھا۔ انہیں اپنے کیے کی سزا بہت جلد مل گئی۔ بیس ہزار کے نوٹ جیب میں ڈال کے میں نے پوچھا۔ "پیچھے کوئی رسی ہے؟"

اس نے کدو جیسا سر ہلایا۔ "کیا آپ پھانسی دو گے ہمیں؟ میرا تو کوئی قصور نہیں۔۔۔ میں یتیم مسکین۔۔۔"

میں نے اس کے ایک لات رسید کی۔ "یتیم مسکین کی اولاد۔۔۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہ کر ورنہ سچ مچ پھانسی دوں گا پہلے تجھے۔"

اس نے پہلے استادِ محترم کا بنڈل میری ہدایات کے مطابق بنایا۔ پھر میں نے اس کو باقی ماندہ رسی سے باندھا۔ ریشم نے ان دونوں کے منہ میں کپڑے ٹھونسنے کا کام بڑے شوق سے کیا۔ ان کی طرف سے بے فکر ہو کے میں استاد کی

جگہ بیٹھا اور میرے ساتھ ریشم بیٹھ گئی۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم؟" اس نے بے اطمینانی سے کہا۔

"ڈرائیونگ۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"میرا مطلب تھا ٹرک چوری کا ہے اور اس میں اب دو بندے بھی پڑے ہیں۔"

"بندے نہیں وہ چور ہیں۔"

"تو کیا تم انہیں لے کر تھانے جاؤ گے؟ کیوں خوامخواہ اس چکر میں پڑتے ہو۔ میں تو کہتی ہوں اس کو چھوڑو یہاں۔"

"نہ میں تھانے جا رہا ہوں اور نہ ٹرک چھوڑ کے پیدل ملتان تک جانے کا خیال ہے۔ پولیس کی تم فکر مت کرو۔ ٹرک ڈرائیور کو تو اس نے مار دیا تھا۔ رپورٹ کون لکھوانے گیا ہوگا۔ جب تک مالکوں کو پتا نہ چلے، کوئی بھی کارروائی نہیں ہوگی۔ اسے زیادہ فکر ہوگی کہ سو ڈبے گھی کے کہاں گئے۔ ڈرائیور کا کیا ہے، دوسرا مل جائے گا۔ ٹرک تو مل گیا ہے۔ پولیس بھی کہے گی کہ صبر کرو کیونکہ اللہ صبر والوں کے ساتھ ہے۔"

وہ ملتان پہنچنے تک بالکل نہیں بولی۔ شہر کے مضافات میں مجھے ایک پولیس اسٹیشن دکھائی دیا تو میں نے بہتر سمجھا کہ ٹرک کو اس کے سامنے کھڑا کر دوں۔ چابیاں لگی چھوڑ کے میں نیچے اترا اور دوسری طرف سے ریشم کو اتار لیا۔ ریشم پریشان تھی اور پیچھے مڑ مڑ کے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی اس کے تعاقب میں ہو۔ ایک فرلانگ دور آ کے اس نے کہا۔ "وہ بیس ہزار تم نے رکھ لیے؟"

"پھر کیا کرتا؟ پولیس کے لیے چھوڑ دیتا؟"

"مگر وہ چوری کے تھے؟"

"چوری میں نے نہیں کی۔ اس وقت یہ غیبی امداد کیسے چھوڑ دوں۔۔۔ یا تو مالک کو تلاش کروں اور کہوں کہ یہ آپ کا مال ہے۔ وہ باقی کا پوچھے گا کہ سو ڈبے کس کو بیچے؟ میں کیا جواب دوں گا؟ معاملہ گیا پولیس میں تو سمجھو یہ رقم بھی گئی ان کی جیب میں۔۔۔ مالک بھی رسید مانگے تو وہ کہیں گے کہ اچھا پرچہ درج کرتے ہیں۔ جب کیس کا فیصلہ ہو تو لے لینا۔ اس سے بہتر ہے یہ ہمارے کام آئے۔ حلال کا مال کام آیا۔"

وہ میری دلیل سے قائل تو کیا ہوتی، خاموش ہو گئی۔ مجھے ایک عجیب طمانیت محسوس ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ ریشم اس جنگل میں وحشت ڈاکوؤں کے ہاتھوں میں پڑنے سے بچ گئی تھی بلکہ ہمیں ملتان تک کی سواری مل گئی تھی اور جیب میں اتنی رقم آ گئی تھی کہ فوری ضرورت پوری ہو جائے۔

ملتان میں اب شام کے سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ پہچانے جانے کا خوف ایک بار پھر میرے اعصاب پر سوار تھا۔ ایک عجیب سے احساس نے مجھے گھیر لیا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ میرے دوست نہیں، دشمن بڑھ رہے ہیں۔

برقع کے اندر ریشم محفوظ تھی۔ میں صرف اللہ کے آسرے پر ایک اجنبی شہر میں اجنبیوں کے درمیان تھا۔ مجھے پھر روپوشی کی ضرورت تھی۔ اس کے دو ہی آزمائے ہوئے طریقے تھے۔ یا میں میک اپ سے اپنی شناخت کو بدل دوں۔۔۔ پھر پہلے کی طرح داڑھی اور چشمے کے ساتھ مصنوعی بالوں سے ایک نیا چہرہ بنا لوں یا پھر خود بھی ریشم کی طرح برقع میں غائب ہو جاؤں۔ یہ دوسرا طریقہ مشکل اور بڑی الجھن والا تھا۔ مگر سو فیصد تحفظ کی گارنٹی دیتا تھا۔

ایک جگہ رک کر ہم نے کھانا کھایا کیونکہ بھوک پیاس اور تھکن اب ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ وہیں ریشم نے ایک کاغذ کے پرزے پر وہ پتا لکھا جو سلونی نے دیا تھا اور ریشم کے دماغ میں محفوظ تھا۔ وہ ایک عمر رسیدہ سفید ریش اور نرم خو شخص تھا۔ اس نے پہلے یہ سمجھا کہ ہم اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ اس نے کہا کہ فلاں بازار میں جا کے فلاں جگہ اتر جانا۔ وہاں ایک کلاتھ اسٹور ہے۔ اس کے ساتھ والی گلی۔۔۔ بعد میں اس نے زیادہ تفصیل سے بتایا اور مشورہ دیا کہ ہم رکشا پر جائیں کیونکہ وہ جگہ نئی آبادی کا حصہ ہے اور کم سے کم بھی پندرہ کلومیٹر ہے۔

سلونی کا گھر اس وقت ہمارا واحد آسرا تھا۔ وہاں ہم اپنی تھکن اتارنے کے بعد بھی جب تک چاہتے رہ سکتے تھے۔ ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ کھانے سے فراغت پاتے ہی میں نے نئی آبادی جانے کے لیے ایک رکشے کو منہ مانگے معاوضے پر لے لیا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ ہم اجنبی ہیں۔ پہلی بار اُدھر جا رہے ہیں اور یہ ہو سکتا ہے کہ پتا آسانی سے نہ ملے۔ اسے ہمارے ساتھ رہنا ہوگا اگر زیادہ وقت لگے گا تو ہم اس نقصان کی تلافی بھی کریں گے۔

"کون ہے آپ کا وہاں؟" رکشے والے نے پوچھا۔

"بھائی ہے میرا۔ ریشم نے مجھ سے پہلے جواب دیا۔

رکشے والے نے پلٹ کے دیکھا۔ "اچھا بھائی ہے جس کا گھر نہیں دیکھا آپ نے؟"

میں نے کہا۔ "نیا بنوایا ہے ابھی مہینا بھر پہلے۔"

اس جواب سے وہ مطمئن نہیں ہوا۔ ''پتا نہیں جی۔۔۔ ایسا کیوں ہوتا ہے آج کل۔۔۔ مہینا بھی کم نہیں ہوتا مگر ہم نے گھر بنانے سے پہلے ساری دنیا کو بتادیا تھا کہ زمین لی ہے۔۔۔ اور مکان تو بعد میں بنا۔ زمین سارا خاندان پہلے دیکھ آیا تھا۔''

ریشم نے اسے ڈانٹا۔ ''کیا فضول بولتے جارہے ہو۔۔۔ میں یہاں نہیں تھی، ملک سے باہر تھی۔''

''اچھا اچھا۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''سعودی عرب میں؟''

ریشم کا ہاتھ دبا کے میں نے کہا۔ ''ہاں۔'' ورنہ وہ لندن، امریکا کہہ دیتی تو پھر جواب مشکوک ہوجاتا۔ کیا وہاں یہ برقع چلتا ہے؟

میں نے خدا کا شکر ادا کیا جب اس نے مجھ سے مزید کوئی سوال نہیں کیا ورنہ وہ مکہ مدینہ کے بارے میں بہت کچھ پوچھ سکتا تھا جن کا جواب تو دیا جاسکتا تھا کیونکہ سنی سنائی کا ذخیرہ میرے پاس کم نہ تھا۔ رکشا اچانک ایک بازار میں رک گیا۔ نئی آبادی اتنی نئی بھی نہ رہی تھی۔ شاید اس کا نام بھی نئی دلی کی طرح نئی آبادی پڑ گیا تھا۔ ''نام کیا ہے جی آپ کے سالے صاحب کا؟'' رکشے والا مجھ سے مخاطب ہوا۔

''تم اتنا فضول کیوں بولتے ہو؟ وہ میرا سب سے چھوٹا بھائی ہے۔'' میں نے کہا۔

''نام ہے مشتاق احمد۔''

''کیا کرتا ہے؟'' رکشے والے نے ایک بے ضرر سوال کیا۔ ''کوئی پوچھے تو۔۔۔ کیا بتاؤں۔''

میں نے کہا۔ ''کام یہی کرتا تھا وہ بھی پہلے۔۔۔ رکشا چلاتا تھا۔''

''رکشا چلاتا تھا؟ دس سال سے تو میں بھی چلا رہا ہوں مگر مشتاق احمد کوئی نہیں ہے۔''

ریشم کے خفا ہونے سے پہلے میں نے اسے روک دیا۔ ''دراصل اس کو اصل نام سے کوئی نہیں جانتا۔ پہلے مشتاق احمد دیوانہ کہلاتا تھا۔ اس کے رکشا کے پیچھے بھی دیوانہ لکھا ہوتا تھا۔ آج کل ٹیکسی چلاتا ہے اور رنگیلا مشہور ہے۔''

''لوجی حد کرتے ہو آپ بھی۔۔۔ پہلے بتانا تھا۔ جب میں لاہور میں تھا تو اس کا رکشا مشہور تھا۔ پھر وہ چلا گیا تھا پتا نہیں کہاں۔ اب آپ بتا رہے ہو ٹیکسی چلاتا ہے اور رنگیلا رکھ لیا ہے اپنا نام۔ آپ بیٹھو میں ابھی پوچھ کے آتا ہوں۔'' وہ جواب سنے بغیر رکشے سے اتر گیا۔

میں نے اسے ایک بیکری، پھر ایک بار بر شاپ [illegible] آخر میں دودھ دہی والے امرتسری حلوائی کے پاس [illegible] دیکھا۔ وہ مایوس لوٹا۔ ''یہاں تو کسی سے پتا نہیں چلا۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا، تم جاؤ۔۔۔ ہم پوچھ [illegible] گے۔''

دراصل میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہمارے سا[illegible] گھر تک جائے اور کل خدانخواستہ کوئی ہمیں پوچھتا ہوا آ[illegible] تو اسے وہاں پہنچا دے، وہ کچھ مایوس ہوا۔ ہمارے سا[illegible] پھرنے میں اس کو اضافی آمدنی کی توقع جو تھی۔ اس [illegible] جانے کے بعد میں نے کچھ اور دکان داروں سے معلوم [illegible] بظاہر ایڈریس مکمل تھا۔ بالآخر کافی تگ و دو کے بعد [illegible] گلی میں مکان آسانی سے مل گیا۔ ریشم نے گھنٹی [illegible] بند تھی یا خراب تھی۔ میں نے دروازہ بجایا تو اوپر [illegible] بچے نے جھانک کے دیکھا۔ مشتاق احمد کا نام سن کر وہ [illegible] ہٹ گیا۔ کچھ دیر بعد ایک بڑھیا دروازے کے پیچھے [illegible] ہوئی۔ ''کون ہو تم؟''

میں نے کہا۔ ''مشتاق احمد کا دوست۔''

''مگر وہ تو چلے گئے یہاں سے گھر خالی کرکے۔'' وہ [illegible] مجھے جھٹکا سا لگا۔ ''گھر خالی کر گئے۔۔۔ کب؟''

''ارے آج ہی صبح۔'' وہ بولی۔ ''نہ کچھ پہلے بتایا اور نہ نوٹس دیا۔ میں نے بہت پوچھا مشتاق سے بھی [illegible] اس کی بیوی سلونی سے بھی کہ آخر ہوا کیا۔ میرا خیال [illegible] انہوں نے کوئی بڑا گھر لے لیا۔ ایسا تھا تو بتا دیتے۔ میں [illegible] ساز بردستی روک سکتی تھی انہیں۔۔۔ کہیں سے بہت مال [illegible] لگ گیا تھا ان کے ہاتھ۔۔۔ ابھی چند دن پہلے گاڑی [illegible] تھی نئی۔۔۔ میں کون سا ادھار مانگتی اُن سے۔ [illegible] افراتفری میں صبح سامان اٹھایا۔۔۔ کل شام تک تو [illegible] نہ تھی۔ پتا نہیں ایک دم کیا ہوگیا۔''

میں جانتا تھا کہ ایک دم کیا ہوا۔ ریشم کا رنگ بھی [illegible] پڑ گیا۔ وہ بھی سمجھ گئی تھی مگر ہم کسی سے کچھ کہہ نہیں [illegible] تلاش کا دوسرا زیادہ مشکل مرحلہ شروع ہوچکا تھا اور [illegible] پر کھڑی تھی۔ امید کی ایک کرن اب بھی روشن تھی [illegible] انہوں نے ہماری خاطر اپنا پرانا پتا بدلا ہو جہاں ان [illegible] کوئی نہ جانتا ہو۔

ہر محاذ پر ایک نئے داؤ کی منتظر
جواری کی تدبیریں اگلے ماہ پڑھیے

چور کا مور

مختار آزاد

ان دونوں کی اپنی اپنی الگ دنیا تھی۔ ایک جرم کا رسیا تو دوسرا علم و ادب اور فن کا دلدادہ... دونوں کے شوق ہی ان کی گزر بسر کا ذریعہ تھے... وہ قطبین کے دو سروں پر کھڑے تھے لیکن محبت کے پُل نے ان کے درمیان فاصلوں کو پاٹ دیا تھا مگر جب یہ فاصلے مٹے تو صورتِ حال تمام تر بھیانک سچائی کے ساتھ سامنے کھڑی تھی...

پیار... سچائی اور جرم و سزا کی تکون پر مبنی ناروے سے آمدہ توشۂ خاص

موٹروے پر دور دور تک نہ کوئی انسان نظر آرہا تھا نہ ہی کوئی گاڑی مگر عادت سے مجبور رونی نے ایک بار پھر زور سے ہارن بجایا۔ اُس وقت وہ دارالحکومت اوسلو سے شمال مغرب کی سمت واقع ایک قصبے کو جارہا تھا۔ ڈکی اور پچھلی سیٹ پر آرڈر کا مال اور نئی ورائٹی کے کیٹلاگ رکھے تھے۔ شام ڈھل رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ رات گئے تک واپس لوٹ آئے گا۔ جمعے کا دن ڈھل رہا تھا۔ ویک اینڈ شروع ہوچکا تھا لیکن اسے خوشی تھی کہ اس کام کا اوور ٹائم

اور نئے آرڈر پر ملنے والا کمیشن خاصا معقول ہے۔ چھٹی کے دو دن مزے سے گزریں گے۔

گنگناتے ہوئے اس نے بیک ویو مرر میں دیکھا، عقب سے کوئی گاڑی نہیں آرہی تھی۔ اس نے ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ چند ہی سیکنڈوں میں رفتار نوے کلومیٹر فی گھنٹا ہو چکی تھی۔ کچھ دیر تک وہ گہری تاریکی اور سناٹے میں ہموار موٹروے پر تیز ڈرائیونگ سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ تیز رفتاری اس کی کمزوری تھی۔ وہ ہر معاملے میں جلد بازی کرتا تھا۔ اب اسے قصبے تک پہنچنے سے پہلے واپسی کی فکر لاحق ہو چکی تھی۔ وہ مزید رفتار بڑھانے والا تھا کہ سائن بورڈ پر نظر پڑی۔ موٹروے پولیس کی ہدایت کے مطابق رفتار پچپن کلومیٹر فی گھنٹا کی مقررہ حد تک کم کرنی پڑی۔ ”اگر کوئی تمہارا تعاقب کرتا ہوا آئے تب بھی تم تک نہیں پہنچ سکتا۔ تم بہت تیز رفتار اور ہوشیار ڈرائیور ہو۔“ اپنی تعریف کر کے وہ خود ہی ہنس دیا۔ خود کلامی اور خود ستائشی اس کی سفاک اور ظالم طبیعت کا حصہ تھی۔

رونی اوسلو میں برانڈڈ مردانہ ملبوسات تیار کرنے والی ایک کمپنی کا سیلز مین تھا۔ وہ اس کام سے خوش تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ یہ اس کے مزاج کے مطابق ہے۔ آوارہ گردی، بے فکری اور لاابالی پن اس کی زندگی کا محور تھا۔ وہ کبھی سنجیدہ نہ ہوا۔ گو کہ عمر سینتالیس سال ہو چکی تھی مگر اب بھی وہ ٹین ایجر لڑکوں کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ کوئی اور بھی ڈھنگ کا کام کر سکتا تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ سیلز مین شپ میں اسے گھومنے پھرنے کا بھرپور موقع ملتا ہے اور یہی اس کام کو کرتے رہنے کی وجہ تھی۔ گھومنے پھرنے کے ساتھ وہ تیز رفتار ڈرائیونگ کا شوق بھی پورا کر لیتا تھا۔

بات صرف یہی نہیں تھی، اسے کسی کی تلاش بھی تھی۔ گزشتہ تین برس سے وہ اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا تھا۔ اگر وہ کوئی اور کام کرتا تو شاید اسے تلاش کرنے کے لیے نوکری چھوڑنا پڑتی مگر سیلز مینی کا اسے ایک فائدہ ہو رہا تھا۔ لگ بھگ ہفتے میں تین چار بار اسے مختلف علاقوں میں جانے کا موقع ملتا۔ نئے لوگوں سے ملاقاتیں، پرانے لوگوں سے سلام دعا اور ساتھ ساتھ لینا کی تلاش...

لینا اس کی بیوی تھی مگر دونوں ایک دوسرے کے برعکس تھے۔ رونی کئی بار چھوٹے موٹے جرائم ...... کے الزام میں گرفتار ہوا۔ ایک بار تو اسے سال بھر جیل میں رہنا پڑا مگر یہ اس کی چالاکی تھی کہ پولیس آج تک اس کے خلاف کبھی اتنے ٹھوس ثبوت حاصل نہ کر سکی جو سزا سنانے کے لیے جج کو قائل کرنے کے لیے کافی ہوتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چھوٹ [illegible] پھر چند ماہ بعد کسی اور الزام میں پھنس جاتا۔ یہ چکر رونی [illegible] زندگی میں لڑکپن سے چل رہا تھا مگر لینا ہرگز ایسی نہ تھی۔

گڑیا بنانا اور کتابیں پڑھنا بس! لینا کے دو ہی [illegible] تھے۔ بچپن سے ہی اس نے کہانیاں لکھنا شروع [illegible] تھیں۔ بڑا ہونے پر یہ شوق پیشے میں بدل گیا۔ اس نے اوسلو کی یونیورسٹی کے شعبۂ ثقافت سے پتلی سازی کی تعلیم حاصل کی اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے ماسکو چلی گئی۔ یہاں اس نے ادب میں بھی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ واپسی پر اس نے اوسلو کے ادبی رسالے میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر ملازمت اختیار کر لی۔ ساتھ ہی وہ مختلف پبلشنگ ہاؤسز کے لیے روسی اور انگریزی زبان کی کتابوں کے تراجم بھی کرنے لگی۔ اسی دوران اوسلو میں ایک بین الاقوامی نمائش منعقد ہوئی، جہاں اس کی تیار کردہ پتلیوں کو پہلا انعام ملا۔ اس کے بعد لینا کی زندگی میں دو بڑی تبدیلیاں آگئیں۔ اوسلو کے ممتاز [illegible] نے اسے اپنی فلموں اور ڈراموں میں ڈمی تیار کرنے کے لیے بھاری تنخواہ پر ملازمت کی پیشکش کی جسے اس نے قبول کر لیا۔ دوسری تبدیلی رونی سے اتفاقیہ ملاقات تھی [illegible] میں ہونے والی اتفاقیہ ملاقات جس کے دوران چرب زبان رونی نے لینا کو اس طرح اپنی لچھے دار باتوں کے جال میں پھانسا کہ پھر لاکھ کوشش کے باوجود وہ اس سے نکل نہ سکی۔

عیاش طبع، آوارہ مزاج رونی کی فطرت میں [illegible] وفائی اور سازش شامل تھی۔ دوسری طرف وہ خوابوں میں رہنے والی اور فن و ادب کی رسیا عورت تھی۔ شادی کا [illegible] ایک سال ہی امن و سکون سے گزرا ہوگا۔ اس کے بعد [illegible] اپنی اصل فطرت میں لوٹ آیا۔ مستقل مزاجی اس [illegible] کوسوں دور تھی۔ وہ کہیں ٹک کر کام نہیں کرتا اگر کسی جگہ چند ماہ ٹک جائے تو پولیس کے ہاتھوں پکڑے جانے [illegible] بعد نوکری خود بخود چلی جاتی۔ وہ بیوی کو نہ صرف مارتا [illegible] بلکہ وہ جو کچھ کماتی تھی، وہ بھی چھین لیتا تھا۔ رونی نے لینا کو [illegible] وجوہات کی بنا پر پھانسا تھا۔ وہ اچھا کماتی تھی، دوسرا [illegible] خوبصورت بہت تھی۔ یہ دونوں چیزیں رونی کی [illegible] تھیں۔ اسے اپنے سے زیادہ لوٹ کا مال خرچ کرنا [illegible]

لینا مجبوری میں اس کے ساتھ نباہ کر رہی تھی [illegible] اسے رونی سے پیار تھا۔ اسی دوران ایمی پیدا ہوئی [illegible] ہوبہو ماں کی شکل تھی۔ بس! یہیں سے اس کی زندگی میں ایک اور نیا عذاب شروع ہوا۔ رونی اسے بیٹی ماننے پر [illegible] تھا۔ وہ جب نشے میں ہوتا، اس پر بدچلنی کا الزام لگا کر مار[illegible]

[illegible] شروع کر دیتا۔ ایک بار لینا نے ڈی این اے ٹیسٹ بھی کرایا تھا۔ رپورٹ ثابت کرتی تھی کہ ایمی اسی کی بیٹی ہے [illegible] وہ رپورٹ تسلیم کرنے پر بھی تیار نہ تھا۔

سات سال گزر چکے تھے۔ لینا نے کئی بار پولیس [illegible] رپورٹ درج کرائی کہ اسے شوہر سے جان کا خطرہ ہے [illegible] چرب زبان اور مکار فطرت رونی نے ہر بار ایسا ناٹک [illegible] کہ معافی مل گئی۔ رونی اسے دھمکیاں دیتا تھا کہ اگر اس [illegible] طلاق کا سوچا تو وہ ایمی کو قتل کر دے گا۔ وہ جانتی تھی کہ [illegible] رونی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ اپنی جان کا خطرہ مول [illegible] تھی مگر ایمی کو کچھ ہو، یہ اس سے برداشت نہیں ہوتا۔ [illegible] کو سات سال گزر چکے تھے۔ آخر اسے رونی سے [illegible] کا ایک سنہری موقع مل گیا۔

ایک دن رونی پھر پکڑا گیا۔ اگرچہ یہ تو آئے دن کا معمول تھا لیکن اس بار الزام سنگین تھا۔ پولیس کا کہنا تھا کہ اس نے ساتھیوں کی مدد سے بینک لاکر لوٹا تھا۔ لینا کو یقین تھا کہ اس بار وہ لمبا گیا اور ہوا بھی ایسا ہی۔ اس نے فوراً موقع [illegible] فائدہ اٹھایا۔ وقت کافی تھا۔ اس نے پورا منصوبہ بنایا [illegible] ایک دن اپنا فلیٹ فروخت کر کے خاموشی سے ایمی کو [illegible] لے کر چلی گئی... کہاں یہ اس کے قریبی دوستوں تک [illegible] علم نہ ہو سکا۔

[illegible] ایک سال بعد پھر الزام ثابت نہ ہونے پر چھوٹ [illegible] جب وہ واپس آیا تو لینا لاپتا تھی۔ اسے دو باتوں کی بنا [illegible] پر شک تھا۔ ایک اس کے گھر چھوڑنے اور دوسرا [illegible] کی چوری... اس بار پولیس نے جس طرح اس پر تشدد [illegible] اس کے بعد وہ بظاہر جرم سے توبہ کر چکا تھا لیکن باعزت [illegible] بسر کرنے کے لیے اسے باکس کی تلاش تھی۔ وہ خود [illegible] تھا کہ آخر وہ غائب کہاں ہو گیا۔ پولیس کے ہتھے نہ [illegible] وجہ وہ جانتا تھا۔ اس نے چھپایا ہی ایسی جگہ تھا لیکن [illegible] گمشدگی سے اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ اُسی کے پاس [illegible]

[illegible] سال سے وہ لینا کو پاگلوں کی طرح تلاش کر رہا تھا [illegible] اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ آج اسے جس قصبے میں مال [illegible] دینا تھی، وہاں وہ پہلی بار جا رہا تھا۔ دل میں [illegible] دعا کر رہا تھا کہ وہیں سے لینا کا کوئی سراغ مل [illegible] اگرچہ وہ لینا کا دیوانہ تھا لیکن جسمانی طلب کی حد [illegible] اس کی خوبصورتی رونی کی مجبوری تھی لیکن ساتھ ہی وہ [illegible] اس کو بھی نہیں بھولا تھا۔

☆☆☆

سڑک بالکل خالی پڑی تھی۔ وہ ایک چھوٹے سے گاؤں کے برابر سے گزر رہا تھا۔ اس نے سڑک کنارے ایک آدمی کو کھڑا دیکھا۔ سیاہ بالوں کا حامل اور دراز قامت وہ شخص اسے دیکھنے میں اچھا لگا۔ حسبِ عادت رونی نے خوشی کے اظہار کے لیے ہارن بجایا۔ اچانک اسے پھر لینا یاد آگئی۔ ”خوبصورت چڑیا۔“ وہ بڑبڑایا اور پھر زور سے ہنس دیا۔ اس نے چشمِ تصور میں اس کا سراپا دیکھا۔ دراز قامت، گھنے لمبے سیاہ بال، اکہرا بدن، غلافی آنکھیں جو رونی کو دیکھ کر اس طرح خوف سے بھر جاتی تھیں کہ جیسے گھنے جنگل میں بے بس ہرنی کے سامنے شیر کی صورت موت کھڑی ہو۔

اسے ڈرائیو کرتے کرتے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ شام ہو چکی تھی۔ اس نے موٹروے پر لگے سائن بورڈ پر نظر ڈالی۔ وہ قصبہ جہاں اسے پہنچنا تھا، صرف تین کلومیٹر دور رہ گیا تھا۔

”ہیلو...“ تقریباً دس منٹ بعد رونی مطلوبہ اسٹور کے منیجر کو مخاطب کر رہا تھا۔ منیجر بہت باتونی تھا۔ اگرچہ رونی پہلی دفعہ اُس سے مل رہا تھا لیکن وہ اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے دونوں کے درمیان برسوں کی آشنائی اور بے تکلفی کا رشتہ ہو۔ ”سنو...“ اس نے کافی کا گھونٹ بھر کر منیجر کو مخاطب کیا۔ ”یہاں تم کسی لینا کو جانتے ہو؟“

”لینا...؟“ منیجر نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ سامان چیک کر رہا تھا۔

”لینا لینگمو...“

منیجر نے چند لمحے سوچا۔ ”میرا خیال ہے کہ شاید جانتا ہوں لیکن...“

”دبلی پتلی، دراز قامت، مخروطی چہرہ، گالوں کی ہڈیاں ذرا سی ابھری ہوئی ہیں...“ رونی نے قطع کلامی کرتے ہوئے حلیہ بتایا۔ وہ اس کے لہجے سے بھانپ گیا تھا کہ شاید وہ اسے جانتا تو ہے لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتا۔

اس کا سراپا سن کر منیجر ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا۔

ویسے یہ بھی رونی کی عادت بن چکی تھی جہاں جاتا لینا کے بارے میں ضرور پوچھتا تھا۔ اگرچہ اب تک اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا لیکن لینا کے ذکر پر منیجر کے چہرے پر آئے تاثرات کو دیکھ کر اسے لگا کہ شاید وہ اسے جانتا ہوگا۔ اسی لیے اس نے مزید تفصیل بیان کی۔ ”بہت خوبصورت ہے۔ لگ بھگ پینتیس برس کی عمر ہوگی۔ اس کی ایک سات آٹھ سال کی بیٹی بھی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف

کیا۔ ''ایمی...'' اس نے جان بوجھ کر پورا نام لینے سے گریز کیا تھا۔
''وہ تو ٹھیک ہے...'' منیجر نے ہچکچاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''مگر تم اُس کا کیوں پوچھ رہے ہو... کیا اُسے جانتے ہو؟''
''جانتا ہوں...'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا۔ ''دور کی سہی پر وہ میری رشتے دار ہے۔ چند برس پہلے وہ اوسلو چھوڑ کر کہیں اور شفٹ ہو چکی ہے۔ اُن دنوں میں باہر گیا ہوا تھا۔ اس لیے علم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں گئی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ''سنا تھا کہ کسی چھوٹے سے قصبے میں رہ رہی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے باہر کی طرف دیکھا۔ ''یہ بھی تو چھوٹا سا اور خوبصورت قصبہ ہے۔ بس، اسی لیے پوچھ لیا کہ وہ کہیں...''
''اوہ...'' منیجر نے ہنکارا بھرا۔ ''اگر یہ وہی لینا ہے جو تمہاری دور کی رشتے دار ہے تو پھر وہ یہیں رہ رہی ہے۔'' منیجر نے اسے گھورتے ہوئے ذومعنی لہجے میں کہا۔ ''جسے تم ڈھونڈ رہے ہو شاید یہ وہی لینا ہے جو فیبریکن فارم کے ایک چھوٹے سے کاٹیج میں رہتی ہے۔''
''کیا...!'' رونی نے خوشگوار حیرت کا اظہار کیا۔ پہلی بار اسے لینا کا کوئی سراغ مل رہا تھا۔
''شاید... یہ وہی ہو۔ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔''
''مگر...''
''تم نے جو حلیہ اور بچی کا بتایا، اسی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔'' منیجر نے قطع کلامی کرتے ہوئے وضاحت کی۔
رونی کے لیے یہ بڑی کامیابی تھی۔ پہلی بار اُس کی تلاش یہاں تک پہنچی تھی۔ ''میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ اس کے لہجے سے بے تابی جھلک رہی تھی۔ ''لیکن ایک بات بتاؤ...'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
''کیا...!'' منیجر نے سوالیہ نظروں سے گھورا۔
''اُس کا کوئی بوائے فرینڈ بھی ہے؟''
''شاید نہیں...'' منیجر نے سر ہلایا۔
یہ سن کر رونی کی آنکھوں میں چمک اُتر آئی۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی پہلی تلاش گمشدہ باکس تھا۔ لینا بونس کی حیثیت رکھتی تھی۔
''ویسے کئی ایک نے اُس پر اپنا دل اچھالنے کی کوشش ضرور کی لیکن وہ اپنے دل کے دروازے کو بند کیے قلعہ بند بیٹھی رہی۔ اب تو عادی عاشقوں نے بھی اُس کی طرف دیکھنا اور اُس کے بارے میں سوچنا تک بند کر دیا ہے۔'' یہ کہہ کر منیجر زور سے ہنسا۔
''ہاں! وہ ہے ہی ایسی... بور اور ہر وقت افسردہ رہنے والی۔''
''ایسا ہی لگتا ہے۔'' منیجر نے تائید کی۔ وہ بدستور بل چیک کرنے میں مصروف تھا۔ شام کے ساڑھے سات بج چکے تھے۔
''ویسے اس کی مصروفیات کیا ہیں؟'' رونی نے بات آگے بڑھائی۔ وہ چاہتا تھا کہ لینا سے متعلق جتنی معلومات مل سکتی ہیں، حاصل کر لے تاکہ اس سے نمٹنے کا منصوبہ بنا سکے۔
''اس کا تو کچھ پتا نہیں، البتہ اس وقت میں بہت مصروف ہوں۔'' منیجر نے اسے گھورتے ہوئے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔
''تم ناراض ہو گئے۔''
منیجر نے سر اٹھا کر رونی کو دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔
رونی نے احتیاط پسندی کے تحت اب لینا کے بارے میں گفتگو سے گریز کیا۔ ویسے بھی اس کا خیال تھا کہ جتنی معلومات مل چکی ہیں، وہ بھی کم مفید نہیں۔ کچھ دیر تک وہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا رہا اور پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''اب بہتر ہوگا کہ چیک بنا دو، مجھے واپسی کے لیے نکلنا ہے۔''
''لینا سے ملنے نہیں جاؤ گے؟'' منیجر نے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔
''شاید نہیں، اب بہت دیر ہو چکی ہے۔'' اس نے پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''اگلی ڈیلیوری پر آیا تب دیکھوں گا۔'' وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ لینا اب اتنی بھی اہم نہیں کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کی طرف چل دے۔ البتہ بندے کو فرصت ہو تو پھر دیکھا جا سکتا ہے۔
''ویسے چاہو تو جا کر دیکھ لو، ممکن ہے یہ وہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی اور ہو۔''
''تمہاری بات ٹھیک ہے مگر...'' اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''اب وقت نہیں ہے، پھر کبھی سہی۔'' دراصل وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ کہیں اس کی بے تابی دیکھ کر منیجر اس پر شک کرے۔ اس لیے کچھ دیر پہلے لینا کے بارے میں پوچھنے والا رونی اُس کے ذکر پر اب بیزاری ظاہر کر رہا تھا۔
''جلدی ہے تو پھر چیک لو اور نکل لو۔'' منیجر نے اس کی جانب چیک بڑھاتے ہوئے مذاق کے لہجے میں کہا۔
''شکریہ...'' اس نے چیک تھاما اور جیکٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے باہر نکل آیا۔ اس نے واپسی کا ارادہ

لیکن چند کلومیٹر آگے جا کر یوٹرن لیا اور فیبریکن فارم کے راستے پر چل دیا۔ یہ جگہ قصبے کے مرکز سے جنوب میں چند کلومیٹر کی دوری پر تھی۔ اس نے اِردگرد کا ایک چکر لگایا مگر وہاں دور دور تک کوئی دکھائی نہ دیا۔ ''لینا... تم سے ملنے آ رہا ہوں۔'' اس نے خودکلامی کی۔ خوشی سے اس کے دل کی دھڑکنیں تیز اور بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ اسے امید تھی کہ گمشدہ باکس اور لینا کی شکل میں اُس کا سود، دونوں اب اس سے کچھ دوری پر ہیں۔
منیجر کا بتایا ہوا کاٹیج اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ اسے یقین تھا کہ سامنے والا گھر لینا کا ہی ہوگا لیکن وہ رکا نہیں، آگے بڑھتا چلا گیا۔ لگ بھگ سو گز آگے جا کر درختوں کے جھنڈ میں رونی نے کار روکی اور پلٹ کر پیدل اس کاٹیج کی طرف چل دیا۔ وہ کھیتوں کے بیچوں بیچ تھا، جہاں تک ایک کچی سڑک جا رہی تھی۔ راستے کے دونوں جانب خودرو جھاڑیاں تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ دیکھ بھال صحیح طریقے سے نہیں کی جا رہی تھی۔ وہ گھر کے قریب پہنچا۔ بظاہر وہ بھی اچھی حالت میں نہ تھا، کافی پرانا دکھائی دے رہا تھا۔ لگتا تھا کہ کاٹیج مدتوں سے رنگ و روغن اور مرمت جیسے تکلفات سے بے نیاز رہا ہے۔ دروازے کے ساتھ کی کھڑکی سے گھر کے اندر کی روشنی نظر آ رہی تھی۔
''لگتا ہے اس کے حالات کچھ زیادہ ٹھیک نہیں۔'' حسبِ عادت رونی نے خودکلامی کی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید خستہ حال گھر لینا کو سستے داموں مل گیا ہوگا۔ ویسے یہ اس کے علم میں تھا کہ اس نے اوسلو کا شاندار فلیٹ خاصی بھاری قیمت پر فروخت کیا تھا۔ اس گھر کو دیکھنے کے بعد اسے یقین آ گیا کہ اس وقت بھی لینا کے اکاؤنٹ میں اچھی خاصی رقم موجود ہونی چاہیے تھی۔ اس نے بے فکرے پن سے ہلکی سی سیٹی بجائی اور آگے بڑھا۔ ابھی وہ داخلی دروازے سے چند قدم دور تھا کہ اچانک برابر کی جھاڑیوں سے درمیانے قد کا ایک کتا نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔ اس کے قدم جہاں تھے، وہیں رُک گئے۔ لمحہ بھر کے لیے اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ لینا اتنی بے وقوف ہرگز نہ تھی کہ حفاظت کے لیے ایک کتا نہ رکھ سکے۔ اگلے لمحے وہ کچھ سوچ کر مسکرایا کہ کیا ایک کتا اس کا راستہ روک پائے گا؟
کتا بھونک رہا تھا لیکن وہ آگے نہ بڑھا۔ اچانک اُس نے بھونکنا بند کیا اور سر جھکا کر اس کی دائیں پنڈلی کی طرف لپکا لیکن وہ بھی رونی تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پنڈلی کو جبڑے میں دبوچتا، اُس نے اسے گردن سے پکڑا، اوپر اٹھایا اور پوری قوت کے ساتھ زمین پر پٹخ دیا۔
اسی دوران گھر کے اندر سے ایک نسوانی آواز سنائی دی جسے سنتے ہی رونی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ پہچان گیا تھا۔ یہ لینا کی کھنک دار آواز تھی۔ وہ پکار رہی تھی۔ ''ٹیڈی، ٹیڈی... کہاں ہو تم؟ یہ شور کیسا ہے... کس پر بھونک رہے ہو؟'' آواز گھر کے اندر سے آ رہی تھی۔
اسی دوران میں ایک بار پھر لینا کی آواز گونجی۔ ''کیا ہوا؟ آ رہی ہوں میں۔'' اس بار اس کی آواز اونچی تھی۔
رونی گھٹنوں کے بل بیٹھا اور کتے پر نظر ڈالی۔ وہ ساکت پڑا تھا۔ اس نے بدن ٹٹولا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے کتے کی موت کا افسوس ہوا مگر اگلے لمحے سوچا کہ اس میں خود اس کی کوئی غلطی نہیں۔ ایسا نہ کرتا تو وہ اس کی پنڈلی بھنبھوڑ چکا ہوتا۔ ''ویسے بھی اپنے دفاع میں انسان کے قتل پر مقدمہ نہیں بنتا تو پھر...'' وہ بڑبڑایا اور لباس ٹھیک کرنے لگا۔
اچانک دروازہ کھلا۔ رونی بیٹھے بیٹھے سمٹا اور اُچک کر جھاڑیوں کی اوٹ میں دُبک گیا۔ لینا کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ وہ آگے بڑھی اور جیسے ہی کتے پر نظر پڑی، اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ ''اوہ میرے خدا... یہ کیا ہو گیا؟'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی اور ہذیانی کیفیت میں چلاتے ہوئے اسے آوازیں دینے لگی۔ ''ٹیڈی ٹیڈی...'' ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ٹیڈی کو اس حال میں دیکھ کر اسے دلی صدمہ پہنچا ہے۔
رونی اندھیرے کی آڑ میں تھا۔ اس سے اب مزید صبر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اٹھا اور آگے بڑھا۔ ''ہیلو لینا... یہ میں ہوں۔''
''کیا...'' لینا نے آواز سنتے ہی اس کی طرف دیکھا۔ حیرت کے مارے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹی اور چلائی۔ ''تم، تم... یہ تم ہو۔'' غیر متوقع طور پر اسے اپنے سامنے پا کر وہ سخت حیرت زدہ تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔
''مجھے گرم جوشی سے خوش آمدید کہے جانے کی توقع تھی لینا۔'' رونی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر مردہ ٹیڈی پر نظر ڈالی۔ ''واقعی مجھے نہایت گرم جوشی سے خوش آمدید کہا گیا۔'' اس کے لہجے سے طنز عیاں تھا۔
''تم نے اسے مارا؟'' لینا نے کتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بے یقینی سے پوچھا۔
''نہیں... میں نے اس سے اپنا دفاع کیا ورنہ یہ

میری پنڈلی بھنبھوڑ دیتا۔" رونی نے وضاحت کی۔
شیریں لہجے والی لینا اسے دیکھ کر ہمیشہ حیران یا شاید خوف زدہ ہوجاتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ کوبرا کی طرح اچانک جھپٹ کر حملہ کردے گا۔
"چلو... اندر چلو۔" اس نے لینا کو بازو سے پکڑ کر کھینچا۔ وہ مڑمڑ کر ٹیڈی کی طرف ہی دیکھے جارہی تھی۔
اندر داخل ہوتے ہی رونی نے دروازہ لاک کردیا اور چابی اپنی جیب میں ڈال لی۔ وہ اُس سے آگے چل رہی تھی، اُس کی یہ حرکت نہ دیکھ سکی۔ لینا اسے لے کر ہال میں پہنچی۔ اندر خاصی روشنی تھی۔ اس نے پہلی بار اس کے سراپا پر بھرپور نظر ڈالی۔ اسے لگا کہ جیسے وہ مفلوج ہوچکی ہو۔ اس کا جسم بے جان محسوس ہورہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کی قوتِ مدافعت جواب دے چکی ہے۔ "توتم مجھے دیکھ کر حیران ہو یا پریشان؟" رونی نے اس کا چہرہ اپنے سامنے کیا۔
اُس نے منہ سے کچھ جواب نہ دیا البتہ اس کا جسم ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا۔ غلافی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔
رونی نے غور سے اس کے سراپا پر نظر ڈالی۔ "کچھ کمزور لگ رہی ہو۔"
طویل عرصے بعد وہ اس سے مل رہا تھا۔ اس کا وزن لگ بھگ سو پاؤنڈ کے قریب لگتا تھا جبکہ وہ خود اس سے دُگنے سے بھی زیادہ وزن کا مالک ہوچکا تھا۔ لینا کی آنکھیں سوزش زدہ اور سرخ محسوس ہورہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے وہ راتوں کو جاگتی ہو۔ اس نے اب تک لینا کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ وہ بغور اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کا دوسرا ہاتھ اٹھا اور لینا کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ پڑا۔ اس کا چہرہ دوسری طرف پھر گیا۔ اگلے ہی لمحے کمرے میں اس کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔
"اِدھر... اِدھر۔" اس نے لینا کو شانوں سے پکڑ کر اُس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ "اس طرح غائب ہوتے ہیں۔" اس کا لہجہ شکایتی تھا۔ وہ بدستور سسکیاں لے رہی تھی۔ "تم بڑی ہوچکی ہو۔ اب تو اچھی بچی بن جاؤ۔" رونی نے اس کو گلے لگالیا۔ وہ اس کے کندھے سے چہرہ ٹکائے بدستور سسک رہی تھی۔ "میں سمجھتا تھا کہ تم مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوگی مگر نہیں... تم مجھے دیکھ کر خوف زدہ ہو۔"
"شاید..." اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "ہوسکتا ہے ایسا نہ ہو، ہوسکتا ہے شاید۔" اس کے الفاظ بے ترتیب ہورہے تھے۔
"بہت ڈھونڈا تمہیں، تب کہیں جاکر پتا چلا۔" رونی کا لہجہ نرم پڑچکا تھا۔ "چلو یہ رونا دھونا بند کرو، مجھے اپنا گھر دکھاؤ۔ کچھ تواضع کرو۔ آخر اتنے عرصے بعد ہم مل رہے ہیں، پہلی بار تمہارے گھر آیا ہوں۔"
لینا نے آہستہ سے خود کو اس کی بانہوں سے علیحدہ کیا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا "سوری..."
رونی نے اس کی آنکھ سے بہہ کر گالوں تک آنے والے آنسو اپنی انگلیوں سے صاف کیے۔ اس کی آنکھوں کی سوزش اور سرخی کچھ زیادہ بڑھ گئی تھی۔ "فکرمت کرو، یہ ویک اینڈ نائٹ ہے۔ ہمارے پاس بہت وقت ہے۔"
وہ پہلی بار ہلکا سا مسکرائی اور اثبات میں سرہلایا۔ یہ اور بات کہ اس کا دل کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔
"تم مجھے اپنا گھر نہیں دکھاؤ گی؟" رونی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر ہال پر طائرانہ نظر ڈالی۔
کاٹیج باہر سے خاصا پرانا تھا لیکن اندر سے بھی اس کی حالت بہت زیادہ اچھی نہ تھی لیکن پھر بھی لینا نے اسے قرینے سے رکھا ہوا تھا۔ باہر کی نسبت اندر موسم خاصا خوشگوار تھا۔ آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ رونی نے جیکٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکادی۔
"آؤ..." لینا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنا گھر دکھانے لگی۔
رونی نے محسوس کیا کہ گھر کی حالت خاصی خستہ تھی۔ چیزیں بھی نئی نہ تھیں لیکن قرینے سے رکھی ہونے کے سبب اتنی بری نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ اسے ایک کے بعد ایک کمرا دکھاتی رہی۔ "کیسا لگا تمہیں میرا گھر..." واپس ہال میں آتے ہوئے لینا نے پوچھا۔
"بہت اچھا مگر..."
"مگر..." لینا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"گھر کو مرمت کی ضرورت ہے لیکن ایک بات ہے۔"
لینا نے پھر اسے دیکھا۔ اس کی نظریں پھر سوالیہ تھیں۔
"ہر چیز سے تمہارا سلیقہ اور ذوق عیاں ہے۔" یہ کہہ کر وہ صوفے پر بیٹھا۔ "بڑا آرام دہ ہے۔" رونی نے ہال پر بھرپور نظر ڈالی۔ جس صوفے پر وہ بیٹھا تھا، اس کے برابر تپائی پر لینڈ لائن فون رکھا تھا۔ سامنے کی کافی ٹیبل پر لینا کا موبائل فون دھرا تھا۔
یک لخت صورتِ حال کا رخ بدلنے لگا۔ رونی نے جیب سے کٹر نکالا اور لینڈ لائن فون کا وائر کاٹ دیا۔ اُس کا موبائل فون اٹھا کر اپنے سامنے کرلیا۔ یہ دیکھ کر لینا نے یہرہ

دیوار کی طرف کرلیا۔ وہ ایک بار پھر سخت خوف زدہ تھی۔ کسی ادیدہ خوف سے اس کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید پڑچکا تھا۔
"تو یہ ہے تمہارا پورا گھر..." رونی نے چاروں طرف نظریں گھماتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "سب کچھ دکھادیا یا اب بھی کچھ ایسا ہے جو مجھ سے چھپانا چاہ رہی ہو؟"
"نن نن نہیں تو... ایسا تو کچھ بھی نہیں..." لینا کی آواز کانپ رہی تھی۔
"اگر تم جھوٹ بول رہی ہو تو پھر اس کا انجام بھی جانتی ہوگی۔" رونی نے دھمکی دی۔ اس کی آواز سے درشتگی عیاں تھی۔ اس نے کمر میں ہاتھ ڈال کر بڑا سا چاقو نکال کر ہوا میں لہرایا۔ "یہ دیکھو... جھوٹ کا انجام۔" وہ کھڑا ہوا۔ "تم نے سب کچھ مجھے نہیں دکھایا۔"
"تم پورا گھر دیکھ چکے ہو۔" لینا نے احتجاج کیا۔
رونی نے اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹا۔ "چلو، مجھے پورا گھر دکھاؤ۔ میں ایک بار پھر دیکھنا چاہوں گا۔ ابھی اوپر کی منزل باقی ہے۔"
وہ دومنزلہ پرانا کاٹیج سادہ سے انداز میں تعمیر کیا گیا تھا۔ کل تین بیڈ رومز تھے۔ ماسٹر بیڈ روم لینا کے زیر استعمال تھا جس میں بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر لینڈ لائن فون رکھا تھا۔ رونی نے اس کا کنکشن وائر بھی کاٹ دیا۔ گراؤنڈ فلور پر اسٹڈی، کچن اور ہال تھا۔
"تمہاری بچی نظر نہیں آئی، وہ کہاں ہے؟" دوبارہ ہال میں واپس آتے ہوئے رونی نے سوال کیا۔ وہ یہ دیکھ چکا تھا کہ اس وقت لینا گھر پر بالکل تنہا تھی۔ وہ بڑی حد تک مطمئن نظر آرہا تھا۔
"ایمی تمہاری بھی بیٹی ہے۔" لینا نے احتجاجی لہجے میں جواب دیا۔
"اس پر بات کرنے کی بہت گنجائش باقی ہے لیکن..." رونی نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ "وہ گھر پر تو ہے نہیں، پھر کہاں گئی؟"
"اپنی سہیلی کے گھر، اُسے رات وہیں رکنا تھا۔ مجھے بھی سکون کی ضرورت تھی۔ کچھ ترجمے کا کام ہے، کل رات تک مکمل کرنا تھا، اسی لیے جانے دیا۔" لینا نے وضاحت کی۔ وہ بدستور خوف زدہ تھی۔
رونی اٹھا اور اس کے منہ پر ایک اور تھپڑ مارا۔ "تم نے اور تمہاری اس کمینی اولاد نے برسوں مجھے پریشان کیا ہے۔ لعنت ہو تم دونوں پر۔" وہ شدید غصے کے عالم میں چلّا رہا تھا۔

’’اُسے تو گالی مت دو، تم اُس کے باپ ہو۔‘‘ لینا نے احتجاج کیا۔ ’’تم اس کا ڈی این اے...‘‘

روِنی نے اس کے چہرے کے سامنے چاقو لہرایا تو وہ خاموش ہوگئی۔ ’’زیادہ بکواس مت کرو۔‘‘ یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا اور چہرہ اس کے قریب کرتے ہوئے بولا۔ ’’میں اس گھر میں مہمان ہوں اور تمہیں میری خاطر مدارات کرنی چاہیے۔ ویسے بھی تم تو بہت وضع دار ہو۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے لینا کو خونخوار نگاہوں سے گھورا۔ ’’جو پوچھوں گا، سچ سچ بتانا ورنہ...‘‘ اس نے چاقو اُس کی گردن پر رکھا۔

لینا کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔

چند لمحے وہ یونہی کھڑا رہا اور پھر واپس صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔ ’’خیر... وہ تو میں بعد میں پوچھوں گا، پہلے کچھ اور کام بھی نمٹانے ہیں۔‘‘ اس نے معنی خیز نظروں سے لینا کے سراپا کا جائزہ لیا۔

’’تم چاہتے کیا ہو؟‘‘ وہ خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔

’’اپنے سوالوں کے سچ سچ جوابات...‘‘

’’ایسی کوئی بات میرے علم میں نہیں جس کا تم پوچھ سکو۔‘‘

’’ایسی بات تو ہے...‘‘ وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

’’پلیز... میرا پیچھا چھوڑ دو۔‘‘ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

’’تم سمجھتی تھیں کہ اوسلو چھوڑ دیا تو مجھ سے بچ جاؤ گی۔‘‘

’’میں نہیں سمجھتی تھی کہ تم یہاں تک پہنچ پاؤ گے۔‘‘ وہ رو رہی تھی۔

’’واقعی...‘‘ روِنی نے چہرے پر مصنوعی حیرت کے تاثرات طاری کرتے ہوئے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ ’’مجھے حیرت ہے کہ تم ایسا سوچتی تھیں مگر ایسا ہوا نہیں۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ’’ضروری نہیں کہ ہر شخص جو سوچتا ہے، سب ویسا ہو لیکن میرا تجربہ ذرا مختلف ثابت ہوا ہے۔ سوچا، کوشش کی اور تم تک پہنچ گیا۔‘‘ ایسا لگتا تھا کہ وہ بری طرح خوف زدہ کر کے اس کے اعصاب شکستہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لینا خود کو بے جان محسوس کر رہی تھی۔ وہ اس کی بات سن کر کچھ نہ بولی البتہ اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر رومال سے ناک صاف کی۔ لینا کی ناک درمیان سے مڑی ہوئی تھی۔ یہ ٹیڑھا پن پیدائشی نہیں بلکہ روِنی کی دین تھی۔ ایک روز اس نے لینا پر بری طرح تشدد کیا، ایک مُکّا ناک پر پڑا جس سے ہڈی ٹوٹ گئی۔ ہڈی جڑ تو گئی تھی لیکن اس کی ستواں ناک پھر بھی سیدھی نہ ہو سکی۔ وہ اس کے تشدد کو جانتی تھی۔ اسی سے بچنے کے لیے اس نے پولیس کو بیان دیا تھا کہ وہ سیڑھی سے گر پڑی تھی۔ اس وقت جس طرح کا وہ برتاؤ کر رہا تھا، اس سے وہ اندازہ کر چکی تھی کہ یہاں کسی بھی پل کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اسے آنے والے وقت سے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ خود کو آنے والے لمحات کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

روِنی اٹھا اور قریب جا کر اسے غور سے دیکھا۔ ’’تم بالکل جہنمی عورت ہو جو کسی کی بھی زندگی جہنم بنا سکتی ہے۔‘‘

لینا نے پھٹی پھٹی نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ ساٹن کے سیاہ اور سادہ لباس میں ملبوس تھی۔ کھلے بال منتشر تھے۔ چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔ نہ کان میں بندے نہ ہاتھوں میں انگوٹھی۔ وہ ایسی عورت کی طرح لگ رہی تھی جو حالتِ سوگ میں دنیا سے کٹی بیٹھی ہو۔

’’چلو...‘‘ روِنی نے چاقو اُس کی نگاہوں کے سامنے لہرایا۔ ’’جاؤ! جا کر منہ ہاتھ دو، میک اپ کرو اور اچھا سا لباس پہنو۔ آخر تمہارا شوہر برسوں بعد تمہارے گھر آیا ہے۔‘‘

وہ بے چون و چرا... جانے کے لیے مڑ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی معمول کی طرح اُس کا حکم ماننے پر مجبور ہے۔

’’سنو...‘‘

دوسری منزل پر واقع بیڈ روم میں جانے کے لیے لینا لرزتے قدموں سے زینے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ وہ رکی اور پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

’’پہلے مجھے کچھ پینے کے لیے دے کر جاؤ۔ میرے خیال میں گھر میں پینے کے لیے ضرور کچھ خاص چیز ہوگی، کافی کے سوا۔‘‘

’’ہاں ابھی دیتی ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ مرے مرے قدموں سے کچن کی طرف جانے لگی۔

’’سنو...‘‘ روِنی نے پکارا۔

لینا کے بڑھتے قدم پھر رکے، اس نے پلٹ کر دیکھا۔

’’بیئر ہے تو بوتل لے آنا، کھولنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں خود اسے کھول لوں گا۔ تمہارا کچھ پتا نہیں، کہیں زہر نہ ملا دو۔‘‘

وہ آگے بڑھی تو روِنی نے چلّا کر نیا حکم صادر کیا۔ ’’اور

ہاں... چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو پھر خیر نہیں۔‘‘ اس نے ہوا میں چاقو لہرایا۔ ’’پہلے تمہاری بیٹی اور پھر تم... دونوں کی جان لے لوں گا۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے خباثت بھرا قہقہہ لگایا۔

’’اچھا...‘‘ یہ کہہ کر لینا لرزتے قدموں سے کچن میں گھس گئی۔ کچھ دیر بعد وہ پلٹی تو ٹرے میں بیئر کی چند بوتلیں رکھی تھیں۔

صوفے پر براجمان روِنی کافی ٹیبل پر پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس نے ایک بوتل کھولی اور تھوڑی سے بیئر فرش پر انڈیلی۔ جھاگ پھیلنے لگا۔ ’’شان دار...‘‘ یہ کہتے ہوئے اس نے بوتل منہ سے لگائی اور ایک ہی سانس میں آدھی بوتل خالی کر گیا۔ ’’تم تو دفع ہو...‘‘ اس نے ڈکار لے کر لینا کی طرف نفرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ’’جا کر حلیہ درست کرو۔ اس حالت میں کسی جنگلی بلی سے کم بھیانک نہیں لگ رہی ہو۔‘‘

’’اچھا...‘‘ اس نے سپاٹ لہجے میں نپا تُلا جواب دیا۔

’’مجھے یقین ہے کہ تمہیں اب تک یاد ہوگا، مجھے کس طرح کے لباس والی عورت پسند ہے۔‘‘ اس نے نہایت عامیانہ لہجے میں اسے آنکھ ماری۔

’’جانتی ہوں، سب یاد ہے...‘‘ ایک بار پھر اُس نے بے جان لب و لہجے میں تائید کی۔

’’تو پھر کھڑی کھڑی میرا منہ کیا تک رہی ہو، جاؤ دفع ہو یہاں سے۔‘‘ وہ چلّایا تو سہمی سہمی لینا زینے کی طرف چل دی۔

’’ایک منٹ...‘‘

ابھی لینا نے پہلا قدم ہی زینے پر رکھا تھا کہ وہ ایک بار پھر چلّایا۔ وہ پلٹی اور کسی غلام کی طرح اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ ’’مجھے بھوک بھی لگ رہی ہے۔‘‘ اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ ’’فریج میں پیزا ہے؟‘‘

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

’’تو پہلے وہ بنا کر لے آؤ۔ خبردار جو کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی۔‘‘ اس نے پھر چاقو لہرایا۔ ’’ورنہ مرنے سے پہلے تمہاری گردن ضرور کاٹ ڈالوں گا۔‘‘ اس نے اپنی آواز کو مزید بھاری بناتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

لینا نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے کچن میں چلی گئی۔ اس نے ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی آن کیا۔ چینل بدلتے بدلتے وہ رکا۔ میوزک چینل پر اس کی پسند کا گانا چل رہا تھا۔

’’بڑی سخت جان عورت ہے یہ۔‘‘ گانا سنتے سنتے اس نے کچن کی طرف دیکھ کر حسبِ عادت خود کلامی کی۔ اس نے سوئیٹر اتارا اور صوفے پر نیم دراز ہو کر خود بھی گنگنانے لگا۔

چند منٹ بعد لینا کچن سے نمودار ہوئی۔ ’’میں نے پیزا اوون میں رکھ دیا ہے۔‘‘ روِنی کے قریب پہنچ کر اس نے سرد لہجے میں بتایا۔

’’میں نکال لوں گا، تم جا کر تیار ہو۔ اس حلیے میں تمہیں دیکھ کر تو مجھے سخت وحشت ہو رہی ہے۔‘‘

’’او کے...‘‘ لینا نے تابع دار غلام کی طرح جواب دیا اور بیڈ روم میں جانے کے لیے زینہ چڑھنے لگی۔ ’’ذرا اچھی طرح تیار ہو کر آنا، آج میں موڈ میں ہوں اور تمہیں تو میرے مزاج کا پتا ہی ہے نا۔‘‘ روِنی چلّایا۔

لینا کے قدم رکے، اس نے مڑ کر اُسے دیکھا۔

’’کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہیں کرنا۔‘‘ اپنی طرف متوجہ پا کر روِنی نے ایک بار پھر اسے خبردار کیا۔

لینا بنا کچھ کہے بیڈ روم میں چلی گئی۔ وہ ایک بار پھر ٹی وی دیکھنے اور بیئر پینے میں مشغول ہو چکا تھا۔

’’ویک اینڈ ہے، پوری رات باقی ہے۔ دیکھتا ہوں آج وہ کیسے باکس کا پتا نہیں بتاتی لیکن اس سے پہلے کچھ موج مستی۔‘‘ وہ خود سے باتیں کیے جا رہا تھا۔ اتنی بوتلیں معدے میں اُنڈیلنے کے بعد وہ نشے کی حالت میں صوفے پر لینا آنے والے مسحور کُن لمحات کے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ ٹی وی پر مختصر سیاہ لباس میں ملبوس سنگر کم ڈانسر کے جلووں سے اس کی اشتہا بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ گزشتہ برسوں کے دوران وہ لینا کی کمی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ اسے باکس ہی نہیں، خود لینا کے وجود کی بھی طلب تھی۔ اس کی پیاس بڑھتی جا رہی تھی۔ اسی دوران میں اس نے مڑ کر زینے کی طرف دیکھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے ایک اور بوتل کھولی۔ ’’بڑا وقت لگا رہی ہے یہ تیار ہونے میں۔‘‘ وہ حسبِ عادت بڑبڑایا۔

دوسری طرف خوف زدہ لینا بیڈ روم میں تھی۔ وہ بری طرح سہم چکی تھی۔ وہ روِنی کے شدت پسند مزاج اور اس کی مجرمانہ ذہنیت سے بخوبی واقف تھی۔ اس کے ہاتھ میں شکاری چاقو اور چند ملی میٹر چوڑا... کٹر بلیڈ دیکھ چکی تھی، جس سے اُس نے ٹیلی فون وائر کاٹا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ شخص کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ کٹر بلیڈ سے فون کا وائر ہی نہیں، اس کی شہ رگ بھی کاٹ سکتا تھا۔ وہ مجبوری کے عالم میں روِنی کی

ہدایت کے مطابق تیار ہونے آئی تھی لیکن اس کا دماغ تیزی سے کچھ اور سوچ رہا تھا۔ رونی کا اس گھر میں ہونا کسی بھی وقت کسی بھی سنگین واردات کی وجہ بن سکتا تھا۔ بظاہر وہ ناتواں اور سہمی ہوئی تھی۔ ایسے تنہا گھر میں جس کا دروازہ وہ پہلے ہی اندر سے لاک کر چکا تھا، اسے اپنی زندگی ہر لمحے سولی پر لٹکی محسوس ہو رہی تھی۔ رونی کی شکل میں پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں پڑ چکا تھا۔ وہ کسی بھی وقت لیور کھینچ کر اسے موت کے اندھیرے کنوئیں میں پھینک سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس کے جبڑے بھنچ گئے۔ آنکھیں بدستور خوف زدہ تھیں مگر اپنی جان بچانے کے لیے وہ کچھ کر گزرنے کا عزم کر چکی تھی۔ وہ جو کرنے جا رہی تھی، اس کا فیصلہ برسوں پہلے کر چکی تھی۔

دوسری طرف رونی گمشدہ باکس ملنے اور ویک اینڈ نائٹ اس کے ساتھ بتانے کے خیال سے شاداں و فرحاں تھا لیکن لینا کے لیے یہ خیال ہی سوہانِ روح تھا۔ اسے رونی سے صرف نفرت ہی نہیں بلکہ اُس کے وجود سے ہی کراہیت محسوس ہوتی تھی۔

''کم بخت کہاں مر گئی، تیار ہو رہی ہے یا...'' رونی نے زینے کی طرف دیکھا اور خودکلامی کی اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''دس منٹ ہو چکے۔'' اس نے دانت کچکچائے اور انتظار کی شدت کم کرنے کے لیے ایک اور بوتل کھول لی۔ نشہ اس کے سر پر چڑھ چکا تھا لیکن اگلے ہی لمحے اوپری منزل سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز اسے حقیقت کی دنیا میں واپس لے آئی۔ یک دم اس کا سارا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ اس نے چوکنا ہو کر تیزی سے گردن گھمائی اور زینے کی طرف دیکھا۔ ''کیا ہو رہا ہے یہ... کیا کر رہی ہے کمینی...'' وہ چلّایا۔ لہجے سے ہلکا سا خوف بھی جھلک رہا تھا۔ یہ صورتِ حال اس کے لیے غیر متوقع تھی۔

لمحہ بھر سوچنے کے بعد وہ اٹھا اور نہایت محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھتا ہوا زینے کی طرف بڑھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ضرور اس نے پڑوسیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے فائر کیا ہوگا۔ ''اب نہیں چھوڑوں گا اُسے۔'' اس نے دانت کچکچائے۔ اس کی مٹھی بھنچ چکی تھی۔ لگتا تھا کہ اگر لینا اس کے سامنے کھڑی ہوتی تو وہ زوردار مُکّا مار کر ایک بار پھر اس کی ناک توڑ چکا ہوتا۔ چاقو کے دستے پر اس کی گرفت سخت تھی۔ وہ تہیہ کر چکا تھا کہ لینا نے اگر اسے پستول کے زور پر بے بس کرنا چاہا تو پھر وہ کسی صورت اسے نہیں چھوڑے گا۔ اس کے سارے سہانے سپنے بکھر چکے تھے۔ حسین خوابوں کو یوں برباد ہوتا دیکھ کر وہ سخت طیش میں تھا۔

ماسٹر بیڈ روم کے دروازے پر پہنچ کر وہ ایک طرف ہوا۔ خود کو لینا کی چلائی گئی گولی کا ممکنہ شکار بننے سے بچانے کے لیے اس نے دروازے پر لات ماری۔ وہ اندر سے کھلا ہوا تھا۔ زوردار لات پڑتے ہی پٹ تھوڑا سا کھل گیا۔ اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور پھر چوکھٹ کے قریب ہو کر اندر جھانکا۔ جو کچھ نظر آیا، وہ اس کا بچا کھچا نشہ اتارنے کے لیے کافی تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ کمرے کے اندر تھا۔

''اوہ میرے خدا...'' اس نے حیرت سے ہونٹ سکیڑے۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل چکا تھا۔ اسے اپنا گمشدہ باکس یاد آ رہا تھا۔ ''یہ گئی، باکس بھی گیا۔'' اس نے تاسف سے ہاتھ ملے۔

کمرے کے عین وسط میں فرش پر لینا چت پڑی تھی۔ اس کے سینے پر، دل کے اوپر گولی کا نشان نظر آ رہا تھا۔ خون بھل بھل کر کے اُبل رہا تھا۔ فرش پر بھی خاصا خون جمع ہو چکا تھا۔

رونی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ دل پر لگی گولی نے کام کر دکھایا۔ وہ اس کے خوف سے رہائی پا چکی تھی۔ اس کا حلق خشک پڑ رہا تھا۔ اس نے تھوک نگلا اور ایک قدم آگے بڑھا۔ کمرے میں ٹیبل لیمپ کی ہلکی زرد روشنی میں وہ اس کا پیلا پڑتا چہرہ بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھ چکی تھیں۔ رونی نے خود پر قابو پایا۔ ایک بار پھر اس پر غصے کا دورہ پڑ چکا تھا۔ ''کمینی عورت... یہ سب کچھ تجھے آج رات ہی کرنا تھا۔'' اس نے لاش کی پنڈلی پر ٹھوکر مارتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ لاش کے قریب ہی رائفل پڑی تھی۔ وہ جھکا، لمحہ بھر اسے دیکھا اور پھر سر پکڑ لیا۔ ''اوہ میرے خدا...'' وہ چلّایا۔ ''تو یہ لینا نے چوری کی تھی۔'' اس نے رائفل کے بٹ پر نظر ڈالی جہاں 'آر ایم' کندہ تھا۔ یہ اس کے شکار کی رائفل تھی لیکن کئی برس پہلے گم ہو گئی تھی۔ ''یہ اس نے کیسے چوری کر لی تھی؟''

لمحہ بھر کے لیے رونی کے دل میں خیال آیا کہ وہ اپنی رائفل اٹھائے اور جتنا تیزی سے ممکن ہو، یہاں سے نکل جائے۔ اس نے رائفل کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اگلے ہی لمحے اس کے دماغ میں ایک اور خیال کوندا۔ اس نے آگے بڑھا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر جائے وقوع سے پولیس کو آلۂ قتل نہ ملا تو وہ اسے خودکشی نہیں بلکہ قتل قرار دے

گی۔ ویسے بھی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ چند گھنٹوں پہلے ہی وہ قصبے میں کپڑوں کے ایک بڑے اسٹور کے منیجر سے لینا کا پتا پوچھ رہا تھا۔ وہ اس کے حوالے سے کافی باتیں بھی کر چکا تھا۔ یقیناً پولیس کو اس کا پتا چلانے اور قاتل ٹھہرانے میں کوئی دیر نہ لگتی۔ وہ بھی ایسی صورت میں کہ جب مقتولہ اس کی مفرور بیوی ہو۔

اس نے زمین پر گھٹنے ٹیک دیے اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اسی دوران میں اسے اپنے کندھے میں درد کی لہر اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ساتھ ہی حلق کے دائیں حصے میں بھی درد ہوا۔ اس نے چند لمحوں بعد پھر لاش پر نظر ڈالی۔ نیم کھلی آنکھیں، فرش پر خون اور کمرے میں لہو کی مہک... اس کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔

''آرام سے رونی...'' اس نے خودکلامی کی۔ ''خود پر قابو رکھو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ اپنے آپ کو تسلی دے رہا تھا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور کمرے پر طائرانہ نظر ڈال کر چند لمحے سوچتا رہا۔ اپنے دفاع کی خاطر اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے جیب سے رومال نکالا اور بیڈ روم کے دروازے کے ہینڈل کو اچھی طرح صاف کیا۔ اس کے بعد وہ تیزی سے زینہ اترتا ہوا ہال میں پہنچا۔ کھونٹی سے جیکٹ اتار کر پہنی اور کچن میں گیا۔ ذرا سی تلاش کے بعد اسے الماری سے ایک تھیلا مل گیا۔ وہ پلٹا اور کافی ٹیبل پر پڑی خالی بوتلیں اس میں ڈالنے لگا۔ وہ اپنی یہاں موجودگی کے تمام تر ثبوت مٹا دینا چاہتا تھا۔

''پولیس کو چکما دینا ہے، ہوشیاری سے۔'' اس نے ہال پر نظر ڈالتے ہوئے حسبِ عادت خودکلامی کی۔ ''سب ٹھیک ہے... چلو نکلو یہاں سے۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ رومال سے پہلے ہینڈل اور چابی کو اچھی طرح صاف کیا اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

چہار سُو بدستور تاریکی اور سناٹا تھا۔ اندھیرے میں وہ ٹیڈی کی لاش سے ٹکرایا اور جھاڑیوں میں گرتے گرتے بچا۔ ''لعنت ہو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھاتا ہوا درختوں کے اُس جھنڈ کی طرف بڑھا جہاں کار پارک کی تھی۔

اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ جسے برسوں سے تلاش کر رہا تھا، ہاتھ لگی مگر چکنی مچھلی کی طرح پھسل گئی۔ یک دم اسے گمشدہ باکس کا خیال آیا۔ ''باکس قسمت میں نہیں تھا۔'' اس نے کار کا دروازہ کھولا۔ اندر بیٹھ کر ایک بار پھر احتیاطاً طلب نظروں سے باہر دیکھا۔ وہاں دور دور تک اسے کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ خود کو خوش قسمت گردان رہا تھا۔ نہ تو اسے کسی نے کاٹیج میں آتے جاتے دیکھا اور نہ ہی گولی کی آواز سن کر کوئی اس طرف آیا تھا۔

اسے یہ تو یقین تھا کہ فی الوقت ایسے حالات نہیں کہ پولیس اس پر فوری ہاتھ ڈال سکے لیکن مفرور بیوی کا قتل اور واردات سے چند گھنٹے قبل اُس کا قصبے میں موجود ہونا... پولیس اس تک پہنچے گی ضرور۔ اس کا سازشی اور مجرمانہ ذہن تیزی سے آنے والی صورتِ حال پر غور کر رہا تھا۔ اس نے اپنے بچاؤ کا منصوبہ بنا لیا۔ فہرست میں اگلا نام ایڈا نیلسن کا تھا۔

ایڈا اوسلو کی ایک کریمنل کیسز کی وکیل تھی اور اس کی دوست بھی۔ اس نے اب تک آخری ملاقات میں ایڈا کی کافی بے عزتی کی تھی لیکن یقین تھا کہ جب یہ اس کے در پر

شوہر نے دفتر سے آتے ہی جلدی جلدی ہاتھ دھوئے غالباً زور کی بھوک لگ رہی تھی، اتفاق سے سامنے سے بیگم نمودار ہو گئیں، ذرا کرخت لہجے میں کہنے لگیں۔ ''یہ آپ دفتر سے آتے ہی کیا کر رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں... وہ ذرا... ہاتھ دھو کر منے کو اٹھانے لگا تھا۔'' شوہر نے ٹپٹاتے ہوئے کہا۔

برنارڈ اور چرچل

انگریزی کے مشہور ڈراما نویس جارج برنارڈ شا نے ایک روز چرچل سے کہا۔

''میری ذہانت، صحت اور لمبی عمر کا راز یہ ہے کہ میں عورت سے دور رہتا ہوں، شراب نہیں پیتا، گوشت نہیں کھاتا۔ تمباکو کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ صرف پھلوں، سبزیوں اور دودھ پر گزارہ کرتا ہوں۔''

چرچل نے جواب دیا۔

''مسٹر شا! میں تو چوبیس گھنٹے شراب پیتا ہوں، ہر وقت میرے ہاتھ میں سگار رہتا ہے، شادی شدہ بھی ہوں، گوشت خور بھی ہوں اور خوش خوراک بھی۔ اس کے باوجود نہ میں آپ سے کم عمر ہوں، نہ آپ سے کم ذہین اور صحت بھی آپ سے خراب نہیں۔''

حسن ابدال سے موہن سنگھ کا چٹکلا

جائے گا تو اُس کا دل ضرور پسیجے گا اور وہ آنے والے مشکل حالات سے نکلنے میں اس کی مدد پر فوراً تیار ہو جائے گی۔ اسے اپنی رائفل کی وجہ سے بھی پھنسنے کا خدشہ تھا مگر وہ یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ اس نے سیکیورٹی ڈپارٹمنٹ کے پاس اسے اپنے نام سے رجسٹرڈ نہیں کرایا تھا۔ رائفل کے بٹ پر کندہ 'آر ایم' کی کوئی بھی وجہ بیان کی جاسکتی تھی۔ یک دم اسے یاد آیا کہ اس نے جو رائفل رجسٹرڈ نہیں کرائی، وہ تو اس کے گھر پر ہے۔ یہ تو دوسری تھی جسے اُس نے لینا کے پاس دیکھا۔ ''اوہ...'' فوراً ہی اس کے شاطر دماغ نے ایک اور چال چلی۔ سوچا کہ وہ یہاں سے سیدھا ایڈا کے پاس جائے گا اور اسے ساتھ لے کر پہلے پولیس کے پاس جا کر رائفل چوری کی رپورٹ درج کرادے گا۔ ''یہ ٹھیک ہوگا، بات بن گئی۔'' رونی نے خود اپنے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے داد دی۔ اس طرح جب پولیس کو لاش کے پاس سے رائفل ملے گی اور یہ اس کی گمشدگی کی رپورٹ دکھائے گا تو وہ یہ اعتراف کرلے گی کہ لینا نے اس طرح خودکشی کی جسے قتل کا رنگ دیا جاسکے۔ اس کا تو ثبوت یہ ہے کہ رونی سے پیچھا چھڑانے سے پہلے اس نے شوہر کے خلاف کئی بار تشدد اور جان لینے کے خطرے کی رپورٹ درج کرائی تھی اور ہر بار اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اس کا وکیل کہہ سکتا تھا کہ لینا نے اپنے شوہر کو پھنسانے کی بار بار کوشش کی لیکن جب کوئی حربہ کامیاب نہ ہوا تو اس نے رائفل چوری کی اور اسی سے خود کو گولی مارلی تاکہ کسی بھی طرح اُس سے انتقام لیا جاسکے۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''وقت کم ہے۔'' خود کلامی کرتے ہوئے اس نے کار اسٹارٹ کی اور ہیڈ لائٹس آن کیے بغیر جس راستے سے پہنچا تھا، اُسی پر پلٹ گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ فیبریکن فارم کی حدود سے باہر نکل چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہاں آتے اور جاتے ہوئے اسے کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔ قصبے سے باہر نکلتے ہی اس نے کار کی رفتار بڑھادی۔ وہ جلد از جلد اوسلو پہنچنا چاہتا تھا۔ اسے ایڈا کی مدد لے کر کسی بھی طرح رائفل چوری کی پولیس رپورٹ درج کرانا تھی۔

اسے اتفاق کہیے کہ قصبے سے نکل کر موٹر وے پر آنے تک ایسا کچھ نہ ہوا کہ جس سے رونی کسی قسم کا خطرہ محسوس کرتا۔ قصبے سے نکلنے تک وہ نہایت محتاط ڈرائیونگ کر رہا تھا لیکن موٹر وے پر آتے ہی اس نے رفتار بڑھادی۔ وقت کافی گزر چکا تھا۔ ایڈا جلد سونے کی عادی تھی۔ وہ اس تک جلد از جلد پہنچنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر تک وہ طے شدہ رفتار پر چلتا رہا لیکن موٹر وے پر کچھ زیادہ گاڑیاں نہ تھیں۔ اس نے موقع پا کر رفتار تیز کردی، ویسے بھی اسے تیز رفتاری کا چسکا تھا۔ ڈرائیونگ کے دوران دوسری گاڑیوں کو پیچھے چھوڑنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ گاؤں سے نکلے کافی دیر ہوچکی تھی لیکن رات کے وقت موٹر وے پر رفتار کی حد کافی کم رکھی گئی تھی۔ رونی کو کم رفتار پر کار چلانے سے کوفت ہوتی تھی۔ اس نے رفتار مزید بڑھادی۔ وہ نوے کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے جا رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر بیک ویو مرر پر پڑی۔ اس کے پیچھے پولیس کار کی نیلی اور سرخ جلتی بجھتی بتیاں نظر آرہی تھیں۔

''لعنت ہے...'' اس نے رفتار سو میل کردی۔ پولیس کار کی رفتار بھی تیز ہوچکی تھی۔ رات کے اس پہر موٹر وے کے اس حصے پر حدِ رفتار ساٹھ کلومیٹر فی گھنٹا تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر پولیس نے پکڑا تو جرمانے پر ہی جان نہیں چھوٹنے والی۔ وہ نشے میں بھی تھا۔ ایسے میں پکڑے جانے کا مطلب جیل، جرمانہ اور لائسنس ضبط ہوتا تھا۔ ''میں ہاتھ نہیں آنے والا۔'' اس نے ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھادیا۔ رفتار ایک سو تیس میل فی گھنٹا تک پہنچ چکی تھی۔

اب پولیس کار کافی پیچھے رہ گئی تھی لیکن وہ رکی نہیں تھی۔ ''پکڑلو...'' اس نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا اور منہ باہر نکال کر پیچھے دیکھا۔ ''نہیں پکڑ سکتے۔'' اس نے خود کلامی کرتے ہوئے زبان چڑائی۔

☆☆☆

فیبریکن فارم میں لینا کے کاٹیج پر مکمل سکوت طاری تھا۔ رات کی تاریکی گہری ہوچکی تھی۔ کاٹیج کے ہال میں بدستور روشنی تھی۔ اچانک داخلی دروازہ تھوڑا سا کھلا اور ایک سایہ باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ یہ لینا تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آگے بڑھی۔ وہ محتاط نگاہوں سے دونوں طرف دیکھتی جارہی تھی۔ کُتے کی لاش کے پاس پہنچ کر وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر غم و افسوس کا تاثر نمایاں تھا۔ وہ کافی دیر تک کُتے میں زندگی کی رمق تلاش کرتی رہی مگر وہ کب کا مرچکا تھا۔ وہ اس کے چہرے پر نہایت پیار سے ہاتھ پھیرتی رہی۔ کافی دیر بعد وہ اٹھی۔ گھر کے اندر گئی۔ باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک چادر اور بیلچہ تھا۔ اس نے جھاڑیوں کے قریب زمین کھودی اور کُتے کو چادر میں لپیٹ کر دفن کردیا۔ اس نے اخروٹ کے درخت کی سوکھی ٹہنی سے صلیب بنائی اور قبر کے سرہانے گاڑی۔ ''الوداع اے

پیارے دوست!''

وہ گھر کے اندر پلٹی اور بیلچہ اسٹور میں رکھ کر ماسٹر بیڈ روم میں چلی آئی۔ فرش پر پڑی لاش جو رونی کے مطابق لینا تھی، اس کے سینے سے خون اُبلنا بند ہوچکا تھا۔ لینا نے کمرے کی لائٹس روشن کیں۔ وہاں دو لینا تھیں۔ ایک فرش پر لاش کی صورت جبکہ دوسری اس کے عین سامنے زندہ سلامت کھڑی تھی۔

زندہ لینا کے ہاتھ میں بالٹی اور پوچا تھا۔ اس نے لاش ایک طرف کھسکائی اور فرش صاف کرنے لگی۔ اس کے بعد اس نے لاش کے کپڑے اتارے۔ وہ دراصل لاش نہیں بلکہ جیتی جاگتی لینا سے ہوبہو مشابہ ربر کی ڈمی تھی جسے اس نے وہ کپڑے پہنادیے تھے، جو کچھ دیر پہلے رونی کی آمد کے وقت اس نے پہن رکھے تھے۔

جب لینا بیڈ روم میں تیار ہونے آئی تو سوچ رہی تھی کہ رونی پہلے اپنی من مانی کرے گا اور جی بھرنے کے بعد ایک بار پھر اسے مار پیٹ کر اُس باکس کا پوچھے گا۔ انکار کا مطلب مزید تشدد ہوتا۔ وہ تین برس تک اس سے چھپی رہی لیکن اب وہ اسے تلاش کرچکا تھا۔ اگر اس بار اُس کے ہاتھوں مرنے سے بچی تو پھر جان بچانے کا ایک ہی حل ہوگا ایک اور فرار... لیکن لینا نے اس بار کھیل ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ رونی سب سے زیادہ پولیس سے ڈرتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ جو ناٹک اس نے رچایا تھا، اُس کے بعد اب رونی کبھی اس طرف کا رخ نہیں کرے گا۔ ویسے بھی وہ الماری کے اندر چھپ کر کی ہول سے اُس کی ساری کارروائی دیکھ چکی تھی۔ جس طرح وہ خوف زدہ تھا، اس سے یہی لگتا تھا کہ اب وہ اس طرف نہیں آنے والا۔ یہ سچ تھا کہ رونی ڈمی اور زندہ لینا کے درمیان کوئی فرق نہیں سمجھ سکا تھا۔ ڈمی کے سینے سے اُبلتا خون اس کے لیے کافی تھا۔ واقعی اسے تو اب اپنی جان کے لالے پڑے تھے۔ یہ بات لینا اچھی طرح جان چکی تھی۔ اسی لیے وہ خاصی مطمئن تھی۔

کمرے کی صفائی کے بعد لینا نے رائفل اور ڈمی اٹھا کر الماری میں رکھی اور کچن میں آگئی۔ رونی کے لیے اوون میں رکھا پیزا ویسے کا ویسے تھا۔ اس نے پیزا گرم کیا اور ہال میں آکر صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاید اب رونی سے جان چھوٹ جائے گی۔

لینا ماہر پتلی ساز تھی۔ وہ اوسلو کی ایک تھیٹر فلم کمپنی گلیکسی تھیٹر کے ساتھ کئی برس تک وابستہ رہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ رونی نے اس کی زندگی ہی نہیں بلکہ اس کے کیریئر پر بھی تباہ کُن اثر ڈالا تھا۔ لینا کی نظر میں دونوں کی تباہی کا ذمے دار رونی تھا۔ وہ لاکھ کوششوں کے بعد بھی اس سے پیچھا چھڑانے میں ناکام رہی تو پھر اس نے حال اور مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے ایک منصوبہ بنایا۔ ربر سے اپنی ہم شکل ڈمی بنائی۔ موقع پا کر اس کی کار سے رائفل چوری کی اور جن دنوں وہ بینک ڈکیتی کے الزام میں جیل کے اندر تھا، ایک روز خاموشی سے اپنا پُرتعیش اور قیمتی فلیٹ فروخت کرکے اوسلو سے اس گمنام قصبے میں آبسی۔ وہ ایسا نہ کرتی لیکن رونی نے اوسلو میں اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، اس کے بعد اسے اپنی جان خطرے میں نظر آرہی تھی۔ اس کا منصوبہ مکمل تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ایسا ہوگا اور آخر تین برس کے بعد وہ اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کی تیاری وہ تین برس پہلے ہی کرچکی تھی۔ خون کا نقلی ڈبا کئی برس سے استعمال کا منتظر تھا۔

ٹی وی پر بدستور وہی میوزک پروگرام چل رہا تھا جسے صوفے پر لیٹا رونی دیکھ رہا تھا۔ لینا نے پیزا ختم کیا۔ ٹیلی فون کی تاریں جوڑیں، بیٹی کی سہیلی کے گھر فون کیا۔ وہ دونوں سوچکی تھیں۔ لینا بھی ٹی وی اور لائٹس آف کرکے سونے کے لیے چل دی۔

دوسری صبح آٹھ بج رہے تھے جب ایمی نے دروازے پر دستک دی۔ اس کی سہیلی کی ماں اسے چھوڑنے آئی تھی۔ لینا نے کار میں بیٹھی عورت کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور بیٹی کو لیے اندر آگئی۔ دونوں ماں بیٹی کچن میں ڈائننگ ٹیبل پر تھیں۔

''مما... آج آپ بہت خوش نظر آرہی ہیں۔''

''ہاں... ہم اب کافی عرصے تک خوش رہیں گے۔'' لینا نے چہک کر جواب دیا۔

''واہ... اور گھومنے بھی جائیں گے اوسلو۔''

''شاید...'' اس بار لینا کا لہجہ کچھ افسردہ تھا۔ ''ارے ذرا جاؤ، لیٹر باکس سے آج کا اخبار تو لے آؤ۔'' اس نے گفتگو کا رخ بدلنے کے لیے بہانہ بنایا۔

''اچھا...'' ایمی باہر کی طرف بھاگی۔

''مما پلیز کیک...''

''ایک منٹ...'' اس نے پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور میز پر رکھے اخبار پر نظر ڈالی۔ ''اوہ میرے خدا...'' پہلے صفحے پر ایک تباہ شدہ کار کی بڑی سی تصویر موجود تھی۔ عقبی حصے پر لگی کار کی نمبر پلیٹ صاف نظر آرہی تھی۔ اس نمبر کو وہ کبھی بھلا نہیں سکتی تھی۔ ''یہ کیا ہوگیا...؟'' اس کے منہ

سے بے اختیار نکلا۔ وہ سخت حیرت زدہ تھی۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا ہوجائے گا۔ اس نے خبر کی سرخی پر نظر ڈالی... ”پولیس سے بچنے کی کوشش کرنے والا مشتبہ کار سوار ہلاک، موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی اُلٹ گئی۔“

خبر کے متن میں پولیس کا کہنا تھا کہ مقررہ رفتار سے کہیں زیادہ تیز چلتی کار کو انہوں نے روکنے کی کوشش کی لیکن ڈرائیور نے رکنے کے بجائے رفتار اور بڑھادی۔ پولیس کے پیچھا کرنے کے باوجود وہ نہ رکا۔ آخر ای سکس موٹروے کا ایک خطرناک موڑ کاٹتے ہوئے کار بے قابو ہوکر الٹی اور کھائی میں جاگری جس کے باعث اوسلو کا رہائشی سینتالیس سالہ ڈرائیور رونی میرلے موقع پر ہی ہلاک ہوگیا۔ متوفی مجرمانہ پس منظر کا حامل تھا تاہم پولیس کو ایک شکاری چاقو اور کٹر کے سوا کوئی اور مشکوک شے کار سے نہیں ملی۔

اس نے نظریں اوپر کیں اور بیٹی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت، دکھ اور خوشی کے ملے جُلے تاثرات تھے۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ شوہر کے مرنے کا سوگ منائے، اس سے چھٹکارے کا جشن منائے یا اپنی کمسن بیٹی کے یتیم ہونے پر اس سے ہمدردی کرے۔

وہ کافی دیر تک سوچ میں ڈوبی رہی۔ ایمی ہال میں تھی۔ آخر وہ اٹھی۔ ایمی گھومنے کا سن کر اتنی خوش تھی کہ اس نے اوسلو میں رہائش کے دوران کھینچی گئی اپنی تصویروں کا البم نکالا اور دیکھنے بیٹھ گئی۔

”تمہیں اوسلو بہت پسند ہے؟“ اس نے پیچھے سے آکر ایمی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”کیوں نہیں مما... کیا ہم کبھی اوسلو جاسکیں گے؟“

”کیوں نہیں...“ وہ چہک کر بولی۔ ”اپنا سامان ابھی سے پیک کرنا شروع کردو۔ ہم شہر کے رہنے والے ہیں، گاؤں ہمارے لیے چھوٹا پڑ گیا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔

”واقعی...“ ایمی حیرت سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اسے ماں کے کہے کا یقین نہیں آرہا تھا۔ اوسلو کا نام سنتے ہی خوف زدہ ہوجانے والی لینا آج وہاں جانے اور رہنے کی بات کررہی تھی۔ یہ اس بچی کے لیے بہت بڑی خبر تھی۔ اسے ماں کے اس طرح ہنسنے پر بھی بہت حیرانی تھی۔ وہ شاید برسوں بعد اس طرح دل کھول کر ہنسی تھی۔

”ہم بہت جلد اوسلو واپس جارہے ہیں رہنے کے لیے۔“ اس نے بیٹی کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ ”تم آنٹی جینی کے گھر جاکر اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلو۔ مجھے کئی کام کرنے ہیں، پیکنگ کرنی ہے...“

ایمی اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی باہر کی طرف دوڑ چکی تھی۔

لینا بیڈروم میں آئی۔ الماری کھول کر ڈمی نکالی اور ایک چاقو کی مدد سے اس کا پیٹ چاک کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ اندر سے ایک باکس نکال رہی تھی۔ ”یہ رہا تمہارا باکس مسٹر رونی مرحوم...“ وہ بڑبڑائی۔ ”میں نے کہا تھا نا کہ ایمی تمہاری بیٹی ہے اور اب یہ اس کے مستقبل کے کام آئے گا۔“ اس نے باکس کھولا۔ اندر سو گرام سونے کے کئی بسکٹ اور چند ہیرے جگمگا رہے تھے۔ ”باپ کا مال بیٹی کے کام نہ آیا تو کیا فائدہ...“ یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسی۔ ”شاندار فلیٹ، قیمتی گاڑی... مال کافی رہے گا۔“

یہ بینک لاکر سے لوٹا گیا رونی کا وہ باکس تھا جسے واردات کے بعد اس نے گیراج کی دیوار میں بنے خفیہ خانے میں چھپایا تھا۔ لوٹ کے مال میں سے یہ رونی کا حصہ تھا۔ جب وہ باکس چھپا رہا تھا، تب اسے یہ علم نہیں تھا کہ لینا اسے ایسا کرتا دیکھ چکی ہے۔ پولیس نے رونی کو سخت تشدد کا نشانہ بنایا لیکن لوٹ کا مال برآمد نہ کرسکی، نہ ہی اس کے خلاف کوئی اور ثبوت عدالت میں پیش کرسکی تھی اور نہ ہی رونی نے یہ اعتراف کیا کہ مال کہاں گیا۔ سال بھر بعد جب رونی جیل سے چھوٹا تو سیدھا اپنے گیراج پہنچا مگر اس کا مال تو اُڑ چکا تھا۔

سب رائگاں گیا مگر وہ آسانی سے ہار ماننے والا نہ تھا۔ آخر باکس کی تلاش میں لینا تک پہنچ گیا۔ اس کا شک درست تھا مگر بازی ایسی پلٹی کہ باکس کیا ملتا، اُلٹا جان دینی پڑگئی۔

لینا نے پیار سے باکس پر ہاتھ پھیرا اور بڑی احتیاط سے اسے الماری میں رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ ڈمی تلف کرنے کے لیے اسے ٹکڑوں میں کاٹنے لگی۔ ابھی اسے رائفل کو کھول کر اسے بھی ٹھکانے لگانا تھا۔

گلیکسی تھیٹر اور اوسلو... اس کا ذہن ماضی کی خوشگوار یادوں میں کھویا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہاں سے جانے کے بعد وہ بہت جلد ایک بار پھر اوسلو میں اپنی پرانی زندگی شروع کرسکے گی۔ ادب، مستقل تماشا، فلم... وہ اپنے تمام مشغلے ازسرِنو شروع کرنے کی منصوبہ بندی کررہی تھی۔ اب اس کے پاس کافی دولت تھی۔ وقت گزاری کے لیے اسے کام نہیں صرف مشغلوں کی ضرورت تھی۔

قیدی

جمال دستی

پھول کی مہک پھول کو قریب سے سونگھنے کی خواہش پر اکساتی ہے... اور ایسا ہونا انسان کے فطری جذبے کا اظہار ہے... اور ایسا نہ کرنا ذوقِ حسن پرستی کی توہین ہے... ایک خوب صورت... دوشیزہ کی بے چینی اور بے قراری کا دلچسپ انوکھا پارہ...

ایک قید سے نکل کر دوسرے قید خانے میں جانے والے شوقین کا احوال

موٹا آدمی لنچ روم کے کاؤنٹر پر کافی اور ہیمبرگر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے لڑکی کو مسلسل گھور رہا تھا۔

لڑکی کاؤنٹر کے عقب میں چوبی باکس پر بیٹھی تھی۔ یہ لکڑی کا بنا ایک اونچا باکس تھا۔ جسے وہ کرسی کی جگہ استعمال کررہی تھی۔ وہاں سے وہ ہائی وے کے دونوں جانب نظر رکھ سکتی تھی۔

”تم دو سال سے اس کا انتظار کررہی ہو؟“ موٹے نے کہا۔ ”کتنے برس انتظار کا ارادہ ہے۔“

”دو سال اور... شاید پانچ سال۔“ وہ بولی۔ ”لیکن میرا خیال ہے کہ شاید میرا انتظار ختم ہونے والا ہے۔“

موٹے نے گردن گھما کر ہائی وے کی جانب دیکھا جس طرف لڑکی کی نگاہ تھی۔ اسے دور ایک آدمی کی جھلک نظر آئی۔ اس کی چال میں تیزی تھی جیسے کوئی اس کے تعاقب میں ہو۔

”وہ مجھے قیدیوں کے لباس میں نظر آرہا ہے؟“ موٹے نے سوال کیا۔

”اسے پھنسایا گیا تھا۔ وہ قطعی معصوم ہے۔“ لڑکی نے قطعیت کے ساتھ کہا۔

”تم بری طرح وابستہ ہو اس کے ساتھ، آخر وہ کون ہے؟“

”ڈریکسن۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ اس کی بھوری آنکھیں قریب ہوتے شخص پر تھیں۔

''کریکسن؟'' موٹا آدمی چونکا۔ اس کا منہ برگر سے بھرا ہوا تھا۔ ''مجھے یاد آیا، اسے تو دس سال کی سزا ہوئی تھی۔''

لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ سڑک پر موجود آدمی نے اب دوڑنا شروع کر دیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دروازے پر تھا۔ اس نے اپنے عقب میں دیکھا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ اس نے بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر لڑکی کو مخاطب کیا۔ ''میٹی میٹی۔'' اس نے لڑکی کو کچھ بتانا چاہا۔ تاہم وہ صرف اس کا نام ہی لے سکا۔ عقب سے آنے والی گولیوں نے اس کے جسم کو روح سے خالی کر دیا۔ وہ گرا اور ختم ہو گیا۔

برگر سے بھرا موٹے آدمی کا منہ ٹیڑھا ہو گیا۔ آنے والا گھوم کر اس کے اسٹول کے قریب ہی گرا تھا۔ موٹا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

باہر اسٹیٹ پولیس کار کے دروازے بند ہونے کی آواز آئی۔ مسلح پولیس کی ٹولی کار میں موجود تھی۔ ان میں سے دو دروازے میں نمودار ہوئے۔ ایک سیدھا لاش کی جانب گیا۔

اس نے موٹے کو دیکھ اور لڑکی سے بولا۔ ''یہ کچھ دیر قبل جیل توڑ کر بھاگا تھا۔ ہمیں یہ جگہ دیکھنی پڑے گی۔ یہ اس طرف کیوں آیا؟''

لڑکی کی آنکھیں نفرت سے سکڑ گئیں۔ وہ ابھی تک چوبی بکس پر بیٹھی تھی۔

''تم لوگ قاتل ہو۔'' وہ چلائی۔ ''تم نے ایک غیر مسلح شخص کو مار ڈالا، جو اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تت... تم لوگ وحشی ہو۔''

''میں معذرت خواہ ہوں مس، ہم مجبور تھے۔'' پھر وہ موٹے کی جانب مڑا۔ ''تم نے یہاں کسی اور کو دیکھا ہے؟''

''نہیں۔'' موٹا گھبرایا ہوا تھا۔ ''لیکن یہ برسوں سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔'' موٹے نے مردہ شخص کی جانب اشارہ کیا۔ ''اس کے نزدیک وہ بے قصور تھا۔'' موٹے نے ادائیگی کاؤنٹر پر رکھی۔ ''سوری، میٹی... مجھے جانا چاہیے۔''

''ابھی نہیں، وہیں رکو... جب تک میں اجازت نہ دوں۔'' ایک آفیسر نے حکم جاری کیا۔ ''اس آدمی پر نظر رکھو، بل! جو اور جم تم لوگ آس پاس کا جائزہ لو، میں اندر دیکھتا ہوں۔''

حکم جاری کرنے والے نے اندرونی سمت پیش قدمی کی۔ لڑکی ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے ابھی تک باکس پر بیٹھی تھی اور آفیسر کو معاندانہ انداز میں گھور رہی تھی۔

اس نے کاؤنٹر کے عقب میں آ کر نیچے جھانکا۔ پھر کچن میں گھس گیا۔ میٹی اندرونی کمروں سے کھٹ پٹ کی آوازیں سن رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ پھر نمودار ہوا اور مفرور قیدی کی لاش کے قریب کھڑا ہو گیا۔

''آل رائٹ، بل ذرا مدد کرنا۔''

اس نے لڑکی سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ چوبی باکس پر براجمان پتھریلے تاثرات کے ساتھ تمام تر کارروائی کا جائزہ لے رہی تھی۔ ان دونوں نے لاش اٹھا کر باہر کار کی ڈکی میں منتقل کی۔

کچھ دیر بعد وہ سب وہاں سے جا چکے تھے۔ موٹا وہیں تھا اور ماچس کی تیلی سے دانتوں کو کھنگال رہا تھا۔ اس کی نظر لڑکی پر تھی۔

''بہت برا ہوا۔'' وہ بولا۔ ''برسوں کے انتظار کا ایسا دردناک انجام۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم چاہو تو میرے ساتھ رہ سکتی ہو۔''

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' میٹی جنگلی بلی کی طرح غرائی۔

''ہاں، میں جا رہا ہوں۔ بہت دیر ہو گئی۔'' موٹا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ باہر نکل کر اپنی ٹرک نما پک اپ میں جا بیٹھا۔ پولیس کار پہلے ہی غائب ہو چکی تھی۔ لڑکی موٹے کی گاڑی اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ ہائی وے پر نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

☆☆☆

پھر وہ پہلی بار چوبی باکس پر سے اتری... دروازے پر جا کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ عقبی دروازے پر پہنچی اور اطراف کا جائزہ لے کر اسے بھی لاک کر دیا۔

اب وہ واپس اونچے چوبی باکس کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے باکس کا ڈھکن اوپر اٹھا دیا... باکس میں قیدیوں کے مخصوص لباس میں ایک نڈھال شخص مڑا تڑا پڑا تھا۔

اس کی آنکھیں میٹی کی آنکھوں سے ملیں۔

''جلدی چلے گئے۔'' وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں سمجھا تھا کہ اب مر کر ہی اس لکڑی کی قبر سے جان چھوٹے گی۔ قید خانہ اس سے بہتر تھا۔''

''کریکسن! باہر آؤ۔'' لڑکی نے اسے سہارا دیا۔ وہ پہلی بار مسکرائی تھی۔ ''تو واپس قید خانے جانا ہے کیا؟''

پھندا

بشریٰ امجد

مچھلی کی بھوک کانٹے میں پھنسے چارے کو نگلنے پر مجبور کر دیتی ہے... اور بالآخر پھندے میں پھنس جاتی ہے... وہ بھی اپنا مطلوبہ ہدف نہایت ہوشیاری سے حاصل کر چکا تھا... مگر اس سے بے خبر تھا کہ اچھے آغاز کے بعد اختتام پر ایک کانٹا اس کے لیے تیار ہو چکا ہے...

قانون کی گرفت میں آ جانے والے زیرک کھلاڑی کی ستم گزیدگی

رات کی تاریکی میں جھیل کنارے پائن کے درختوں سے کسی اُلو کی چیخ سناٹے کو چیرتی چلی گئی۔ جھیل کے اوپر پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ اُلو کی چیخ کی لہریں پہاڑی چوٹیوں سے ٹکرا کر بازگشت کی صورت میں پلٹیں... ڈاکٹر پال نے جھرجھری لی۔

وہ اندھیرے میں ساکت کھڑا تھا۔ گاڑی سڑک سے ہٹ کر اس نے دور کھڑی کی تھی۔ یہ بھوکے اُلو کی آواز تھی جو رات کے اندھیرے میں شکار کے لیے نکلا تھا۔ ڈاکٹر

جانتا تھا مگر پھر بھی سرد لہر ریڑھ کی ہڈی سے ہوتی ہوئی گُدی کے بالوں جا تک پہنچی تھی۔

ڈاکٹر کا قد لمبا اور آنکھوں پر عینک تھی۔ سان برنارڈینو کی پہاڑیوں میں یہ جھیل ایک پکنک پلیس تھی۔ ڈاکٹر شہری فضاؤں کا عادی تھا۔ پہاڑوں اور ویرانوں کا گہرا اندھیرا اسے سخت ناپسند تھا۔

اس نے انتظار کیا لیکن الو کی چیخ دوبارہ نہیں ابھری۔ تاہم اس کا بدن ایک بار پھر لرزا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی چوہا اس کی قمیص میں گھس کر کمر پر سفر کر رہا ہو۔ ڈاکٹر نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر قصائی کی وزنی چھری کا دستہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ چھری کا پھل بڑا اور چوڑا تھا۔ شاید اسے چھرا کہنا چاہیے... دستے پر ہاتھ آتے ہی ڈاکٹر نے اپنے آپ کو بہتر محسوس کیا۔

''مجھے پُرسکون رہنا چاہیے۔'' اس نے خود کو سمجھایا۔ ''یہاں ایسی کوئی چیز نہیں جس سے خوف زدہ ہوا جائے۔'' بات بھی ٹھیک تھی۔ ریچھ، بھیڑیے اور دیگر درندے اس مقام سے دور صحرائی علاقے میں پائے جاتے تھے۔ یہ علاقہ محفوظ نہ ہوتا تو یہاں کوئی تفریح کے لیے نہ آتا۔

سیزن کے حساب سے جھیل کا اطراف خاصا آباد ہو چکا تھا۔ چھولداریاں اور خیمے نصب تھے۔ خطرہ صرف سرخ چوبی کیبن میں تھا۔ جہاں اسٹیو تھارن موجود تھا۔ لیکن یہ خطرہ بھی اختتام کی جانب گامزن تھا۔ ڈاکٹر مسکرایا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک مذبح خانے میں استعمال ہونے والی چھری پر تھا۔ تھارن کو آج اس دنیا سے رخصت ہو جانا تھا۔

ڈاکٹر نے آپریشن سے قبل کسی ماہر سرجن کی طرح منصوبہ بندی کی تھی۔ تھارن کو ختم کرنے کے بعد اسے پہلی فلائٹ سے نکل جانا تھا۔ وہ معمولی رسک بھی لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے چابیاں کار کے اندر ہی اگنیشن میں چھوڑ دی تھیں۔

اس نے محتاط قدموں سے چلنا شروع کیا۔ کیبن کے قریب پہنچ کر وہ واپسی کے راستے کو بغور ذہن نشین کرنے لگا۔ ممکن ہے وہ تھارن کو قتل کرنے کے بعد گھبراہٹ کا شکار ہو جائے اور واپسی میں اندھیرے میں بھٹکتا پھرے۔ مطمئن ہونے کے بعد وہ آگے بڑھا اور کیبن کی سیڑھیوں پر قدم رکھ دیا۔

دستک کے جواب میں اندر سے سوال آیا۔

''کون ہے؟'' کرسی کھسکنے کی آواز آئی۔

ڈاکٹر نے جواب نہیں دیا تو قدموں کی چاپ ابھری اور تھارن کا چہرہ نظر آیا۔ اسے نہیں پتا تھا کہ وہ ڈاکٹر کا نہیں، موت کا منتظر تھا۔

ڈاکٹر نے قدم اندر رکھا۔

☆☆☆

تھارن پستہ قامت اور ڈھیلا ڈھالا شخص تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔

''میں مطالعہ کر رہا تھا۔ تم دستک کے ساتھ اپنا نام نہیں گنگنا سکتے تھے؟'' وہ بولا۔

'نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔' ڈاکٹر نے سوچا۔ 'امکان تھا کہ آس پاس کے کسی کیبن یا خیمے میں کوئی میرا نام سن لیتا۔' ڈاکٹر مسکرایا۔ ''تم نے کچھ کھایا پیا نہیں ہے شاید؟''

''میں کھا پی چکا ہوں، تم کچھ لو گے؟'' اس نے دروازہ بند کیا۔

''نہیں۔''

''رقم لائے ہو؟''

ڈاکٹر نے فوراً جواب نہیں دیا۔ اس نے موٹے تھارن کو دیکھا اور کمرے کا جائزہ لیا۔ تھارن ٹھنڈی سانس بھر کے واپس اپنی آرام دہ کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ تھی۔

''ماہانہ رقم لائے ہو؟'' اس نے سوال دہرایا۔

''یہ آخری ادائیگی ہے، تھارن۔'' ڈاکٹر اس کی کرسی کے قریب چلا گیا۔ اسے اپنے اطمینان پر تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ وہ ایک عرصے سے تھارن کو ختم کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا... عمل کا وقت آن پہنچا تھا۔ وہ ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔ یہی اس کے اطمینان کی وجہ تھی۔

تھارن مسکرایا۔ ''تم ہر مرتبہ یہی کہتے ہو۔'' اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ''لیکن تم نے کبھی ایسا کیا نہیں... جب تک میرے پاس تمہارے خلاف بیورلے ہلز میں مخصوص ہیروئنز کو منشیات کی فراہمی کے ثبوت موجود ہیں تب تک ماہانہ ادائیگیاں چلتی رہیں گی۔'' قدرے توقف کے بعد اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اچھے خاصے موٹی اسامیاں تمہیں مارفین کی فراہمی پر معقول رقم دیتے ہیں۔ اس میں سے کچھ حصہ تم مجھے دیتے رہو تو کیا فرق پڑتا ہے؟''

ڈاکٹر خاموشی سے سنتا رہا۔

''میں نے اگر سی ڈی پولیس کے حوالے کر دی تو سوچو کیا ہوگا۔ تم جانتے ہو کہ تمہاری نیند آور ادویات کے باعث چھ مہینے پہلے ہی ایک اداکارہ مر چکی ہے لہٰذا میرا مشورہ ہے ڈاکٹر کہ کبھی ہوشیاری مت دکھانا... بری طرح پھنس جاؤ گے... لاؤ اب رقم نکالو۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' ڈاکٹر نے کہا اور کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا سوائے تیز دھار چھری کے... ڈاکٹر نے تھارن کی قمیص کے کالر سے تیسرا بٹن گنا... پھر اس کا ہاتھ باہر آیا اور ہدف کی جانب نرم گوشت میں اترتا چلا گیا۔ یہ ایک تیز تر اور جچا تلا وار تھا۔ تھارن کو ردعمل کا موقع ہی نہیں ملا۔

نہ زیادہ خون نکلا، نہ چیخ بلند ہوئی۔ تھارن کی آنکھیں درد اور اذیت کے باعث پھیل گئیں۔ تاثرات مسخ ہو گئے۔ اس کا جسم بل کھا کر کرسی سے پھسل گیا۔ ڈاکٹر کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس کا پیشہ ہی ایسا تھا۔ اس نے موت کے اَن گنت رنگ دیکھے تھے۔

تھارن ابھی مرا نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں اذیت کے ساتھ بے یقینی کا رنگ شامل تھا۔ اس کا ہاتھ اپنے سینے سے ہٹ گیا... ہاتھ خون سے بھرا ہوا تھا۔ ''ڈاک... اوہ خدایا... ڈاک... ک... ک...'' خون آلود ہاتھ چوبی فرش پر حرکت کر رہا تھا۔

ڈاکٹر کا چہرہ سپاٹ تھا۔ کوئی ہمدردی نہ کوئی رحم۔ ''آخری ادائیگی، تھارن۔ میں نے کہا تھا نا...'' ڈاکٹر نے رخ پھیر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی مطلوبہ چیز کہاں ہوگی۔ البتہ تھارن ایک سست اور آرام طلب شخص تھا۔ کیمرا اور سی ڈی وہ ساتھ لیے پھرتا تھا۔ کیمرا تو نظر آجاتا لیکن سی ڈی کے بارے میں جب تک ڈاکٹر کو یقین نہیں ہو گیا، وہ پابندی سے تھارن کو ہر ماہ ادائیگی کرتا رہا...

وہ جانتا تھا کہ جہاں کیمرا رکھا ہوگا وہیں سی ڈی بھی ملے گی۔ اگر نہیں تو پھر وہ مقتول کے لباس میں ہوگی۔ مختصر وقت میں دونوں چیزیں تلاش کرنے میں ڈاکٹر کا زیادہ وقت صرف نہیں ہوا۔ کیمرے کو اس نے ہاتھ نہیں لگایا۔ حتی الامکان اس نے کم چیزوں کو ہاتھ لگایا تھا۔

پھر جہاں جہاں ہاتھ لگایا وہاں رومال گھماتا چلا گیا۔ ڈاکٹر مطمئن تھا۔ وہ پلٹا اور تھارن کی جانب متوجہ ہوا۔ چھری اس کے سینے میں گہری اتر گئی تھی لیکن وہ زندہ تھا۔ ڈاکٹر کو حیرت ہوئی۔ تاہم اس کا تجربہ بتا رہا تھا کہ تھارن کے بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ڈاکٹر گھٹنے کے بل اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ''تمہاری بڑھتی ہونے والی حرص نے تمہیں ختم کروا دیا... ورنہ ثبوت تو میں بہت پہلے حاصل کر لیتا لیکن تمہیں بولنے سے نہیں روک سکتا تھا... تمہاری زبان ثبوت کے بغیر بھی کھل جاتی تو الٹا اس پولیس کے لیے مجھے گھیرنا کچھ مشکل نہ ہوتا۔ اب ثبوت بھی غائب اور تم بول بھی نہیں سکتے۔'' ڈاکٹر نے تھارن کی آنکھوں میں جھانکا... اس کی آنکھوں کی روشنی مدھم پڑ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے رومال سے سینے میں پیوست چھری کے دستے کو صاف کیا اور... کھڑا ہو گیا۔

وہ اپنی پُرسکون و پُراعتماد حالت پر حیران تھا اور خوشی بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کیبن پر طائرانہ نظر ڈالی۔ آخری بار مرتے ہوئے تھارن کو دیکھا اور آہستگی سے باہر اندھیرے میں مدغم ہو گیا۔

چھری اس نے ایک ہارڈ ویئر اسٹور سے چرائی تھی۔ پولیس کے پاس کوئی کلیو نہیں تھا کہ وہ اس قتل کو ڈاکٹر کی ذات سے جوڑنے میں کامیاب ہو جائے۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد نیم مردہ تھارن نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ مر رہا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا... دو منٹ کے اندر اس کی آنکھیں دوبارہ بند ہو گئیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر کے کمرے میں فون کی گھنٹی کئی بار بجی تو ڈاکٹر کو اٹھنا پڑا۔

''تم، ڈاکٹر ہو؟'' کسی اجنبی آواز نے سوال کیا۔

''یس۔'' ڈاکٹر کی آواز میں خمار تھا۔ واپسی پر وہ برومائیڈ لے کر سو گیا تھا۔

اجنبی آواز میں تیزی اور تشویش تھی۔

''میں ڈپٹی شیرف جم کین ہوں۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ کسی نے تفریح گاہ میں ایک آدمی کو چاقو مار دیا ہے... جتنی جلدی ہو سکے، پہنچو۔ وہ شدید زخمی ہے۔''

کلک کے ساتھ فون بند ہو گیا۔

ڈاکٹر پوری طرح بیدار ہو گیا۔ خوف سے اس کا دل بے قابو ہونے لگا اور چہرے کے ساتھ ہتھیلیوں پر پسینا پھوٹ پڑا۔

''تھارن اب تک زندہ ہے؟ آخر کیسے؟ اور شیرف طبی امداد کا طلبگار ہے۔'' ڈاکٹر بدحواس ہو گیا۔ ''اگر زندہ ہے تو کیا بول بھی سکتا ہے... نہیں، ناممکن۔ اس کا طویل طبی تجربہ کیونکر دھوکا کھا سکتا ہے۔'' ڈاکٹر اچھل کر بستر سے نکلا۔ فرار ہونا اس کی بدقسمتی پر مہر ثبت کر دیتا۔ اس کا احساسِ جرم دیگر خیالات پر حاوی تھا۔

وہ ہوٹل کے کمرے میں ساکت کھڑا تھا۔ وسوسوں اور اندیشوں کے سانپ اس کے ذہن میں سرسرا رہے تھے۔ خیالات کا جنگل اُگ آیا تھا۔ دفعتاً ایک نئی سوچ نے سر ابھارا۔ ''اگر وہ ہوش میں ہوتا یا بات کرنے کے قابل ہوتا تو وہ مجھے مدد کے لیے نہ بلاتے بلکہ مجھے گرفتار کرنے پہنچ چکے ہوتے۔

اس نئے خیال کے ساتھ ہی اس کی بدحواسی کم ہو گئی۔ یہ کرشمہ ہے کہ اب تک اس کی سانس چل رہی ہے۔ تاہم وہ کسی بھی وقت مر سکتا ہے۔ اسے ڈپٹی شیرف کا انداز اور آواز یاد آئی۔ اس کی آواز سے پریشانی جھلک رہی تھی اور اس نے ڈاکٹر سے جلد از جلد پہنچنے کی درخواست کی تھی۔

بس مجھے اتنا کرنا ہے کہ میں وہاں پہنچ جاؤں اور تھارن کو مرتے ہوئے دیکھوں... معاً اسے خیال آیا کہ ڈپٹی محض اس پر انحصار نہیں کر سکتا۔ یقیناً اس نے تفریح گاہ کے دیگر ہوٹلوں میں موجود ڈاکٹرز کو بھی فون کیا ہوگا اگر میں نہیں گیا اور کوئی دوسرا ڈاکٹر پہنچ گیا تو برا ہوگا۔ مجھے سب سے پہلے پہنچنا چاہیے۔ اگر کوئی معمولی خطرہ بھی ہو تو میں زخمی کو کوئی ایسی چیز دے سکتا ہوں کہ وہ ہوش میں ہی نہیں آئے... اور سوتے کا سوتا رہ جائے۔

ڈاکٹر نے پھرتی سے لباس تبدیل کیا اور بیگ اٹھا کر تقریباً دوڑتا ہوا ہوٹل سے نکلا۔ راستے میں اس نے کار بھی تیز چلائی تھی۔

اسٹیو تھارن کے کیبن کے قریب اس نے کار پارک کی۔ اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہاں دوسری کار صرف شیرف کی تھی۔

ڈپٹی شیرف دراز قد اور بھوری آنکھوں والا آفیسر تھا۔

''آؤ، ڈاکٹر اندر آ جاؤ... تم کافی جلدی آ[illegible]'' وہ بولا۔

اس کے چند الفاظ کے پیچھے اطمینان ہلکورے [illegible] تھا۔ کچھ عجیب سا لہجہ تھا اس کا۔ ڈاکٹر کو کچھ الجھن سی [illegible] تاہم اس نے اظہار نہیں کیا۔

اس نے تھارن کی خون آلود لاش کو دیکھا تو [illegible] ڈاکٹر کو کوئی شک نہیں تھا کہ تھارن بہت پہلے مر چکا [illegible]... پھر اس کی نگاہ تھارن کے خون آلود ہاتھ پر گئی۔ [illegible] D-O-C کے حروف خون سے لکھے گئے تھے۔ [illegible] قاتل کے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی لیکن [illegible] اسے اتنی ہی مہلت دی اور وہ تین حروف ہی لکھ [illegible] حروف نہایت بامعنی تھے۔

''کیوں...'' ڈاکٹر کی آواز بھرائی ہوئی [illegible] ''کیوں، یہ آدمی تو کئی گھنٹے قبل مر چکا ہے؟''

''ٹھیک... ڈاکٹر تم بالکل ٹھیک سمجھے ہو۔ [illegible] ہے۔'' ڈپٹی شیرف نے کہا۔

ڈاکٹر کو شیرف کے الفاظ بمشکل ہضم ہوئے۔ [illegible] ذہن کو خوف اور دہشت نے جکڑنا شروع کر دیا تھا۔ [illegible] سے بنائے گئے بھدے حروف کو گھورتا چلا گیا۔ [illegible] شیرف کو دیکھا۔ ڈاکٹر کی نگاہ خالی، خالی سی تھی۔

آفیسر مسکرا رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ گن پر تھا۔

''میرا اندازہ ہے کہ تمہیں معلوم ہے [illegible] کیسے ہوا؟ کیا میں غلط ہوں؟'' وہ بولا۔

ڈاکٹر احمقانہ انداز میں اسے گھور کر رہ گیا۔ [illegible] حال اور مستقبل سب تباہ ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر جان گیا [illegible]... اس کا چہرہ سپید پڑ گیا۔

''میں نے یہاں موجود سب ڈاکٹرز کو فون کیا [illegible] اگرچہ وہ چند ہی تھے۔'' آفیسر نے کہا اور فرش کی [illegible] اشارہ کیا جہاں DOC لکھا تھا۔ ''اور سب کو ایک ہی [illegible] دیا۔ لیکن کسی کو بھی لوکیشن کے بارے میں بتائے بغیر فون [illegible] کر دیا۔ کوئی نہیں آیا۔ صرف تم آئے۔ کیونکہ تمہیں پتا تھا [illegible] کہاں پہنچنا ہے۔ گھبراہٹ میں تمہارے دماغ نے [illegible] کیا اور تم سیدھے دوڑے چلے آئے۔ حالانکہ [illegible] معمولی سا پھندا لگایا تھا اور تم سیدھے آن پھنسے۔''

ڈاکٹر نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے چکر آیا۔ آفیسر نے بڑھ کر اسے بازو سے تھام لیا۔

طارق نے چائے کا گھونٹ لیا اور اخبار کا اشتہارات والا حصہ کھول کر دیکھنے لگا۔ وہ اس ون بیڈ لاؤنج کے اپارٹمنٹ میں گزشتہ دو مہینے سے مقیم تھا۔ اس سے پہلے بھی اس نے متعدد رہائش گاہیں بدلی تھیں، یہی نہیں وہ کئی شہر بھی بدل چکا تھا۔ وہ جو کرتا تھا اس کا کسی ایک جگہ زیادہ عرصے رہنا مناسب نہیں تھا۔ اپارٹمنٹ کلفٹن میں ہونے کی وجہ سے اس کا کرایہ اچھا خاصا تھا۔

اخبار پر اس کی نظریں ضرورتِ رشتہ کے کالم پر پھسل

برابر کی ٹکر

مریم کے خان

شاطروں کے کھیل سفاک ہی نہیں... بعض اوقات عبرت ناک بھی ہوتے ہیں... محبت کا جال اس قدر دلفریب ہوتا ہے کہ ہر کوئی اس میں نہ چاہتے ہوئے بھی الجھنا پسند کرتا ہے... شکار اور شکاری کے تعاقب میں سنسنی خیز موڑ اختیار کرتی دلچسپ کہانی...

ایک دوسرے کے نقش پا پر چلنے والے ہم سفر جوڑے کی سنگین یکجائی

رہی تھیں اور پھر ایک اشتہار پر رک گئیں۔ اس میں لکھا تھا۔ ''ایک خود مختار بیوہ کو مالی طور پر مضبوط شخص کا رشتہ درکار ہے۔ عمر اڑتیس سال، ڈیفنس میں رہائش۔ ذاتی گاڑی اور مناسب بینک بیلنس، مالی لحاظ سے مضبوط۔ اپنے جیسا شخص چاہتی ہے۔ مرد اکیلا اور خود مختار ہو۔ بچے نہ ہوں۔ قبول صورت ہو، عمر پینتالیس برس سے زیادہ نہ ہو۔ طلاق یافتہ رنڈوے بھی قبول ہیں۔''

طارق نے پین اٹھا کر اشتہار پر دائرہ کھینچ دیا۔ یہ اسے مناسب لگا۔ فون نمبر نہیں تھا بلکہ اخبار کی طرف سے باکس نمبر دیا گیا تھا۔ چائے ختم کر کے وہ اندر سے ایک قیمتی چرمی بیگ لایا اور اس میں سے ایک نفیس لیٹر پیڈ نکالا جس کے صفحے کے نچلے حصے میں طارق شہباز لکھا تھا اور اس کا سائن بھی پرنٹ تھا۔ اس نے پین اٹھایا اور لکھنا شروع کیا۔ ''سلام، آپ کا ضرورت رشتہ کا اشتہار پڑھا، پتا نہیں کیوں آج اخبار کا یہ صفحہ کھول لیا، برسوں سے اکیلا ہوں، اس سے پہلے کبھی نہیں کھولا۔ شاید اس لیے کھولا تھا کہ آپ کا اشتہار پڑھ لوں۔ میں نے پڑھا اور مجھے لگا جیسے میرے لیے ہی ہے، اب میں آپ کے لیے ہوں یا نہیں اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ فقط ایک امیدوار... طارق شہباز۔''

نوٹ: ہاں اپنی تصویر بھی ساتھ بھیج رہا ہوں۔

اس نے خط اور اپنی ایک مناسب تصویر جس میں وہ گولف کلب میں اسٹک لیے کھڑا تھا، لفافے میں رکھی اور اسے بند کر دیا۔ لفافے پر پتا لکھ کر اس نے اسے بھی چرمی بیگ میں رکھ لیا۔ نیچے پارکنگ میں ایک چند سال پرانی لیکن بہت اچھی حالت میں لگژری کار موجود تھی۔ اس نے کار نکالی اور اخبار کے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ دفتر زیادہ دور نہیں تھا۔

صبح کا وقت تھا اور سناٹے کا عالم تھا۔ کچھ روزمرہ کے کام نمٹانے والا عملہ موجود تھا۔ اس نے استقبالیہ پر اشتہارات سیکشن کا پوچھا اور تیسری منزل پر آیا۔ اس سیکشن کا انچارج شام کو ہی آتا تھا لیکن اس وقت ایک نائب موجود تھا۔ طارق نے لفافہ اس کے سامنے رکھا۔ ''یہ میں باکس نمبر بیس اکیس کے جواب میں لایا ہوں۔''

''ٹھیک ہے اسے باکس میں رکھ دیا جائے گا۔'' نائب نے لفافے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لیکن طارق نے لفافہ پیچھے کر لیا۔

''اس خاتون کو کیسے پتا چلے گا کہ اس کے لیے کوئی لفافہ آیا ہے؟''

''وہ ہمارے سیکشن میں کال کر کے معلوم کر سکتی ہے۔''

طارق نے لفافہ اس کے حوالے کر دیا۔ وہ دروازے کی طرف جا رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی، نائب نے فون ریسیو کیا اور بولا۔ ''ملا دو... جی میڈم... اتفاق سے ابھی ایک صاحب لفافہ دے کر گئے ہیں... میں باکس میں رکھ رہا ہوں آپ جب چاہیں آ کر حاصل کر لیں۔''

طارق نیچے آ گیا۔ اس نے کار اخبار کی عمارت کے سامنے سڑک کے دوسری طرف روکی تھی۔ طارق نے کار وہیں چھوڑی اور سڑک پار عمارت کی دوسری منزل پر واقع کیفے میں آیا۔ اس نے جان کر ایسی میز منتخب کی جہاں سے وہ اخبار کا دفتر دیکھ سکتا تھا۔ طارق نے چائے منگوائی اور چسکیاں لینے لگا۔ دو کپ پی لینے کے بعد اسے واش روم جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی مگر وہ فی الحال یہاں سے ہل نہیں سکتا تھا۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اخبار کے دفتر کے سامنے ایک چھوٹی شیوی چیری کار رکی اور ایک ساڑی پوش عورت باہر آئی۔ اس نے بڑے اسٹائل سے جوڑا باندھ رکھا تھا اور آنکھوں پر سن گلاسس تھا۔ ساڑی میں اس کا متناسب جسم نمایاں تھا اور رنگت بھی صاف تھی مگر اتنی دور سے نقوش کا کہنا مشکل تھا۔

اسے دیکھتے ہی طارق حرکت میں آیا۔ وہ تیزی سے واش روم کی طرف گیا لیکن اس سے پہلے وہ میز پر بل کی رقم رکھنا نہیں بھولا تھا۔ بہت عجلت میں فارغ ہو کر وہ کیفے سے باہر آیا اور شیوی کو اپنی جگہ پا کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اگر یہ وہی عورت تھی تو اس کا اپنے بارے میں دعویٰ درست تھا۔ طارق کار میں بیٹھ گیا اور اسے گھما کر دوسری لائن میں لانے لگا۔ یہاں کٹ خاصے طویل فاصلے پر تھے اور وہ بالکل درست وقت پر پہنچا۔ عورت باہر نکل رہی تھی اور اس کے ہاتھ میں جانا پہچانا لفافہ تھا۔ عورت نے کار کا دروازہ کھول کر پرس اور لفافہ اندر ڈالا اور چند لمحے بعد وہاں سے روانہ ہو گئی۔ طارق نے بلا توقف کار اس کے پیچھے لگا دی۔

کلفٹن سے ہوتے ہوئے وہ سی ویو والی سڑک پر آئے اور دس منٹ بعد عورت ڈی ایچ اے کے ایک اپارٹمنٹ کمپلیکس میں داخل ہوئی۔ گیٹ پر سیکیورٹی تھی اور وہ بنا کسی تعارف کے اندر نہیں جا سکتا تھا۔ بہرحال اس نے عورت کو دیکھ لیا تھا اور یہ جگہ بھی دیکھ لی تھی۔ وہ مطمئن تھا

عورت مناسب تھی۔ اسے امید تھی کہ اس نے جو خط لکھا تھا اس کا جواب ضرور ملے گا۔ وہ واپس فلیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا اندازہ تھا کہ اگر عورت نے اسے کال کرنی ہوئی تو وہ آج کے دن ہی کر لے گی اور اگر اس نے آج کال نہ کی تو اس کا مطلب ہوگا کہ اسے طارق کے خط نے متاثر نہیں کیا، اس صورت میں اسے پھر کوشش کرنی ہوگی۔ مگر اس کی نوبت نہیں آئی شام سے پہلے اس کی کال آ گئی۔ اجنبی نمبر دیکھ کر طارق کو امید ہوئی۔ ویسے بھی اسے یہاں بہت کم لوگ جانتے تھے۔

''طارق شہباز صاحب؟'' دوسری طرف سے ایک لوچ دار نسوانی آواز نے کہا۔ طارق آواز میں موجود سیکس اپیل محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''جی بات کر رہا ہوں۔''

''میں فلک ناز بات کر رہی ہوں۔''

''جی فلک ناز صاحبہ؟''

''آپ کا خط مجھے مل گیا ہے۔''

طارق نے فوری اپنے سپاٹ اور روکھے انداز میں تبدیلی کی اور گرم جوشی کے ساتھ بولا۔ ''تو وہ آپ ہیں... میری خوش نصیبی کہ میں نے آج خط بھیجا اور آپ نے رابطہ بھی کر لیا۔''

''طارق صاحب! آپ پہلے شادی شدہ رہ چکے ہیں؟''

''ایک بار۔'' اس نے جواب دیا۔ ''دو سال شادی چلی اور پھر طلاق ہو گئی اب تو اس بات کو بھی دس سال ہو گئے ہیں۔ بچہ کوئی نہیں تھا اور شکر ہے نہیں تھا ورنہ وہ عورت صرف خود سے پیار کرتی تھی، میرا بچہ بھی اس کے ساتھ رل جاتا۔''

''اوہ آئی ایم سوری۔'' فلک ناز نے رسمی انداز میں کہا۔ ''اس کے بعد آپ نے پھر شادی کا نہیں سوچا؟''

''کئی بار سوچا... میں انسان ہوں... اور شادی انسان کی ضرورت ہے لیکن میں پہلے تجربے سے خوفزدہ تھا۔ پھر کوئی ملا بھی نہیں۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' اس بار فلک ناز کے انداز میں بے تکلفی تھی۔ ''آپ کی تصویر بتاتی ہے کہ آپ میں کوئی کمی نہیں ہے۔ پھر کوئی کیوں آپ کی طرف متوجہ نہیں ہوئی؟''

''میرے خیال میں رشتے ناتے قسمت سے ہوتے ہیں۔ اب تک میری قسمت میں نہیں تھا۔''

''تو آپ کا خیال ہے اب آپ کی قسمت جاگ گئی ہے؟'' وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

''مجھے لگ رہا ہے۔'' طارق نے کہا۔ ''آپ نے میرے بارے میں پوچھ لیا۔ اب کچھ سوال میں کرنا چاہوں گا۔''

''ابھی سب نہیں پوچھا ہے لیکن خیر آپ پوچھیں؟''

''آپ کے شوہر کی ڈیتھ کب ہوئی؟''

''تین سال پہلے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''حامد بہت اچھے انسان تھے اولاد نہ ہونے کے باوجود انہوں نے مجھ سے بہت محبت کی اور بہت خیال رکھا۔ مگر تین سال پہلے ایک ٹریفک حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا۔''

''آئی ایم سوری۔'' اس بار طارق نے رسمی انداز میں کہا۔ ''حامد صاحب کیا کرتے تھے؟''

''ایک غیر ملکی بینک میں منیجر تھے۔ اچھی پوسٹ تھی۔ میرے لیے بہت کچھ چھوڑ کر گئے ہیں۔''

''تین سال۔'' طارق نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''یہ خاصی بڑی مدت ہے۔''

''ہاں، یوں سمجھ لیں کہ مجھے دوسری شادی کے لیے خود کو تیار کرنے میں تین سال لگے۔'' فلک ناز نے کہا۔ ''آپ جانتے ہیں مرد کی نسبت عورت اپنے جیون ساتھی کو آسانی سے نہیں بھلاتی اور نہ ہی آسانی سے کسی اور کو اس کی جگہ دیتی ہے۔''

''ہاں یہ فطری بات ہے۔''

''آپ کیا کرتے ہیں؟''

''کچھ خاص نہیں۔'' طارق نے سرسری سے انداز میں جواب دیا۔ ''ویسے میں خرید و فروخت کا کام کرتا ہوں، کبھی کمیشن ایجنٹ بن جاتا ہوں۔ مارکیٹ میں میری ساکھ ہے اس لیے لوگ مجھ سے سودا کروانا پسند کرتے ہیں۔''

''کوئی خاص فیلڈ؟''

''کوئی خاص نہیں۔ مڈل ایسٹ کی پارٹیوں کے لیے کام کرتا ہوں۔ وہاں کسی چیز کی لاٹ آتی ہے تو یہاں گاہک تلاش کرتا ہوں اور اگر وہاں کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہاں چیز تلاش کرتا ہوں۔''

''یہ تو اچھا کام ہے۔''

''ہاں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے میرا دفتر تک نہیں ہے۔ سارا کام رابطے پر ہوتا ہے۔''

''انکم کتنی ہو جاتی ہے؟'' فلک ناز نے ایک بار پھر

بے تکلف لہجے میں پوچھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ جب کسی مرد سے کوئی بات اگلوانی ہو تو کس لہجے میں پوچھنا چاہیے۔

طارق ہنسا۔ ''کہتے ہیں کہ عورت سے اس کی عمر اور مرد سے اس کی آمدنی نہیں پوچھنی چاہیے۔''

وہ جواباً ہنسی۔ ''میں بتادوں میں فورٹی کی ہوں۔ تین دن پہلے میری برتھ ڈے تھی۔''

''اگر تین دن پہلے آپ سے بات ہوئی ہوتی تو میں شاید برتھ ڈے گفٹ بھی کرتا۔'' طارق نے کہا۔

''میں نے اپنی عمر بتادی ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

طارق نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اگرچہ میں آپ سے ملا نہیں ہوں اور نہ آپ کا لائف اسٹائل دیکھا ہے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں میرے ساتھ آپ کو کبھی تنگی محسوس نہیں ہوگی۔ ویسے میں آمدنی کیا بتاؤں کبھی مہینے میں دس لاکھ کما لیتا ہوں اور کبھی ایک روپیا بھی نہیں ملتا۔ الٹا جیب سے بزنس پر بیس تیس ہزار خرچ ہو جاتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر میں فائدے میں رہتا ہوں تب ہی تو اس مقام پر ہوں۔''

فلک ناز نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''بسر و چشم۔'' طارق نے جواب دیا۔ ''آج رات ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''ڈنر؟'' فلک ناز کا لہجہ شوخ ہوگیا۔ ''کہاں؟''

''جہاں آپ کہیں؟'' طارق کا لہجہ سرسری تھا جیسے کہیں بھی ڈنر کرانا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ ہو۔ اس کا خیال تھا کہ فلک ناز کسی بڑے ہوٹل کا نام لے گی مگر خلافِ توقع اس نے سی ویو کے ایک ریستوران کا نام لیا۔ ''میں سات بجے وہاں آپ کا انتظار کروں گا۔''

اس بار فلک ناز ہچکچائی۔ ''یہ کچھ جلدی نہیں ہے؟''

''ہمیں ایک دوسرے کو جاننا بھی ہے اور اس کے لیے کچھ وقت تو درکار ہوگا۔''

''ٹھیک ہے میں آجاؤں گی۔''

☆☆☆

طارق سامنا ہونے پر فلک سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا تھا۔ وہ بہت گوری تو نہیں تھی لیکن اس کی صاف رنگت میں سرخی اور کشش تھی۔ نقوش تیکھے اور ناک نقشہ بہت مناسب تھا۔ عمر کی مناسبت سے بدن کسی قدر بھاری تھا لیکن یہ بھاری پن ان جگہوں پر تھا جہاں وہ بذاتِ خود خوبی بن جاتا ہے۔ اس نے جدید فیشن کے مطابق تقریباً پیروں تک آتی فراک اور نیچے چست ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ فراک کے چاک کمر سے شروع ہو رہے تھے اس لیے جب وہ چلتی تو اس کی سڈول ٹانگیں نمایاں ہوتی تھیں۔ اس نے ہلکا لیکن نفیس میک اپ کیا ہوا تھا۔ ہونٹ لپ اسٹک سے گلابی تھے۔ طارق اسے دیکھ رہا تھا اور انہماک کا احساس اس وقت ہوا جب وہ ہنسی۔

''دیکھ لیا ہے تو اندر چلیں۔''

''سوری۔'' طارق خفیف ہوگیا۔ ویسے اس کے یوں دیکھنے میں کچھ اداکاری بھی شامل تھی۔ وہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ ایک ہی نظر میں اس پر مرمٹا ہے۔ اس نے ریستوران میں ایک ایسی جگہ میز بک کرائی تھی جہاں سے ساحل پر تی روشنیوں کا منظر خوشنما لگ رہا تھا۔ ساحل کی طرف سے ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ جگہ اور ماحول بہت آئیڈیل تھا۔ میز پر ایک گلاب کی تازہ کلی رکھی تھی۔ طارق نے وہ فلک ناز کو پیش کی، وہ خوش ہوگئی۔

''میرے لیے ہے... تھینک یو ویری مچ۔''

اس موقع پر طارق نے محسوس کیا کہ اس نے فلک ناز کے دل میں کسی قدر جگہ بنالی تھی۔ وہ تجربے کار آدمی تھا اور جانتا تھا کہ عورت کب کس طرح بات کرتی ہے۔ انہوں نے ڈنر لیٹ کیا اور اس سے پہلے ایک دوسرے کے بارے میں بات ہوتی رہی۔ فلک شروع میں جھجکی لیکن پھر اس نے کھل کر بتایا کہ اب اس سے اکیلے نہیں رہا جاتا۔ حامد کے بعد اس نے تین سال خود پر جبر کیا۔

''میں تھک گئی ہوں۔ تمام سہولتوں اور آسائشوں کے باوجود مجھے لگتا ہے جیسے میں کسی صحرا میں پیاسی ننگے پاؤں چلی جارہی ہوں۔''

طارق نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''تقریباً یہی حال میرا ہے، پتا ہے اخبار میں آپ کا ایڈ دیکھنے سے پہلے میں سوچ رہا تھا کہ میرے پاس سب کچھ ہے لیکن کوئی فرد ایسا نہیں ہے جسے میں اپنا کہہ سکوں جو میرے لیے ہو اور میں اس کے لیے ہوں۔'' طارق نے یہ کہتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اپنا ہاتھ فلک کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''شاید قدرت نے اسی لیے ہمیں ایک دوسرے سے ملوایا ہے۔''

فلک نے ہاتھ نہیں کھینچا۔ ''شاید۔''

وہ تقریباً دس بجے ڈنر سے فارغ ہوئے پھر کچھ دیر ساحل پر چہل قدمی کرتے رہے۔ طارق نے جوتے اور

فلک نے اپنے سینڈل اتار لیے تھے۔ کبھی کبھی لہریں ان کے پاؤں تک آجاتی تھیں۔ ایسے میں فلک ہلکی سی چیخ مارتی پھر ہنسنے لگتی۔ اس نے طارق کے سامنے اعتراف کیا۔ ''مجھے پانی سے خوف آتا ہے۔ حامد بہت اچھے تیراک تھے۔ انہوں نے سوئمنگ کلب کی ممبر شپ لے رکھی تھی۔ مجھے بھی سوئمنگ سیکھنے کا کہتے تھے مگر میں نہیں مانی۔ میں صرف باتھ ٹب کی حد تک پانی میں جاتی ہوں۔''

''مجھے بھی سوئمنگ نہیں آتی لیکن اس کی وجہ پانی کا خوف نہیں ہے۔''

وہ گیارہ بجے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہوئے۔ فلک نے اسے اپنے اپارٹمنٹ کا پتا دیا۔ طارق نے پوچھا۔ ''اگر میں آنا چاہوں تو...؟''

''ویلکم۔''

طارق دو دن بعد ہی شام کے وقت ایک عدد چاکلیٹ کیک اور ایک بڑا سا بوکے لیے فلک کے اپارٹمنٹ کے سامنے تھا۔ یہ خاصا بڑا اپارٹمنٹ تھا۔ گارڈ نے اسے اس وقت اندر جانے دیا جب فلک نے انٹرکام پر اسے اجازت دی۔ کال بیل کے جواب میں اس نے دروازہ کھولا اور ایک طرف ہوگئی۔ وہ نہا کر آئی تھی۔ بال تولیے میں بندھے تھے اور لان کا ہلکا سا لباس کہیں کہیں بھیگے بدن سے چپکا ہوا تھا۔ گلے کا ڈیزائن ایسا تھا کہ نظر کو کھینچتا اور پھر توڑ چھوڑ دیتا تھا۔ طارق اس کے پاس سے گزرا تو ایک الوہی مہک اس کے حواس پر حملہ آور ہوئی اور شاید اسی وجہ سے وہ حواس کھو بیٹھا۔ اس نے کیک اور بوکے میز پر رکھا اور پلٹ کر فلک کو بازوؤں میں لے لیا۔ جب اس نے مزاحمت نہیں کی تو طارق نے مزید پیش قدمی کی۔ پھر وہ پیش قدمی کرتا چلا گیا اور فلک نے کسی بھی موقع پر مزاحمت نہیں کی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے بیڈروم میں طارق کے شانے پر سر رکھے لیٹی ہوئی تھی اور وہ اس کی زلفوں سے کھیل رہا تھا۔ بہت کم وقت میں انہوں نے مرد اور عورت کے تعلق کے تمام مراحل طے کر لیے تھے۔ فلک نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور شوخی سے بولی۔

''مجھے پتا نہیں تھا آپ اتنے تیز نکلیں گے؟''

''میں دعوت سے انکار کرنے والا شخص نہیں ہوں۔'' طارق نے کہا تو فلک کھسیا گئی۔ اس نے طارق کے سینے پر مکا مارا۔

''جی نہیں، میں نے کوئی دعوت نہیں دی۔''

''سوری، میں نے شاید غلط کہہ دیا۔ میں کہنا چاہ رہا تھا کہ قدرت نے ہمیں ملنے کے لیے ملایا ہے تب ہی تو یہ سب اتنی آسانی سے ہوگیا۔''

''شاید۔'' فلک ناز نے سر ہلایا اور پھر چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ ''سچ مجھے اب شرم آرہی ہے۔''

''یہی بات ہے کہ اب مجھے بھی اپنی کمزوری پر شرمندگی ہو رہی ہے۔'' طارق نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہاری شرم اور میری شرمندگی کے ازالے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم اپنے اس تعلق کو جلد از جلد قانونی صورت دے دیں۔''

فلک ناز کھل اٹھی۔ ''میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ اگر آپ یہ بات نہ کہتے تو میں خود کو ذلت میں گرا ہوا محسوس کرتی۔''

''میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ اب سے نہیں بلکہ اس وقت سے جب پہلی بار دیکھا تھا۔ مگر اس ملاپ کے بعد مجھے لگتا ہے کہ تمہاری محبت اور وقعت کم نہیں ہوئی ہے بلکہ بڑھ گئی ہے۔ اب میں پہلی فرصت میں تمہیں اپنا لینا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے۔''

''کیسا مسئلہ؟''

''میں جس اپارٹمنٹ میں رہتا ہوں وہ چھوٹا سا ہے ون بیڈ لاؤنج سمجھ لو۔ اگرچہ تمہیں وہاں رہنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اس میں ہر سہولت ہے مگر وہ تمہارے شایانِ شان نہیں ہے۔ میں اب تمہارے لحاظ سے کوئی بڑا اپارٹمنٹ لینا چاہتا ہوں۔''

فلک نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے میں اس میں بھی رہ لوں گی اور پھر یہ میرا فلیٹ بھی تو ہے۔''

طارق نے اس کا ہاتھ تھاما۔ ''سوری جان، میں اس معاملے میں ذرا کنزرویٹو آدمی ہوں۔ میرے خیال میں شادی میں ذمے داری مرد کی ہوتی ہے۔ وہ عورت کی ذمے داری نہیں ہوتا۔ اگر تم کچھ دن میرے اپارٹمنٹ میں گزارا کر لو تو میں بہت شکر گزار ہوں گا۔ میں یقین دلاتا ہوں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں دوسرا مکان یا اپارٹمنٹ لے لوں گا۔''

''میں رہ لوں گی۔'' فلک نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''میں بھی اب آپ سے دور نہیں رہ سکتی۔''

اگلے دن شام کے وقت طارق اور فلک کا نکاح ایک رجسٹرڈ نکاح خواں نے پڑھایا اور گواہوں کا بندوبست بھی اسی نے کیا تھا۔ اس نے یقین دلایا تھا کہ اگلے دن وہ رجسٹرار آفس میں انٹری کرا کے نکاح نامے کی کاپیاں انہیں

بے تکلف لہجے میں پوچھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ جب کسی مرد سے کوئی بات اگلوانی ہو تو کس لہجے میں پوچھنا چاہیے۔

طارق ہنسا۔ ''کہتے ہیں کہ عورت سے اس کی عمر اور مرد سے اس کی آمدنی نہیں پوچھنی چاہیے۔''

وہ جواباً ہنسی۔ ''میں بتادوں میں فورٹی کی ہوں۔ تین دن پہلے میری برتھ ڈے تھی۔''

''اگر تین دن پہلے آپ سے بات ہوئی ہوتی تو میں شاید برتھ ڈے گفٹ بھی کرتا۔'' طارق نے کہا۔

''میں نے اپنی عمر بتادی ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

طارق نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اگرچہ میں آپ سے ملا نہیں ہوں اور نہ آپ کا لائف اسٹائل دیکھا ہے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں میرے ساتھ آپ کو کبھی تنگی محسوس نہیں ہوگی۔ ویسے میں آمدنی کیا بتاؤں کبھی مہینے میں دس لاکھ کما لیتا ہوں اور کبھی ایک روپیا بھی نہیں ملتا۔ الٹا جیب سے بزنس پر بیس تیس ہزار خرچ ہو جاتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر میں فائدے میں رہتا ہوں تب ہی تو اس مقام پر ہوں۔''

فلک ناز نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''بسر و چشم۔'' طارق نے جواب دیا۔ ''آج رات ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''ڈنر؟'' فلک ناز کا لہجہ شوخ ہوگیا۔ ''کہاں؟''

''جہاں آپ کہیں؟'' طارق کا لہجہ سرسری تھا جیسے کہیں بھی ڈنر کرانا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ ہو۔ اس کا خیال تھا کہ فلک ناز کسی بڑے ہوٹل کا نام لے گی مگر خلافِ توقع اس نے سی ویو کے ایک ریستوران کا نام لیا۔ ''میں سات بجے وہاں آپ کا انتظار کروں گا۔''

اس بار فلک ناز ہچکچائی۔ ''یہ کچھ جلدی نہیں ہے؟''

''ہمیں ایک دوسرے کو جاننا بھی ہے اور اس کے لیے کچھ وقت تو درکار ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، میں آجاؤں گی۔''

☆☆☆

طارق سامنا ہونے پر فلک سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا تھا۔ وہ بہت گوری تو نہیں تھی لیکن اس کی صاف رنگت میں سرخی اور کشش تھی۔ نقوش تیکھے اور ناک نقشہ بہت مناسب تھا۔ عمر کی مناسبت سے بدن کسی قدر بھاری تھا لیکن یہ بھاری پن ان جگہوں پر تھا جہاں وہ بذاتِ خود خوبی بن جاتا ہے۔ اس نے جدید فیشن کے مطابق تقریباً پیروں تک آتی فراک اور نیچے چست ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ فراک کے چاک کمر سے شروع ہو رہے تھے اس لیے جب وہ چلتی تو اس کی سڈول ٹانگیں نمایاں ہوتی تھیں۔ اس نے ہلکا لیکن نفیس میک اپ کیا ہوا تھا۔ ہونٹ لپ اسٹک سے گلابی تھے۔ طارق اسے دیکھ رہا تھا اور انہماک کا احساس اس وقت ہوا جب وہ ہنسی۔

''دیکھ لیا ہے تو اندر چلیں۔''

''سوری۔'' طارق خفیف ہوگیا۔ ویسے اس کے یوں دیکھنے میں کچھ اداکاری بھی شامل تھی۔ وہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ ایک ہی نظر میں اس پر مر مٹا ہے۔ اس نے ریستوران میں ایک ایسی جگہ میز بک کرائی تھی جہاں سے ساحل پر کی روشنیوں کا منظر خوشنما لگ رہا تھا۔ ساحل کی طرف سے ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ جگہ اور ماحول بہت آئیڈیل تھا۔ میز پر ایک گلاب کی تازہ کلی رکھی تھی۔ طارق نے وہ فلک ناز کو پیش کی، وہ خوش ہوگئی۔

''میرے لیے ہے... تھینک یو ویری مچ۔''

اس موقع پر طارق نے محسوس کیا کہ اس نے فلک ناز کے دل میں کسی قدر جگہ بنالی تھی۔ وہ تجربے کار آدمی تھا اور جانتا تھا کہ عورت کب کس طرح بات کرتی ہے۔ انہوں نے ڈنر لیٹ کیا اور اس سے پہلے ایک دوسرے کے بارے میں بات ہوتی رہی۔ فلک شروع میں جھجکی لیکن پھر اس نے کھل کر بتایا کہ اب اس سے اکیلے نہیں رہا جاتا۔ حامد کے بعد اس نے تین سال خود پر جبر کیا۔ ''میں تھک گئی ہوں۔ تمام سہولتوں اور آسائشوں کے باوجود مجھے لگتا ہے جیسے میں کسی صحرا میں پیاسی ننگے پاؤں چلی جارہی ہوں۔''

طارق نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''تقریباً یہی حال میرا ہے، پتا ہے اخبار میں آپ کا ایڈ دیکھنے سے پہلے میں سوچ رہا تھا کہ میرے پاس سب کچھ ہے لیکن کوئی فرد ایسا نہیں ہے جسے میں اپنا کہہ سکوں جو میرے لیے ہو اور میں اس کے لیے ہوں۔'' طارق نے یہ کہتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اپنا ہاتھ فلک کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''شاید قدرت نے اس لیے ہمیں ایک دوسرے سے ملوایا ہے۔''

فلک نے ہاتھ نہیں کھینچا۔ ''شاید۔''

وہ تقریباً دس بجے ڈنر سے فارغ ہوئے پھر کچھ دیر ساحل پر چہل قدمی کرتے رہے۔ طارق نے جوتے اور

فلک نے اپنے سینڈل اتار لیے تھے۔ کبھی کبھی لہریں ان کے پاؤں تک آجاتی تھیں۔ ایسے میں فلک ہلکی سی چیخ مارتی پھر ہنستی۔ اس نے طارق کے سامنے اعتراف کیا۔ ''مجھے پانی سے خوف آتا ہے۔ حامد بہت اچھے تیراک تھے۔ انہوں نے سوئمنگ کلب کی ممبر شپ لے رکھی تھی۔ مجھے بھی سوئمنگ سیکھنے کا کہتے تھے مگر میں نہیں مانی۔ میں صرف باتھ ٹب کی حد تک پانی میں جاتی ہوں۔''

''مجھے بھی سوئمنگ نہیں آتی لیکن اس کی وجہ پانی کا خوف نہیں ہے۔''

وہ گیارہ بجے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہوئے۔ فلک نے اسے اپنے اپارٹمنٹ کا پتا دیا۔ طارق نے پوچھا۔ ''اگر میں آنا چاہوں تو...؟''

''ویلکم۔''

طارق دو دن بعد ہی شام کے وقت ایک عدد چاکلیٹ کیک اور ایک بڑا سا بوکے لیے فلک کے اپارٹمنٹ کے سامنے تھا۔ یہ خاصا بڑا اپارٹمنٹ تھا۔ گارڈ نے اسے اس وقت اندر جانے دیا جب فلک نے انٹرکام پر اسے اجازت دی۔ کال بیل کے جواب میں اس نے دروازہ کھولا اور ایک طرف ہوگئی۔ وہ نہا کر آئی تھی۔ بال تولیے میں بندھے تھے اور لان کا ہلکا سا لباس کہیں کہیں بھیگے بدن سے چپکا ہوا تھا۔ گلے کا ڈیزائن ایسا تھا کہ نظر کو کھینچتا اور پھر قید چھوڑ دیتا تھا۔ طارق اس کے پاس سے گزرا تو ایک انوکھی مہک اس کے حواس پر حملہ آور ہوئی اور شاید اسی وجہ سے وہ حواس کھو بیٹھا۔ اس نے کیک اور بوکے میز پر رکھا اور پلٹ کر فلک کو بازوؤں میں لے لیا۔ جب اس نے مزاحمت نہیں کی تو طارق نے مزید پیش قدمی کی۔ پھر وہ پیش قدمی کرتا چلا گیا اور فلک نے کسی بھی موقع پر مزاحمت نہیں کی۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے بیڈ روم میں طارق کے شانے پر سر رکھے لیٹی ہوئی تھی اور وہ اس کی زلفوں سے کھیل رہا تھا۔ بہت کم وقت میں انہوں نے مرد اور عورت کے تعلق کے تمام مراحل طے کر لیے تھے۔ فلک نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور شوخی سے بولی۔

''مجھے پتا نہیں تھا آپ اتنے تیز نکلیں گے؟''

''میں دعوت سے انکار کرنے والا شخص نہیں ہوں۔'' طارق نے کہا تو فلک کھسیا گئی۔ اس نے طارق کے سینے پر مکا مارا۔

''جی نہیں، میں نے کوئی دعوت نہیں دی۔''

''سوری، میں نے شاید غلط کہہ دیا۔ میں کہنا چاہ رہا تھا کہ قدرت نے ہمیں ملنے کے لیے ملایا ہے تب ہی تو یہ سب اتنی آسانی سے ہوگیا۔''

''شاید۔'' فلک ناز نے سر ہلایا اور پھر چہرہ ہاتھوں میں چھپالیا۔ ''سچ مجھے اب شرم آرہی ہے۔''

''سچی بات ہے کہ اب مجھے بھی اپنی کمزوری پر شرمندگی ہو رہی ہے۔'' طارق نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہاری شرم اور میری شرمندگی کے ازالے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم اپنے اس تعلق کو جلد از جلد قانونی صورت دے دیں۔''

فلک ناز کھل اٹھی۔ ''میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ اگر آپ یہ بات نہ کہتے تو میں خود کو ذلت میں گرا ہوا محسوس کرتی۔''

''میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ اب سے نہیں بلکہ اس وقت سے جب پہلی بار دیکھا تھا۔ مگر اس ملاپ کے بعد مجھے لگتا ہے کہ تمہاری محبت اور وقعت کم نہیں ہوئی ہے بلکہ بڑھ گئی ہے۔ اب میں پہلی فرصت میں تمہیں اپنا لینا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے۔''

''کیسا مسئلہ؟''

''میں جس اپارٹمنٹ میں رہتا ہوں وہ چھوٹا سا ہے ون بیڈ لاؤنج سمجھ لو۔ اگرچہ تمہیں وہاں رہنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اس میں ہر سہولت ہے مگر وہ تمہارے شایانِ شان نہیں ہے۔ میں اب تمہارے لحاظ سے کوئی بڑا اپارٹمنٹ لینا چاہتا ہوں۔''

فلک نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے میں اس میں بھی رہ لوں گی اور پھر یہ میرا فلیٹ بھی تو ہے۔''

طارق نے اس کا ہاتھ تھاما۔ ''سوری جان، میں اس معاملے میں ذرا کنزرویٹو آدمی ہوں۔ میرے خیال میں شادی میں ذمے داری مرد کی ہوتی ہے۔ وہ عورت کی ذمے داری نہیں ہوتا۔ اگر تم کچھ دن میرے اپارٹمنٹ میں گزارا کرلو تو میں بہت شکر گزار ہوں گا۔ میں یقین دلاتا ہوں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں دوسرا مکان یا اپارٹمنٹ لے لوں گا۔''

''میں رہ لوں گی۔'' فلک نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''میں بھی اب آپ سے دور نہیں رہ سکتی۔''

اگلے دن شام کے وقت طارق اور فلک کا نکاح ایک رجسٹرڈ نکاح خواں نے پڑھایا اور گواہوں کا بندوبست بھی اسی نے کیا تھا۔ اس نے یقین دلایا تھا کہ اگلے دن وہ رجسٹرار آفس میں انٹری کرا کے نکاح نامے کی کاپیاں انہیں

لادے گا۔ اسی شام وہ اپنے مختصر سامان کے ساتھ طارق کے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں آگئی۔ طارق نے کہا۔ ''یہ میرا ہے لیکن جو میں اگلا لوں گا وہ ہم دونوں کا ہوگا۔''

''مطلب یہ بھی تو ہمارا ہے۔''

''وہ ہماری مشترکہ ملکیت میں ہوگا۔'' طارق نے وضاحت کی تو فلک کا چہرہ جگمگانے لگا۔

''آپ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں؟''

''اس سے بھی زیادہ، ان چند دنوں میں ایسا لگنے لگا کہ میں تمہارے بغیر کچھ نہیں ہوں۔ تم ہو تو سب ہے ورنہ میری زندگی میں کچھ نہیں ہے۔''

اس رات جب فلک تھک کر گہری نیند سو گئی تو طارق کچھ دیر آنکھیں بند کیے لیٹا رہا اور پھر اٹھ کر اس نے الماری سے فلک کا بیگ نکالا اور لاؤنج میں آگیا۔ اس نے بیگ کھول کر مکمل تلاشی لی لیکن اس میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو فلک کی مالی پوزیشن کو ظاہر کرتی۔ نہ کوئی چیک بک تھی اور نہ ہی کسی قسم کے کوئی ملکیت کے کاغذات تھے۔ کچھ چابیاں تھیں۔ اس کے ہینڈ بیگ میں بھی کچھ نہیں تھا سوائے چند ہزار کی رقم کے اور شناختی دستاویزات کے۔ طارق نے سب احتیاط سے ویسے ہی رکھا اور بیگ واپس الماری میں رکھ دیا۔ پھر وہ اپنی جگہ لیٹا اور کچھ دیر میں گہری نیند سو گیا۔

چند گھنٹے بعد فلک کی آنکھ کھلی تو اس نے طارق کو دیکھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ گہری نیند میں ہے تو دبے قدموں اٹھی اور اس نے الماری کھول کر دیکھی۔ دو خانوں میں سوائے کپڑوں اور طارق کے ذاتی استعمال کی چیزوں کے اور کچھ نہیں تھا مگر تیسرے خانے میں ایک چرمی بیگ رکھا ہوا تھا۔ فلک نے وہ بیگ نکالا اور دبے قدموں لاؤنج کی طرف چلی گئی۔ وہاں اس نے بیگ کھولا اور احتیاط سے اس کی تلاشی لینے لگی۔ اس میں تین چیک بکس تھیں اور اتنے ہی اے ٹی ایم کارڈز تھے۔ اس کے سوا ایک لاکر کی چابی بھی تھی لیکن اس میں کسی قسم کی ملکیت کے کاغذات نہیں تھے۔ چیک بکس اور اے ٹی ایم کارڈز کے ساتھ کوئی ایسی اسٹیٹمنٹ نہیں تھی جس سے پتا چلتا کہ کس اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہے۔ فلک نے سب کچھ ویسے ہی رکھا اور بیگ واپس الماری میں رکھ کر خاموشی سے اپنی جگہ آکر لیٹ گئی۔

اس نے طارق کو دیکھا اور کچھ دیر بعد وہ خود بھی گہری نیند سو گئی تھی۔ کیونکہ دونوں رات کو دیر سے سوئے تھے، اس لیے صبح دونوں ذرا دیر سے اٹھے۔ پہلے طارق شاور لے کر باہر آیا پھر فلک چلی گئی۔ جب تک وہ واپس آئی طارق ناشتا بنا کر باہر بالکونی کی میز پر سجا چکا تھا۔ فلک خوش ہو گئی۔ ''کتنا خوب صورت منظر ہے۔'' اس نے کہا اور میز کی طرف دیکھا۔ ''آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں اورنج جوس اور براؤن بریڈ سے ناشتا کرتی ہوں؟''

''میرا اندازہ تھا۔'' طارق نے اس کی ٹرے سرکائی۔ ''البتہ چائے، کافی کا مجھے نہیں معلوم۔''

''میں یہ دونوں چیزیں نہیں لیتی۔ میں سادہ کھاتی ہوں۔ مہینے میں ایک دو بار بدپرہیزی کر لیتی ہوں۔''

''بدپرہیزی؟'' طارق نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''مجھے کھایا پیا لگتا ہے، دنوں میں وزن بڑھ جاتا ہے اس لیے احتیاط کرتی ہوں۔''

''اچھا کرتی ہو، مجھے موٹی عورتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔''

''میرا ویٹ زیادہ ہے؟''

''بس وہیں زیادہ ہے جہاں ہونا چاہیے۔'' طارق نے کہا تو وہ جھینپ گئی۔ پھر موضوع بدل دیا۔

''آج کیا پروگرام ہے؟''

طارق نے شرارت سے کہا۔ ''نئی نئی شادی ہے ایسے میں آدمی کا کیا پروگرام ہو سکتا ہے۔''

''آپ بات گھما پھرا کر اسی طرف لے جا رہے ہیں، میں ویسے ہی پوچھ رہی ہوں۔''

''کم سے کم تین دن نہ کہیں جانا ہے اور نہ کچھ کرنا ہے۔'' طارق نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ آنے والے تین دن وہ سچ مچ ایک دوسرے میں کھوئے رہے۔ دونوں جوانی کی عمر سے گزر چکے تھے اور ادھیڑ عمری میں تھے مگر دونوں جسمانی لحاظ سے فٹ اور صحت مند تھے اس لیے اپنی ازدواجی زندگی کو بھرپور انجوائے کر رہے تھے۔ چوتھے دن تک ان کے جذبات اعتدال پر آگئے تھے اور طارق نے صبح ناشتے کے موقع پر بتایا۔ ''آج ہم کچھ جگہیں دیکھنے جائیں گے اور پھر تم فیصلہ کرو گی کہ ہم نے اس میں سے کون سی جگہ لینی ہے؟''

فلک خوش ہو گئی تھی۔ ''پلیز، جلدی کریں مجھے اتنی چھوٹی سی جگہ رہنے کی عادت نہیں ہے۔''

''مجھے اندازہ ہے۔ اسی لیے اب میں سب سے پہلے یہ کام نمٹانا چاہتا ہوں۔''

فلک نے ہچکچا کر پوچھا۔ ''آپ کی رینج کیا ہے؟''

طارق نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر مبہم انداز میں جواب دیا۔ ''تم فکر مت کرو، میں نے اسٹیٹ ایجنسی والوں سے اپنی رینج کے مطابق دکھانے کو کہا ہے۔''

''اس فلیٹ کا کیا کریں گے؟''

''رینٹ پر دے دیں گے۔'' طارق نے بے پروائی سے کہا۔ ''یہاں رینٹ اچھا ملتا ہے اسی بلڈنگ میں میرا ایک فلیٹ اور بھی ہے۔''

یہ سن کر فلک کی آنکھوں میں چمک آئی لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ اس شام کو وہ نکلے۔ طارق نے ڈیفنس کے کچھ اسٹیٹ ایجنٹس سے بات کی ہوئی تھی۔ وہ پہلے ایک کے ساتھ نکلے اس نے انہیں ڈیفنس کے ایک نئے آباد ہونے والے بلاک میں بنگلا دکھایا۔ اس کی مالیت اس نے ڈھائی کروڑ روپے بتائی اور یہ فائنل تھی۔ اس نے طارق سے کہا۔ ''مالک ایک روپیا بھی کم نہیں کرے گا۔''

''مجھے معلوم ہے یہاں پلاٹ ڈیڑھ کروڑ میں مل جاتا ہے اور اتنا بڑا بنگلہ ساٹھ ستر لاکھ میں آرام سے بن جائے گا تو میں اسے اوپر سے کیوں دوں؟''

''پارٹی باہر ہے اور اسے ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ کو کم قیمت...''

''بات قیمت کی نہیں ٹھیک قیمت کی ہے۔'' طارق نے کہا۔ ''مالک سے کہو شوق سے اپنے پاس رکھے کوئی نہ کوئی احمق مل ہی جائے گا۔''

دوسرے اسٹیٹ ایجنٹ نے انہیں ایک نئے بننے والے اپارٹمنٹ میں لگژری فلیٹ دکھایا۔ یہ بھی تین بیڈ کا تھا مگر فلک کے فلیٹ سے بڑا تھا۔ فلک نے پہلی نظر میں اسے پسند کر لیا۔ اس نے وہاں سے نکلتے ہی کہا۔ ''بس مجھے یہی پسند ہے اور میں ویسے بھی ساری عمر فلیٹوں میں رہتی آئی ہوں۔ یہاں مجھے سیکیورٹی فیل ہوتی ہے اس لیے بنگلے سے زیادہ فلیٹ اچھے لگتے ہیں۔''

طارق نے تائید کی۔ ''ٹھیک کہا تم نے مینٹی نینس دے کر آدمی ساری ذمے داریوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے، سچ کہوں تو مجھے بھی فلیٹ ہی پسند ہیں۔''

ایجنٹ نے اس کی قیمت ایک کروڑ تیس لاکھ بتائی تھی مگر اس کا کہنا تھا کہ مالک ایک بیس تک آجائے گا۔ فلک نے کہا۔ ''قیمت بھی مناسب ہے ورنہ میرے اپارٹمنٹ میں فلیٹ ڈیڑھ سے پونے دو کروڑ میں بک رہے ہیں۔''

''اگر تمہیں پسند ہے تو میں کل ہی ڈن کر دیتا ہوں۔'' طارق نے کہا۔

''نہیں اتنی جلدی کی ضرورت نہیں ایجنٹ نے ایک کروڑ بیس لاکھ کا کہا ہے، اس کا مطلب ہے مالک اس سے بھی نیچے آئے گا۔ اس لیے جلدی مت کریں، آرام سے رابطہ کریں گے۔''

''ٹھیک ہے میں پرسوں فیچ کر لوں گا۔'' طارق مان گیا۔ ''کل ہم ایک کام اور کر لیتے ہیں۔''

''کیا کام ہے؟''

''میرے تین بینک اکاؤنٹ ہیں، میں انہیں جوائنٹ کرانا چاہتا ہوں۔''

''میرے ساتھ۔'' فلک خوش ہو گئی اس نے یہ پروا کیے بغیر کہ وہ شاہراہ پر ڈرائیو کر رہے ہیں، طارق کا گال چوم لیا۔ ''تھینک یو سو مچ۔''

''ہاں، میں نے کہا تھا نا کہ میرا سب کچھ اب تمہارا بھی ہے ہم دونوں کا ہے۔''

''میرا جو بھی ہے وہ بھی...''

''نہیں۔'' طارق نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''میں تمہارے اپارٹمنٹ اور بینک بیلنس میں کسی قسم کی شراکت نہیں چاہتا وہ تمہارا ہی رہے گا۔''

''آپ سچ مچ بے لوث آدمی ہیں، آپ نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ میرے پاس کیا کیا ہے؟''

''اس کی ضرورت نہیں ہے، میں تو بس یہ سوچتا ہوں کہ میرے پاس جو ہے وہ ہم دونوں کا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا نا کہ میرے تین اکاؤنٹ ہیں، دو فلیٹ ہیں اور ڈی ایچ اے میں ہی ایک ہزار گز کا پلاٹ ہے۔ یہ شروع زمانے میں والد صاحب نے لیا تھا ورنہ میری اتنی حیثیت نہیں ہے کہ ہزار گز کا پلاٹ لے سکوں۔ بزنس کی وجہ سے مجھے رقم ہاتھ میں رکھنی پڑتی ہے تاکہ پیسے کی کمی سے کوئی سودا ہاتھ سے نہ نکلے۔''

یہ سن کر فلک فکر مند ہو گئی۔ ''تو آپ رہائش مت لیں۔ میرا فلیٹ ہے نا؟''

''میں اس بارے میں اپنا نقطہ نظر بتا چکا ہوں۔''

''تب ہم اسی ون بیڈ لاؤنج میں گزارا کر لیں گے۔''

طارق نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ ''تم میری خاطر قربانی دینا چاہتی ہو تو میں کیسے تمہیں مشکل میں دیکھ سکتا ہوں۔ میں جلد از جلد اس فلیٹ کا سودا کرتا ہوں۔ ڈیڑھ دو کروڑ روپے مسئلہ نہیں ہیں۔ اگر بنگلے کا مالک اس کی ٹھیک قیمت لگاتا تو میں اسے بھی لینے کو تیار تھا۔''

’’نہیں یہ ٹھیک ہے۔‘‘ فلک نے کہا۔ ’’آپ کو بزنس کے لیے رقم کی ضرورت پڑے گی تو آپ مجھ سے لیں گے۔ وعدہ کریں آپ ہچکچائیں گے نہیں۔‘‘

طارق نے گہری سانس لی۔ ’’او کے ڈیئر وعدہ ہے اگر مجھے ضرورت پڑی تو میں تم سے لے لوں گا۔‘‘

اگلے دن وہ دونوں ان تین بینکوں میں گئے جہاں طارق کے اکاؤنٹس تھے۔ یہ تینوں الگ الگ بینک تھے۔ طارق نے فلک کے ساتھ اکاؤنٹ جوائنٹ کرنے کی کارروائی مکمل کی۔ طارق نے تینوں جگہوں سے اپنا اکاؤنٹ بیلنس بھی معلوم کیا تھا۔ اس کے دو اکاؤنٹس میں تقریباً ڈیڑھ کروڑ کے مساوی رقم تھی اور تیسرے اکاؤنٹ میں ڈھائی کروڑ کی رقم۔ چار کروڑ کی رقم کا جان کر فلک کی آنکھیں پھیل گئی مگر اس سے زیادہ اس نے کوئی ردِعمل نہیں دیا تھا۔ واپسی میں طارق نے اسے بتایا کہ وہ بڑی رقم والے اکاؤنٹ کو ہی بزنس کے لیے استعمال کرتا ہے۔ فلک نے پوچھا۔ ’’آپ کا بزنس ڈاکومینٹڈ نہیں ہے آپ انکم ٹیکس دیتے ہیں؟‘‘

’’باقاعدگی سے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’میں اس معاملے میں عام سوچ سے مختلف سوچتا ہوں۔ میں سال بھر کی آمدنی کا حساب رکھتا ہوں اور ایک فرم سے اپنی رپورٹ بنواتا ہوں۔ پچھلے سال میں نے ساڑھے تین لاکھ روپے کا ٹیکس ادا کیا۔ فلیٹس کا ٹیکس اس کے علاوہ جاتا ہے۔ اگر میں چاہوں تو ایک روپیہ ٹیکس بھی نہ دوں کوئی مجھے پکڑ نہیں سکتا ہے لیکن ساڑھے تین چار لاکھ بچا کر مجھے کیا مل جائے گا، سوائے گناہ اور جرم کے احساس کے۔‘‘

’’آپ کی سوچ بہت اچھی ہے۔‘‘ فلک نے آہستہ سے کہا۔ ’’میں اب خود کو پہلے سے زیادہ خوش قسمت سمجھ رہی ہوں کہ مجھے آپ جیسا شریکِ سفر ملا ہے۔‘‘

’’خوش قسمت تو میں ہوں۔‘‘ طارق نے اس کے گداز شانے پر ہاتھ رکھا۔ ’’مجھے تم جیسی خوب صورت عورت ملی ہے۔‘‘

وہ شرمائی۔ ’’اب کہاں خوب صورت اب تو جوانی کا چل چلاؤ ہے۔‘‘

’’میں کون سا جوان ہوں۔‘‘

فلک نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔ ’’مرد ساٹھا پاٹھا ہوتا ہے۔ پتا ہے حامد مجھ سے پورے پندرہ برس بڑے تھے اور جب ان کا انتقال ہوا تو وہ باون کے تھے لیکن پوری طرح صحت مند تھے۔‘‘

’’اور میں؟‘‘ طارق نے کسی قدر حاسدانہ انداز میں پوچھا۔

’’آپ تو ادھیڑ عمر بھی نہیں لگتے۔‘‘ فلک نے والہانہ انداز میں کہا۔

اس رات فلک سوئی تو طارق جو آنکھیں بند کر کے لیٹا ہوا تھا، وہ اٹھا اس نے اطمینان سے کپڑے بدلے اور اپارٹمنٹ سے باہر نکل گیا اسے اطمینان تھا کہ فلک نہیں اٹھے گی کیونکہ سونے سے پہلے اس نے دودھ کا جو گلاس پیا تھا اس میں نیند کی ایک زود اثر دوا شامل تھی۔ وہ صبح سے پہلے نہیں اٹھتی۔ طارق روانہ ہوا تو اس کی کار کا رخ فلک کے اپارٹمنٹ کی طرف تھا۔ بیس منٹ بعد وہ اپارٹمنٹ کے پاس تھا۔ مگر وہ گیٹ سے اندر نہیں گیا۔ گارڈز اسے جانے نہیں دیتے۔ اگر وہ حوالہ دیتا تب بھی جانے نہیں دیتے اور اس طرح فلک کو بھی علم ہو جاتا کہ وہ اس کے اپارٹمنٹ تک گیا تھا۔ اس لیے اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا جو وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ عقبی کمپاؤنڈ کی دیوار پھلانگ کر وہ اندر داخل ہوا۔ سات فٹ اونچی دیوار اس نے اتنے آرام سے پھلانگی جیسے اسے اس کام کی بہت مشق ہو۔ اندر کودتے ہی وہ ایک طرف لگے پودوں تلے دبک گیا اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ وہاں کوئی نہیں ہے تو وہ پارک سے ہوتا ہوا پارکنگ میں داخل ہوا۔ لفٹس وہیں تھیں مگر اس نے لفٹ سے اوپر جانے سے گریز کیا کیونکہ لفٹس میں کیمرے لگے ہوئے تھے۔ اس کی آمد ریکارڈ ہو جاتی۔ اس کے بجائے وہ سیڑھیوں سے اوپر آیا۔

فلک کے فلیٹ کے دروازے پر آ کر اس نے سُن گُن لی اور پھر آرام سے ڈپلی کیٹس کی مدد سے تالا کھول لیا۔ اس نے فلک کے پاس موجود چابیوں کی نقل پہلے ہی بنوالی تھی۔ اندر تاریکی تھی لیکن اس نے اندر آ کر روشنی کرنے کے بجائے ایک چھوٹی ٹارچ جلائی اور اس کی محدود روشنی میں اپارٹمنٹ کا جائزہ لیتا ہوا فلک کے بیڈ روم میں آیا۔ اپارٹمنٹ کے علاوہ اضافی چابیاں اس کی الماری کی ثابت ہوئی تھیں۔ طارق نے یکے بعد دیگرے تینوں پٹ کھول لیے۔ اس نے محسوس کیا کہ نہایت مضبوط پلائی کی بنی اس الماری کے لاک بھی اسپیشل تھے۔ تبھی اسے ان کی چابیاں کسی لاکر کی لگی تھیں۔ چوتھی چابی بیچ بیچ الماری میں موجود ایک دھاتی لاکر کی تھی۔

اس نے لاکر کھولا اور اس میں موجود چیزیں باہر نکالیں۔ نقد رقوم، قیمتی زیورات اور دستاویزات کے علاوہ

ای بہت کچھ تھا۔ مگر یہ بہت کچھ اس کے مطلب کا نہیں تھا کیونکہ اس کا معائنہ کرتے ہوئے طارق کے چہرے پر مایوسی کی سیاہی آئی تھی۔ اس نے چیزیں نکالتے ہوئے بہت احتیاط سے کام لیا تھا ہر چیز کی جگہ اور ترتیب یاد رکھی تھی اس لیے تمام چیزوں کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد اس نے انہیں واپس بالکل اسی ترتیب سے رکھ دیا۔ اس اپارٹمنٹ سے اسے دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے وہ باہر نکل آیا اور جس طرح عمارت میں داخل ہوا تھا اسی طرح باہر نکل گیا۔ وہ گھر پہنچا۔ فلک بے خبر سو رہی تھی۔ طارق نے اسے جو دوا دی تھی اس کے سائڈ ایفکٹ نہیں تھے اس لیے وہ صبح اٹھتی تو خود کو فریش اور ٹھیک محسوس کرتی۔ سنسنی خیز قسم کی نائٹی میں وہ سوتے ہوئے بہت دلکش لگ رہی تھی مگر طارق نے اسے نفرت بھری نظروں سے دیکھا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

طارق کے پاس دو سم والا موبائل تھا۔ یہ جدید قسم کا موبائل تھا جو سم بینک میں رجسٹرڈ تھی اور جس سے وہ الرٹ استعمال کرتا تھا وہ عام طور سے آف رہتی تھی اور جب طارق کو ضرورت ہوتی تب ہی وہ اسے آن کرتا تھا۔ فلک کو اس سم کے بارے میں علم نہیں تھا کیونکہ وہ اسے موبائل میں بھی نہیں رکھتا تھا بلکہ یہ اس کے پرس کے ایک خفیہ خانے میں رہتی تھی۔ فلک یقیناً اس کے موبائل کا معائنہ کرتی تھی۔ مگر وہ دوسری سم کا پتا نہیں لگا سکی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ فلک کے لیے پھر سے محبت کرنے والا اور اس پر جان چھڑکنے والا شوہر بن گیا۔ اس نے کہا کہ وہ آج فلیٹ کی بات کرے گا۔ فلک نے اسے مشورہ دیا۔ ’’آپ ایک کروڑ کی آفر کریں۔‘‘

’’میں نے بھی یہی سوچا ہے۔‘‘ طارق نے کہا۔ ’’ایک دس آخری ہو گا۔ اگر اس قیمت پر دے دیا تو ٹھیک ہے۔‘‘

’’اور کیا ورنہ میرا اپارٹمنٹ ہے، ہم وہاں رہ سکتے ہیں۔ بے شک آپ مجھ سے وہ خرید لیں۔‘‘

طارق چونکا۔ ’’یہ آئیڈیا تو اچھا ہے۔ مگر مجھے وہ زیادہ اچھا لگا۔ اگر اس کا مالک نہ مانا تو پھر میں یہی کروں گا۔‘‘

فلک خوش ہو گئی۔ ’’مجھے وہ اپارٹمنٹ بھی اچھا لگا لیکن وہاں میں دس سال سے رہ رہی ہوں۔‘‘

طارق اس کی بات پر پُراسرار انداز میں مسکرایا تھا مگر فلک برتن اٹھانے کی وجہ سے اس کی مسکراہٹ دیکھ نہیں سکی۔ ناشتا اب وہ بنانے لگی تھی۔ دوپہر میں وہ دونوں ہی نہیں کھاتے تھے یا کبھی نوڈلز اور سادہ چاول جیسی ڈش بنا لیتی تھی۔ رات کو وہ باہر کھاتے تھے یا باہر سے آ جاتا تھا۔ فلک نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اسے کوکنگ کرنا پسند نہیں ہے۔ اسے بہت کچھ بنانا آتا تھا اور اس نے دو بار بنایا بھی تھا مگر روٹین کوکنگ سے اسے نفرت تھی۔ اس رات کو ڈنر لینے کے لیے نکلا تو اس نے پہلے ایک جگہ رک کر اپنی خفیہ سم لگائی اور اس کے بعد اس پر آنے والے میسج چیک کرنے لگا۔ پھر اس نے ایک نمبر پر کال کی اور دوسری طرف آپریٹر سے بات کرنے لگا۔ وہ اس کی پوچھی باتوں کا جواب دے رہا تھا اور اسے کچھ معاملات میں اجازت دے رہا تھا۔ بالآخر وہ کام ہو گیا جس کے لیے اس نے کال کی تھی۔ آخر میں اس نے پوچھا۔ ’’کتنے دن لگ سکتے ہیں؟‘‘

’’دو سے تین دن۔‘‘ آپریٹر نے جواب دیا۔

اس سے بات کر کے طارق نے باقی دو بینکوں سے متعلق آپریٹرز کو کال کی اور تقریباً نصف گھنٹے بعد اس نے سم موبائل سے نکالی تو خاصی حد تک مطمئن تھا۔ اس کے پاس تین سے چار دن کا وقت تھا۔ گزشتہ رات فلک کے فلیٹ کا معائنہ کرنے پر جو حقیقت اس کے سامنے آئی تھی، اس نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ اب دیر نہیں کرنی ہے اس کام کو جلد از جلد نمٹا دینا چاہیے۔ اس نے جو سوچا تھا ویسا تو نہیں ہو رہا تھا مگر بالآخر وہ نقصان میں نہیں رہتا۔ یہ تین دن بعد کی بات تھی۔ وہ ڈنر کے بعد لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ طارق کے موبائل کی بیل بجی اور اس نے کال ریسیو کی۔ مگر یہ کال نہیں تھی اس نے الارم لگا کر اس کی رنگ ٹون وہی کر دی جو بیل تھی۔ اس نے اٹھ کر بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے موبائل کا بٹن دبا کر الارم آف کیا اور بہ ظاہر اس ’’گاہک‘‘ سے بات کرنے لگا جس نے اسے کال کی تھی۔ یہ کال ختم کر کے اس نے خود کسی کو ’’کال‘‘ کی اور جب اس سے بھی بات کر لی تو لاؤنج میں آ کر فلک کو بتایا۔ ’’دبئی سے ایک پارٹی کی کال آئی ہے۔ اسے اعلیٰ درجے کا سوٹن باسمتی چاول چاہیے۔‘‘

فلک نے دلچسپی سے پوچھا۔ ’’دوسری کال کس کی تھی؟‘‘

’’حیدرآباد میں چاولوں کا ایک واقف کار تاجر ہے۔ چاول تو یہاں سے بھی مل سکتا ہے لیکن اس کے پاس ایک نمبر ہوتا ہے اور وہ ریٹ بھی کم لگاتا ہے۔‘‘

’’آپ کمیشن پر یہ کام کریں گے؟‘‘

’’نہیں اس میں اتنا نہیں ملے گا۔ ساری کھیپ کروڑ

کے آس پاس کی ہے۔ مجھے پانچ فیصد کے حساب سے پانچ لاکھ سے زیادہ نہیں ملیں گے لیکن میں خود خرید کر بیچوں تو مجھے دس بارہ لاکھ بچ جائیں گے۔ بس ایک دو دن کی بھاگ دوڑ ہوگی۔''

''آپ خود حیدرآباد جائیں گے؟'' فلک نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

''یہی تو بھاگ دوڑ ہوگی۔ یہاں شپنگ کا کام تو بہت آسان ہے۔ کل شام نکلوں گا۔ رات تک پہنچ جاؤں گا۔ صبح کام نمٹا کر واپس آجاؤں گا۔''

''لیکن کل تو مجھے شاپنگ کے لیے جانا ہے۔'' فلک نے ٹھنک کر کہا۔

طارق نے اس کا گال تھپتھپایا۔ ''مجبوری ہے ڈیئر... مجھے جانا ہی ہے۔ ایسا کرو تم کل خود چلی جاؤ ویسے بھی تم نے خود لینا ہے۔ مجھے تو بس ساتھ جانا تھا۔''

''ٹھیک ہے ہم ساتھ نکلیں گے۔''

''میں گاڑی لے کر نہیں جاتا۔'' طارق نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ٹیکسی میں جاؤں گا اور کل اسی میں واپس آجاؤں گا۔ رات کے وقت ہائی وے پر ڈرائیو نہیں کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔''

اس رات دونوں سونے کے لیے لیٹے تو دونوں ہی سونے کی اداکاری کر رہے تھے۔ دونوں کو ہی خاصی دیر سے نیند آئی۔ طارق صبح اٹھا تو اس کا سر درد سے بوجھل تھا مگر فلک تازہ دم اور گنگناتے ہوئے ناشتا تیار کر رہی تھی۔ ناشتا کر کے طارق بہانے سے باہر نکلا۔ ایک گھنٹے بعد وہ واپس آیا تو وہ بھی بہت خوشگوار موڈ میں تھا۔ باقی سارا دن دونوں میاں بیوی ہنستے مسکراتے اور چہلیں کرتے رہے۔ فلک نے آنے والے فیشن کے ڈیزائنر سوٹ لینے تھے۔ اس نے دو دن پہلے ہی طارق سے کہہ دیا تھا مگر اب اسے اکیلے جانا تھا۔ طے ہوا کہ وہ فلک کے ساتھ نکلے گا اور وہ اسے کسی ایسی جگہ ڈراپ کر دے گی جہاں سے وہ مطلب کی ٹیکسی یا پرائیویٹ کار حاصل کر سکے۔ وہ سورج ڈوبنے کے بعد تیار ہوئے اور باہر نکلنے لگے تھے کہ فلک نے کہا۔ ''ایک منٹ میں واش روم سے آتی ہوں۔''

اس کے جاتے ہی طارق نے موبائل نکالا اور ایک نمبر ملا کر صرف ایک بیل دے کر کاٹ دیا۔ فلک ایک منٹ میں واپس آگئی۔ طارق نے نوٹ کیا کہ اس کے ہاتھ خشک تھے۔ گویا وہ واش روم کا بہانہ کر کے اندر گئی تھی۔ طارق سوچ رہا تھا کہ وہ کیوں واش روم گئی تھی؟ وہ باہر نکلے۔ فلک نے اپنی کار نکالی۔ وہ اسے ہی استعمال کرتی تھی ہاں دونوں کہیں جاتے تھے تو طارق کی کار میں جاتے تھے۔ اپارٹمنٹ سے باہر آتے ہی انہیں سڑک پر ایک بڑی یلو کیب نظر آئی۔ فلک نے چونک کر کہا۔ ''اس سے بات کر لیں اگر یہ جانے کے لیے تیار ہو تو اس کے ساتھ چلے جائیں۔''

عام طور سے بڑی یلو کیب والے ہی طویل سفر پر جانے کے لیے آمادہ ہوتے۔ چھوٹی گاڑی میں اتنے طویل سفر کا دم کم ہوتا ہے۔ طارق نے سر ہلایا تو فلک نے کار روک لی اور طارق اتر کر نیچے آیا۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ ''بکنگ پر چلتے ہو؟''

ڈرائیور جوان آدمی تھا۔ سپاٹ نقوش اور عام سا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''جاتے ہیں صاحب، آپ نے کہاں جانا ہے؟''

''حیدرآباد جانا ہے اور کل واپس آنا ہے تمہیں ایک رات رکنا بھی پڑے گا۔''

''منظور ہے صاحب، اے سی کے ساتھ پانچ ہزار روپے اور بغیر اے سی کے چار ہزار روپے ہوں گے۔ باقی رکنا اور کھانا پینا آپ کے ذمے ہوگا۔''

''منظور ہے، اے سی کے ساتھ۔'' طارق نے کہا اور فلک کی کار سے اپنا لیدر بیگ نکال لیا اسے خدا حافظ کہا اور ٹیکسی میں آبیٹھا۔ شاپنگ کے لیے طارق نے اسے اپنا ایک اے ٹی ایم کارڈ دیدیا تھا جو اصل میں ڈیبٹ کارڈ بھی تھا۔ دونوں گاڑیاں مخالف سمتوں میں روانہ ہو گئیں۔ ڈرائیور نے اپنا معاوضہ پیشگی مانگا تھا مگر طارق نے اسے ڈھائی ہزار دیے تھے۔ ''باقی کل واپسی کے بعد ملیں گے۔''

ڈرائیور نے اعتراض نہیں کیا اور ڈھائی ہزار روپے رکھ لیے۔ اس کی گاڑی بہت اچھی حالت میں اور آرام دہ تھی۔ انجن جاندار تھا۔

وہ ٹول پلازا کراس کر چکے تھے کہ طارق کے موبائل کی بیل بجی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ اگر ڈرائیور عقبی آئینے میں اس کا چہرہ دیکھ بھی رہا تھا تو تاریکی کی وجہ سے اس کی مسکراہٹ دیکھنے سے قاصر تھا۔ طارق نے کال ریسیو کی دوسری طرف فلک تھی اور بہت غصے میں تھی اس نے آغاز ہی گالیوں سے کیا اگرچہ وہ دبی زبان استعمال کر رہی تھی کیونکہ وہ ایک معروف شاپنگ سینٹر میں تھی لیکن اس کی آواز بہرحال طارق تک صاف آرہی تھی اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آج تک تم جیسا گھٹیا آدمی نہیں دیکھا۔''

''اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟'' طارق نے دھیمی آواز میں کہا۔ پھر ڈرائیور سے گفتگو چھپانے کے لیے اسے اے سی آف کر کے اپنی طرف کا شیشہ کھولنے کو کہا۔ ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی اب تقریباً سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے اندر آتی ہوا کے جھکڑ ڈرائیور کو اس کی کال سننے کی اجازت نہیں دیتے۔ ''ہاں اب بولو۔''

''تم نے اس اکاؤنٹ میں ایک روپیہ نہیں چھوڑا ہے؟''

''میرا اندازہ درست تھا تم نے بینک والوں سے معلوم کر لیا ہے۔''

''یہ زیادہ مشکل نہیں ہے۔'' فلک زہریلے لہجے میں بولی۔ ''میں نے فون بینکنگ سروس کو کال کی اور اپنا حوالہ دیا تو آپریٹر نے بتا دیا کہ اکاؤنٹ میں کچھ بھی نہیں ہے۔''

''ڈیئر اس کو کہتے ہیں جیسے کو تیسا۔'' طارق نے سکون سے کہا۔ ''تم نے مجھ سے جھوٹ بولا؟''

''تو تم نے کون سا سچ بولا؟'' وہ بولی۔

''او کے سچ میں نے بھی نہیں بولا۔ میرا فلیٹ اصل میں کرائے کا ہے اور میرے پاس کوئی جائداد نہیں ہے۔ لیکن میرے تینوں اکاؤنٹ جینوین ہیں۔ تمہارے پاس کیا ہے؟''

''میرے پاس جو ہے اس تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔''

''حالانکہ میں پہنچ گیا ہوں۔'' طارق نے معنی خیز انداز میں کہا تو فلک جز بز ہوگئی۔

''تم سخت واہیات آدمی ہو۔''

''آدمی واہیات ہوتا ہے شوہر نہیں۔'' طارق نے سکون سے کہا۔ ''تم نے بھی جھوٹ بولا کہ وہ اپارٹمنٹ تمہارا ہے۔ تم وہاں کرائے پر رہ رہی ہو۔''

''ہاں لیکن اس کا کرایہ بھتا ہے؟''

طارق نے اس کے طنز پر توجہ دیے بغیر کہا۔ ''تمہارا حامد نامی کوئی شوہر نہیں تھا اور تمہیں اس جگہ آئے ہوئے صرف دو مہینے ہوئے ہیں۔''

اس بار فلک فکر مند ہوگئی اور وہ بولی تو اس کے لہجے میں غصہ نہیں تھا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے تم نے دعویٰ کیا تھا کہ کوئی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا ہے اور میں نے کہا تھا کہ میں پہنچ گیا ہوں اس پر تم نے مجھے واہیات آدمی کہا۔ تم میری بات کو بالکل غلط معنوں میں لے رہی تھیں۔ میرا اشارہ ہرگز تمہارے حسن

ورلڈ کپ

فیفا ورلڈ کپ میں کانٹے کا میچ ہو رہا تھا۔ اسٹیڈیم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی لیکن جم کے برابر کی ایک نشست خالی تھی، اس کے بعد ایک برازیلی نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔

جم سے رہا نہ گیا۔ اس نے برازیلی سے پوچھا۔ ''کیا یہ خالی سیٹ تمہارے کسی مہمان کی ہے؟''

''ہاں، یہ میری بیوی کی سیٹ ہے۔''

''وہ فٹ بال کی شوقین معلوم ہوتی ہے؟''

''ہوں...'' برازیلی نے دھیمے سے کہا۔ ''ہم دونوں نے پچھلے چار ورلڈ کپ کے سارے میچز ایک ساتھ دیکھے تھے۔''

''وہ تمہارے ساتھ نہیں آئی؟''

''اس کا انتقال ہو گیا ہے۔''

''اوہ... لیکن یہاں کا مہنگا ٹکٹ ضائع ہو رہا ہے... اس کی جگہ اس کی کسی بہن، بھائی، ماں یا باپ کو لے آتے... مرحومہ کی روح خوش ہو جاتی۔''

''ضرور لے آتا مگر وہ سب اس کی تدفین میں گئے ہوئے ہیں۔ اس کا آج ہی انتقال ہوا ہے۔''

کراچی سے ارشد بیگ چغتائی کی شوخی

کے خزانے کی طرف نہیں تھا۔"

فلک کچھ دیر خاموش رہی پھر وہ تڑپ کر بولی۔ "میرے خدا... تم میرے اندازے سے بھی زیادہ ذلیل شخص نکلے ہو تم نے میری چابیوں کی ڈپلی کیٹ بنوائی ہے؟"

طارق اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ "اسی سے تو مجھے حقیقت تک پہنچنے کا موقع ملا۔"

دوسری طرف سے ایسی آواز آئی جیسے فلک نے گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا ہو۔ طارق جانتا تھا کہ وہ کہاں جا رہی تھی۔ پھر اس نے رو دینے والے انداز میں کہا۔ "تم نے وہاں سے سب نکال لیا ہے؟"

"درست ہے اب وہاں تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔" طارق نے تسلیم کیا۔

"تم کیا سمجھتے ہو وہ سب اتنی آسانی سے ہضم کر جاؤ گے؟" فلک نے چلا کر کہا۔ "نہیں، وہ سب میرا ہے اور مجھے ہی ملے گا۔"

طارق چونکا۔ "کیا مطلب؟"

فلک کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی جیسے خود پر قابو پا رہی ہو پھر اس نے کہا۔ "اب تم سب جان گئے ہو کہ میرے پاس بس یہی کچھ ہے تب تم کیا کرو گے؟"

"مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"تم مجھے طلاق دے دو گے لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ تم مجھ سے اتنی آسانی سے جان چھڑا لو گے۔"

"ورنہ تم عدالت چلی جاؤ گی۔" طارق نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "حالانکہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہم دونوں میں سے کوئی عدالت یا..." وہ بولتے بولتے رکا اور پھر ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ "ٹیکسی سائیڈ پر روک لو۔"

ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے سڑک سے اتار کر ٹیکسی کچی بیلٹ پر روک لی۔ طارق اپنا چرمی بیگ سنبھالتا ہوا نیچے اتر آیا۔ وہ ٹیکسی سے ذرا دور اس نالے کے کنارے تک آیا جو ہائی وے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا یہاں سے ڈرائیور اتنا دور تھا کہ کسی صورت اس کی آواز نہیں سن سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اب جو گفتگو ہو اور اس کے بعد جو ہو اس کی بھنک کسی صورت ڈرائیور کے کانوں تک نہیں پڑنی چاہیے۔ فلک نے کہا۔ "چپ کیوں ہو گئے؟"

"میں ٹیکسی سے اتر آیا ہوں۔"

"ابھی کہاں ہو؟"

"ٹول پلازا سے کوئی پانچ چھ کلومیٹرز آگے نکل آئے ہیں۔"

"طارق جب تمہارا کوئی بزنس نہیں ہے تو پھر تم جانے کا ڈراما کیوں کر رہے ہو؟"

"جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔" طارق نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

"کیا پتا چل جائے گا؟"

"فلک تم نے سوچا کہ میں نے تم سے آنکھ بند کر کے کیسے شادی کر لی؟"

"جیسے میں نے کر لی۔" اس نے جواب دیا۔

"پھر تمہیں اپنے اکاؤنٹس میں شریک کر لیا۔"

"مجھے یقین ہے اب ان اکاؤنٹس میں کچھ نہیں ہوگا۔"

"نہیں صرف یہی اکاؤنٹ خالی ہے اور وہ بھی عارضی طور پر کل صبح اس میں خاصی بڑی رقم جمع کرا دوں گا۔"

فلک الجھ گئی۔ "پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"کیونکہ یہ اکاؤنٹس میں نے کھولے تھے اور تمہیں صرف شریک کیا ہے اس لیے بینک والوں نے تمہیں شرائط، ضوابط اور اکاؤنٹس کے دوسرے فوائد نہیں بتائے۔"

"کیسے فوائد؟"

"تمہیں نہیں معلوم ان تینوں بینکوں میں اکاؤنٹس ہولڈر کی فری پرسنل انشورنس بھی ہوتی ہے۔ اگر اکاؤنٹ ہولڈر انتقال کر جائے تو اس کے ساتھی کو خاصی بڑی رقم ملتی ہے۔"

"کک کتنی رقم؟" فلک بدحواس ہو گئی تھی۔ "تم مجھے مروانا چاہتے ہو میری انشورنس وصول کرنا چاہتے ہو؟"

"نہیں ڈیئر میں تمہیں مروانا نہیں چاہتا۔ میں تمہیں مروا رہا ہوں اور تمہارے مرنے کے بعد ان تین اکاؤنٹس سے مجموعی طور پر مجھے انشورنس کی ساٹھ لاکھ کی رقم ملے گی۔ تمہارے لاکر سے جو ملا ہے اس کی مالیت بھی تقریباً چالیس لاکھ ہے اس لیے ایک کروڑ روپے تو مجھے مل رہے ہیں اور یہ برے نہیں ہیں خاص طور سے جب میں چند دن تک تمہاری دلنواز قربت سے بھی لطف اندوز ہو چکا ہوں۔"

"تم مجھے قتل کر دو گے؟" فلک نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

طارق کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ہم دونوں ہی شکاری ہیں۔ میرا خیال ہے جو میرا دھندا ہے تم بھی وہی کرتی آئی ہو۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

فلک بھی کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے مبہم انداز میں اقرار کر لیا۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تم اب تک کئی بار شادی کر چکی ہو۔ کچھ اندازہ ہے کہ کتنے مرد تمہارا شوہر بننے کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں؟"

"یہی سوال میری طرف سے ہے کتنی عورتیں تمہاری بیویاں بن چکی ہیں؟"

"پہلے سوال میں نے کیا تھا؟"

"اوکے میں جواب دے رہی ہوں۔" فلک نے اس بار سکون سے کہا۔ جس پر طارق کو تعجب بھی ہوا تھا۔ "آپ سے پہلے میں سات افراد سے شادی کر چکی ہوں۔"

"اسی شہر میں؟"

"نہیں چار مختلف شہروں میں۔" اس نے جواب دیا۔ "اور تم نے کتنی عورتوں سے شادی کی ہے؟"

"میرا اسکور تم سے ایک زیادہ ہے۔" طارق نے کہا۔ "لیکن میں اس موقع پر اعتراف کیے بغیر نہیں رہوں گا کہ ان میں سے ایک بھی تمہارے جیسی نہیں تھی۔ کاش کہ تم شادی نہ ہوتیں تو میں شاید ارادہ بدل دیتا باقی عمر تمہارے ساتھ رہتا لیکن خیر..."

"ہاں ضروری نہیں ہے کہ آدمی کی ہر خواہش پوری ہو۔" فلک نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "مجھے بھی اعتراف ہے کہ آج تک جتنے آدمی ملے ان میں تم ہی سب سے زیادہ نفیس اور شائستہ نکلے۔ یہی بات میری طرف سے بھی ہے اگر تم شکاری نہ ہوتے تو میں تمہارے ساتھ ساری عمر رہ سکتی تھی خیر اب کوئی اچھا آدمی ملا تو میں وائنڈ اپ کر دوں گی۔"

طارق نے اس کی بات پر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے اپنے سابق شوہروں کے ساتھ کیا کیا؟"

"وہی جو تم نے اپنی سابق بیویوں کے ساتھ کیا۔" فلک نے بلاجھجک کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے ابتدائی صدمے پر قابو پا لیا۔ "جو میں تمہارے ساتھ کرنے جا رہی ہوں۔"

طارق چونکا۔ "کیا... کیا کہا تم نے؟"

فلک اس کا سوال نظرانداز کر کے بولی۔ "طارق تم کو معلوم نہیں ہے کہ میں پولیس کو کال کر سکتی ہوں؟"

"شوق سے کرو... تم کیا بتاؤ گی؟" طارق ہنسا اس نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی۔ "ویسے بھی تمہارے پاس وقت نہیں ہے۔"

اسی لمحے گاڑی کسی چیز سے ٹکرائی کیونکہ دھات رگڑنے اور شیشے ٹوٹنے کی آواز آئی تھی۔ پہلے فلک کی چیخ سنائی دی۔ پھر وہ چلائی۔ "طارق اسے تم نے بھیجا ہے؟"

"ہاں اسے میں نے بھیجا ہے۔" اس نے سکون سے کہا۔ "یہ موت کا فرشتہ عرف ٹارگٹ کلر ہے۔"

"اسے روکو ورنہ تم بھی نہیں بچو گے۔" فلک ہذیانی آواز میں بولی پھر اس کے لہجے میں موت کا سا خوف آ گیا۔ "نہیں... نہیں۔"

"گڈ بائی مائی ڈیئر وائف۔" طارق نے کہا اور دوسری طرف سے دو بار گولی چلنے کی آواز آئی پھر کسی نے موبائل اٹھایا اور دھیمے لہجے میں بولا۔

"کام ہو گیا۔"

طارق ہلکے سے ہنسا اور اس نے کال کاٹ کر موبائل رکھ لیا۔ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اسے اپنی ٹکر کی عورت ملی تھی۔ مگر آخر میں وہ اس سے مات کھا گئی۔ فلک اس دنیا میں نہیں رہی تھی لیکن اس کی بعض باتیں ابھی تک طارق کے ذہن میں کھٹک رہی تھیں۔ وہ سوچتا رہا اور الجھتا رہا پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ بلاوجہ سوچ رہا ہے اسے آگے سفر کرنا چاہیے تاکہ جب پولیس اس سے رابطہ کرے تو وہ حیدرآباد میں ہو۔ وہ ٹیکسی کی طرف مڑنے لگا تھا کہ اسی لمحے اسے عقب سے کھٹکے کی آواز آئی اور اس نے مڑ کر دیکھا تو نیم تاریکی کے باوجود اسے ڈرائیور کے ہاتھ میں پستول دیکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ پستول کا رخ اس کی طرف تھا، طارق کے ہاتھ سے بیگ چھوٹ گیا۔ اس نے ہکلا کر کہا۔ "یہ... یہ کیا؟"

"میرا کام آسان کرنے کا شکریہ۔" ڈرائیور نے کہا۔

اب طارق کی سمجھ میں آیا کہ فلک نے کیوں کہا کہ اس کا سب کچھ اس کا ہے اور اسے ملے گا پھر اس نے مرنے سے پہلے کہا تھا کہ وہ بھی نہیں بچے گا گویا جو کام اس نے فلک کے لیے کیا تھا۔ ٹھیک وہی کام فلک نے بھی کیا تھا۔ یعنی کرائے کا قاتل ہائر کرنا۔ اتفاق سے دونوں نے ایک ہی دن اور تقریباً ایک ہی وقت چنا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ڈرائیور نے اس کے دل کا نشانہ لے کر یکے بعد دیگرے دو فائر کیے اور وہ الٹ کر نالے میں جا گرا۔ ڈوبتے ذہن کے ساتھ اس نے سوچا کہ ٹکر یچ برابر کی رہی تھی۔ پھر اس نے بجھتی آنکھوں سے قاتل کو نیچے آتے دیکھا جو اپنا کام مکمل کرنے آ رہا تھا۔

آوارہ گرد

قسط :3

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا

ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہوتی ہے مگر موت کو آنکھوں کے سامنے... بالکل قریب پا کر یہ کرب انگیز احساس ضرور ہوتا ہے کہ بس! اب آخری وقت آن پہنچا...

ہماری آنکھوں کے سامنے چنی بائی کے آدمی کو انتہائی بے رحمی سے شفقت راجا کے کارندے نے چاقو مار کے ہلاک کر دیا تھا۔ اس بہیمانہ قتل کے ہم تین چشم دید گواہ اب ان کے رحم و کرم پر تھے۔

یک وقت کئی گنز ہماری طرف اٹھتی چلی گئیں۔

کم از کم مجھے تو اپنی موت کا یقین ہو چلا تھا۔ ابھی گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھرے گی اور میرے وجود میں سلگتی ہوئی اذیتیں تراز و کر دی جائیں گی۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز ابھری ضرور تھی مگر یہاں نہیں، بیٹھک سے باہر۔ ہم تینوں سے زیادہ شفقت راجا اور اس کے کارندے بری طرح اچھل پڑے بلکہ شفقت راجا نے تو اپنی قمیص کے اندر
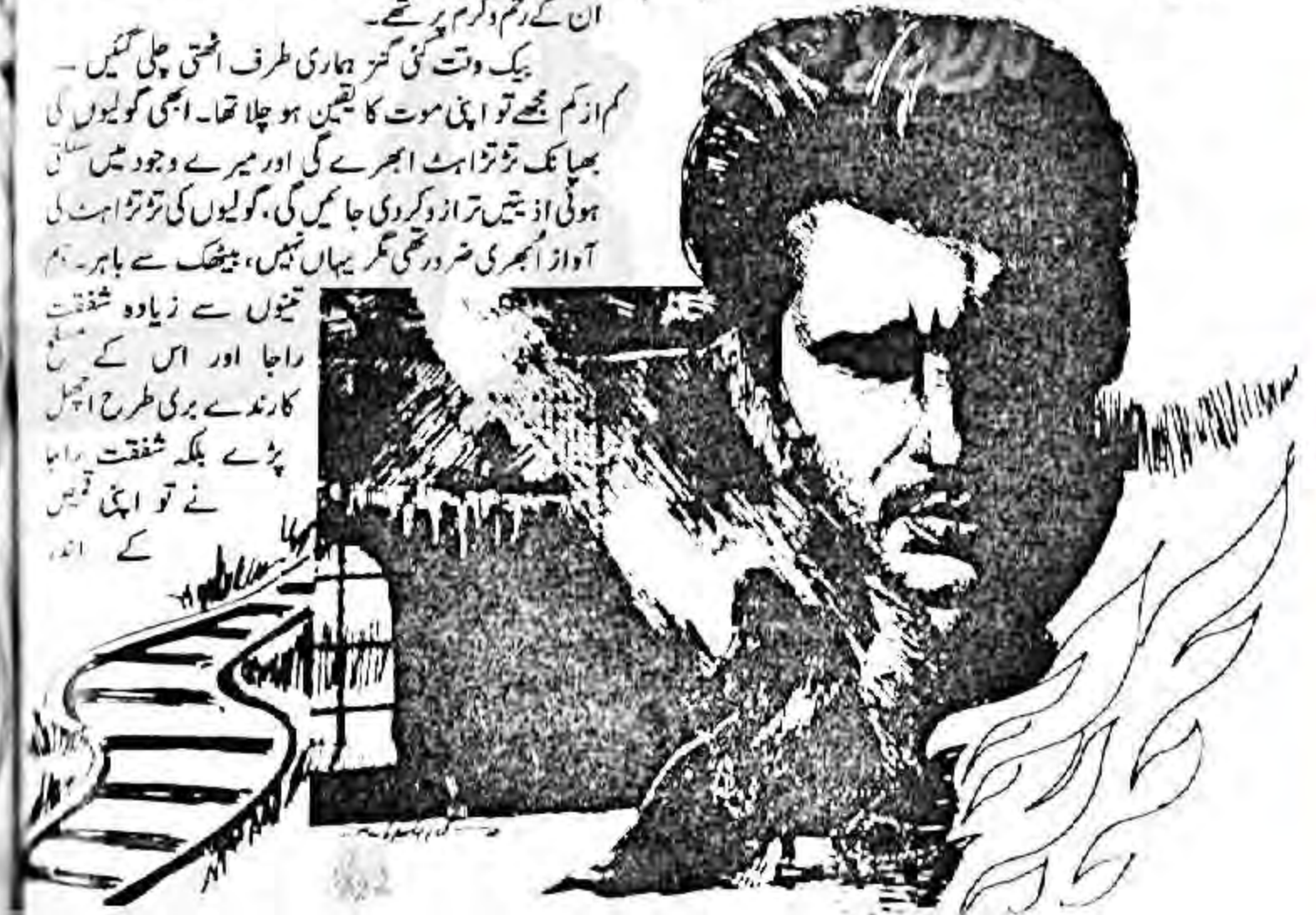
اڑسا ہوا پستول بھی نکال لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازے کی طرف بڑھتے، چار پانچ نقاب پوش مسلح افراد اندر در آئے اور انہوں نے اپنی گنوں کے منہ کھول دیے۔

آناً فاناً شفقت راجا سمیت اس کے کارندے رقصِ اجل میں لہراتے تھرکتے زمین بوس ہو گئے ..... کڑے وقت نے جن لوگوں کو ہم پر ملک الموت کی طرح نازل کر رکھا تھا، وقت کی کایا کلپ نے چند ثانیوں کے لیے ہی سہی، انہیں ہماری ڈھال بنا دیا تھا۔ اسی مختصر سی مدت سے فائدہ اٹھا کر اول خیر نے چلا کر موت کے اِن ہرکاروں سے کہا۔

''ہم ان کے قیدی ہیں... ہمیں مت مارنا۔'' یہ کہتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ کھڑے کر دیے۔ میں نے اور ارشد نے بھی اس کی تقلید کی۔

فرش پر پہلے سے چنی بائی کے آدمی کی لاش.... پڑی تھی۔ وہ چاروں نقاب پوش خونی نظروں سے ہماری طرف گھورتے رہے۔ اور ہم اپنے انجام کے منتظر رہے۔ پھر شاید بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔

اپنے شکاریوں کے ختم ہونے کا یقین کرنے کے بعد وہ چاروں ہرکارے جس طرح چشم زدن میں آئے تھے اسی طرح لوٹ گئے، باہر ہمیں گاڑی کے انجن اسٹارٹ ہونے اور پھر بتدریج دور جاتی آواز سنائی دی تھی۔

''او... خیر... یہ تو گلی ہی مک گئی۔'' اول خیر نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ ''اپنی گنیں سنبھالو اور نکل چلو۔'' وہ بولا۔ میں اور ارشد حرکت میں آ گئے، ہم نے اپنا اسلحہ قبضے میں کیا اور بیٹھک سے باہر آ گئے۔ سامنے ایک گرے رنگ کی ٹویوٹا اڑتی چلی آ رہی تھی اور جب تک ہم اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے، باہر بکھری ہوئی دو تین آدمیوں کی خون میں لت پت لاشوں کے قریب وہ کار زوردار آواز سے آن رکی۔ اس کے اندر سے ایک جواں سال لڑکی برآمد ہوئی، اس نے ٹائٹ جینز اور پنک کلر کی مہین کُرتی پہن رکھی تھی، بال ڈائی کیے ہوئے تھے، رنگت گوری اور آنکھیں کشادہ تھیں۔ دیکھنے میں شوخ اور بولڈ نظر آتی تھی۔

''گاڑی میں سوار ہو جاؤ جلدی...'' اول خیر چلایا۔ لڑکی بہادر اور شاید ایسے حالات کی عادی ہی نہیں حاضر دماغ بھی تھی، خون میں لت پت پڑی تین لاشوں کو دیکھتے ہی اس نے اپنے بڑے اسکرین والے سیل فون سے ہماری ویڈیو بنانی شروع کر دی۔ گولیوں کی گھن گرج کے بعد قریب کے لوگ بھی اس طرف متوجہ ہو چکے تھے، یہ جانکاہ واقعہ معمولی نہ تھا۔ ہم سب اپنی جیپ میں سوار ہو چکے تھے، اس بار ڈرائیونگ سیٹ اول خیر نے سنبھالی تھی۔ اس نے ہمارے سوار ہوتے ہی گاڑی ایک جھٹکے سے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

''اس لڑکی نے ہماری اپنے سیل فون پر ویڈیو فلم بنالی ہے۔'' میں نے تھرائی ہوئی آواز میں انکشاف کیا... ارشد، اول خیر کے برابر بیٹھا تھا۔ میں عقبی سیٹ پر اور گاہے بہ گاہے عقبی اسکرین سے پیچھے جھانکتی سڑک کو دیکھ رہا تھا۔

''اس لڑکی سے سیل فون چھین لینا چاہیے تھا۔ پتا نہیں کون تھی، بعد میں ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر سکتی ہے وہ لڑکی۔'' میں چلاتا رہا۔ اول خیر بولا۔

''کاکا بس ابھی اس مصیبت سے نکلنے کی فکر کرو۔ دوسری مصیبت سے بعد میں نمٹ لیں گے۔'' میں خاموش ہو گیا مگر میری تشویش بجا تھی۔ اس کی بڑی ٹھوس وجہ تھی، میں نہیں جانتا تھا کہ اس لڑکی نے اول خیر یا ارشد کی کس قدر ویڈیو بنائی تھی لیکن اپنے بارے میں مجھے تشویش ناک حد تک ''تسلی'' تھی کہ کم از کم میرے چہرے کی وہ بالکل صاف ویڈیو تو بنا ہی چکی ہوگی، کیونکہ اس وقت لڑکی کے زیادہ قریب میں ہی تھا اور غیر ارادی طور پر اپنے پورے چہرے کے ساتھ اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''اوئے کاکا فکر نہ کر... اس ویڈیو کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔'' گاڑی بھگانے کے دوران شاید عقبی آئینے میں میرے چہرے کے تاثرات بھانپتے ہوئے اول خیر نے تسلی دی۔

''فکر کی بات ہے اول خیر!'' اس بار ارشد نے میری تائید میں کہا۔ ''ہم کسی معمولی آدمی کے نرغے میں نہیں تھے، شفقت راجا خود بھی ابھرتی ہوئی سیاسی شخصیت ہے، یہ موروثی سیاست سہی مگر اس کا باپ بھی بڑا کھاپڑ سیاست داں ہے۔ تم نے بھی اس کے سیاسی جلوس کا حال دیکھ ہی لیا تھا۔ اب شفقت راجا اپنے دشمنوں کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کی پرانی دشمنیاں بھی نسل در نسل چلتی ہیں۔ اس لڑکی کے سیل فون پر ہماری شکلیں عین ایسے وقت میں محفوظ ہو چکی ہیں جبکہ یہ خون ریز واقعہ ہوا ہے۔''

''کاکا! میں تیری ساری تشویش اور باتیں سمجھ رہا ہوں۔'' اول خیر نے ذیلی سڑک سے مین ملتان روڈ پر آتے ہوئے کہا۔

''میں اس بارے میں سوچ رہا ہوں... کہ...''

''اب کیا فائدہ سوچنے کا اول خیر۔'' میں نے اس کی بات کاٹی ''ہمیں اس وقت لڑکی پر حملہ کر کے اس سے سیل فون چھین لینا چاہیے تھا یہ میڈیا کا دور ہے۔ اول خیر! اور پھر اتنی اہم شخصیت کا قتل اور ہماری فوٹیج... آدھے گھنٹے بعد ہی یہ فوٹیج

ملک کے ہر نجی ٹی وی چینل بڑے فخر سے دکھا رہے ہوں گے اور ہمارے سر پہ کسی اور کی بلائے جان آن پڑی ہے۔''

''او خیر... کاکے میں نے تیرے بارے میں غلط نہیں کہا تھا کہ تو ایک دم دھاکڑ مرد ہے۔ تیری عقل اور تیری دور اندیش سوچ بہت آگے تک اور وقت سے پہلے دوڑتی ہے۔'' اول خیر اپنے مخصوص لب و لہجہ میں بولا تو میں نے بیزاری سے کہا۔

''مجھے ہر وقت اپنی تعریفیں پسند نہیں اول خیر! ہم نے اپنے بچاؤ کا ایک اہم موقع کھو دیا ہے۔''

''اب مٹی ڈالو اس پر، پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں، آگے کی سوچو...'' ارشد نے جھلا کر کہا تو اول خیر بولا۔

''ہم ابھی اوکاڑہ پہنچنے والے ہیں... کسی ہوٹل میں ٹی وی دیکھ لیں گے، پتا تو چل جائے گا کہ ہماری کس حد تک فوٹیج آئی ہے۔''

اس صورتِ حالات میں ہمارا دھیان بھی اپنے اصل مشن سے ہٹ گیا تھا۔ یاد آیا تو میں یکبارگی ذہن میں ابھرنے والے ایک منظر پر بری طرح چونک کر بولا۔

''تم لوگوں نے شاید اس بات پر غور نہیں کیا کہ ہمارے سامنے جس آدمی کا شفقت راجا کی بیٹھک میں قتل ہوا تھا، وہ چنی بائی کا خاص آدمی تھا اور وہ اس سے دام کھرے کرنے آیا تھا۔ پولیس یقیناً اس معاملے کو چھپا دے گی۔ یعنی اس کے قتل کو...''

اول خیر اور ارشد نے میری بات شاید سنی ان سنی کر دی۔ سفر پُر تفکر سی خاموشی میں کٹ گیا۔ اوکاڑہ پہنچتے پہنچتے رات ہو چکی تھی۔ اوکاڑہ پر بیک وقت گاؤں اور شہر ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔ اس شہر کی وضع قطع ہی کچھ ایسی تھی۔ چنی بائی کے کوٹھے تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

گاڑی ایک جگہ روک کر میں نے اور اول خیر نے کوٹھے میں داخل ہونے کا پروگرام بنایا، جبکہ ارشد کو وہیں گاڑی میں ہی موجود رہنے کا کہا۔ بھوک تو ہماری اڑ چکی تھی۔

بہرحال ہم دونوں نے اپنا حلیہ درست کیا اور کوٹھے کے دروازے پر جا پہنچے، قریب میں ایک سگریٹ پان کا بڑا سا کیبن بنا ہوا تھا، میں نے اور اول خیر نے پہلے ہی سے اپنی وضع قطع ایسی بنالی تھی کہ ہم کوئی عام گاہک نظر نہ آئیں، کیبن خوب سجا ہوا تھا، اونچی آواز میں ریکارڈ بج رہا تھا۔

چاروں طرف ایک عجیب سا ماحول تھا، جو ظاہر ہے میرے لیے نیا ہی تھا، لوگ کیبن پر کھڑے پان سگریٹ خرید رہے تھے، چند ایک مخصوص قسم کے آدمی بھی موجود تھے، جن کا کام گاہکوں کو تاڑنا تھا۔ دائیں بائیں چوباروں پہ گویا بجلیاں سی چمک رہی تھیں۔ سستے اور گاڑھے میک اپ سے تھپے ہوئے ادا فروش چہرے، بھڑکیلے اور چست کھلے گریبان والے کپڑوں میں ملبوس، نیچے آتے جاتے گاہکوں کو فحش اشاروں سے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے میں منہمک تھیں۔ گلی سے شوقین قسم کے لوگوں کی آوک جاوک جاری تھی۔ ایک طوائف نے مجھے کسی مشہور بھارتی ہیرو کے نام سے پکار کر فحش اشارہ کیا۔ اول خیر کی ہدایت مجھے یاد تھی، ہمیں خود کو ایسا ہی ظاہر کرنا تھا، اور میں نے ''ایسا ہی'' کیا، یعنی بہ جبر دل و دماغ اس طوائف کی طرف دیکھ کر جوابی اشارہ بھی کیا، انداز میرا بھی اوباشانہ تھا...

ہم دونوں کیبن پہ آ کے رک گئے، اول خیر نے دو سادہ خوشبو پان بنوائے، ایک اس نے منہ میں دبا لیا، دوسرا میری جانب بڑھایا۔ پان کھانے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔

معاً ایک ادھیڑ عمر دبلا پتلا آدمی ہمارے قریب آن کھڑا ہوا۔ اور بھویں اچکا کر ہمیں اشارہ کیا پھر مخصوص انداز میں اپنے ایک ہاتھ کی انگلی سے اپنی ناک میں نتھ کی جگہ پر دستک دی۔ میں تو اس کا یہ اشارہ نہیں سمجھ سکا، البتہ اول خیر فوراً سمجھ گیا اور اثبات میں ... سر ہلا دیا۔ پان والے کو نوٹ تھمایا اور آدمی کو لے کر ایک طرف آ گیا۔ میں ساتھ تھا۔

''ہے کوئی اچھا دانہ...'' اول خیر نے پرانے پاپیوں والے انداز میں آدمی سے پوچھا۔ وہ پیشہ ورانہ انداز میں بولا۔

''ایک دم فرسٹ کلاس... بالکل کرینہ کپور... پر ریٹ ہائی ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے ایک نظر میرے چہرے پہ بھی ڈالی تھی، انداز بازاری تھا۔

''ایک گھنٹے کا پانسو... بہت آرام و سکون کے ساتھ کوئی جلد بازی نہیں۔ دو سو روپے میرا کمیشن الگ ہوگا۔''

''مال ہمیں ''تھری ڈی'' چاہیے۔'' اول خیر نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا تو وہ ادھیڑ عمر شخص سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔

''صاحب! تھری ڈی والی پسند ڈھونڈنا ذرا مشکل کام ہے۔''

''کوئی بات نہیں ہم خود ڈھونڈ لیتے ہیں۔ چل بے لنڈے۔'' اول خیر نے بے پروا لہجے میں کہا اور مجھے آگے دھکیلا۔ وہ آدمی پیچھے پڑ گیا۔

''ارے ارے... کدھر؟... ٹھہرو، بات تو کرو... اب اتنا بھی مشکل کام نہیں ہے یہ... مگر جو تم لوگوں کی پسند ہے وہ ذرا مہنگی ہے۔''

''ہمیں دانے سے مطلب ہے، مہنگے سستے سے نہیں۔'' اول خیر بولا اور اپنی جیب سے سو کا ایک کرارا نوٹ نکالتے ہوئے اس کی طرف لہرایا۔

''یہ رکھ لو، ویسے ہمیں معلوم ہے تمہری ڈی مال صرف چنی بائی کے کوٹھے پر ملتا ہے، وہاں تک لے چلتے ہو تو بات کرو۔''

سو کے کرارے نوٹ کو دیکھ کے آدمی کی پیک زدہ باچھیں بہہ پڑیں۔ چندی چندی آنکھوں میں حریصانہ چمک ابھری۔ اس نے نوٹ اچکنے کی کوشش کی مگر اول خیر نے ہاتھ اپنا پیچھے کرلیا۔ ''پہلے کام۔''

''ابھی لیے چلتا... آؤ...'' وہ جھٹ سے بولا۔ اول خیر نے نوٹ اسے پکڑا دیا۔ ہم دونوں اس کے عقب میں چلنے لگے۔

''ابے او... اپنی موٹی بھینس جیسی بیوی کے پاس لے جار ہا ہے ان دونوں مسٹنڈے شہزادوں کو... مت جانا اس کے ساتھ کالی بلا ہے اس کی بیوی۔'' اوپر ایک چوبارے پر چمگادڑ کی طرح جھولتی جواں سال لڑکی نے چلاّ کر کہا مگر وہ آدمی شاید اس جملے بازی کا عادی تھا۔ سنی ان سنی کرتا ہوا ہمارے آگے چلتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے چنی بائی کے کوٹھے پر ہمیں پہنچا دیا۔

''میں ادھر کیبن پر ہی ملتا ہوں، مُنّے میاں نام ہے میرا، اگر چنی بائی سے بات نہ بنے تو آ جانا... پھر میں تمھیں پنکی بائی کے پاس لے جاؤں گا، وہاں ضرور کام بن جائے گا تمہارا۔'' مُنّے میاں نے کہا اور واپس چلتا بنا۔

ہمیں ایک چھوٹے سے کمرے میں دو کرسیوں پر بٹھا دیا گیا۔ مجھے گھٹن کا احساس ہورہا تھا، بڑا گندہ اور پراگندہ ماحول تھا۔ میرے آگے کوئی نیک مقصد حائل نہ ہوتا تو میں ادھر آنے کا تصور بھی نہ کرتا۔ یہاں آکے میرے ضمیر اور میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہورہی تھی۔ کہنے کو تو یہ بازارِ حسن تھا، مگر درحقیقت یہ گناہوں کی بستی تھی۔ جہاں اچھے برے خاندان کے بھی لوگ آتے ہوں گے اور پیسے دے کر یہاں کا گند اور غلاظت... خوشی خوشی اپنے گھر لے جاتے ہوں گے۔

ایک اطفال گھر میں پرورش پانے والے شہزاد احمد خان... عرف شہزی کو اللہ نے غیر معمولی ذہن سے نوازا تھا۔ مجھے اس کا وقت کے ساتھ ساتھ احساس ہو چلا تھا۔ میں نے باہر کی دنیا نہیں دیکھی تھی مگر یہاں ہوتا کیا تھا، وہ سب ٹی وی پر چلنے والے ڈراموں پروگراموں میں دیکھتا آیا تھا۔

اگرچہ اطفال گھر میں ٹی وی ایک حد تک ہی دکھایا جاتا تھا مگر... ہم چند دوست چوری چھپے ٹی وی روم میں جاکر رات رات بھر ڈرامے، فلمیں اور دستاویزی پروگرام دیکھا کرتے تھے، عام اوقات میں ہمیں صرف سرکاری چینل دکھایا جاتا تھا مگر ہم چوری چھپے تمام ملکی و غیر ملکی نجی چینلز بھی دیکھا کرتے تھے۔

میں بنیادی طور پر خاموش طبع مگر زیادہ سوچنے والا لڑکا تھا۔ ٹی وی کے مختلف رنگ برنگ چینلز میں ہر طرح کے پروگرام آتے تھے، مگر میں نے اپنے ذہن کو بھٹکنے نہیں دیا، ہاں معلومات اور آگہی حاصل کرنے اور سدھار لانے کی خاطر میں یہ پروگرام دیکھا ضرور کرتا تھا۔

نیشنل جیوگرافک چینل میں ایک بھارتی دستاویزی فلم میں نے بھی دیکھی تھی جس میں طوائفوں کی زندگی پر ڈاکیومنٹری دکھائی گئی تھی۔ اسی میں یہ سب بتایا گیا تھا۔

جب تک اطفال گھر کے روحِ رواں حاجی صاحب زندہ تھے وہ ہماری تعلیم پر خصوصی توجہ دیا کرتے تھے، انہی کی توجہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے مناسب حد تک تعلیم بھی حاصل کی تھی، تعلیم نے بھی مجھے شعور عطا کیا تھا، اور پھر دینی تعلیم کی کلاسوں نے مجھے کسی حد تک بصیرت بھی عطا کی تھی جس کے باعث میری فکر و نظر میں شعور و پختگی پروان چڑھی تھی، میں زود فہم ہو گیا تھا، ذرا سی بات پر مضمون کا پورا مفہوم سمجھ لیتا تھا۔ اب اول خیر کی سنگت میں رہتے ہوئے بھی میں بہت کچھ سیکھ رہا تھا۔

یہاں کا ماحول کیا تھا، اس کا مجھے خوب تجربہ ہونے لگا۔

تھوڑی دیر گزری ایک ٹھسے دار عورت اندر داخل ہوئی۔ وہ بھینس نما عورت تھی اور بھینس ہی کی طرح جگالی کررہی تھی، ساتھ میں کپڑے کی چھوٹی سی تھیلی پکڑ رکھی تھی، اس میں شاید اس کی جگالی کرنے کا سامان موجود تھا۔

''ہاں کیا ہے؟ کون ہو تم؟'' اس نے ایک سرسری سی نگاہ مجھ پر ڈالنے کے بعد اول خیر کی طرف دیکھتے ہوئے جھٹکے دار لہجے میں پوچھا۔

''او... خیر ہے۔ ذرا بیٹھو تو سہی چنی بائی! ارمان (آرام) سے باتیں کرتے ہیں، ہم کوئی عام گاہک تھوڑی ہیں، لینے دینے والے لوگ ہیں۔''

اول خیر نے مخصوص لہجے میں اور معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔ ذرا دیر بعد ہی دو ہٹے کٹے سیاہ رُو آدمی اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے نیلے رنگ کی ٹائٹ جینز اور ہاف آستینوں والی چست ٹی شرٹس پہن رکھی تھیں، شکل سے ہی

چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ وہ دونوں ہماری طرف بڑی تیز نظروں سے گھور رہے تھے، انہیں دیکھ کر مجھے ہول سا محسوس ہونے لگا۔ تاہم میں پُراعتماد اور بے نیاز سا دکھائی دینے کی کوشش کرتا رہا۔

''نئے اور فریش دانے چاہیے تھے ہمیں۔'' اول خیر نے ایک اچٹتی سی نظر دونوں غنڈوں پر ڈالی اور چنی بائی سے بولا۔ میں چنی بائی کے چہرے کا بہ غور جائزہ لے رہا تھا۔ وہ خاصی پریشان اور غصے میں نظر آرہی تھی، یقیناً اس کی وجہ ہم نہیں ہوسکتے تھے، یا تو اسے اپنے خاص آدمی کے ہلاک ہونے کی خبر مل چکی تھی یا پھر اسے اپنے ''دانوں'' کی قیمت، شفقت راجا سے وصول نہ کرنے کا غصہ تھا۔ جواباً وہ بڑے اکھڑ پن سے بولی۔

''تم جاؤ ابھی... دو تین روز بعد آنا، ابھی میرے پاس بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔''

ایک بازاری عورت کا یوں اکڑنا مجھے ہی نہیں، یقیناً اول خیر کو بھی بری طرح کھلا ہوگا مگر مصلحت سے کام لینا ضروری تھا۔

''ہم نے مال آگے پہنچانا تھا، شفقت راجا کا تو نام سنا ہوگا آپ نے بڑی تگڑی آسامی ہے وہ۔''

میں جانتا تھا اول خیر نے دانستہ شفقت راجا کا نام لیا تھا۔ میں نے دیکھا اس بات کا اس عورت پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ نہ صرف اس پر بلکہ اس کے دائیں بائیں کھڑے کالے سانڈوں کے سیاہ رُوبشروں پہ بھی عجیب سے تاثرات لہرا گئے۔

''تم دونوں شفقت راجا کے لیے کام کرتے ہو؟'' جھریوں بھری چتون پر بل ڈال کر چنی بائی نے ہم دونوں کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہم صرف اپنے لیے کام کرتے ہیں میڈم جی!'' اول خیر نے جواب دیا۔ ''شفقت راجا جیسے ہمارے کئی گاہک ہیں۔''

''آخری بار کب ملے ہو شفقت راجا سے تم؟ چنی بائی نے انکشاف کرنے والے انداز میں پوچھنا چاہا۔

میرا اندازہ تھا کہ شفقت راجا کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح صوبے میں ہی نہیں پورے ملک میں گردش کرگئی ہوگی لیکن سرِدست اس ''خبر'' سے ہمارا انجان بنے رہنا ضروری تھا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں میڈم جی آپ کی بات کا مطلب؟'' اول خیر نے کمال کی اداکاری کی۔ پتا نہیں وہ کون سی چال چلنا چاہ رہا تھا۔

''شفقت راجا اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ ابھی چند گھنٹے قبل اسے اس کی بیٹھک میں کچھ نامعلوم حملہ آوروں نے قتل کر ڈالا ہے۔''

چنی بائی نے بالآخر اپنے تئیں انکشاف کر ہی ڈالا۔ میرے دل کی دھڑکنیں یکلخت تیز ہو گئیں، اس میں کوئی شک نہ تھا کہ مختلف نجی ٹی وی چینلز نے یہ اہم خبر نشر کردی تھی۔ مگر میرے دل کی یکبارگی تیز ہوئی دھڑکنوں کا گماں کچھ اور تھا کہ اس نامعلوم لڑکی نے اپنے سیل فون سے ہماری اتاری فوٹیج میڈیا والوں کے حوالے ابھی تک کی تھی یا نہیں۔ شاید ابھی تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ ورنہ چنی بائی نامعلوم حملہ آوروں کا لفظ استعمال نہ کرتی۔

''او خیر...! اس کا مطلب ہے ہمارے پرانے دانوں کے دام گئے ہاتھ سے، یہ تو بڑا نقصان ہو گیا ہمارا کاکا۔ اب کیا کریں؟''

اول خیر نے اپنے چہرے اور آواز کو پُرتشویش بناتے ہوئے میری طرف دیکھا، میں نے بھی اسی انداز میں اپنی بھویں اچکا دیں۔

''کتنا مال تھا تمہارا؟'' چنی بائی نے پوچھا۔

''پورے چار دانوں کا مال تھا میڈم جی لیکن خیر... ہمیں معلوم ہے شفقت راجا نے انہیں کہاں رکھا ہوگا۔ اب یہاں رکنا فضول ہے، ہمیں ابھی اسی جگہ کا رخ کرنا پڑے گا۔ ورنہ مال گیا ہاتھ سے۔ چل اٹھ کاکا۔'' یہ کہتے ہوئے اول خیر نے مجھے ٹہوکا دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے گویا چنی بائی کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اور اب اس کی طرف سے بے نیاز نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ٹھہر جاؤ... ہمارا معاملہ بھی تم سے مختلف نہیں ہے۔'' دفعتاً چنی بائی نے اول خیر سے کہا۔ اب اس کے لہجے سے اکھڑ پن اور سرد مہری عنقا ہو چکی تھی۔ اول خیر ذرا رک کر چنی بائی کے چہرے کی طرف مستفسرانہ نظروں سے گھورنے لگا۔

''کیا تم واقعی جانتے ہو کہ شفقت راجا نے لڑکیوں کو کہاں رکھا ہوگا؟'' چنی بائی نے پوچھا۔

''ہاں بہت اچھی طرح۔ وہاں اور لڑکیاں بھی تھیں۔ مڈل ایسٹ سے ایک سوداگر کو آنا تھا۔ جو بنگال کے راستے ان سب لڑکیوں کو لے کر جاتا۔'' اول خیر نے ہوا میں تیر چھوڑا۔ چنی بائی کے چہرے پر الجھن سی تیرنے لگی۔

''سوداگر؟ کیا شفقت راجا بھی مال کو آگے سپلائی کرتا تھا؟''

''ہاں! مگر پہلے کچھ روز تک شکار کو خوب نچوڑنے کے

بعد۔ لیکن اب اس کو موت نے نچوڑلیا۔ وقت کم ہے ہمارے پاس میڈم جی۔ آپ نے کچھ کہنا ہے تو...'' اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔

''تم لوگ تو بڑے پہنچے ہوئے بیوپاری لگتے ہو۔ میں تم سے ہر طرح کا سودا کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' چنی بائی رفتہ رفتہ اپنے روایتی ہتھکنڈے پر اتر آئی، وہ خوشامدانہ انداز میں بولی۔ ''آج کل یہاں کوٹھوں، چوباروں میں پہلے والا مزہ نہیں رہا اس لیے ہم نے بھی بڑا ہاتھ مارنے کے لیے چھن میاں کے مشورے کے مطابق عورتوں کی خرید وفروخت کے کاروبار میں ہاتھ ڈالا اور شفقت راجا کو ایک نہیں دو نہیں پورے پانچ دانے فروخت کرڈالے مگر اس نے ہمیں پے منٹ صرف دو لڑکیوں کی کی، باقی تین کی پے منٹ اس پر واجب تھی کہ آج ہی چھن میاں اپنی پے منٹ لینے کے لیے شفقت راجا کے ہاں گیا تو بدقسمتی سے شفقت راجا کے دشمنوں کی بھینٹ وہ بھی چڑھ گیا۔''

''یہ تو واقعی بہت برا ہوا آپ کے ساتھ۔'' اول خیر نے متاسفانہ انداز میں ہونٹ سکیڑے۔ میں اس کی اداکاری سمجھ رہا تھا۔ اب چنی بائی کو کیا معلوم تھا کہ چھن میاں کو شفقت راجا کے دشمن نے نہیں بلکہ خود اس کے ایک کارندے نے اس کے پیٹ میں چاقو گھونپ کر ہلاک کیا تھا۔

''لیکن شفقت راجا تو اس طرح کا دھندا نہیں کرتا، وہ تو بس ہم سے اچھے اچھے نئے اور فریش دانوں کی فرمائش کرتا، منہ مانگے دام دیتا اور...''

''چھوڑیں اس بات کو میڈم جی!'' اول خیر نے اس کی بات کاٹ کر چالاکی سے کہا۔ ''یہ لمبی کہانی ہے۔ بعد میں وہ لڑکیوں کا اچار تو نہیں ڈالتا ہوگا۔ ویسے وہ تم سے لڑکیاں خریدتا کیوں تھا، اپنی ذاتی عیاشی کے لیے یا...؟''

''ہاں! اپنی عیاشی کے لیے بھی اور دوسروں کی دل بستگی کے لیے بھی۔ جن میں بڑے بڑے عیاش افسران اور بیوروکریٹ بھی شامل ہوتے۔''

''خیر، ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، میڈم جی! وہ لڑکیوں کا کیا کرتا ہوگا۔ آپ ہمارے بارے میں کیا کہتی ہیں؟ ہم تو پکے بیوپاری ہیں، اس ہاتھ مال لیتے ہیں، اس ہاتھ دام دیتے ہیں۔'' اول خیر نے اپنے دونوں ہاتھ بیوپاری کے انداز میں باری باری آگے کیے۔ چنی بائی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اول خیر اب وہاں سے جانے کی جتنی جلدی مچانے کی اداکاری کررہا تھا چنی بائی اتنا ہی ہمیں روکنے پر مصر تھی، یہی نہیں وہ ہمیں لے کر ایک نسبتاً بہتر کمرے میں آگئی، یہاں ذرا ڈھنگ کا فرنیچر نظر آرہا تھا۔ اے سی بھی لگا ہوا تھا، فرش پر قالین اور سامنے پلنگ سا بچھا ہوا تھا۔ سامنے صوفے بچھے ہوئے تھے، عجیب طرح کی خوشبو سی پھیلی ہوئی تھی۔ پلنگ کے عقب میں ایک بڑی کھڑکی بھی اور دو چھوٹی کھڑکیاں صوفے والی دیوار پر جو کھلی پڑی تھیں اور ریشمی پردے لگے ہوئے تھے۔ میں نے وہاں سے کچھ لڑکیوں کو ہنستے کھلکھلاتے گزرتے دیکھا تھا۔

چنی بائی نے ہمیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود پلنگ پر بیٹھ گئی اور سرخ رنگ کے سنہری کڑھائی والے گاؤ تکیے سے پہلو لگا دیا۔ دونوں مسٹنڈوں کو بھنوؤں کے اشارے سے جانے کا اشارہ کیا، پھر کسی لڑکی کو پکارا۔

''او چنبیلی... او چنبیلی! ادھر آ۔''

تھوڑی دیر بعد ایک دبلی پتلی نازک اندام لڑکی ہمارے سیدھے ہاتھ کے دروازے سے جھجک کے اندر داخل ہوئی، اس کا رنگ سانولا مگر چہرے کے نقوش پُرکشش تھے۔ نیلے رنگ کے چست کرتے اور چوڑی دار سرخ پاجامے میں وہ اسمارٹ لگ رہی تھی۔ لمبی سی چٹیا اس کی تھرکتی بل کھاتی کمر پر ناگ کی طرح لہرا رہی تھی۔

''یہ ہمارے مہمان ہیں، لاہور سے آئے ہیں۔ کچھ ٹھنڈا ٹھنڈا لے آ ان کے لیے۔'' چنی بائی نے چنبیلی نام کی اس لڑکی سے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ چنبیلی نے ایک ادائے دلربا کے ساتھ ہماری طرف دیکھا اور پھر مجھ پر نگاہ ڈال کر معنی خیز انداز میں مسکرائی اور اسی طرح تھرکتی ہوئی چلی گئی۔

''بڑی شوخ لڑکی ہے۔ میں نے ہی اسے پالا ہے۔'' چنی بائی نے چنبیلی کے بارے میں مختصراً بتایا۔

''کم عمر بھی ہے۔'' اول خیر نے ایک آنکھ میچ کر بازاری پن سے کہا۔

''تم بتا رہے تھے کہ... شفقت راجا نے لڑکیوں کو کہیں رکھا ہوا ہے، اب تم انہیں کیسے چھڑا کر لاؤ گے؟''

چنی بائی نے فوراً مطلب کی بات چھیڑ ڈالی۔ وہ اول خیر سے ہی مخاطب تھی وہ جواباً بولا۔

''ہاں! پتا تو ہے۔ اپنے ڈیرے پر ہی انہیں رکھا ہوگا۔ پہلے تو اس کے آدمی سے بات کرنا پڑے گی، وہ کیا کہتا ہے۔ اب پتا نہیں وہ بھی مارا گیا ہے یا زندہ ہے۔''

''کیا اس کا باپ میرا مطلب ہے شفقت راجا کا باپ زبیر خان بھی درپردہ یہی دھندا کرتا ہے، یا...'' چنی بائی نے مستفسرانہ انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو اول

خیر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''نہیں مگر اپنے بیٹے کے کرتوتوں کا علم تو اسے ہوگا؟''

''پھر تمہیں پہلے زبیر خان سے ہی بات کرنی چاہیے۔'' چنی بائی نے اپنی طرف سے مشورہ دیا تو اول خیر نے وہ رد کرتے ہوئے کہا۔

''اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ان کے ڈیرے پہ جاؤں گا۔ اور کسی طرح کسی ایسے آدمی سے بات کرنے کی کوشش کروں گا جو ہمارے کام آسکے، میرا خیال ہے کہ یہ کام آسان ہے، میرا مطلب ہے اپنے دانے واپس لینا اب کوئی مسئلہ نہیں۔ شفقت راجا کی موت کے بعد لڑکیاں ان لوگوں کے لیے بیکار ہوگئی ہوں گی۔''

مجھے بے چینی سی لگی ہوئی تھی، معلوم نہیں اول خیر کون سی چال چل رہا تھا، اور چنی بائی کو کس مقصد کی خاطر الجھائے ہوئے تھا، اس کا ڈراما کچھ سمجھ میں بھی آرہا تھا مگر چاہتا تھا کہ اب وہ جلد از جلد مطلب کی بات پر آجائے، تاکہ یہ اونٹ... جو ملتان سے چلا تھا کسی کروٹ بیٹھ جائے، اپنے سیل فون پر ہماری خطرناک فوٹیج بنانے والی لڑکی الگ میرے ذہن پر کسی آسیب کی طرح سوار تھی۔

''آپ کے کتنے دانے چھڑانے ہیں؟ آپ اس کی قیمت لگاؤ، ہم ویسے ہی مال لے جائیں گے، آپ کو قیمت ادا کرکے۔''

بالآخر اول خیر جس مقصد کے لیے اب تک گراؤنڈ بنا رہا تھا اس پر آگیا۔ اس کی بات پر چنی بائی یقیناً اندر سے خوشی کے مارے دہری ہوگئی کیونکہ اس کا اظہار اس کے پھٹکار برساتے عمر رسیدہ چہرے سے عیاں تھا۔

''پانچ لڑکیاں تھیں۔'' چنی بائی نے فوراً بتایا۔

''نام...؟'' اول خیر نے بظاہر بے پروا انداز میں پوچھا۔ جبکہ مجھے یقین تھا کہ میری طرح وہ بھی پہلے اس بات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ ان میں اطفال گھر سے تعلق رکھنے والی وہ چار بدنصیب لڑکیاں شامل تھیں یا نہیں۔

چنی بائی نے ان پانچ میں سے چار لڑکیوں کے نام جو بتائے تھے وہ ہمارے لیے اجنبی تھے۔ ان کے بارے میں بقول چنی بائی کہ وہ اس کے کوٹھے سے تعلق رکھتی تھیں۔ جبکہ پانچویں لڑکی کا نام اس نے شکیلہ بتایا تھا۔ اس نام پر میں چونک اٹھا۔ اول خیر نے جب شکیلہ کے سلسلے میں کچھ کرید کی تو چنی بائی نے ماتھے پر ہتھیلی مار کر کہا۔

''میں تو بہت پچھتائی تھی اس لڑکی کو لے کر... بڑی ہٹیلی لڑکی تھی، پٹھے پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتی تھی، میں نے بھی غصے میں اسے آگے کردیا۔''

میں نے شکیلہ کا ناک نقشہ پوچھا تو چنی بائی نے بالکل ویسا ہی اس کا حلیہ بتایا جو اطفال گھر کے پرانے ساتھی، شوکت حسین عرف شوکے کی ساتھی شکیلہ کا تھا۔ میرے کان کھڑے ہوگئے، مگر یہ سن کر تشویش بھی ہوئی کہ وہ بے چاری شریف زادی کہاں سے کہاں پہنچادی گئی تھی، اب باقی ثریا سمیت اطفال گھر کی باقی تین لڑکیوں کی تلاش کا سوال تھا۔ اول خیر نے بڑی چالاکی سے ان کے بارے میں بھی چنی بائی سے اگلوالیا۔ وہ تینوں بدنصیب ادھر ہی موجود تھیں۔ مگر میں نے چنی بائی کے چہرے سے اندازہ لگایا وہ کچھ چونک سی اٹھی تھی۔ اسی اثنا میں چنبیلی ہاتھوں میں ایک بڑی سی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی، اور درمیان میں بچھی میز پر وہ ٹرے رکھ دی، اس میں دو شیشے کے گلاس رکھے ہوئے تھے، بڑی ادا سے اس نے وہ باری باری ہماری طرف بڑھائے۔ اس کے بعد ہنستی مسکراتی چلی گئی۔

''چنی بائی! صاف اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں پیشہ ور لڑکیوں کی ضرورت نہیں ہے، وہ تو ہمیں لاہور میں بھی مل سکتی تھیں، آپ سمجھ رہی ہیں ناں، میری بات کا مطلب؟''

اول خیر اب پوری طرح مقصد کی بات پر آگیا اور غیر محسوس انداز میں چنی بائی سے نظر بچا کر میرا ہاتھ بھی ہولے سے دبایا ہے، یکبارگی میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ بلاشبہ یہ اشارہ تھا کہ اب اصل عملی کارروائی کا وقت آن پہنچا اور کسی بھی لمحے کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ چنی بائی اچانک بدک بھی سکتی تھی۔ لیکن یہاں اول خیر کا پہلے سے بنایا ہوا ''گراؤنڈ'' کام آگیا۔ چنی بائی بھی معنی خیز مسکراہٹ سے بولی۔ ''ہاں ہاں کیوں نہیں، سمجھ رہی ہوں تمہاری بات کا مطلب، لیکن اس کے دام زیادہ ہوں گے۔''

''دام کی طرف سے تم بے غم ہوجاؤ میڈم جی'' اول خیر نے گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ ''ذرا دیدار شیدار تو کرا دو۔''

چنی بائی پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے سے نکل گئی، وہ شاید ان تینوں کو لینے گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد اول خیر نے میرے کان میں سرسراتی سرگوشی کی۔ ''کاکے اب ہوشیار۔ وہ جیسے ہی لڑکیاں لائے گی، تو نے چنی بائی کو قابو کرنا ہوگا، گلا دبانے کی بھی ضرورت پڑے تو دبا دینا گلا سالی کا۔''

''ٹھیک ہے۔ تم بے فکر رہو۔'' میں نے تسلی دی۔ میرا

پستول میری جیب میں موجود تھا، میں نے اسے تھپک کر موجودگی کی تسلی بھی کی، اچانک کمرے میں تین چار غنڈے مسٹنڈے آن وارد ہوئے، ان میں پہلے والے دو بدمعاش صورت بھی شامل تھے، دو کے ہاتھ میں ریوالور اور دو بدمعاشوں نے لمبے پھل والے چھرے پکڑے ہوئے تھے، نجانے کہاں ہم سے غلطی ہوگئی تھی اور کب ہماری ذرا سی جلد بازی نے کھیل بگاڑ کر چنی بائی کو شبہے میں مبتلا کردیا کہ اس حرافہ نے لڑکیوں کو یہاں لانے کے بہانے اپنے مسلح ہرکارے بھیج دیے۔

سنسنی اور خوف کی تیز لہر میرے وجود میں اتر گئی اور حلق میں سانس سی اٹکنے لگی۔ اول خیر بھی اس صورتِ حال سے لمحہ بھر کو تشویش زدہ سا ہوا پھر ان چاروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اوخیر... کیا کوئی غلطی ہوگئی ہے ہم سے؟''

''کون ہو تم؟ اور کس نے بھیجا ہے یہاں؟'' ایک گنجے سر والے بدمعاش نے اپنے ریوالور کی خوفناک نال ہمارے سامنے لہراتے ہوئے خونخوار لہجے میں پوچھا۔

''ہمیں کیا معلوم؟ اس سے پوچھ لو۔'' اول خیر نے اس طرح بے پروا انداز میں ان سے کہا۔ یہ بے شک چھٹے ہوئے بدمعاش سہی مگر خاص حالات میں ذرا سی بات کے الٹ پھیر کے جھانسے میں غیر ارادی طور پر آجانا عام بات تھی، وہ بھی اول خیر کے جھانسے میں آگئے۔ ذرا پیچھے گردن انہوں نے گھمائی ہی تھی کہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اول خیر کی دونوں ٹانگیں بیک وقت حرکت میں آئیں اور آگے والے دونوں اسلحہ بہ دست غنڈوں کے ہاتھ ریوالور سے خالی نظر آنے لگے۔ میری تو اور کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ مگر موقع سے میں نے بھی فائدہ اٹھاتے ہوئے جو سمجھ میں آیا کرگزرا۔ اپنے سامنے پڑی میز اٹھا کر میں نے ان چاروں غنڈوں پر دے ماری، اول خیر نے جتنی پھرتی سے اپنی جیب سے پستول نکالا تھا، کم و بیش اسی پھرتی سے میرے ہاتھ میں بھی اپنا پستول آچکا تھا۔ پھر بیک وقت ہم دونوں کے پستولوں نے آتشیں قہقہے اگلے اور وہ چاروں قصائی صورت بدمعاش فرش پر تڑپنے لگے۔ میرے ہاتھوں یہ پہلا قتل تھا مگر مجھے اس کا چنداں افسوس نہ تھا۔ یہ لوگ اس انجام کے مستحق تھے۔ اندر متعدد لڑکیوں کے چیخنے چلاّنے کی آوازیں ابھریں۔ میرے جسم کا رواں رواں اس وقت تھرتھرا رہا تھا۔ اول خیر کے وجود میں گویا بجلی دوڑنے لگی' وہ تیزی سے اس دروازے کی طرف بڑھا جس دروازے سے چنی بائی نکلی تھی۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی، دو تین خواجہ سرا تالیاں پیٹتے ہوئے ہم سے ٹکرائے' چند لڑکیاں اِدھر اُدھر بھاگیں، ہم ہال کمرے میں تھے، اور دائیں بائیں محرابی برآمدے، کچھ طبلچی اور سازندے... کھڑے تھے اور آٹھ دس کے قریب تماش بین بدحواسی میں اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے، ایک کمرے کی طرف اول خیر نے عقابی نظریں جمائیں تو مجھے بھی وہاں چنی بائی کمرے کا دروازہ بند کرتی دکھائی دے گئی۔ اول خیر اور ہم ملک الموت بنے مذکورہ کمرے کے دروازے پر جا پہنچے اور... اول خیر نے ایک لات مار کر دروازہ توڑ ڈالا۔

چنی بائی سامنے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی، اول خیر نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی اور چڑھی ہوئی آنکھوں سے غرا کر بولا۔ ''کھیل ختم میڈم جی! تم جان گئیں کہ ہم کون ہیں۔ ان تینوں لڑکیوں کو ہمارے حوالے کردو۔ ورنہ تمہارے سمیت کوٹھے کو آگ لگا دیں گے' باہر ہمارے اور بھی ساتھی موجود ہیں۔'' چنی بائی نے ہکلاتے ہوئے باہر نکلنے کا اشارہ کیا اور ہم اس سمیت کمرے سے نکلے۔

برآمدے کے کونے والے کوٹھڑی نما کمرے میں وہ ہم سمیت داخل ہوئی، اندر روشنی تھی میں نے ثریا سمیت تین لڑکیوں کو ڈرے سہمے انداز میں... کونے میں دیوار سے لگے پایا تو ثریا سمیت باقی دو لڑکیاں مجھے پہچان کر خوشی سے چلاّئیں۔ میرا دل خوشی اور آنسوؤں سے بھر گیا۔

''اول خیر! کام ہوگیا۔ اب یہاں سے نکلنے کی کر د...'' میں نے جوش سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور ثریا سمیت قیدی لڑکیوں کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں سمولیا۔ اول خیر نے چنی بائی کو دھکا دیا اور ہم باہر کی جانب لپکے۔

گلی میں بھی شور مچ گیا تھا۔ شکر تھا کہ کہیں کوئی قریب میں پولیس کی گشتی موبائل نہیں کھڑی تھی، ارشد گاڑی سمیت تیار تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی اس نے اسٹارٹ رکھی گاڑی کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔

☆☆☆

ایک مشن کی کامیابی نے میرا دل خوشی سے بھر دیا تھا مگر دل میں شکیلہ کی طرف سے ابھی کسک باقی تھی۔ تینوں لڑکیاں عقبی سیٹوں پہ بیٹھی رونے لگیں، میں نے اسے دلاسا دیا۔ وہ میری اطفال گھر کی بچپن کی ساتھی تھیں۔ میں نے ثریا سے شکیلہ کے بارے میں بھی پوچھنا ضروری سمجھا تھا، اس نے بھی بہت سسکتے ہوئے یہی بتایا تھا کہ... شکیلہ کو انہوں نے کسی اور کے حوالے کردیا تھا۔ میں نے ثریا کو تسلی دی...

کہ... وہ اس سلسلے میں بے فکر رہے، ہم نے شکیلہ کا بھی کھوج لگالیا ہے۔ ثریا نے یہ انکشاف بھی کیا کہ شکیلہ اصل میں شوکت عرف شوکی کی سگی بہن ہے... یہ بات انہوں نے اطفال گھر میں سب سے چھپائی ہوئی تھی۔

راتوں رات ہمارا سفر جاری رہا اور ہمارا دماغ بھی سوچوں میں سفر کرتا رہا۔ پھر میں نے ہی اول خیر سے کہا۔

''اول خیر! تم اور ارشد... ان لڑکیوں کو لے کر ملتان پہنچو اور انہیں کسی دارالامان میں پہنچا دو اور مجھے کھلاں والی اتار دو۔''

کھلاں والی وہی علاقہ تھا جہاں شام والا خوں ریز واقع پیش آیا تھا۔

''اوخیر... کاکا... تجھے اکیلا کیسے چھوڑ دیں۔ دوبارہ ایسی بات مت کرنا۔'' اول خیر بولا، پھر وہ ارشد کو کچھ سمجھانے لگا۔ کھلاں والی کے ایک روڈ سائڈ چھپر ہوٹل میں ہمیں اتار کر ارشد تینوں لڑکیوں سمیت روانہ ہوگیا۔

اب ہم خطرے کے حوالے سے ایک ''ریڈ زون'' میں تھے، جہاں ایک بڑی سیاسی شخصیت کا جواں سال بیٹا اور ابھرتا ہوا سیاست داں... شفقت راجا کا بے رحمی سے قتل ہوچکا تھا، اس پر مستزاد وقوعے پر ہماری ویڈیو فلم بنانے والی وہ لڑکی... الگ ہمارے لیے خطرے کا الارم بنی ہوئی تھی۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی، یہ سرائے نما ہوٹل تھا جس کی اوپری منزل میں چھوٹے چھوٹے رہائشی کمرے بنے ہوئے تھے، اس کے وسیع کچے احاطے میں ایک مسافر لاری، ایک لگژری کوچ اور دو تین... وہیلر ٹرک کھڑے تھے، اردگرد چارپائیاں بچھی تھیں۔ لوگ انہی چارپائیوں پر بیٹھے چائے اور کھانا کھانے میں معروف تھے، تمام روڈ سائڈ ہوٹل اسی وضع کے ہوتے ہیں۔ میز کرسیوں کی جگہ زیادہ تر چارپائیاں یا تختے دار پلنگ بچھے ہوتے ہیں۔

اول خیر کو بھوک لگی ہوئی تھی، میری بھوک واجبی سی تھی، اول خیر نے کڑاہی گوشت کا آرڈر دیا۔ ہمارے سامنے ملتان روڈ تھا اور وہاں آنے جانے والی تیز رفتار گاڑیوں کی شائیں شائیں گونج رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد گرما گرم کھانا آگیا۔ کڑاہی اور گرما گرم کڑک تنوری روٹیاں دیکھ کر میری بھی بھوک چمک اٹھی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد میرے اور اول خیر کے درمیان ایک بحث سی چھڑ گئی۔ ہم دھیمی آواز میں باتیں کررہے تھے۔

میرے خیال کے مطابق شکیلہ کو چھڑانے کی مہم ایک آدمی کے کرنے کی تھی اور میں چاہتا تھا کہ اسے تنہا سر کرلوں جبکہ اول خیر مجھے تنہا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسرا خیال اس کا یہ تھا کہ میں واپس ملتان لوٹ جاؤں اور بیگم صاحبہ یا سرمد بابا کے ہاں چلا جاؤں اور وہ خود یہ مہم سر کرنے کی کوشش کرے گا، اول تو میں بھی اول خیر کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسری بات یہ بھی کہ شکیلہ اول خیر کو جانتی نہیں تھی، وہ صرف مجھے پہچانتی تھی، یوں بھی شکیلہ کے بغیر میں کیسے ملتان لوٹ سکتا تھا۔ شوکت حسین کو کیا منہ دکھاتا۔ اطفال گھر کی بھی کوئی خیر خبر نہ تھی کہ اب وہاں کے کیا حالات تھے۔ اس کا بھی پتا لگانا میرے اہم مقاصد میں شامل تھا۔ میں چاہتا تھا، جلدی یہ سارے مسائل حل ہوجائیں تاکہ بعد میں، میں اپنے باپ کو تلاش کرنے کی جستجو کروں لیکن پے در پے رونما ہونے والے حالات غیر محسوس طور پر مجھے جکڑتے جارہے تھے بہ مشکل کسی ایک مسئلے سے جان چھوٹتی تو اس کی باقیات میرے تعاقب میں ہوتیں۔

''کاکا! اب اس بحث کو چھوڑ!''

بالآخر اول خیر نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ ''ابھی میں ہوٹل کے مالک سے کمرا لینے کی بات کرکے آتا ہوں۔ رات یہاں گزار کے ہم صبح زبیر خان کے ڈیرے کا رخ کریں گے، ضروری ہوا تو اپنا حلیہ بھی بدل لیں گے۔'' اس کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ بالآخر میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اول خیر نے ایک کمرا رات بھر کے لیے کرائے پر لیا۔ اس کے بعد ہم کمرے میں آگئے۔ دو چارپائیاں دائیں بائیں بچھی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں تھکے ہوئے تھے، لیٹتے ہی گہری نیند سو گئے۔

صبح سب سے پہلے اول خیر کی آنکھ کھلی۔ اس نے مجھے بھی جگا دیا۔ وہ غسل وغیرہ کرکے تیار ہوچکا تھا۔ میں جب تک نہانے وغیرہ سے فارغ ہوا، اول خیر ناشتے کا آرڈر کرچکا تھا۔ ناشتا کرتے ہی ہم ہوٹل سے باہر آگئے۔

قریبی دکان سے ہم نے دو چادر نما بڑے رومال خریدے، یہ ایسے ہی رومال تھے جو عام طور پر لوگ تیز دھوپ کی تپش وغیرہ سے بچنے کے لیے سر اور چہرے کو ڈھانپتے ہیں۔ یہ سر اور چہرے کے گرد لپیٹ کر ہم ایک تانگے کی طرف بڑھے تو اچانک میرے دل میں ایک خیال آیا۔

''اول خیر' آؤ ذرا ٹی وی دیکھ لیں۔'' وہ میری بات کا مطلب سمجھ گیا۔ یہاں تقریباً ہر ہوٹل میں ٹی وی کا عام

رواج تھا، بعض ہوٹلوں میں تو باقاعدہ وی سی ڈی لگا کر فلمیں اور گانے بھی چلائے جاتے تھے، مگر اس وقت ٹی وی پر خبریں نشر ہو رہی تھیں، اور لوگوں کی خاصی تعداد میں نے ٹی وی کے آگے بیٹھے دیکھی۔ میرا دل یکبارگی کسی خیال کے باعث تیزی سے دھڑکا۔ ہم بھی آگے ہو کر ٹی وی دیکھنے لگے۔ علاقائی چینل پر ابھی تک زبیر خان کے بیٹے شفقت راجا کے خوں ریز قتل کی خبریں فوٹیج وغیرہ دکھائی جارہی تھی۔ نیچے اس خبر سے متعلق پٹی (سلائیڈنگ نیوز بیلٹ) بھی چل رہی تھی، میرا پورا وجود اس وقت آنکھ بنا ہوا ٹی وی پر مرکوز تھا جہاں خبر نشر ہو رہی تھی۔ کچھ صحافی بھی جائے وقوع پر موجود میزبان نیوز کاسٹر کے سوالوں کا جواب دے رہے تھے۔ شفقت راجا کی تجہیز و تکفین کے مناظر، اس کے باپ زبیر خان سے بات چیت اس طرح کی فوٹیج اور تبصرے وغیرہ نظر آرہے تھے، میرا دل سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا، میری دھڑکتی ہوئی پُرتشویش نظروں کے سامنے ابھی تک وہ فوٹیج یا ایسی خبر نہیں آئی تھی... جس میں بتایا جارہا ہوتا...

''ہمارے چینل کو موقع واردات کی فوٹیج مل گئی ہیں۔ جن میں راجا کے قاتلوں کو اس کی بیٹھک سے فرار ہوتے ہوئے دکھایا جا رہا ہے، وغیرہ۔''

ابھی اگر ایسی کوئی بریکنگ نیوز آجاتی تو وہ یقیناً میرے اور اول خان کے لیے ایٹم بم پھٹنے سے کم نہ ہوتی مگر شکر تھا کہ ابھی ایسی کوئی بریکنگ نیوز نشر نہیں ہوئی۔ میں نے اول خیر کی طرف دیکھا اور ہلکی آواز میں بولا۔

''اول چاچا... ابھی تک خیر ہی ہے۔'' ہجوم میں آگے بڑھنے لگا تو یکدم اول خیر نے مجھے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر روک دیا۔ میں نے قدرے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی یک ٹک سی نظریں ہنوز ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں، مجھے حیرت سی ہوئی اور میں نے بھی اس وقت ٹی وی کی طرف دیکھا۔ اور پھر جیسے مجھے اردگرد کا ہوش ہی نہ رہا۔ کنپٹیاں سائیں سائیں کرنے لگیں۔ پورے وجود میں سنسنی پھیل گئی۔

جس خبر کے نہ آنے کی میں دعا مانگ رہا تھا، اب وہی [illegible] بار بار بریکنگ نیوز کے طور پر دکھائی جا رہی تھی۔

''معروف سیاسی رہنما... زبیر خان کے بیٹے... شفقت راجا کے قاتلوں کی ویڈیو کلپ آشکارا ہوگئی۔ اس ویڈیو میں آپ ممکنہ قاتلوں کے چہرے دیکھ رہے ہیں۔''

ایک میزبان نیوز ریڈر اور اینکر پرسن گویا چلاّ چلاّ کر .... بار بار یہی دہرائے جا رہا تھا۔ ''دو چہرے غیر واضح سے ہیں مگر ایک خونی قاتل کا چہرہ آپ صاف طور پر دیکھ پا رہے ہیں۔''

میری دھڑکتی نظریں سب دیکھ رہی تھیں، ویڈیو کلپ بالکل ویسا ہی تھا۔ ہم تینوں شفقت راجا کی بیٹھک سے نکل رہے ہیں۔ اول خیر اور ارشد کے چہروں کے سائڈ پوز تھے جو گاڑی میں سوار ہو رہے تھے، مگر میرا چہرہ بالکل واضح تھا، چینل نے میرا ہی چہرہ... پوری ٹی وی اسکرین پر واضح کر رکھا تھا، اس پر ''ریڈ سرکل'' بھی بار بار بلنک کر رہا تھا... مزید تفصیل بتائی جانے لگی... اسے سن کر میری تشویش زدہ آنکھیں مزید پھٹ گئیں۔

جس لڑکی نے موقع واردات کے عین وقت پر یہ فوٹیج اپنے سیل فون پر محفوظ کی تھی، وہ درحقیقت... شفقت راجا کی منگیتر خولہ تھی۔ ملتان کے بڑے زمیندار چوہدری الف خان کی اکلوتی بیٹی اور ممتاز خان کی بہن تھی، ٹی وی پر انہیں بھی دکھایا جا رہا تھا۔ گاڑی کی نمبر پلیٹ کو بھی کلوز اپ کر کے فوکس کیا گیا تھا۔ اور یہ ویڈیو کلپ بار بار دکھائی جا رہی تھی۔

دفعتاً میرے ہاتھ پر کسی کا دباؤ پڑا، اول خیر تھا... جو میرا ایک ہاتھ دبوچ کر وہاں سے کھینچ کے دوسری طرف لے گیا۔

''او... کاکا! خیر نہیں ہے۔ بات دشمنوں کے دشمن تک چلی گئی ہے، جو پہلے ہی ہم پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ بہت برا ہوگیا... ٹھہر ایک منٹ، میں پہلے استاد کبیل دادا سے بات کرلوں...'' اس نے تھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کے بعد فوراً اپنا سیل فون نکالا۔ کبیل دادا سے ساری بات تفصیل سے کہہ ڈالی۔ دوسری طرف سے کبیل دادا نے اس سے دوبارہ رابطہ کرنے کا کہہ کر بات منقطع کر لی۔ صورتِ حالات یکدم ہی ہمارے لیے بلکہ .... میرے لیے مخدوش ترین حد تک خطرناک ہوگئی تھی۔ میں گم صم سا ہوگیا تھا، مگر مجھے خود سے زیادہ اپنے دوست کی بہن شکیلہ کی فکر ہو رہی تھی، جبکہ موجودہ حالات بتا رہے تھے کہ اگر میں کھلاں والی کا رخ کرتا تو یہ بات آ بیل مجھے مار... والی مثال بن جاتی، اس لڑکی خولہ نے اس بات کی تصدیق کیے بغیر کہ اس کے منگیتر شفقت راجا کے قاتل ہم نہیں بلکہ کوئی اور تھے، ان کے بہیمانہ جرم کا سارا ملبا ہمارے بلکہ میرے سر

ڈال دیا ہے۔ اور پھر خولہ بھی کوئی معمولی لڑکی نہ تھی۔ یہ چوہدری الف خان کی بیٹی اور ممتاز خان کی لاڈلی بہن تھی، زبیر خان کا خاندان ہمارے دشمنوں کا سمدھیانہ تھا۔ جو پہلے ہی ہم پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ یہ صورتِ حالات بالخصوص میرے لیے خطرناک تھی، اول خیر نے بتایا تھا مجھے کہ کبیل دادا کو بھی اس بات پر از حد تشویش ہوئی ہے، اور اس نے کہا ہے کہ وہ ابھی چند منٹوں میں ''بیگم صاحبہ'' (مختاری بیگم) سے سارے معاملات پر مشورہ کر کے اسے فون کرے گا۔

چند منٹوں بعد کبیل دادا نے اول خیر سے رابطہ کیا اور اس سے صرف اتنا کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا کہ جتنی جلدی ہو سکے ہم کسی مسافر لاری یا کسی تیز رفتار نان اسٹاپ لگژری مسافر کوچ میں بیٹھ کر ملتان کی راہ لیں اور کسی نئی مہم پر جانے کا سوچیں ہی نہیں، وغیرہ جبکہ میرا ارادہ کچھ اور تھا۔ اب جو ہونا تھا، وہ تو ہو ہی چکا تھا۔ میں اپنی مہم کو ادھورا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا، جبکہ اول خیر نے میری بات مانی نہیں تھی، سردست میں نے چپ سادھ لی تھی مگر میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

ہم سڑک کے کنارے آگئے، پہلی بات یہ تھی کہ... میں اب اول خیر سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ مجھے گم صم پا کر اول خیر جانے کیا سمجھا، مجھ سے تشفی آمیز انداز میں بولا۔ ''پریشان نہیں ہونا کاکا۔... بیگم صاحبہ معمولی ہستی نہیں ہیں، وہ سب سنبھال لیں گی۔''

''یہ بات نہیں ہے اول خیر...'' میں نے گم صم سے مگر واضح لہجے میں کہا۔

''تو پھر...؟'' وہ یکدم چونک کر میرا منہ تکنے لگا جیسے میرے چہرے کے تاثرات بھانپنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''میں کہیں نہیں جا رہا ہوں، مگر تم واپس لوٹ جاؤ... مجھے ہر صورت کھلاں والی جانا ہے۔'' میرے اٹل اور مضبوط لب و لہجے نے اول خیر کو حیرت آمیز پریشانی میں مبتلا کر دیا۔

''او خیر کا کا... اب یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔ تیرا دماغ تو ٹھیک ہے؟ جانتے بوجھتے ہوئے بھی تو شیروں کی کچھار کا رخ کرے گا۔ نہیں، میں تجھے اس طرح دیدہ و دانستہ جلتی آگ میں نہیں کودنے دوں گا۔ تجھے میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ میں بیگم صاحبہ کو کیا جواب دوں گا؟''

''اول خیر... تیرا یا تیری بیگم صاحبہ کا مجھ پر کوئی حق نہیں بنتا۔ وہ مجھ پر کسی قسم کا حق نہیں جتا سکتیں'' میں نے یکدم بدلے ہوئے لہجے میں کہا تو اول خیر کھلے منہ کے ساتھ میرا چہرہ تکنے لگا۔ پھر بولا۔

''او خیر... کاکا۔ بڑی بات کر دی تو نے اپنے یار کے ساتھ... کیا سمجھتا ہے تو اول خیر کو...؟ میں... وہ اگر بیگم صاحب کا کارندہ ہے تو تیرا جگری دوست بھی تو ہے۔ آگ دی باؤلی وچ میں تجھے ایسے ہی کلا جانے دوں گا؟ ہرگز نہیں۔ میں تیرے ساتھ چلوں گا۔ کدھر جانا ہے تجھے؟'' وہ ایسی باتیں کر کے مجھے لاجواب کر دیا کرتا تھا۔ مگر اس بار معاملہ اور تھا، میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے اول خیر اپنے لوگوں کے زیرِ عتاب آئے... میں نے اس حوالے کے ساتھ اس سے بات کی۔

''اول خیر! اس بار بات اور ہے۔ بیگم صاحبہ کا تیرے لیے یہی حکم ہے کہ واپس لوٹ جاؤ۔''

''نہیں کاکا! کبیل دادا نے بیگم صاحبہ کا سختی کے ساتھ یہ حکم دہرایا تھا کہ... میں تمہیں بہت حفاظت کے ساتھ لے کر واپس ملتان پہنچوں بلکہ تمہیں بہ حفاظت ملتان لانے کے لیے انہوں نے کبیل دادا کو بھی ایک کار میں روانہ کر دیا ہے۔ یہ میرے لیے بہت حیرت کی بات ہے۔ کیونکہ آج تک بیگم صاحبہ نے کبیل دادا کو ایسے کسی کام کے لیے ''بیگم ولا'' سے باہر نہیں نکالا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیگم صاحبہ کی نگاہوں میں تمہاری کتنی اہمیت ہے۔ اس بات پر یقیناً کبیل دادا کو بھی حیرت ہوئی ہوگی۔ لیکن بہرحال... اب کیا کہتے ہو؟'' اول خیر نے کہا۔ ...'' بیگم صاحبہ کا میری ذات میں غیر معمولی دلچسپی لینا خود میرے لیے باعثِ حیرت ہی نہیں اب باعث الجھن بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ یہ سب الف خان والے معاملے کی وجہ سے تھا یا پھر کوئی اور وجہ... میرے پاس اب ان سب باتوں کے سوچنے کا وقت نہ تھا۔ اور صرف ایک بار میں نے میں اول خیر سے بیگم صاحبہ کے بارے میں پوچھنا چاہا تھا، مگر وہ ٹال گیا تھا۔

میں نے اول خیر سے گہری متانت سے کہا۔ ''تم کبیل دادا سے رابطہ کر کے اسے بتا دو کہ ابھی ہماری مہم نامکمل ہے، جب تک میں اپنے دوست کی بہن کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا یہاں سے ہلوں گا بھی نہیں۔''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اول خیر کے سیل فون کی بیل بجی۔

''کمیل دادا کا فون آرہا ہے۔ کیا جواب دوں اُسے، وہ روانہ ہو چکا ہوگا، ہم سے ہماری پوزیشن پوچھے گا۔'' اول خیر نے اپنے سیل فون کی اسکرین پر کمیل دادا کا نمبر پہچانتے ہوئے مجھ سے کہا تو میں نے سردمہری سے کہا۔

''اسے وہی بتادو، جو میں تمہیں بتا چکا...''

اول خیر نے کمیل دادا کی کال ریسیو کر کے بالآخر اسے میرے عزائم سے آگاہ کردیا۔

ہم سڑک کے کنارے بظاہر بس کے انتظار میں کھڑے تھے... ملتان کی اس ڈبل روڈ پر کافی ہیوی ٹریفک رواں تھی۔

''کاکا تم سے بات کرنا چاہ رہا ہے، دادا۔'' اول خیر نے چند ثانیے بعد اپنا سیل فون میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے ایک نظر اول خیر پر ڈالی اور سیل اس کے ہاتھ سے لے کر کان سے لگالیا۔

''ہیلو۔''

''شہزی! یہ تم کیا بے وقوفی کرنے جارہے ہو۔'' میرے ہیلو کہتے ہی آواز پہچان کر دوسری طرف سے کمیل دادا کی آواز ابھری۔

''کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ تم کس خطرناک سازش کا شکار ہو چلے ہو۔ تم اپنے ساتھ... اول خیر کو بھی مرواؤ گے اور ہمارے لیے بھی مصیبت کھڑی کردو گے، ابھی تمہارا مقدمہ بھی ملتان کی عدالت میں زیرِ سماعت ہے۔''

''کمیل دادا!'' میں نے گہری متانت سے کہا۔ ''تمہارا آدمی اول خیر میری طرف سے آزاد ہے۔ میں نے اسے نہیں روکا ہے، باقی میرا جواب وہی ہے جو اول خیر تھوڑی دیر پہلے تمہیں بتا چکا ہے۔''

''تم کیا پاگل ہوگئے ہو؟'' دوسری طرف کمیل دادا کی چلاتی ہوئی آواز ابھری۔ ''یہ بیگم صاحبہ کا حکم ہے، سمجھے تم۔''

''میں کسی کے حکم کا پابند نہیں ہوں کمیل دادا۔ اور ذرا اپنی آواز دھیمی رکھو۔'' میں نے سردمہری سے کہا اور سیل اول خیر کی طرف بڑھا دیا۔ اول خیر نے سیل لے کر اپنے کان سے لگایا پھر ہٹالیا۔ شاید دوسری طرف سے کمیل دادا نے رابطہ منقطع کردیا تھا۔

اول خیر نے ایک گہری سانس لے کر مجھ سے کہا۔

''دادا! ایک بار پھر سوچ لے... تجھے کیا کرنا ہے۔''

مجھے اول خیر کی یہ بات بری لگی، میں نے اس کی طرف دیکھ کر قدرے رکھائی سے کہا۔ ''اول خیر! میرا فیصلہ اٹل ہوتا ہے۔ اس میں دوبارہ سوچنے کی گنجائش نہیں ہوتی، لیکن میرا خیال ہے تمہیں سوچنا چاہیے دوبارہ۔ تمہیں واپس لوٹ جانا چاہیے۔''

پھر وہی غیروں والی گل... اب تو بھی چپ رہ... جو جی چاہتا ہے کر... میں تیرے ساتھ...''

معاً دوبارہ اس کے سیل فون کی بیل بجی، میں نے بیزاری سے کہا۔ ''یار! اب اس کو آف کردو۔''

''او خیر...! یہ تو بیگم صاحبہ کا نمبر ہے... بُرے پھنسے۔'' اول خیر نے اپنے سیل فون پر نمبر پہچانتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات عجیب ہوگئے تھے۔ میں خود بھی ذرا چونکا مگر دوسرے ہی لمحے میں بے پروائی سے سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

دھوپ خوب جم کر نکلی ہوئی تھی، پنجاب کی گرمی بڑی خشک اور چبھنے والی ہوتی ہے۔ حاجی رومال ہمارے سروں اور چہروں کو نصف حد تک ڈھانپے ہوئے تھے، گرم ہوا کے تھپیڑے چلنے لگے تھے، مگر ہم نے چہرے... ڈھانپ رکھے تھے۔

مجھے اول خیر کی انتہائی مودبانہ انداز میں آواز سنائی دی۔

''جی بیگم صاحبہ! میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اچھا... اچھا... جی... جی۔ بالکل... بات کریں۔''

''یہ لے کاکا! بیگم صاحبہ تجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔'' کہتے ہوئے اس نے سیل فون میری طرف بڑھادیا۔ میرے چہرے پہ سخت قسم کی بیزاری کے آثار تھے۔ میں نے سیل فون لے کر کان سے لگایا۔

''جی بیگم صاحبہ! میرے یہ کہتے ہی دوسری جانب سے بیگم صاحبہ کی مترنم سی نرم آواز ابھری۔

''شہزاد... مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ میں تمہارے ذاتی معاملات میں دخل دوں لیکن...'' اس نے کچھ توقف کیا۔ میں خاموشی سے سن رہا تھا اس کی بات۔ دوبارہ اس کی آواز آئی ''......تمہاری حیثیت ہمارے کارکن کی نہیں، دوست کی سی ہے۔ اور اس دوستی کے ناتے ہی میں تم سے بات کررہی ہوں، اسے حکم نہیں سمجھنا......جو کچھ تم کرنے جارہے ہو، بے شک یہ تمہارے سچے نیک عزم کی دلیل ہے مگر انسان کو اپنی حفاظت کے بارے میں بھی سوچنے کا حق ہے، اس ناتے میرا دوستانہ مشورہ ہے تمہارے

لیے... کہ تم... ابھی واپس لوٹ آؤ، میرے آدمی یہ کام کردیں گے۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔ اول خیر نے جب سیل فون مجھے تھمایا تھا تو اس نے دانستہ سیل فون کا... اسپیکر آن کردیا تھا۔ وہ ساری گفتگو جو بیگم صاحبہ نے مجھ سے کی تھی، وہ اس نے بھی سنی تھی۔

بیگم صاحبہ کی بات اور اندازِ مخاطب نے مجھے ازحد متاثر کیا تھا۔ ورنہ تو میں سمجھ رہا تھا کہ وہ بھی کمیل دادا کی طرح میرے ساتھ تحکمانہ رویہ اختیار کرے گی، لہٰذا میں نے نرمی اور احترام سے کہا۔

''بیگم صاحبہ! آپ نے دوستوں والی بات کہہ کر میری بڑی عزت کی ہے، میں اس کے لیے آپ کا تہِ دل سے مشکور ہوں، درحقیقت میری فطرت میں ... کسی کی غلامی یا کسی کا کارپرداز بننا شامل نہیں ہے۔ میں آزاد پیدا ہوا ہوں اور آزاد زندگی گزارنے کا قائل ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو... حاجی صاحب کے انتقال کے بعد اطفال گھر میں جس قسم کے حالات پیدا ہونے لگے تھے، میں ان کے خلاف بغاوتِ علم بلند نہ کرتا اور آج میں یوں دربدر ہونے کے بجائے... چوہدری ممتاز کے آلۂ کار کی حیثیت سے بڑی عیاشانہ زندگی بسر کررہا ہوتا... رہی بات میرے مقصد کی، تو اس کو حاصل کرنے کا یہی وقت ہے، جو میں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔''

میری بات ختم ہوئی تو دوسری جانب لمحے بھر کو پھر سوچ میں ڈوبی خاموشی چھائی رہی پھر دفعتاً ہی مجھے دوسری جانب سے بیگم صاحبہ کی کچھ اس طرح کی بڑبڑاتی آواز سنائی دی جو شاید ان کے دل کی آواز تھی۔

''بالکل ویسے ہی ہو... تم... ذرا بھی فرق نہیں، ویسے ہی خوددار، جی دار، اور دلیر... اپنے مقصد میں... اپنے عزائم میں پختہ اور سچے...''

''جی... جی... بیگم صاحبہ میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہہ رہی ہیں۔'' میں نے قدرے گڑبڑا کر کہا تو یکدم جیسے دوسری جانب سے بیگم صاحبہ نے خود کو سنبھالا ہو۔

''...پپ... پتا نہیں... کچھ نہیں... کیا کہہ گئی میں... میرا مطلب تھا... تم ایک بہادر نوجوان ہو... اگر تم نے پختہ عزم کر ہی لیا ہے تو تھوڑا انتظار کرلو... میں اپنے آدمی کھلاں والی بھیج رہی ہوں تمہاری مدد کے لیے۔''

''نہیں بیگم صاحبہ! آپ کا شکریہ۔ آپ کا ایک آدمی اول خیر میرے ساتھ ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہی میرے لیے کافی ہے۔ زیادہ لوگوں کے شامل ہونے سے میرا مشن متاثر ہوسکتا ہے۔ آپ بھی میری کامیابی کے لیے دعا کریں۔ خدا حافظ!''

بات ختم کر کے میں نے سیل فون دوبارہ اول خان کو تھمادیا۔ اس نے فوراً سیل فون میرے ہاتھ سے لے کر اپنے کان سے لگایا لیکن شاید دوسری طرف سے بیگم صاحبہ نے بھی رابطہ منقطع کردیا تھا۔ وہ بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا... وہاں گمبھیر اور اسرار بھری سوچوں کے سائے چھپلے ہوئے تھے۔

یقیناً... میری طرح اول خان بھی سوچ میں پڑ گیا تھا کہ آخر بیگم صاحبہ... کا میرے ساتھ... کیسا پُراسرار معاملہ تھا؟ وہ میرے ساتھ... باتیں کرتے ہوئے کچھ عجیب سی ہوجایا کرتی تھی۔

''او خیر... شاید بات کچھ کچھ سمجھ میں آتی ہے۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا تو میں بدستور اس کی چہرے کی طرف تکتے ہوئے قدرے چونک بولا۔

''کیا... کیا بات تمہیں سمجھ میں آرہی ہے، اول خیر؟''

''آں... ہاں... ک... کچھ نہیں۔'' وہ جیسے خیالات کے بھنور سے ابھرا تو میں نے پوچھا۔

''یار اول خیر... آخر یہ تمہاری بیگم صاحبہ ہے کیا شے؟ تم نے ابھی تک مجھے ان کے بارے میں نہیں بتایا کچھ...؟''

''بتادوں گا' بتادوں گا۔'' وہ ٹالنے کے انداز میں بولا۔

''دیکھ اول خیر... ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہیں۔ بے شک مجھے تمہارے ماضی کے بارے میں علم نہیں، مگر میں نے آج تک اپنے بارے میں تم سے کچھ نہیں چھپایا... بس! میرے دل نے تمہیں سچا یار مان لیا سو مان لیا...''

''او خیر...'' کہتے ہوئے اول خیر نے مسکرا کر میرا شانہ تھپتھپایا۔ ''بے شک میرے یار!... تو تو میرا جگری ہے شہزی کاکا! لہٰذا میں تجھ سے کیا چھپاؤں گا۔ میرا اپنا ماضی کچھ زیادہ قابلِ فخر نہیں... مگر بیگم صاحبہ کی تو پوچھتا ہے تو میں تجھے ضرور ایک دن بتاؤں گا ان کے بارے میں بھی

اور اب تو مجھے بتانا ہی پڑے گا... لیکن اس کے لیے ایک وقت چاہیے۔ پُرسکون اور لمبا وقت...''

میں مسکرا دیا اور بولا۔ ''چل چھوڑ پھر اس بات کو اب یہ بتا... کھلاں والی کے لیے تانگا لیا جائے؟''

''بالکل۔'' اس نے کہا اور پھر ہم ایک تانگے میں سوار ہو گئے۔

☆☆☆

کھلاں والی ملتان روڈ کی دوسری طرف تھا اور یہ وہی نیم پختہ سا راستہ تھا جو اس منحوس بیٹھک تک جاتا تھا، جہاں کل خوں ریزی ہوئی تھی، اول خیر نے ذرا آگے چل کر تانگے والے سے راستہ بدل کر دوسری طرف سے بازار کی طرف چلنے کو کہا۔

ہمیں دور سے ہی بیٹھک کی جانب لوگوں کا ہجوم نظر آ رہا تھا۔

کچھ دور جا کے ہم تانگے سے اتر گئے۔ ارد گرد کا جائزہ لیا۔ بازار بند پڑا تھا۔ دیگر چھوٹی موٹی دکانوں کا بھی یہی حال تھا۔ یقیناً ایسا سوگ کی وجہ سے تھا۔

بازار سے علاقے کی ویرانی دیکھ کر ہمیں اپنے پہچان لیے جانے کی تشویش ہونے لگی۔ بے شک اس وقت ہم آگ کے ایسے دریا میں کود پڑے تھے، جو ایک طرح سے ہماری ہی لگائی ہوئی تھی۔ چند مقامی لوگوں ہی کی آمد و رفت نظر آتی تھی۔ ہم آگے بڑھے اور پھر یونہی منرگشت کے انداز میں اِدھر اُدھر تھوڑی دیر تک گھومتے پھرتے رہے۔ یہاں ہمیں کیا کرنا تھا۔ اس سلسلے میں اول خیر اور میں تبادلہ خیال کر چکے تھے۔ مگر یہ درست تھا کہ اس سلسلے میں ہمارے ذہن میں کوئی واضح لائحہ عمل نہ تھا، اور ہوتا بھی کیسے...؟ شفقت راجا ہی نہیں اس کے قریبی حواری بھی قتل ہو چکے تھے، جو لڑکیوں کے بارے میں جانتے تھے یا جنہوں نے ان معصوموں کا چنی بائی سے سودا وغیرہ کیا تھا۔ اب ہم کسے پکڑ کر پوچھتے۔ رہی بات شفقت راجا کے باپ زبیر خان کی، اس سے جا کر ہم نہیں پوچھ سکتے تھے کہ آپ کے فرزند ارجمند جو اَب آنجہانی ہو چکے ہیں، اور شاید انہیں مظلوم، بے گناہ اور شریف زادیوں کا سودا کرنے کے پاداش میں خدا کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آئی تھی کہ اس نے شکیلہ کو کہاں قید میں رکھا ہوا ہے۔ پہلے تو وہ میری شکل پہچانتے ہی میری گردن ناپ لیتا اور بعد میں میرے سوال کا جواب دیتا بھی کہ نہیں۔

چنی بائی وغیرہ کے کہنے کے مطابق زبیر خان اس دھندے میں ملوث نہ تھا، ممکن ہے باپ کو بیٹے کے اور بیٹے کو باپ کے کرتوتوں کا علم نہ ہو۔ دفعتاً ایک آواز پر میں چونک گیا۔ وہ کسی گاڑی کی آواز تھی۔ مجھ سمیت اول خیر نے بھی بیک وقت مڑ کر دیکھا اور فوراً دکان کے ایک تھڑے کے قریب ہو گئے، وہ کار نئے ماڈل کی تھی۔ اس کی رفتار درمیانی تھی مگر بیچ بازار میں یہ بھی بہت تیز محسوس ہوئی تھی، میں نے فوراً کسی خطرے کے پیشِ نظر اپنے رومال کو درست کیا، کار ہمارے قریب سے گزر گئی، یہ نیلے رنگ کی ہنڈا سٹی تھی۔ اندر مجھے چند خرانٹ صورت بڑی بڑی مونچھوں والے افراد نظر آئے تھے۔ ان کے سینوں سے ذرا اوپر گنز جھانک رہی تھیں، یقیناً ان کا تعلق زبیر خان سے ہی ہو سکتا تھا وہ علاقے کی ایک بھاری بھرکم شخصیت تھی۔

کار تو گزر گئی مگر ہم ایک اور منظر دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گئے۔ کار کے پیچھے اڑتے گرد و غبار سے کوئی حواس باختہ سایہ نمودار ہوا۔ یہ کوئی عمر رسیدہ عورت تھی جس کے بکھرے بال مٹی دھول سے اٹے پڑے تھے، حالت بھی اس کی ناگفتہ بہ تھی، میلے چیکٹ کپڑے۔ وہ گرتی پڑتی، پاگلوں کی طرح غالباً کار ہی کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہی تھی۔ کار تو اب نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی، اور اس پر میں نے اور اول خان نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔ مگر اس ادھیڑ عمر عورت کی موجودگی ہمارے لیے باعثِ الجھن تھی۔ وہ ہمارے قریب سے گزرتی ہوئی گر پڑی۔ وہ کپکپاتی آواز میں چلا رہی تھی۔ ''ظالمو... خدا کا تم پر قہر پڑے... میری معصوم جیراں... کو کھا گئے تم...'' اس کے ہاتھ میں پتھر بھی تھے، جو وہ پھینکتی جا رہی تھی، مگر کار تو پتھروں کی زد سے تو کیا نظروں کی زد سے بھی دور جا چکی تھی۔

''شاید بے چاری کوئی پاگل عورت ہے، آگے بڑھ کاکا!'' اول خیر نے میرے کان میں سرگوشی کی، مگر شاید اس نے اس عورت کی بات پر غور نہیں کیا تھا، جس نے مجھے اندر سے پہچان لیا تھا۔

دھوپ و گرمی اور تپتی ہوئی زمین پر یہ مصیبت اور غموں کی ماری عورت اب بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس میں اب اٹھنے کی تو کیا بولنے کی بھی سکت باقی نہ رہی تھی، نجانے کتنی دور سے وہ اس کار کے تعاقب میں دوڑی چلی آ رہی تھی اور اب بالآخر بے دم ہو کر گر پڑی تھی۔ میں ابھی اس کی طرف بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک ایک پکی عمر کے آدمی کو لنگی اور کرتے میں دوڑتے آتے دیکھا... وہ شاید اسی ادھیڑ عمر کی عورت کے تعاقب میں تھا۔ اس کی...

حالت بھی ایسی ہی تھی، جیسی کسی غریب کی ہو سکتی تھی۔ پریشانی اور دکھ سے اس کا چہرہ کُستا ہوا تھا۔ اس عورت کے قریب پہنچ کر وہ بھی نڈھال سا ہو کے اس کے قریب ہی گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا اور اسے سنبھالتے ہوئے سسکنے کے انداز میں بولا۔

''اری، جیراں کی ماں! ان ظالموں کے پیچھے ایسے نہ پڑا وہ تجھے بھی مار ڈالیں گے؟''

میں نے ان کے قریب پہنچنے میں دیر نہیں لگائی اور اس کمزور سے آدمی کو سہارا دینے لگا۔ وہ چونک کر گردن گھما کے میری طرف دیکھنے لگا۔

اول خیر کو میں نے اشارہ کیا۔ وہ عورت کو سنبھالنے لگا۔ پھر ہم دونوں کو سنبھالے ہوئے اس بند دکان کے چبوترے پر لے آئے جس پر چھپر کا سائبان ایستادہ تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر مجھے پانی ایسی کوئی شے کہیں بھی نظر نہ آئی، وہ بازار بند تھا۔ آدمی کو سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے میں خود بھی اس کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا اور بولا۔

''چاچا! کیا معاملہ ہے؟ یہ بے چاری دکھی عورت کون ہے؟'' میرے استفسار پر وہ بے چارہ بند دکان کی دیوار سے کمر لگا کر بیٹھ گیا اور جواباً بے حال سی آواز میں بولا۔

''کیا بتاؤں بیٹا! جہاں فرعون پیدا ہو جائے، وہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔''

''یہ تمہاری گھر والی ہے؟''

''ہاں پتر...! یہ بدنصیب میری گھر والی ہے۔''

''یہ لوگ کون تھے، جن کی کار کے پیچھے...'' میرا سوال ادھورا رہ گیا، کیونکہ اس دوران بوڑھے نے ایک غمزدہ آہ... بھری تھی۔

''کیا پوچھتے ہو پتر! اور کیا تمہیں بتاؤں؟ پھر وہ اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا، وہ ہنوز بے حال تھی۔

''یہ زندہ تو ہے نا؟'' ایک مجبور سی آواز میں اس نے اول خیر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ اس عورت کو اس نے ہی سہارا دے رکھا تھا۔

میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے، اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، دفعتاً ایک گدھا گاڑی آتی دکھائی دی۔ ایک نوعمر لڑکا گدھے کی باگیں تھامے ہوئے تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ اس نے گدھے کی رسی کھینچ لی۔ میں چبوترے سے اتر کر اس کی طرف بڑھا۔

''سواری لے کر چلنا ہے۔'' میں اس سے پوچھا۔

اس نے جھٹ اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں پلٹا اور بوڑھے سے بولا۔

''چاچا! تمہارا گھر کہاں ہے، چلو تمہیں ہم چھوڑ دیں تمہارے گھر۔'' وہ بوڑھا کھڑا ہوا۔ اول خیر نے اس کی عمر رسیدہ بیوی کو سہارا دے کر اٹھایا۔ بوڑھے نے گدھا گاڑی والے کو کچھ بتایا۔ لڑکے نے سر کے اشارے سے انہیں بیٹھنے کو کہا۔ پھر ہم بھی ان دونوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اول خیر نے مجھ سے کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ اب تک شاید وہ سمجھ چکا تھا جو میں چاہ رہا تھا۔

گدھا گاڑی کے سفر کے دوران میں گرد و پیش پر بھی نظر ڈالتا رہا۔ بازار ختم ہونے کے بعد کچے پکے اونچے نیچے گارے مٹی کی دیواروں والے گھروں کا سلسلہ شروع ہوا، پھر کھیتوں کے درمیان سے گزرنے لگے، آگے ایک خشک برساتی تالاب تھا، اس کے اندر سے گدھا گاڑی گزری، وہ دوسری جانب ابھری تو ایک سوکھے درخت کے نیچے سرکنڈوں کا جھونپڑی نما گھر دکھائی دیا۔ بوڑھے نے اسی جگہ لڑکے کو گدھا گاڑی روکنے کا کہا۔ ہم نیچے اترے، پھر میں نے اول خیر کی طرف دیکھا۔ وہ اشارہ بھانپ کر فوراً اپنی جیب سے کچھ نکالنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹے بڑے نوٹ تھے، میں نے چند نوٹ لیے اور پچاس کے نوٹ لڑکے کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ تمہارا کرایہ ہے۔ اگر تم میرا ایک کام اور کر دو تو زیادہ بھی ملیں گے؟''

ظاہر ہے کرایہ لڑکے کی سوچ سے زیادہ تھا۔ پچاس کے نوٹ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھری تھی، جھٹ سے وہ لے کر بولا۔ ''کہو جی... اور کیا کام ہے؟''

''کہیں سے ٹھنڈا پانی اور کچھ کھانے کا سامان لے آؤ تو۔''

''ابھی حاضر کرتا ہوں جی، آپ فکر نہ کرو۔''

''مگر بازار تو سارا بند ہے، تم کہاں سے لاؤ گے؟''

''اُدھر جی، روڈ پر اسٹور کھلے ہیں۔ وہاں سے لے آؤں گا، اپنا ہی اسٹور ہے۔'' وہ بولا۔

''شاباش! جلدی سے ٹھنڈے پانی کی تین چار بوتلیں اور کیک بسکٹ لے آؤ، بعد میں پیسے دیتا ہوں، تمہاری خرچی الگ سے ہو گی۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ اس نے اپنا اسٹور کہا تھا، میں سمجھ گیا تھا، اس کے جاننے والے کا ہو گا۔ اس لیے اسے پہلے پیسے نہیں تھمائے، وہ بھی خوش تھا۔ فوراً اپنا گدھا روڈ کی طرف دوڑا دیا۔

میں حیران پریشان کھڑے بوڑھے کی طرف متوجہ ہوا۔ ''چاچا! میں نے تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کی چیزیں منگوائی ہیں۔ کیا تم ہمیں تھوڑی دیر کے لیے اندر اپنے گھر میں آنے دو گے؟''

''کیوں نہیں پتر! آؤ آؤ...'' وہ بولا۔ پھر ہم ٹاٹ جھولتے دوازے سے اندر داخل ہو گئے۔

وہاں بجلی کا کوئی دخل نہ تھا۔ بڑی کسمپرسی کا عالم تھا۔ البتہ اندر کا ماحول نسبتاً ٹھنڈا تھا۔ ایسا شاید کچی اور چھپر دار دیواروں کی وجہ سے تھا۔ جس کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ دو چھلنگا سی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ صحن چھوٹا سا تھا۔ پاگل سی عورت کو ایک چارپائی پر لٹا دیا گیا۔ جبکہ بوڑھا دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اول خیر نے بیٹھنے کے لیے دوسری چارپائی کی پٹی سنبھال لی جبکہ میں بوڑھے کے ساتھ پائنتی کے قریب بیٹھ گیا۔

''تم دونوں کون ہو؟ اس پنڈ کے تو نہیں لگتے۔'' بوڑھا ہم دونوں کی طرف تکتے ہوئے بولا۔ ہم نے رومال ہٹا دیے تھے اور اپنا پسینا پونچھنے لگے۔ بوڑھا کب ٹی وی دیکھتا ہوگا، جو میرا چہرہ پہچانتا... خیر میں نے جواباً کہا۔

''آپ نے ٹھیک کہا چاچا! ہم دونوں اوکاڑہ سے آئے تھے یہاں ایک دوست سے ملنے، وہ نہ ملا، اب واپس جا رہے تھے۔ پھر سنا کہ یہاں کوئی واردات شاردات ہو گئی ہے اس لیے بازار بند تھا سارا!''

''آہو پتر۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''سیر کو سوا سیر پڑ ہی جاتا ہے، پتر!'' وہ جیسے اپنے دل کے پھپولے پھوڑنے لگا۔ ''ظلم کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ خدا کی بے آواز لاٹھی بھی حرکت میں آتی ہے۔ اب مرنے والے کے لیے کیا کہا جائے مگر زبیر خان کے پترے (بیٹے) نے بھی پنڈ والوں پہ کم ظلم نہیں ڈھائے تھے۔ ایک ہی بیٹا تھا وہ بھی بگڑا ہوا، کم تو اس کا باپ بھی نہیں مگر وہ ذرا سیاست سے چلتا ہے۔ لیکن پترے کی تو بات ہی اور تھی۔ شفقت راجا نے پنڈ کے شرفا اور غربا کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔''

''مگر ابھی ہونے والے الیکشن میں تو دونوں باپ بیٹا جیت چکے ہیں۔'' اول خیر نے پہلی بار لب کشائی کی۔ ''یہ لوگ اتنے ہی ظالم ہیں تو... پھر بار بار ایک ظالم کو ووٹ دے کر کامیاب کیوں کرتے ہو؟''

بوڑھے نے اول خیر کی طرف دیکھا پھر تلخ سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ''تو نے بھی خوب کہی پتر! ایسے تیرا ناں (نام کیا ہے)؟''

میں نے اول خیر کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔ اس نے اشارہ سمجھ کر اپنا غلط نام بتایا۔

''او دیکھ پتر! لگتا ہے تو نے بہت عرصہ شہر میں گزارہ ہے۔ پنڈ دیہات کا تمہیں تجربہ نہیں، یہ جو دولت، جاگیر اور اثر و رسوخ ہوتا ہے ناں یہ کسی کو یا تو فرعون بنا دیتا ہے یا پھر خدا! یہ ساری جاگیر... زبیر خان کی ہے۔ وہ بادشاہ ہے اور ہم اس کی رعایا۔ وہ غلط بھی ہوگا تو سچا ہوگا۔ کسی کو جرأت نہیں ہے کہ اس کے خلاف آنکھ اٹھانا تو دور کی بات ہے، سرگوشی میں بھی کوئی ان کے خلاف کچھ نہیں بولتا۔ کچھ لوگوں نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی تھی، ان کا انجام ہم سب پنڈ والوں نے دیکھ لیا تھا۔ اب تو بس ہر کوئی ان کے آگے سے سر جھکائے اور ہاتھ باندھے ہی گزرتا ہے۔ اور پھر یہ شفقت راجا... توبہ توبہ، باپ سے بھی چار ہاتھ آگے تھا۔ اس نے تو لوگوں کی عزتوں پر ہاتھ ڈالنا شروع کر دیا تھا... میری جیراں بھی...''

وہ یکدم روہانسا ہو گیا اور آواز میں رقت اتر آئی۔ جیراں شاید اس کی بیٹی تھی پھر بھی میں نے پوچھا۔

''چاچا! یہ جیراں کیا تمہاری بیٹی تھی؟''

''ھک ہی کڑی سی میری... ہیریاں والی۔'' (ایک ہی بیٹی تھی میری ہیرے جیسی) اس بار وہ پاگل سی عورت سسک کر یکدم بولی۔

''پھر اس فرعون شفقت راجا نے اسے اٹھوا لیا... دو دن گزرے۔ اس غیرتاں والی کڑی نے اپنی نس کاٹ کر جان دے دی۔ مسجد کے پاس والی کچی باؤلی کے پاس اس کی لاش ملی تھی۔'' وہ عورت رو رو کر بتانے لگی۔ ''جس دن میں نے وڈے سائیں کے پتر نہیں... فرعون دے پتر شفقت راجا کے قتل کی خبر سنی تو میرا کلیجا ٹھنڈا ہو گیا۔ میں تو آج بھی اپنی جھولی اٹھا کر ان کو بددعا دیتی ہوں۔ گریب کی آہ... عرش کو ہلا دیتی ہے۔''

''چل چل... ھن بس کر جیراں دی ماں!'' بوڑھا اپنے آنسو پونچھ کر بیوی سے بولا۔ ''یہ جیراں کے غم میں پاگل ہو جاتی ہے۔ جب بھی زبیر خان یا شفقت راجا کے آدمیوں پر نظر پڑتی ہے، پاگلوں کی طرح ہنس ہنس کر ان سے کہتی پھرتی ہے۔ ''میری ہیراں والی دھی... جیراں کا انتقام میرے رب سوہنے نے لے لیا۔ وہ تمہیں بھی نہیں چھوڑے گا۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ اس جھلی کی حرکت کی وجہ سے وہ اسے بھی نہ نقصان پہنچا دیں غصے میں آ کر۔''

اول خیر نے بوڑھی عورت کو دلاسے تھپکیاں دے کر

لٹا دیا چارپائی پر... میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

''کمال ہے چاچا! یہاں کے کیسے لوگ ہیں؟ شفقت راجا اگر ان کی عزتوں کے لیے خطرہ بنا ہوا تھا تو پھر...'' میں رک گیا۔ مجھے اپنا سوال فضول ہی لگا۔ وہ کہہ تو چکا تھا کہ وہ لوگ کس طرح ظلم و جبر کی چکی میں پسے ہوئے تھے، غربت اور مجبوری ہی درحقیقت ان کا جرم تھی۔ یہاں مجھے زیردست سے زبردست کا وہی پرانا چکر چلتا ہوا محسوس ہوا تھا جو میں اطفال گھر میں دیکھ چکا تھا اور یہی میری زندگی کا وہ ناقابلِ برداشت منظر تھا، جو میں کبھی قبول نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اپنا سوال ادھورا چھوڑ دیا اور اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ''چاچا! ایک بات بتاؤ، میں نے سنا ہے کہ... یہ شفقت راجا عورتوں کا بیوپاری بھی تھا؟''

''ہاں پتر... یہ تو یہاں سبھی کو معلوم ہے۔'' وہ بولا اور مجھے پھر حیرت کا جھٹکا لگا۔

''چاچا، اب تو شفقت راجا اپنے انجام کو پہنچ ہی گیا ہے۔ اب شاید ایسا نہ ہو... لیکن اس کے مرنے کے بعد .... ان معصوم لڑکیوں کا کیا بنے گا... جو اس کی قید میں ہوں گی؟''

میری بات پر بوڑھے نے پہلی بار چونک کر میرے چہرے کی طرف دیکھا، پھر اول خیر کی طرف...

''تم دونوں مجھ سے کچھ نہیں چھپاؤ، ڈرنے کی ضرورت نہیں مجھ سے، مجھے سچ سچ بتاؤ تم دونوں یہاں کھلاں والی کس مقصد کے لیے آئے ہو؟'' بوڑھے کی بات پر میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا اور ایک نظر اول خیر پر ڈالنے کے بعد بوڑھے کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ملائمت سے کہا۔

''چاچا! تو تم نے ٹھیک ہی سمجھا۔ ہم دونوں شاید ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ ہم یہاں ایک لڑکی کی تلاش میں آئے ہیں۔ وہ میرے دوست کی بہن ہے، اور شریف زادی ہے۔ اسے زبردستی اغوا کیا گیا تھا، ہمیں پتا چلا کہ وہ شفقت راجا کے قبضے میں ہے۔ مگر یہاں اس کی تلاش میں پہنچے تو پتا چلا شفقت راجا ہی دنیا میں نہیں رہا۔''

''ذرا ٹھہر پتر!'' بوڑھے نے یکدم مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر چارپائی سے اٹھ کر دروازے تک گیا اور باہر نکل گیا۔ میں اور اول خیر... اس کی اس حرکت پر گھبرا سے گئے، ابھی ہم اٹھنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ وہ اندر داخل ہوا، اس کے انداز و اطوار سے رازداری جھلک رہی تھی۔ پھر وہ میرے قریب چارپائی پہ آ کر بیٹھ گیا اور دھیمی آواز میں بولا۔

''ذرا آہستہ بات کرنا ویسے ڈرنے کی ضرورت نہیں، یہاں کوئی آتا جاتا نہیں ہے۔ یہ کھولی بھی دور بنی ہوئی ہے، اس کے پیچھے پرانا قبرستان ہے۔ سامنے کھیت ہے۔ دائیں بائیں میدان اور ریت کے سوا کچھ نہیں۔'' وہ ذرا خاموش ہوا۔ اب اس کے یکدم اٹھ کر باہر جانے کا مقصد ہماری سمجھ میں آیا تھا۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے گیا تھا کہ کہیں باہر کوئی کھولی کے قریب یا آس پاس موجود تو نہ تھا۔ میں نے اور اول خیر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مطمئن انداز میں سر ہلا دیے۔

''دیکھ پتر...'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ''اب مرنے والے کے بارے میں کیا کہا جائے مگر حقیقت یہی ہے کہ پنڈ والے شفقت راجا کے قتل پر اندر ہی اندر خوش بھی ہوئے ہوں گے اور جو کالا دھندا کرتا تھا، اس کی موت کے ساتھ ہی سمجھو ختم ہو گیا۔ مگر رہی تمہاری بات کہ تم اپنے ایک دوست کی بہن کو تلاش کرنے کے لیے آئے ہو، تو اس سلسلے میں، میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں'' اتنا کہہ کر تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوا۔ میرے اندر امید جاگی اور بے اختیار دل ہی دل میں اللہ کی اس مصلحت پر اش اش کر اٹھا کہ بے شک سیدھی اور نیک راہ پر چلنے والوں کے لیے اللہ راستے بھی خود ہی آسان کرتا ہے۔

میں اور اول خیر... بوڑھے کی بات پر پوری طرح گوش برآواز ہو گئے۔

''شفقت راجا کے ساتھ اس کے وہ سب قریبی ساتھی بھی سمجھو جہنم واصل ہو گئے ہیں، مگر ایک ساتھی اس کا شدید زخمی ہونے کے باوجود زندہ بچ گیا ہے، اور میں اس اتفاق پر حیران ہوں کہ یہ آدمی بھی... شفقت راجا کے اس کالے دھندے کے حوالے سے بہت خاص آدمی تھا اس کا۔ اس کا نام مختار خان تھا اور اسی نے میری معصوم جیراں کو بھی اٹھایا تھا۔''

اپنی بیٹی کا ذکر کرتے ہوئے اس غریب کی بوڑھی آنکھیں اور کپکپاتا لہجہ بھی بھیگنے لگا تھا مگر وہ رکا نہیں، آگے بولتا رہا۔

''مختار خان، عرف مختارا... جانتا ہے کہ کون سی لڑکی اس وقت کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں کہ وہ ابھی چلنے پھرنے اور بولنے کے قابل نہیں، پولیس بھی اس سے کوئی بیان نہیں لے سکی ہے۔ پتا نہیں کہ بچتا ہے

کہ نہیں مگر پتر ! اس کا بچنا ضروری ہے۔'' وہ خاموش ہوا تو میں نے اپنی پُرسوچ نظریں گویا ایک ایسے غیر مرئی نقطے پر جمادیں جیسے مجھے وہاں کوئی تحریر لکھی نظر آرہی ہو، شاید یہ میرے شعور کی جھلک تھی وہ جو قبل از وقت مجھے خبردار کردیتی تھی اور میں کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہنے لگا۔

''چاچا، اللہ کا کوئی کام بھی مصلحت سے خالی نہیں ہوتا، نامعلوم دشمنوں کی فائرنگ سے شفقت راجا سمیت اس کے سارے قریبی حواری مارے گئے، مگر مختار خان بچ گیا۔ اسے شاید اللہ نے ہماری مدد کے لیے ہی بچایا ہے تو وہ اب اسپتال میں نہیں مرے گا ہمیں بتا کر مرے گا کہ شکیلہ اور دیگر اغوا کی ہوئی معصوم لڑکیاں کہاں پر ہیں؟''

میرے فلسفیانہ لہجے پر بوڑھے سمیت اول خیر بھی حیرت سے میرا پرسوچ چہرہ دیکھنے لگے۔ میں نے فوراً بات آگے بڑھائی اور بوڑھے سے پوچھا۔'' چاچا تم ہماری کیا مدد کرسکتے ہو۔ کیونکہ فی الحال تو مختار سے ہم نہ مل سکتے ہیں اور نہ ہی اس سے کچھ پوچھ سکتے ہیں۔'' میرے استفسار پر وہ اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔

''ہاں اچتر ! بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے۔ تم اگر کسی طرح فارم ہاؤس والے جنگل ڈیرے کا ایک چکر لگا کر دیکھو تو بہت کچھ حاصل کرسکتے ہو۔''

''فارم ہاؤس والا جنگل ڈیرا؟'' میں زیرلب بڑبڑایا اور سوالیہ نظروں سے بوڑھے کی طرف دیکھنے لگا تو اول خیر نے پوچھا۔

''کہیں یہ وہ جگہ تو نہیں، جہاں اغوا یا خریدی ہوئی عورتوں کو رکھا جاتا تھا؟''

''ہاں پتر...'' بوڑھے نے فوراً اپنے سر کو اثبات میں ہلایا۔

''یہی وہ جگہ ہے یا اسے تم شفقت راجا کا ایسا خفیہ اڈا بھی کہہ سکتے ہو، جہاں اس طرح کے معاملات طے کیے جاتے تھے۔ مگر اس طرف کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ پنڈ کے کئی لوگوں نے بے خیالی میں وہاں سے گزرنے کی کوشش کی تھی مگر انہیں ڈرا دھمکا کر بھگا دیا گیا۔ انہی لوگوں کے ذریعے مجھے اس مقام کا پتا چلا تھا... اپنی جیراں کو تلاش کرنے میں ایک رات چوری چھپے اس طرف گیا تھا میں فارم ہاؤس کے اندر داخل ہونے میں کامیاب بھی ہوگیا تھا۔ جھاڑیوں کی گھنی باڑھ کے عقب میں چھپ کر میں نے فارم ہاؤس کی عمارت دیکھی تھی وہاں جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ بدمعاش وہاں کھڑی تھیں، جنگلی شکاری کتے غراتے ہوئے ادھر اُدھر منڈلا رہے تھے، ان کے ساتھ شفقت راجا کے مسلح کارندے بھی تھے، مجھے کچھ باہر کے لوگ بھی نظر آئے۔ میں نے وہاں بہت تفصیل کے ساتھ ان کی... ساری کارروائی دیکھی تھی۔ وہاں کوئی وڈا چوہدری بھی آیا ہوا تھا، کسی دوسرے شہر سے۔ اس کی بڑی آؤ بھگت کی جارہی تھی، ایک بڑی سی گاڑی تھی اور وہاں عورتیں اور لڑکیاں بھی نظر آرہی تھیں، ان میں کچھ تو پیشہ ور دکھائی دے رہی تھیں، کچھ ڈری سہمی ہوئی تھیں، ان لوگوں کی باتیں سننے کے لیے میں تھوڑا ان کے قریب ہوا، کتوں کا بھی مجھے خوف تھا۔ میری بے تاب نظریں اپنی بیٹی جیراں کو تلاش کررہی تھیں، مگر ابھی تک وہ مجھے نظر نہیں آئی تھی، میں ہمت کرکے اور گھنی جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا اور آگے پہنچا۔ شفقت راجا اور وہ چوہدری آپس میں قہقہے لگا رہے تھے، گوشت بھونا جارہا تھا، اور... شراب بھی چل رہی تھی، ان کی باتوں کے دوران مجھے پتا چلا کہ وہ چوہدری نئے پنڈ کا چوہدری الف خان کا بیٹا... چوہدری ممتاز تھا۔'' بوڑھا اتنا کہہ کر رکا... الف خان اور ممتاز خان کے نام پر میں چونک اٹھا۔ میری اور اول خیر کی نظریں معنی خیز انداز میں چار ہوئیں۔ اول خیر نے ہولے سے نفی میں اپنے سر کو جنبش دی، میں اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ چوہدری ممتاز سے متعلق ابھی کوئی بات نہ کرو، اور اس بوڑھے کی میسر حاصل معلومات سے سردست استفادہ کرتے رہو۔

بوڑھے نے اپنی بات آگے بڑھائی۔'' وہ دونوں شیطان اغوا کی ہوئی لڑکیوں کے سودے کی باتیں کررہے تھے... اس دوران میں نے شفقت راجا کی زبانی یہ بھی سنا تھا کہ کچھ لڑکیاں اس علاقے سے تعلق رکھتی ہیں، وہ انہیں پہلے یہاں سے رخصت کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ سن کر میرے کان کھڑے ہوگئے، یقیناً ان میں جیراں بھی ہوگی۔ مگر معاملہ ابھی طے نہیں ہوپایا تھا۔ چوہدری ممتاز نامی وہ شخص دوسری بار لڑکیوں کی کھیپ لے جانے کا وعدہ کرکے گیا جو پہلی کھیپ لے کر گیا تھا، اس میں میری جیراں نہ تھی... میرا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ میری واپسی بڑی مشکلوں سے ہوئی، کیونکہ میں اس وقت شیروں کی کچھار میں گھسا بیٹھا تھا۔ وہاں سے لوٹنے کے بعد میں نے پولیس کو خبر کرنے کا پکا ارادہ کرلیا تھا مگر ہائے ری قسمت... ادھر ہی مار کھا گیا۔ کیا پتا تھا کہ پولیس ان امیروں اور پیسے والوں کی سنتی ہے۔ ہم جیسے مسکین مجبور اور غریبوں کو بری طرح دھتکار دیتی ہے۔ شفقت راجا کا نام سن کر علاقے کے تھانے دار نے الٹا مجھ

پر چڑھائی کردی، مجھے پاگل سنکی اور نہ جانے کیا کیا کہہ کر تھانے سے بھگا دیا گیا۔ غریب کی کون سنتا ہے پترو!'' اس کا لہجہ پھر گلوگیر ہونے لگا مگر اس نے بات ختم نہیں کی۔

''... مگر میں نے بھی قسم کھا رکھی تھی، پیچھے نہیں ہٹوں گا، میں نے اوکاڑہ جاکر بڑے افسر سے ملنے کا ارادہ کیا، لیکن پھر بدقسمتی آڑے آئی اور میری تھانے پہنچ کر شکایت کرنے کی خبر شفقت راجا تک پہنچادی گئی، اس دن جب میں اوکاڑہ جانے کی تیاری کررہا تھا، شفقت راجا کے کارندوں نے میرے گھر پر چڑھائی کردی... ہم بڈھا بڈھی کو بالوں سے پکڑ کر گلیوں میں گھسیٹا گیا اور گھر سے بے گھر کردیا۔ ہم ہاتھ جوڑتے رہے اور رحم کی بھیک مانگتے رہے۔ ہمیں آبادی سے نکال کر یہاں پھینک دیا گیا۔ بڑی مشکلوں سے اپنی اور اپنی بڈھی کی جان بچائی اور زخمی حالت میں کئی گھنٹوں تک ہم ادھر ہی پڑے رہے۔ یہاں ہم نے سرکنڈوں سے چھپروں کی جھونپڑی بنالی۔ دو دنوں تک ہم نے اندر کا رخ نہیں کیا تھا۔ پھر ایک روز مجھے کسی بھلے مانس نے آکر بتایا کہ ادھر آبادی میں مسجد والی پکی باؤلی کے پاس جیراں کی لاش پڑی ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ کی نس کاٹ ڈالی تھی، وہ غیرت والی کڑی تھی، کسی شیطان کے ظلم کا شکار ہونے کے بعد وہیں مرگئی ہوگی۔ میری جیراں کے لیے یہی مشہور کردیا گیا تھا کہ وہ کسی اپنے چاہنے والے کے ساتھ بھاگ گئی تھی... مگر وہ ایسی نہیں تھی، میری دھی تھی وہ۔ میں اسے جانتا تھا، اور یہ بھی جانتا تھا کہ اپنی شیطانیت اور اپنے جرم کو چھپانے کے لیے اس بے چاری کو دانستہ بدنام کیا گیا تھا۔''

بوڑھے نے اپنی دکھ بھری داستان سنانے کے بعد خاموشی اختیار کرلی مگر اب وہ سسک سسک کر رونے لگا۔ میں اس کا کاندھا...... تھپتھپاتے ہوئے اسے حوصلہ دینے کے علاوہ اور کیا کرسکتا تھا۔ پھر اول خیر نے بھی بوڑھے سے کہا۔

''چاچا! اب تو اللہ نے تمہاری معصوم جیراں کا حساب شفقت راجا اور اس کے کارندوں سے لے ہی لیا ہے۔ اس سے یقیناً زبیر خان کی نہ صرف کمرتوٹی ہوگی بلکہ... اس پنڈ کے غریب معصوم لوگوں نے بھی سکھ کا سانس لیا ہوگا۔ مگر چاچا! تمہاری بڑی مہربانی کہ تم نے ہماری بھی مدد کی... کیونکہ تمہاری جیراں کی طرح اور بھی نجانے کتنوں کی جیراں اس جہنم میں رہائی کی منتظر بیٹھی ہوں گی۔''

بوڑھے نے اپنے کاندھے پر رکھے ایک میلے کپڑے سے چہرہ صاف کیا اور بولا۔

''پترو! میں تمہاری آخری دم تک مدد کروں گا اور خود تمہیں جنگل ڈیرے والے فارم ہاؤس کی طرف لے کر جاؤں گا مگر یہ کام رات کو ہی مناسب ہوگا۔''

''نہیں چاچا! یہ کام ہمیں ابھی نمٹانا ہوگا۔'' میں نے کہا اور اول خیر کی طرف دیکھ کر بولا۔'' کیوں اول خیر! میں سمجھتا ہوں یہی موقع ہے ہمارے پاس... اس وقت وہ سب شفقت راجا اور اپنے سائیں کے کفن دفن میں مصروف ہیں۔ انہیں اپنی پڑی ہوئی ہے۔'' اول خیر نے میری بات پر صاد کرنے کے انداز میں سر کو ہولے سے جنبش دی۔

اس دوران میں... گدھا گاڑی والا لڑکا ٹھنڈے پانی کی بوتلیں اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے آیا۔ ہم نے اسے کچھ مزید اجرتِ خاص سے نواز کر شکریہ کے ساتھ رخصت کردیا۔ پھر بوڑھے سے اس فارم ہاؤس کے محل وقوع کے بارے میں تفصیلات حاصل کرنے لگے۔

☆☆☆

بوڑھے کا نام بشیر تھا۔ آدھے گھنٹے بعد میں اور اول خیر اس کا شکریہ ادا کرکے اس کی جھونپڑی سے نکل پڑے۔

سہ پہر کے چار بج رہے تھے، گرمی جون کی تو نہیں تھی مگر حبس کی کیفیت کم تھی یوں بھی جاتے ہوئے موسم کی گرمی تھی۔ جیسے جیسے دن ڈھلنے لگتا، گرمی کم ہوکر ہلکی ٹھنڈ میں بدلنے لگتی۔ میں اور اول خیر چہروں پہ حاجی رومال ڈالے پہلے سے متعین کردہ راستے پر ہولیے۔ بوڑھے نے بتایا تھا کہ وہ فام ہاؤس یہاں سے جنوب مشرق کی سمت تقریباً نو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ تانگا تو ہمیں کوئی نظر نہیں آیا البتہ گدھا گاڑیاں آتی جاتی ضرور دکھائی دے رہی تھیں، جن پر اناج کی بوریاں لدی ہوئی تھیں، ایک خالی گدھا گاڑی کو روک کر ہم نے اس سے نہر والی پلیا تک چلنے کو کہا۔ وہ تیار ہوگیا۔

بوڑھے بشیر کے مطابق نہر والی پلیا چھ سات کلومیٹر کے فاصلے پر تھی، وہاں سے آگے کوئی تانگا اور سواری جانے کی اجازت نہیں تھی، ہمیں نہر والی پلیا پر اتر کر دائیں جانب نہر کے کنارے کے ساتھ پیدل چلنا تھا، بشیر نے ہمیں اس سمت سے جانے کی نصیحت کی تھی۔

گدھا گاڑی والے نے کرایہ بتایا اور ہم دونوں اس پر سوار ہوگئے کہ پکی عمر کے گدھابان نے گدھے کو للکارا اور وہ آگے روانہ ہوگیا۔

ہم نے دانستہ آبادی سے ہٹ کر آگے بڑھنے کا راستہ اپنایا تھا۔ ہم چاہتے تو نہر والی پلیا کے قریب اترنے کے

بجائے... شہتیروں والے پل کے پاس ہی اترتے مگر بشیر نے ہمیں یہی تاکید کی تھی، ہمیں نہر والی پلیا کے قریب اتر کر باقی راستہ پیدل ہی طے کرنا تھا۔ اس کی مصلحت ہم سمجھتے تھے، کیونکہ ہم ایک طرح سے لوگوایریا کی طرف بڑھ رہے تھے، یہ سارا علاقہ زبیر خان کی جاگیر میں شمار ہوتا تھا۔

گدھا گاڑی کھیتوں کے درمیان سے ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ نہر والی پلیا تک آنے جانے کی کوئی پابندی نہ تھی وہاں کھاد بیج وغیرہ فروخت کرنے والوں کی دکانیں تھیں، دو ایک چھپر نما چائے خانے بھی تھے، جو اَب بند کروادیے گئے تھے۔ میں اور اول خیر، گدھا گاڑی کے چوبی پھٹے پر بیٹھے دانستہ بیج .... اور کھاد وغیرہ سے متعلق ہی باتیں کررہے تھے، تاکہ گدھا گاڑی والے کو ہم پر کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ یہ ساری باتیں ہمیں بوڑھے بشیر نے سمجھائی تھیں۔

میرے لیے یہ عجیب صورتِ حال تھی، مگر اول خیر کے لیے یہ سب کچھ نیا نہیں تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ پنجاب کے بیشتر دیہاتوں کے کچھ بااثر قسم کے لوگوں نے اپنی اپنی جاگیروں میں اس طرح کی اجارہ داریاں قائم کررکھی تھیں اور ایسا صرف پنجاب میں نہیں، ملک کے ہر صوبے میں تھا، بالخصوص اندرونِ سندھ... وہاں تو جاگیریں باقاعدہ ''اسٹیٹ'' کا درجہ رکھتی تھیں۔ حتیٰ کہ حویلی تک جانے والے راستے پر بھی کسی مقامی یا عام آدمی کو چلنے کی اجازت نہ تھی۔

کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو بنجر اور بیابان علاقہ شروع ہوگیا، خاصا اجاڑ علاقہ تھا، کہیں کہیں جھاڑ جھنکاڑ اور سوکھی جھاڑیوں کے جھنڈ بنے ہوئے تھے۔

نہر والی پلیا کے قریب کچھ گہما گہمی نظر آئی تھی، گدھا گاڑی سے اتر کر اول خیر نے اسے اجرت دے کر فارغ کردیا۔ اور گردوپیش پہ نظر ڈالتے ہوئے چھپر نما دکانوں کی طرف بڑھ گئے، دو ایک دکانوں میں بیج اور کھاد وغیرہ کے بارے میں پوچھا پھر غیر مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ یونہی ٹہلنے کے انداز سے دائیں جانب چل دیے، یہاں نہر کا ریتیلا کنارہ تھا۔ جس کے ساتھ ساتھ خاصی دور تک بیر اور ڈوڈی کے موٹے پتوں والے پودوں کی جھنڈ دار جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں اس کی آڑ میں ہوکر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔

میں نے اول خیر کو اب اپنے سیل فون آف کرنے کی ہدایت کردی تھی، کہیں اس کی رِنگ ٹون کسی کو ہماری طرف متوجہ کرنے کا باعث نہ بنے، مگر موبائل فون آف کرنے سے پہلے اول خیر نے احتیاطاً کمیل دادا سے رابطہ کرکے اسے موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کردیا تھا۔ اول خیر نے سائلنٹ پر کرکے اسے وائبریشن پر کردیا تھا۔

مزید ایک دو کلومیٹر پیدل چلنے کے بعد بالآخر نہر کے اس مقام پر پہنچ گئے، جہاں موٹے شہتیروں کو گرا کر پیدل نہر پار کرنے والوں کا راستہ بنایا گیا تھا۔ ہم نہر کے ریتیلے کنارے پر چڑھ گئے، محتاط نظروں سے گردوپیش کا جائزہ لیا پھر دھڑکتے دل کے ساتھ شہتیروں پہ چل کر نہر کے دوسری طرف آگئے۔ وہاں نسبتاً زیادہ جھنڈ دار جھاڑیاں اور درختوں کی بہتات تھی۔

''اول خیر! ہوشیار! ہم لوگوایریا میں داخل ہوچکے ہیں۔'' میں نے سرسراتی سرگوشی سے اول خیر سے کہا۔ وہ بھی دھیمی آواز میں بولا۔

''اوخیر... کاکا فکر کی کوئی بات نہیں، اس وقت ان سب کو اپنی پڑی ہوئی ہے۔ یہاں ہمیں کوئی نہیں ملے گا۔ سوائے چند آدمیوں کے اُن سے ہم نمٹ لیں گے۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہے اس لیے تو میں نے وقت ضائع کیے بغیر روانگی کا فیصلہ کیا تھا۔'' میں نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہم دو ایک گھنٹے میں اپنی کارروائی نمٹا دیں گے، لیکن واپسی کے بارے میں کچھ وقت ہوسکتی ہے، کمیل دادا کا کیا پروگرام تھا؟ تم نے تو اس سے بات کی تھی ناں۔''

وہ جواباً بولا۔ ''میں نے اسے سب بتادیا ہے۔ مگر وہ کھلاں والی داخل ہونے کا رسک نہیں لینا چاہتا۔''

''تو پھر؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''فکر کی کوئی بات نہیں۔'' وہ ازراہِ تشفی بولا۔ ''کمیل دادا ہوشیار آدمی ہے۔ یہ سارے علاقے مجھ سے زیادہ اس کے دیکھے بھالے ہیں، ہمارا محل وقوع جاننے کے بعد اس نے اپنا پروگرام مجھے بتادیا ہے۔ وہ ساہیوال سے بیس کلومیٹر مضافات میں چک اڑتالیس کی طرف مڑ جائے گا اور ایک بڑا چکر کاٹ کر... اس لوگوایریا کے جنوب مغرب سے اندر داخل ہوکر ہم سے ملنے کی کوشش کرے گا، تب تک ہم اپنا کام نمٹا چکے ہوں گے۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' میں نے دعائیہ کلمہ ادا کیا۔ ہم آگے بڑھتے رہے۔ بوڑھے بشیر کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے بالآخر ہم فارم ہاؤس کی اس مستطیل نما

عمارت کے قریب جاپہنچے جس کے اطراف اور عقب میں کیکر اور بیر کا گھنا جنگل تھا۔ اس جنگل ڈیرے کے بعد زبیر خان کی جاگیر کی حد ختم ہوجاتی تھی۔

ہم دور سے کھڑے اس عمارت کا جائزہ لینے لگے۔ یہ مٹیالے رنگ کی عمارت تین چار کنال کے رقبے پر محیط تھی۔ چھت پر بڑا سا ڈش انٹینا نصب تھا، سامنے کے رخ پر تین چار بڑے بڑے دروازے استادہ تھے، درمیان کا دروازہ کھلا تھا، وسیع وعریض احاطے کے گرد خاردار باڑھ تھی، داخلی راستہ کشادہ اور کھلا تھا۔ احاطے کے باہر ایک ٹریکٹر ٹرالی کھڑی نظر آئی۔ اندر ایک پرانے ماڈل کی جیپ تھی۔ کچھ کرسیاں اور دو تین چارپائیاں احاطے میں مذکورہ کھلے دروازے کے سامنے بچھی ہوئی تھیں، دو پیڈسٹل پنکھے تھے، احاطے کے دائیں ... سمت میں ایک چھوٹے سائز کا ٹرک کھڑا تھا۔

چارپائیوں پہ ہمیں صرف دو افراد ہی نظر آئے، جن کے قریب ایک دوسری خالی چارپائی پر ان کی رائفلیں پڑی تھیں۔ ساتھ ہی زنجیر سے دو کتے بندھے ہوئے کچی زمین پر بیٹھے تھے، ان کی زبانیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں، اور ہانپتے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔

''اوخیر... کاکا! لگتا ہے کہ اس طرح معاملہ کچھ ڈھیلا ہوگا۔''

ساری صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد اول خیر نے میرے کان میں سرسراتی ہوئی سرگوشی کی۔

ہم دونوں تھوڑی دیر مزید جھاڑیوں میں دبکے رہے۔ آگے پیش قدمی کا ارادہ کرنے ہی والے تھے کہ اچانک عمارت کے کھلے دروازے سے ایک لمبا موٹا شخص جھومتا جھامتا ہوا باہر نکلتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں دیسی شراب کی بوتل تھی، ہمارا وہاں سے فاصلہ لگ بھگ کوئی پچاس ساٹھ فٹ تھا، اس آدمی کا صرف ہمیں قہقہہ ہی سنائی دیا تھا۔

''چل کاکا! آگے بڑھ...'' اول خیر نے جوش سے مرتعش آواز میں کہا اور پھر دائیں جانب رینگ گیا۔ میں نے بھی فوراً ہی اس کی تقلید کی تھی۔ ہم جھاڑیوں کی اوٹ میں سرکتے رینگتے ہوئے عمارت کے عقبی حصے میں اس کی طرف آگئے۔ عقبی دیوار تک ہمیں یہ جھاڑیاں تحفظ فراہم کرسکتی تھیں، اس لیے ہم نے آگے بڑھنے میں چنداں دیر نہ لگائی۔ اس طرف چار کھڑکیاں تھیں جو سب کی سب بند تھیں۔

''کاکا... اس طرف۔'' اول خیر نے مجھے ٹہوکا دیا۔ ہم دونوں جنوبی سمت کی دیوار کی آڑ لے کر آگے بڑھے۔ سب سے پہلے اول خیر نے دیوار کی آڑ میں دیکھا۔ وہ تینوں اب ہنس ہنس کر باتیں کررہے تھے۔ ہم ایک طرح سے عمارت کے احاطے کے اندر داخل ہوچکے تھے، چاہے عقب سے سہی، ٹرک اس مقام پر ہم سے چند گز کی دوری پر تھا۔ ہم فوراً آگے بڑھے اور ٹرک کی اوٹ میں آگئے، ہمیں ان دونوں کتوں کا بھی ڈر تھا، جو ایک اجنبی پر بھونک کر ان تینوں کو خبردار کرسکتے تھے، اور وہی ہوا... دونوں کتے یکدم اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ٹرک کی سمت منہ کرکے زور زور سے بھونکنے لگے۔ چارپائیوں پر بیٹھے وہ تینوں آدمی بری طرح چونکے۔ میری کنپٹیوں پہ سنسناہٹ ہونے لگی۔ ٹرک کے اندر بھوسا تھا۔ اچانک سے ایک بلی اچھل کر بھاگی، مجھے تسلی ہوئی، کیونکہ وہ تینوں بھی بلی کو دیکھ کر یہی سمجھیں ہوں گے کہ کتے اسے دیکھ کر بھونکے ہیں۔ مگر کتے اب وقفے وقفے سے بھونکنے لگے۔ ایک تو چپ ہوگیا تھا مگر دوسرا کچھ ڈھیٹ قسم کا تھا، اسے ایک کارندے نے ہشکارا دے کر چپ کرایا۔ میں نے اول خیر کی طرف دیکھا تو اس نے ایک طرف اشارہ کیا جہاں لوہے کے زرعی آلات بکھرے پڑے تھے، اشارہ بھانپ کر میں نے اثبات میں سر ہلادیا پھر ہم تیزی سے مذکورہ سمت کی طرف رینگ گئے۔

یہاں سے وہ تینوں کارندے ہمارے بہت نزدیک تھے، ان کی رائفلیں دوسری چارپائی پر رکھی تھیں، اول خیر نے میرے کان میں سرگوشی کی، اور پھر میں نے اور اول خیر نے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑلیے اس کے فوراً ہی بعد جیسے ہمارے وجود میں بجلی دوڑ گئی۔

''خبردار! کوئی حرکت نہ کرنا ورنہ گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔''

آہنی آڑ سے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ابھرتے ہی ان تینوں پر گن تانتے ہوئے میں بھیڑیے کے انداز میں غرایا۔ جبکہ اول خیر نے دوسری چارپائی پر رکھی رائفلوں کی طرف پیش قدمی کی تھی، کتوں نے بھونک بھونک کر آسمان سر پہ اٹھالیا اور رسی تڑوانے کی کوشش کرنے لگے۔ تینوں کارندوں کے چہرے یکلخت مسخ سے ہوگئے، زیادہ دیدنی حالت لمبے تڑنگے موٹے آدمی کی ہورہی تھی، جس کا چہرہ سرخ ہوکے مزید بھیانک نظر آنے لگا تھا۔

بعد میں ہم نے اپنے پستول جیبوں میں ڈال کر رائفلیں سنبھال لیں۔

''کون ہو تم لوگ؟ جانتے نہیں تم کس کی جاگیر میں کھڑے ہو؟'' تنومند شخص ہم دونوں پر قہر آلودہ نظریں ڈالتا ہوا غرایا۔

''اپنا منہ بند رکھ... ذلیل کُتے ورنہ کھوپڑی چھلنی کردوں گا۔'' میں نے خوف ناک لہجے میں غرا کر کہا۔ ''اندر جتنی بھی لڑکیاں موجود ہیں انہیں فوراً باہر لے کر آؤ، جاؤ تم۔''

میں نے دوسرے کارندے سے تحکمانہ درشتی سے کہا مگر وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا، ہمیں گھور کر بولا۔

''کون سی لڑکیاں؟ ہمیں کچھ نہیں معلوم۔'' اس کی چالاکی پر مجھے طیش آگیا۔ میں نے رائفل کا رخ اس کے سینے کی طرف گھمادیا تو اول خیر نے یکدم مجھے ایک ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''ٹھہرو، ابھی نہیں، تم اندر جاؤ، میں یہاں کھڑا ہوں۔'' اس کی بات پر میں نے فوراً حرکت کی اور کھلے دروازے کی طرف بڑھا۔ جب اس لمبے تڑنگے موٹے کے قریب سے گزرنے لگا تو وہ خونخوار سی غراہٹ سے بولا۔

''اس غلطی کا بڑا بھیانک خمیازہ بھگتنا پڑے گا تم دونوں کو۔'' اس کے ان جملوں نے میری کنپٹیاں چٹخادیں اور میں نے رائفل کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ تھام کر اس کا بٹ اس کے جبڑے پر دے مارا۔ چوٹ زوردار ثابت ہوئی یقیناً اس کا جبڑا چٹخ گیا ہوگا۔ کیونکہ وہ ایک کریہہ... آواز سے چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔

''وقت ضائع مت کر کاکا۔ ان کی چال میں مت آ اور آگے بڑھ۔'' پیچھے سے اول خیر نے مجھے تاکید کی، میں مضروب کارندے کو غصیلی نظروں سے گھورتا ہوا کھلے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ اندر روشنی تھی، کچھ باہر کی روشنی بھی اس بلند چھت والے ہال کمرے کے روشندانوں سے اندر پڑ رہی تھی۔

میں بری طرح چونکا۔ یہاں ایک طرف آٹھ نو کے قریب لڑکیاں ڈری سہمی بیٹھی تھیں اور سراسیمہ نگاہوں سے میری طرف تکے جارہی تھیں۔ ان کے نازک پیروں میں آہنی کڑوں کے ساتھ زنجیریں منسلک تھیں۔ میرے لیے یہ بڑا انسانیت سوز منظر تھا مگر مجھے ان میں شکیلہ کہیں نظر نہ آئی تھی۔

میں پریشان اور فکر مند ہوتا۔ تاہم میں نے لڑکیوں کو تسلی دی۔ ''مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں اور میرا ایک ساتھی تمہیں یہاں سے چھڑانے کے لیے آئے ہیں۔ باہر ان تینوں کارندوں کو اس نے اپنی گن پوائنٹ پر رکھا ہوا ہے۔ مجھ سے تعاون کرو، تاکہ جلدی سے نکلا جائے۔'' میری بات پر لڑکیوں کے تاریک پڑے چہرے خوشی کی روشنی سے چمک اٹھے۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کی زنجیروں کا جائزہ لیا اور اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ ایک لڑکی نے میری نظروں اور چہرے کے تاثرات بھانپ کر کہا۔

''اس کی چابی ایک لمبے کالے آدمی کے پاس ہے۔ وہ باہر ہوگا۔''

''اچھا ٹھیک ہے، تم فکر نہ کرو۔'' میں نے کہا اور اس سے پوچھا۔ ''ایک اور لڑکی شکیلہ نام کی بھی تمہارے ساتھ تھی۔ وہ کہاں ہے؟ میرے دوست کی بہن ہے۔'' میرے استفسار پر وہ سوچتی رہ گئی۔ اسے شاید معلوم نہیں تھا مگر ایک اور لڑکی بولی۔

''کہیں تم بھورے بالوں اور گورے رنگ والی موٹی اور لمبی سی لڑکی کی بات تو نہیں کررہے ہو جو ملتان کے کسی اطفال گھر نامی ادارے میں...''

''ہاں... ہاں وہی۔ میں اسی لڑکی کی بات کررہا ہوں۔'' میں نے فوراً اس کی طرف دیکھ کر پُرامید لہجے میں کہا۔

''وہ بے چاری تو...''

''کیا ہوا اُسے؟'' میں نے یکدم دھڑکتے دل اور تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

''اسے کئی روز پہلے چند لوگوں کے حوالے کردیا گیا تھا۔''

''کون تھے وہ لوگ؟'' میں اندر سے سلگ اٹھا۔

''میں نہیں جانتی انہیں۔'' وہ بولی۔ میں دانت پیس کر تیزی سے پلٹا اور دروازے سے باہر آیا۔ کتے مسلسل بھونک رہے تھے، بے زبان تھے؟ میں انہیں ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تنومند سیاہ رُو ابھی تک اپنا جبڑا سہلا رہا تھا اور چارپائی کی پٹی پر ٹک کر بیٹھا تھا۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اول خیر نے میری طرف دیکھا۔

''لڑکیاں اندر موجود ہیں۔ مگر زنجیروں سے بندھی ہوئی ہیں، چابی ان کے پاس ہے مگر اندر شکیلہ نہیں۔'' میں نے اسے آگاہ کیا اور تنومند کی طرف رائفل کرکے درشتی سے بولا۔ ''چابی دو... جلدی...''

اس کا ہاتھ فوراً جیب کی طرف رینگ گیا۔ میں اس کی چال نہیں سمجھ پایا مگر اول خیر تو اس میدان کا پرانا ''پاپی'' تھا۔ ادھار اور خار کھائے آدمی کا اتنی جلدی حکم مان لینا اسے

فوراً کھٹک گیا۔ یہی سبب تھا کہ جیسے ہی اس نے مضروب کارندے کو اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے دیکھا چیخ کر اسے خبردار کیا۔

''اپنا ہاتھ وہیں روک لو۔'' وہ تب تک اپنا ہاتھ جیب کے اندر لے جاچکا تھا، صرف باہر نکالنے کی دیر تھی کہ اچانک ایک دھماکا ہوا۔ یہ دھماکا مضروب کارندے کی جیب کے اندر سے ہوا تھا، جہاں ایک پسٹل موجود تھا اور اس کے ٹریگر پر حرکت کرتی انگلی کی جنبش ہم نہیں دیکھ سکتے تھے، لہٰذا اسے وار کرنے کا موقع مل گیا۔ گولی چلی اور اول خیر کے جانے کہاں لگی کہ وہ چیخ کر چند قدم پیچھے لڑکھڑایا۔ کارندہ زخمی ہونے کے باوجود تیزی سے میری طرف گھوما ہی تھا کہ میں نے برسٹ فائر کردیا۔ وہ بغیر چیخ مارے تیورا کر گرا اور ختم ہوگیا۔ باقی دو کارندوں کی آنکھیں پھیل گئیں، میں ان پر گن تانے اول خیر کی طرف لپکا۔ اسے زخمی ہوکر گرتے دیکھ کر میرا دل جیسے سینے میں گھٹ کر رہ گیا۔

''اول خیر...'' میں چلا کر اس کی طرف بڑھا اور اس طرح اس کے قریب زمین پر اکڑوں ہوکر بیٹھ گیا کہ سامنے کھڑے ان دونوں کارندوں پہ بھی نگاہ رکھ سکوں۔ یکا یک صورتِ حال تشویش ناک حد تک خراب ہوگئی تھی۔

میں نے اول خیر کا جائزہ لیا۔ گولی اس کے دائیں پہلو پہ جگر والی جگہ پر لگی تھی، اور وہاں سے اب بھل بھل خون بہہ...... رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے کراہ رہا تھا، اور پھر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی، اسے اس حال میں دیکھ کر میرا دل کٹنے لگا۔ اس کی موجودگی میرے لیے بڑا سہارا تھی، وہ میرا ایک خاص قسم کا یار باش دوست تھا، اس کا برتاؤ میرے ساتھ سگے بھائیوں سے بڑھ کر تھا۔ میں دہری تہری ذمے داریوں کی زد میں آ گیا تھا۔ قیدی لڑکیوں کو بھی یہاں سے نکالنا تھا اور جاں بہ لب اول خیر کی زندگی بھی بچانا تھی۔ خود میں ایسے ..... دشمنوں کی کچھار میں تھا جن کی خوفناک اور قاتل نظریں، ویڈیو کلپ جاری ہونے کے بعد مجھے بہت بے چینی سے تلاش کررہی ہوں گی۔

''تمہارا ساتھی مرجائے گا۔ گن پھینک کر خود کو ہمارے حوالے کردو۔ فرسٹ ایڈ کا سامان یہاں موجود ہے اور گاڑی بھی۔'' ایک کارندے نے میری پریشانی بھانپ لی اور چالاکی سے بولا۔ تب میں نے اس کارندے کو بہ غور دیکھا اور پلک جھپکتے ہی اس کے سر پہ پہنچ کر اپنی رائفل کو سنگل شاٹ پہ رکھ کر نال اس کی پیشانی سے لگادی اور یکدم اپنے چہرے سے رومال ہٹادیا۔

ملک کے مختلف نجی ٹی وی چینلز میں مجھ سے متعلق وہ ویڈیو کلپ ٹی وی پر بار بار دکھائی جارہی تھی، اور میری شکل اس میں کلوز اپ کرکے اتنی واضح کردی تھی کہ کسی کو مجھے پہچاننے میں ذرا بھی مغالطہ ہونے کا اندیشہ نہ تھا۔ اور پھر یہ تو شفقت راجا کے کارندے تھے، بھلا ان لوگوں نے کیسے میری شکل نہیں دیکھی ہوگی، یہی سبب تھا کہ میری صورت دیکھتے ہی پہلے تو دونوں کو ہلکا سا جھٹکا لگا پھر ان کی آنکھیں اس قدر پھیلتی چلی گئیں، گویا پھٹنے کے قریب ہوگئیں۔

''مجھے اچھی طرح پہچان لو، اور بتاؤ فرسٹ ایڈ بکس کدھر رکھا ہوا ہے۔'' میں نے وحشت انگیز غراہٹ سے اسے گھور کر کہا۔ مگر وہ جیسے ہکا بکا سا رہ گیا۔

''تت... تم... وہی ہو۔''

''ہاں! وہی ہوں... جلدی بتاؤ۔'' میں دہاڑا۔ ''اگر اس دوران میرا ساتھی مرگیا تو تم دونوں کا حشر میں تمہارے تیسرے ساتھی جیسا کروں گا۔''

ان کے سامنے خود کو ظاہر کرنے کا میرا مقصد محض اتنا تھا کہ میری دھاک ان پر بیٹھ جائے اور وقت ضائع کیے بغیر وہ بے چون وچرا میرے احکامات کی تکمیل کرتے رہیں۔ وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کے سامنے کوئی معمولی آدمی تھا... ظاہر ہے جو شفقت راجا جیسے آدمی اور اس کے کارندوں کا اس کی جاگیر میں گھس کر قتل کرسکتا ہے، وہ کیا کم خطرناک ہوگا؟ جبکہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ قتل میں نے نہیں کیا تھا اور دوسرے کے گناہ کا سارا ملبا میرے سر ڈال دیا گیا تھا اور یہ خطرناک رسک میں نے اول خیر کی جان بچانے کے لیے ہی لیا تھا۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اطفال گھر سے نکلتے ہی میں پے در پے ان حالات کا شکار ہوکر اس طرح کی مشکلات ومصائب کی لپیٹ میں آجاؤں گا مگر یہ ہوچکا تھا۔ پتا نہیں تقدیر کون سی راہ متعین کرنے والی تھی، مگر میں دیکھ رہا تھا کہ لحہ بہ لحہ مجھے لاوا اگلتے ہوئے آتش فشاں دہانے کی طرف دھکیلا جارہا تھا۔ ناکردہ جرائم کے پاداش میں ایسے حالات کا شکار ہونے والا انسان بڑا خطرناک باغی بن کر رہ جاتا ہے۔ اور شاید اب کچھ ایسے ہی جذبات میرے دل و دماغ میں ...... پروان چڑھنے لگے تھے۔ اس وقت مجھے ان کے دیگر کارندوں کے ٹپک پڑنے کا بھی خدشہ درپیش تھا۔

دوسرے کارندے نے اچانک... زمین بوس اول خیر کی طرف چھلانگ لگادی، یہ اس کی ایک خطرناک چالاکی تھی، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں میں اس پر فائر کرنے

سے گریز ہی کرتا۔ جبکہ اس کا ہدف وہ رائفل تھی جو تھوڑی دیر پہلے اول خیر کے ہاتھوں میں تھی، مگر اب اس کے ساتھ ہی وہ بھی زمین پر اس کے قریب پڑی تھی۔ مگر وہ چالاکی کرتے ہوئے یہ بات بھول گیا تھا کہ جس انسان کے سر پہ خون سوار ہوجائے وہ اپنے نفع ونقصان کی پروا کم ہی کرتا ہے۔ میں ذہنی وجسمانی طور پر تیار تھا، لہٰذا جیسے ہی دوسرے کارندے نے حرکت کی، میری محتاط اور تھکی ہوئی آنکھوں میں اس کی ''جھپک'' ابھری اور میں نے اس پر فائر کردیا۔ فقط ایک ہی گولی نے اس کا کام تمام کرکے رکھ دیا۔ گولی اس کے پیٹ میں کہیں دھنس گئی تھی۔

ایک ہی کارندہ بچا تھا، میری دھاک اس پر ایسی بیٹھی کہ وہ پھر بے چون وچرا میرا حکم مانتا چلا گیا۔ بہر طور، اس کے بعد سب کچھ تیزی سے ہوتا چلا گیا۔ اول خیر کے بے سدھ زخمی وجود کو چارپائی پہ ڈالا۔ ادھ موئے کارندے کی جیب سے چابیاں نکالیں، اندر داخل ہوکے ایک لڑکی کا تالا کھولا اور چابی اسے تھما کر فرسٹ ایڈ باکس لیا۔ میں نے کارندے کو وہیں ایک کاٹھ کباڑ والے اسٹور میں بند کرکے باہر سے کنڈی چڑھادی کہ کہیں وہ موقع ملتے ہی میرے ساتھ کوئی چالاکی کرنے کی کوشش نہ کرے۔ مگر حالات کی کشاکش میں یہ بات بھول ہی گیا تھا کہ اندر بند کرنے سے قبل مجھے اس کی تلاشی لینی چاہیے تھی، ہتھیار کے علاوہ ضرور اس کے پاس سیل فون بھی ہوسکتا تھا جس کے ذریعے وہ اپنے ساتھیوں کو یہاں.... ہونے والی کارروائی کے بارے میں آگاہ کرسکتا تھا۔

لڑکیاں سب زنجیروں سے آزاد ہوچکی تھیں۔ میں نے مختصراً انہیں یہ سب بتایا۔ ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر مجھے بتایا کہ وہ نرس ہے۔ (وہ کسی کی محبت کے جھانسے میں آکر برباد ہوئی تھی)

اس نے ہی اول خیر کی ڈریسنگ کی تھی، اس کی مدد کے لیے دو اور لڑکیاں بھی شامل تھیں۔

میں نے اول خیر کا موبائل نکال لیا تھا۔۔۔ سائلنٹ پر ہونے کی وجہ سے اس میں دوتین مس کال کمیل دادا کی طرف سے آئی تھیں۔

میں نے فوراً ہی اس سے رابطہ کرکے اسے مختصراً صورتِ حال کے بارے میں بتادیا تھا۔ وہ کہیں قریب ہی موجود تھا اور ہم سے رابطہ کرنے کا بے چینی سے منتظر بھی تھا۔ اول خیر کے زخمی ہونے کا سنتے ہی وہ آندھی طوفان کی طرح ایک بڑی سی مخصوص اور اونچے چوڑے ٹائروں والی جیپ میں وہاں آن پہنچا۔ اس کے ہمراہ چار مسلح افراد بھی تھے۔

انہیں دیکھ کر مجھے کچھ ڈھارس ہوئی، اول خیر کی ڈریسنگ ہوچکی تھی۔ نرس اپنے کام میں ماہر تھی، اور شاید اس نے سرجری سے ہی کام کیا تھا، کیونکہ اس نے زخم پر ٹانکے بھی لگادیے تھے، ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی سنائی کہ گولی پہلو کو چھوتی ہوئی آر پار ہوگئی تھی، البتہ جریانِ خون کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ جگر متاثر ہوا ہے۔ اول خیر کو جیپ کی پچھلی سیٹ پر لٹادیا گیا۔ میں نے کمیل دادا سے کہا۔

''تم اول خیر کو لے کر نکل جاؤ اور کسی اچھے اسپتال میں اسے داخل کرادو... میں سامنے کھڑی جیپ میں آرہا ہوں۔ لڑکیوں کو لے کر۔''

میری بات پر کمیل دادا تذبذب کا شکار نظر آنے لگا مگر میں اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر پلٹ گیا۔ جیپ کی چابیاں میں نے موئے کی لاش سے نکال لی تھیں۔ شکیلہ کے حوالے سے اچانک ہی میرے ذہن میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک خیال ابھرا تھا۔ جس کارندے کو میں نے اسٹور میں بند رکھا تھا اسے میں نے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میں اس سے شکیلہ کے سلسلے میں کچھ اگلوانا چاہتا تھا۔

کمیل دادا نے احتیاطاً دو ساتھی میرے ساتھ کردیے اور مجھے ''بیگم ولا'' پہنچنے کی ہدایت کرکے روانہ ہوگیا۔ نرس لڑکی اول خیر کے ساتھ تھی۔

میں نے جیسے ہی اندر آکر اسٹور کھولا، کارندے کو سیل فون پر دوسری طرف منہ کیے باتیں کرتے سنا۔۔۔ میرے پورے وجود میں سنسناہٹ سی پھیل گئی۔ آہٹ پر وہ چونک گیا تھا اور اپنا سیل فون چھپانے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے آواز پیدا کیے بغیر دروازہ کھولا تھا۔ مجھے اپنی خطرناک غلطی کا احساس ہوا، مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس سے یہ پوچھنا اب فضول ہی تھا کہ وہ فون پر کس سے باتیں کررہا تھا۔ میں نے اس کا سیل چھین کر پھینک کے توڑ ڈالا اور اسے دھکیلتا ہوا باہر آ گیا۔

ایک ساتھی نے جس کا نام اسلم تھا۔ میری دی ہوئی چابی سے جیپ اسٹارٹ کرلی تھی اور سب لڑکیاں اس میں سوار ہوگئی تھیں۔

دوسرے ساتھی کا نام سلیم تھا۔ دشمن کارندے کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ کر جیپ میں سوار کرایا گیا اور خود میں ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر آن بیٹھا۔ دفعتاً گولیوں

کی تڑتڑاہٹ اور ایک سے زائد گاڑیوں کے غرانے کی آواز ابھری۔ میں حلق کے بل چیخا۔

''دشمن تعاقب میں نکل چکے ہیں ہمارے، بھگاؤ جیپ۔'' میں نے اسلم سے کہا، اس نے ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔

دشمنوں کے تعاقب میں آنے کا سن کر بے چاری لڑکیاں زیادہ خوف اور پریشانی کا شکار ہو گئیں۔ وہ ارشد کی طرح ڈرائیونگ میں ماہر معلوم ہوتا تھا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنتے ہی اس نے جیپ کا اسٹیئرنگ کاٹ کر کیکر کے جنگل کی طرف دوڑا دیا تھا۔

کسی گولی نے ہماری جیپ کو ابھی نہیں چھوا تھا، یقیناً وہ دور تھے، محض خوف زدہ کرنے کی خاطر فائرنگ کی تھی۔

ہماری جیپ جنگل میں داخل ہو چکی تھی، کیپل دادا وغیرہ اسی جنگل سے داخل ہوئے تھے۔ اسلم نے بتایا یہ جنگل مختصر ہے اور آگے جا کر ایک نیم پختہ سڑک ہے، جو ایک دو کلو میٹر کے بعد ایک لمبا چکر کاٹ کر چک اڑتالیس جانے والی سڑک سے جا ملتی ہے، وہاں سے ملتان روڈ کی طرف یہ مشکل پانچ چھ کلو میٹر سفر تھا۔ مگر میں ملتان روڈ پر جانے کا خطرہ نہیں مول لے سکتا تھا۔ کوئی بعید نہ تھی کہ اب تک میرے بارے میں پولیس کو بھی بتا دیا گیا ہو اور ناکا بندی کر دی گئی ہو۔ اس لیے میں نے اسلم.... کو مذکورہ راستہ اختیار کرنے سے منع کر دیا اور دوسرے راستے پر آگے بڑھنے کا کہا۔ اسلم نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

شام تاریکی میں ڈھلنے لگی تھی۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس جلانا ناگزیر تھا مگر خطرہ بھی تھا کیونکہ تعاقب میں آتے دشمنوں کی راہنمائی بھی ہو سکتی تھی۔

دفعتاً عقبی سیٹ سے سلیم کی آواز ابھری۔ ''دشمن تعاقب میں آ رہے ہیں۔''

میں اور اسلم... بیک ویو سائیڈ مرر پر گاہے بہ گاہے نظریں ڈالے ہوئے تھے۔ مجھے دو تین گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس دکھائی دے گئیں۔ میری پریشانی اور تشویش میں اضافہ ہونے لگا۔ ہمارے قبضے میں ان کا جو ساتھی تھا اس نے یقیناً سیاق و سباق کے ساتھ میرے بارے میں انہیں بتا دیا ہوگا۔ اور اب بھلا وہ لوگ اپنے ''چھوٹے چوہدری'' (شفقت راجا) کے قاتل (ان کی نظر میں) کو کیسے جانے دیتے۔ وہ مجھے پکڑنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔

مجھے سب سے زیادہ تشویش ان لڑکیوں کی تھی۔ مجھے جلد از جلد اس کارندے سے شکیلہ کے بارے میں پوچھنا تھا۔

''اسلم! ہمیں مقابلہ کرنا ہوگا۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں تیار ہوں، سر... لیکن دشمنوں کی تعداد زیادہ ہے اور معاملہ بھی نازک ہے کہ ان کی مدد کے لیے کسی بھی وقت پولیس انتظامیہ بھی پہنچ سکتی ہے۔ ہمارا نکل جانا ہی بہتر ہوگا۔ آگے جیسے آپ کا حکم ہو۔'' اس کی بات وزن دار تھی۔

مجھے اس وقت خطرناک مجرم کے روپ میں پیش کیا جا رہا تھا۔ کوئی بعید نہ تھی ملک کے سارے اخبارات میں میری تصاویر بھی آ چکی ہوں، گویا میرے لیے سردست کہیں بھی جائے اماں نہ تھی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس وقت میں کسی بھی صورت میں دشمنوں کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہتا تھا۔

دفعتاً عقب سے دوبارہ فائرنگ کی آواز ابھری۔ اسلم نے جیپ کو یکدم ٹرن دیا۔

''آپ فکر نہ کریں سر! میں انہیں جُل دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ بس ذرا اس جنگل سے نکل جائیں۔'' اس نے میری پریشانی بھانپ کر کہا۔ میں چپ رہا۔

اب ٹیلوں ٹبوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اسلم نے ایک موڑ کاٹا تو سامنے ریلوے لائن آ گئی۔ پھاٹک کے ناکے پر اس دور افتادہ علاقہ میں کچھ نہ تھا۔ گویا اپنے رسک پہ ریلوے لائن عبور کرنا تھی، کوئی ٹرین نظر نہیں آ رہی تھی۔

اسلم لائن پار کرنا چاہتا تھا، مگر دفعتاً ہی میرے ذہن میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک خیال ابھرا۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ ہم زیادہ دیر دشمنوں کے تعاقب سے بچ سکتے تھے۔ سیل فون کے ذریعے کوئی بھی کہیں بھی لمحہ لمحہ کی خبر دے سکتا تھا۔ اور پھر معاملہ میرے جیسے خطرناک مجرم کا ہو تو وہ کہاں مجھے ہاتھ سے جانے دیتے۔

ریلوے لائن تک جو کچا راستہ جا رہا تھا اس کے دائیں جانب نشیب میں خشک نالا نظر آیا۔ جس پر پلیا بنی ہوئی تھی، اور اوپر پٹری گزر رہی تھی، میں نے ایک خطرناک فیصلہ کیا اور اسلم کو اس پلیا کے نیچے گاڑی سمیت گھس جانے کا حکم دیا۔... میرے خطرناک ارادے پر وہ ذرا متذبذب دکھائی دیا۔ تاہم اس نے انکار نہیں کیا۔

''ہیڈ لائٹس بجھا دو اور اندر گھس جاؤ۔'' میں نے کہا۔

اس نے سب سے پہلے ساری لائٹس گل کر دیں اور کچے راستے کے دائیں جانب نشیب کے خشک نالے میں جیپ اتار لی، اور اندر اندھیری پلیا کے نیچے داخل ہو کر جیپ روک لی۔

''سلیم! اس سؤر کے منہ پر رومال ٹھونس دو۔ کہیں یہ شور نہ مچانے کی کوشش کرے۔'' میں نے گردن گھما کر کہا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔

اب چہار سُو سناٹا طاری تھا۔ اس خشک نالے میں اُگی ہوئی خودرو قدِ آدم جھاڑیاں ہمیں تحفظ فراہم کر رہی تھیں۔ پلیا کے نیچے تو کسی بنکر کا گمان ہوتا تھا۔ یہاں تھوڑا بہت پانی بھی جمع تھا اور جھاڑ جھنکاڑ میں پھیلا ہوا تھا، ہم سب دم بہ خود سے خاموش بیٹھے تھے، میں نے اسلم اور سلیم کو پہلے ہی سیل فون سائلنٹ پر رکھنے کی ہدایت کر دی تھی۔ میرا دل اس وقت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جب میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں سے گاڑیوں کے انجن کے شور کی آواز سنائی دینے لگی۔ کچھ روشنیاں بھی نظر آ رہی تھیں، جو یقیناً گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس تھیں۔ گاڑیاں شاید اس ناپختہ روش پر آ چکی تھیں، جہاں سے گزر کر ریلوے لائن عبور کی جا سکتی تھی۔

مجھے یقین تھا کہ اس وقت میں ہی نہیں جیپ میں موجود ہر شخص ماسوائے دشمن کارندے کے یہی دعائیں مانگ رہا ہوگا کہ دشمن کی گاڑیاں ریلوے لائن کے دوسری طرف پار ہو جائیں، اور وہی ہوا، قریب سے اور پھر ہمارے سروں کے اوپر سے گزرتی گاڑیوں کا شور جس تیزی سے ابھرا تھا، اسی تیزی کے ساتھ معدوم بھی ہو گیا۔ میں نے سکھ کی سانس لی تھی۔

میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے سلیم سے کہا۔ ''اس سؤر کا گلا دبوچ کر اس کی لاش ادھر ہی پھینک دو تاکہ ہم آگے بڑھ جائیں۔''

میرے سفاک جملوں کی بازگشت یقینی طور پر دشمن کارندے کی سماعتوں تک بھی پہنچی تھی، میرا مقصد بھی یہی تھا، میری توقع کے عین مطابق وہ دست بندھے ہونے کے باوجود بے چینی سے بڑبڑانے لگا۔ موت کا خوف یکدم اس پر طاری ہو گیا تھا۔ منہ میں رومال ٹھونسا ہوا ہونے کے باعث وہ بول تو نہیں سکتا تھا، مگر بے ہنگم اور لایعنی سی آوازیں ضرور برآمد ہونے لگیں۔ جن کا مفہوم بغیر ادائیگی کے یہ سمجھ آتا تھا کہ وہ ہم سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ میرے حکم پر سلیم اس پر جھپٹ پڑا۔ لڑکیاں چیخیں، میں نے انہیں ڈانٹ کر خاموش ہونے کا کہا اور سلیم سے بولا۔ ٹھہرو، تم اِدھر آؤ۔''

سلیم میری سیٹ پر آ گیا اور جیپ کے اندر ہی ہم نے سیٹوں کا تبادلہ کیا۔ میں دشمن کارندے کے پاس جا بیٹھا۔

قابلِ رحم

ایک صاحب: ''میں نے دو شادیاں کیں لیکن دونوں بیویاں مر گئیں، اب کیا کروں؟''
دوسرا: عورت ذات پر رحم۔''

تھوڑی دیر بعد سب لوگ میری چالاکی سمجھ کر خاموش ہو گئے جب میں نے دشمن کارندے کے منہ سے رومال کا گولا کھینچ کر باہر نکالا اور اس سے شکیلہ کے بارے میں استفسار کرنے لگا۔

پہلے میں نے اس پر موت کی دہشت سوار کرنا چاہی تھی، یہ میں نے دانستہ کیا تھا۔ یہ ساری کارروائی اس اندھیری پلیا کے نیچے ہو رہی تھی۔

''کک... کون شکیلہ؟ میں اس نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ میری اصلیت اور میری خوفناک کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد وہ مجھ سے خاصا دہشت زدہ تھا۔

''ہاں! یہ شاید مجھے ہی کرنا پڑے گا...'' میں اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کا گولا بنانے لگا۔ وہ دہشت زدہ ہو گیا۔

''مجھے مت مارو، میں بیوی بچوں والا ہوں۔'' وہ گھگیانے لگا۔

''تو نے ہمارے لیے بڑی مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ اپنے ساتھیوں کو فون پر اطلاع دے کر انہیں ہمارے پیچھے لگوایا۔ ویسے بھی ہم تجھے کہاں لیے لیے پھریں گے؟ یہ گاڑی بھی چھوڑنا چاہتے ہیں، تجھے اپنے ساتھ لیتے جانے کا رسک نہیں لے سکتے۔ اب تک جتنی گناہ آلود زندگی تو نے گزاری، وہ بہت ہے۔'' کہتے ہوئے میں نے رومال کا گولا اس کے جبڑے کو دبوچ کر اندر ٹھونسنا چاہا تو وہ آخری بار منت کرتے ہوئے بولا۔

''د... دے...'' دیکھو اس سارے دھندے میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں تو صرف حکم کا غلام تھا اور بس۔''

''اچھا۔'' کہتے ہوئے میں نے رومال اس کے منہ میں ٹھونسنے والا عمل روک دیا اور دانستہ کچھ سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

''تو پھر میری ایک شرط پوری کرو۔''

''کک... کون سی شرط؟ میں تمہاری ہر شرط پوری کرنے کو تیار ہوں۔''

''مجھے چکر دینے یا بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرنا، کیونکہ مجھے پہلے ہی سے بہت سی باتوں کا علم ہے۔''

میں گھما پھرا کر پانسے پھینکنے لگا۔ ''مجھے ذرا بھی شبہ ہوا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو تو تمہارا گلا دبانے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔''

''پپ... پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' بالآخر اس نے بھنچے بھنچے لہجے میں کہا۔

میں نے اسلم سے گاڑی کی اندرونی لائٹ ذرا دیر کو جلانے کے لیے کہا۔ کھڑکیوں کے شیشے ہم نے چڑھا لیے تھے، کیونکہ گندے نالے کی اس پلیا کے نیچے مچھر بھنبھنا رہے تھے۔

اب میں دشمن کارندے کے چہرے کے تاثرات کو بغور دیکھ سکتا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ثمن خان۔''

''ان لڑکیوں میں ایک شکیلہ نام کی لڑکی بھی تھی، تم یقیناً اسے پہچانتے ہوگے کیونکہ ان کی رکھوالی کے لیے تم ہی فارم ہاؤس میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ متعین تھے، مجھے بتاؤ شکیلہ کہاں ہے؟''

اپنے سوال کے اختتام پر میں نے اپنی آنکھیں سکیڑ کر اس کے چہرے پہ جما دیں۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیری پھر بولا۔ ''شش... شکیلہ''

''ہاں! شکیلہ... صحت مندی اور گوری لڑکی جس کے بال شانوں تک کٹے ہوئے تھے، اور نقوش تیکھے تھے، میرے دوست کی بہن ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تو اگلی سیٹ سے اسلم کی آواز آئی۔

''سر! اس سے جو پوچھنا ہے جلدی پوچھ لیں، زمین کچی ہے زیادہ دیر کھڑے رہے تو جیپ کے ٹائر دھنس جائیں گے، وزن بہت ہے اس پر اور یہ موقع بھی اچھا ہے نکلنے کا۔ دشمن آگے جا چکے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''بس چند منٹ اور... اس نے سچ بولا تو اسے یہیں اتار کر آگے بڑھ جائیں گے، ورنہ ادھر ہی پھینک جائیں گے، لاش کی صورت میں۔'' آخری الفاظ میں نے دانستہ سفاکانہ انداز میں کہے تھے، حالانکہ میرا اسے جان سے مارنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

''ہاں جلدی بولو مگر سچ۔ وقت کم ہے۔ شکیلہ کہاں ہے۔'' میں ثمن کی طرف متوجہ ہوا۔

وہ ایک بار پھر اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے بولا... ''شکیلہ کو راجا صاحب نے مٹھو خان کے حوالے کیا تھا۔''

''مٹھو خان......؟'' میں سوالیہ انداز میں بڑبڑایا۔ ''یہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ کیا شکیلہ ابھی تک اس کے قبضے میں ہے؟''

''ہاں... ابھی تھوڑے دن پہلے ہی مٹھو خان کے آدمی اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔''

''راجا نے ہی سودا کیا تھا؟''

''ہاں...''

''دوسرے سوال کا جواب دو۔''

''مٹھو خان خوب صورت اور کم عمر لڑکیاں خرید کر اندرون سندھ کے بیوپاریوں کو سپلائی کرتا ہے۔ اور وہ چک چھیالیس میں رہتا ہے۔''

''چک چھیالیس؟'' میں چونکا۔ کیونکہ ہم اس وقت چک اڑتالیس میں موجود تھے۔

''اس کا مطلب ہے، وہ جگہ یہاں سے قریب ہے؟''

''ہاں۔''

''تم کیسے یقین سے کہہ سکتے ہو کہ شکیلہ ابھی تک اس کے قبضے میں ہوگی؟''

''مٹھو خان پوری کھیپ بنا کر روانہ کرتا ہے۔ جو ابھی اتنی جلدی پوری نہیں ہوئی ہوگی۔''

''اب سن میری بات... ثمن!'' میں نے آخر میں موضوع لپیٹتے ہوئے کہا۔

''ایک بار پھر سوچ لے کہ تو نے جھوٹ تو نہیں بولا۔ کیونکہ جب تک... تیری باتوں کی تصدیق نہیں ہو جائے گی تو میرے ساتھیوں کے قبضے میں ہی رہے گا۔ ٹھیک ہے پھر...؟''

''میں نے سولہ آنے سچ کہا ہے۔'' وہ بولا۔ ''مگر... مجھے تو چھوڑ دو۔''

''فکر مت کرو۔ میں اپنے وعدے سے نہیں مکرتا۔ ویسے بھی میری تجھ سے دشمنی نہیں ہے۔ لیکن اگر میری محنت تیرے جھوٹ بولنے کی وجہ سے اکارت گئی تو پھر تجھے گلا دبا کر نہیں اذیتیں دے کر ماروں گا۔''

''اگر تم مجھے زندہ چھوڑنے کا وعدہ کر ہی چکے ہو تو فکر نہ کرو۔ میں نے سچ ہی بتایا ہے۔''

''چک چھیالیس تک تو مجھے مٹھو خان کے ٹھکانے تک پہنچائے گا۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے فوراً سلیم کو پیچھے آنے کا کہا اور پھر ثمن کو لیے اگلی سیٹ پر آ گیا۔ اسلم نے فوراً جیپ اسٹارٹ کر کے ریورس کی، اس کا خدشہ

درست ثابت ہونے لگا تھا، نالے کی کیچڑ زدہ زمین پر جیپ کے ٹائر دھنسنے لگے تھے۔ مشکلوں سے جیپ کو باہر نکالا اور آگے بڑھ گئے۔

ثمن اب میرے اور اسلم کے درمیان بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ ہنوز پشت کی جانب بندھے رہنے دیے تھے۔ میں نے اسلم سے پوچھا۔

''تم اب کہاں سے ملتان کے لیے نکلو گے مگر اس جیپ سے چھٹکارا پانا بھی ضروری ہے۔''

اس نے مختصراً مجھے محل وقوع سے آگاہ کیا۔

''مجھے چک چھیالیس پر اتار دینا۔ کتنی دور ہے یہاں سے؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ سامنے ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔

''آپ کو ہم اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ بڑے استاد کا حکم ہی نہیں بیگم صاحبہ کا بھی حکم ہے۔''

''میں اس وقت کسی کے حکم پر یہاں نہیں ہوں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر سرد لہجے میں کہا۔ ''مجھے کس وقت کیا کرنا ہے یہ میں ہی بہتر جانتا ہوں۔'' پھر میں ثمن کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اسے راستہ بتاتے چلو۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جیپ تاریک کچے راستے پر دوڑی جا رہی تھی، کھیتوں اور کچے پکے مکانوں کی آبادی کا مختصر سلسلہ پار کرنے کے بعد چٹیل میدان آ گیا۔ یہ سفر پندرہ سے بیس منٹ میں طے ہوا اور پھر کھیتوں کا سلسلہ آ گیا۔ اس کے بعد باقاعدہ آبادی کے آثار نظر آنے لگے، جیپ کی ہیڈ لائٹ میں راستہ مجھے خاصا کھردرا اور ناہموار نظر آیا۔ یہی سبب تھا کہ جیپ بری طرح ہچکولے کھانے لگی۔ اسلم نے اس کی رفتار فوراً کم کر دی۔

''چک چھیالیس کی حدود شروع ہو گئی ہے۔ اب اس طرف جیپ موڑ لو۔'' ثمن نے ایک طرف اشارہ کیا تو اسلم نے فوراً جیپ اس جانب موڑ لی۔

''سر! گاڑی میں فیول کم ہو رہا ہے۔'' اسلم نے ڈیش بورڈ پر نظر ڈالتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''مٹھو خان کا ٹھکانا کتنی دور ہے؟ اس کا محل وقوع بتاؤ۔'' میں نے اسلم کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے ثمن سے پوچھا تو وہ بتانے لگا۔

''بس... سامنے اس راستے پر ایک گودام نما عمارت نظر آئے گی، یہ راستہ اب پختہ سڑک میں بدلنے والا ہے جو درحقیقت آبادی کے درمیان سے ہو کر گزرتا ہے۔ دائیں جانب وہ عمارت ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے۔ مٹھو خان نے شکیلہ کو ادھر ہی رکھا ہوگا؟''

''امید تو یہی ہے۔''

''مٹھو خان کی رہائش بھی اس عمارت میں ہے؟''

''اس کی رہائش کا مجھے علم نہیں ہے۔ مگر ٹھکانا اس کا یہی ہے۔''

''اس کے آدمی ہوں گے؟''

''ہاں!''

''کوئی خاص آدمی؟''

''اس کے سارے ہی آدمی خاص ہیں۔''

''یہ والی عمارت ہے۔'' اس نے ونڈ اسکرین سے دائیں جانب اشارہ کیا۔ اسلم غیر ارادی طور پر جیپ روکنے لگا مگر میں نے منع کر دیا۔ کچھ آگے جا کر میرے کہنے پر اس نے جیپ روک لی۔

چک چھیالیس ایک چھوٹا شہر نما قصبہ ہی نظر آتا تھا۔ رات کے دس بج رہے تھے، کم ہی لوگ آتے جاتے نظر آئے، مکان دکانیں اور ان کے درمیان بنی ہوئی ٹیڑھی گلیاں نظر آ رہی تھیں۔ دکانیں بیشتر بند تھیں۔ کچھ ہوٹل یا چائے خانے کھلے تھے، ان میں کچھ لوگوں کا رش نظر آتا تھا۔

میں نے اسلم کی طرف دیکھا۔ وہ میری اگلی مہم پر خاصا فکر مند سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اسلم! میں یہاں اتروں گا تم لڑکیوں کو ملتان کے کسی دارالامان میں پہنچانے کی کوشش کرنا۔ یہ تمہارا اور بیگم صاحبہ کا مجھ پر احسان ہوگا۔ یہاں تمہیں کوئی پمپ نظر آ جائے گا۔ فیول بھروا کر نکل جاؤ۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟'' وہ پریشانی سے بولا۔ ''بیگم صاحبہ نے ہمیں آپ کے لیے خاص ہدایت دے کر بھیجا تھا کہ آپ... کو...''

''اسلم۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ہم سب اس وقت خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔ سب سے زیادہ خطرہ تمہیں ہے۔ بیگم صاحبہ سے میرا سلام کہنا اور اس وعدے کے ساتھ کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر ملتان آ کر ان سے ضرور رابطہ کروں گا۔'' پھر میں ثمن سے مخاطب ہو کر بولا۔

''ثمن! اگر تم اللہ کو مانتے ہو تو اس کے نام کی قسم کا یقین بھی کرو گے کسی کا آلہ کار نہیں ہوں، ایک معمولی انسان ہوں... میں نے تمہارے شفقت راجا کا قتل نہیں

کیا نہ ہی میری ان سے دشمنی ہے... بس! مجھے تم سے اتنا ہی کہنا تھا، یہ لوگ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔''

''اسلم! اسے کل تک اپنے ساتھ رکھنا۔ اس دوران میں، میں پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ نہیں پہنچ سکا تو بھی اسے چھوڑ دینا۔ کوئی نقصان پہنچائے بغیر۔'' اسلم ابھی تک سخت تذبذب کا شکار تھا اور میں اس کی وجہ بھی جانتا تھا۔ لڑکیاں بھی مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نگاہوں میں میرے لیے احترام و شکر گزاری تھی۔ میں نے ان کے سلسلے میں اسلم کو ہدایت کردی کہ انہیں فوراً کسی دارالامان میں پہنچانے کی کوشش کرے یا پھر جہاں یہ اپنی مرضی سے جانا چاہتی ہیں جانے دیا جائے۔

اسلم نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا کر جیپ کی باڈی تھپتھپادی اور دور ہٹ گیا۔ ناچار اسلم نے جیپ آگے بڑھادی۔ میں چند ثانیوں تک جیپ اور دور ہوتی بیک لائٹ کو تکتا رہا۔ اس کے بعد میں پلٹا اور... مذکورہ عمارت کی جانب بڑھنے لگا۔

رات گہری ہو رہی تھی۔ گرد و پیش میں سناٹا طاری تھا... عمارت پر بھی گہری خاموشی طاری تھی۔ جب میں نزدیک پہنچا تو مجھے اس کے داخلی دروازے پر ایک آدمی سگریٹ پیتا دکھائی دیا۔ وہاں ایک دیوار پر نصب بلب روشن تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا اور اسے سلام کیا۔ وہ اونگھتا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ میرے مخاطب کرنے پر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری جانب تکنے لگا۔

''مجھے استاد مٹھو خان سے ملنا ہے۔''

وہ بہ غور آنکھیں سکیڑ کر میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''تم کون ہو اور استاد سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہو؟''

''دام اور کام کے سلسلے میں آیا ہوں، نام میرا اولی بھائی ہے۔ اوکاڑہ سے آیا ہوں۔'' میں نے دانستہ معنی خیز مسکراہٹ سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''مگر استاد تو یہاں نہیں ہے لاہور گیا ہوا ہے۔ دو روز بعد لوٹے گا۔'' وہ بولا۔ ''کیا تم نے فون پر ان سے رابطہ نہیں کیا؟''

''میں پہلی بار مٹھو خان سے ملنے آیا ہوں۔ اوکاڑہ کے ایک بڑے زمیندار چوہدری مشتاق نے مجھے بھیجا ہے۔ وہ تو کہہ رہے تھے کہ مٹھو خان نہ ہو تو اس کے کسی ساتھی سے بات کرلینا۔ اندر کوئی تو موجود ہوگا؟'' میں نے چالاکی سے کہا اور اندر کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے کوئی گاڑی وغیرہ کھڑی نظر نہیں آرہی تھی جس کا مطلب تھا کہ میدان صاف ہے، وہ میری بات کے جواب میں بولا۔

''ہاں! تم اِدھر ہی ٹھہرو... میں ذرا اندر بتا کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹا اور عمارت کے اندر غائب ہوگیا۔ میں کھڑا رہا اور عمارت کا جائزہ لیتا رہا۔ عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی، نظر تو گودام ہی کی طرح آرہی تھی، مگر ایک دو مختصر سے رہائشی کمرے چھوٹے سے برآمدے میں نظر آرہے تھے۔ اندر سے ایک ٹھگنے قد کا آدمی نمودار ہوا، پہلا آدمی اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ظاہر ہے میرے بارے میں ہی بتا رہا تھا۔ مڑ کر اس نے میری جانب اشارہ بھی کیا تھا۔ اس پر ٹھگنے آدمی نے اس طرف ایک نظر دیکھا بھی تھا، پھر وہ اس کے ہمراہ میری طرف آنے لگا۔ میں سنبھل کر کھڑا رہا۔ میرے قریب آکر وہ غور سے میرا چہرہ دیکھنے لگا پھر پوچھا۔

''ہم کسی چوہدری مشتاق کے آدمی کو نہیں جانتے ہیں۔ تمہیں استاد مٹھو کے بارے میں کس نے خبر دی ہے؟''

''تم نہیں جانتے ہوگے، مگر تمہارا استاد ضرور چوہدری صاحب کو جانتا ہوگا۔ ایک دانے کے بارے میں چوہدری صاحب کی ان سے بات ہو چکی ہے۔ اب مجھے چوہدری صاحب نے رقم دے کر بھیجا ہے۔''

''دانہ...؟'' کہتے ہوئے وہ بغور میرا چہرہ تکنے لگا۔ اس کے اس انداز سے میرے اندر خدشات ابھرے کہ کہیں دشمن نے مجھ سے کسی قسم کا جھوٹ تو نہیں بولا تھا مگر وہ ایسی جرأت کیسے کرسکتا تھا۔

''کتنے پیسے لائے ہو؟ اور کون سا دانہ چاہیے۔'' معاً ٹھگنے نے مسکرا کر پوچھا اور میرے اندر طمانیت کی لہر دوڑ گئی۔

''5 لاکھ لایا ہوں، شکیلہ نام کی لڑکی کے بارے میں بات ہوئی تھی، جو شفقت راجا سے خرید کر استاد لایا تھا۔'' مجھے اپنی بات میں وزن اور حقیقت پیدا کرنے کے لیے مجبوراً یہ کہنا پڑا۔

''شکیلہ...! لیکن ... خیر... آؤ... میرے ساتھ۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا پھر مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے پیچھے ہولیا۔

وہ جس کمرے سے برآمد ہوا تھا، مجھے وہیں لے گیا۔ کمرا مختصر سا تھا ایک پلنگ اور چارپائی بچھی ہوئی تھی، درمیان میں چار کرسیاں اور ایک میز رکھی تھی۔ اندر پہلے سے موجود دو آدمی تاش کھیل رہے تھے، کمرے میں سگریٹ کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ ایش ٹرے میں بجھے ہوئے سگریٹ پڑے تھے، تھوڑی دیر پہلے تک وہ شاید سگریٹ پی رہے تھے۔

دونوں نے مجھ پر اچٹتی سی نظر ڈالی تھی، پھر کھیل میں مگن ہوگئے، ٹھگنا آدمی مجھے لیے کرسیوں پر جا بیٹھا پھر بولا۔

''جس لڑکی کا تم نے نام لیا ہے اس کا سودا کرنے کے لیے ہی استاد مٹھو لاہور گیا ہوا ہے۔ مگر حیرت ہے تمہارے چوہدری... کیا نام بتایا تھا؟''

''مشتاق صاحب... چوہدری مشتاق'' میں نے کہا۔

''ہاں کیا اس نے استاد مٹھو سے بات نہیں کی تھی فون وغیرہ پر؟''

''میں نے بتایا نا کہ چوہدری صاحب سے استاد کی براہِ راست کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔'' میں نے موقع محل کے مطابق بات کو گھمانے پھرانے کی کوشش کی۔ ''شفقت راجا کے ذریعے سے بات ہوئی تھی، جن سے تمہارا استاد مٹھو شکیلہ کو خرید کر لایا تھا... مگر بدقسمتی سے پرسوں ان کا قتل ہوگیا... لیکن تمہارا استاد یہی سمجھا ہو کہ ان کی موت کے بعد یہ سودا بھی ختم ہوگیا۔''

''ہاں! یہ بات تو ہمارے علم میں بھی ہے۔'' وہ ہولے سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ مجھے خدشہ ہوا کہ وہ شفقت راجا کے قاتل کی حیثیت سے پہچان نہ لے۔ کیونکہ میرے کلوزاپ چہرے کی ویڈیو ہر چینل پر دکھائی گئی تھی، مگر... ضروری نہ تھا کہ ہر خاص و عام کو میری صورت یاد رہتی اور پھر اسکرین اور حقیقت میں تھوڑا فرق یوں بھی آہی جاتا ہے۔ شکر تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا ابھی تک۔

''شکیلہ تو اِدھر ہی ہے نا؟'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھ لیا۔ ''میرا مطلب تھا، اگر ہے تو ہم آپس میں سودا طے کرلیتے ہیں۔ بے شک تم اپنے استاد سے بھی فون پر بات کرلو۔''

''لڑکی تو ادھر ہی ہے۔ اور صرف اب وہ ہی بچی ہے مگر یہ بہت ٹیڑھی ہے دوبار خودکشی کی کوشش کرچکی ہے۔ استاد تو اسے خرید کر پچھتا رہا ہے۔ ایسی لڑکیاں ہمارے لیے مصیبت کھڑی کردیتی ہیں۔ تم میرے ساتھ سودا کرلو۔ بعد میں، میں استاد سے بات کرلوں گا۔ رقم لائے ہو؟'' اس نے کہا۔ پانچ لاکھ کی رقم کا سننے کے بعد اس کا رویّہ بدل گیا تھا۔

''رقم میرے پاس موجود ہے مگر میں پہلے اپنے مطلب کا دانہ پرکھنا چاہوں گا۔''

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی دھڑکتے دل سے... اس کے ساتھ ہولیا۔ کمرے سے باہر آکر ہم ساتھ والے دوسرے کمرے کی طرف بڑھے۔ میرا خیال تھا وہ کمرے میں داخل ہوگا۔ مگر وہ اس کے سامنے سے گزرتا ہوا ایک نسبتاً بڑے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

میری کچھ جھوٹی سچی باتوں نے اسے مجھ پر بھروسا کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ ظاہر ہے شفقت راجا کا حوالہ کم نہ تھا۔ تاہم مجھے یہ سن کر خوشی بھی ہوئی تھی کہ شکیلہ یہاں موجود تھی، مگر یہ سن کر دکھ بھی ہوا تھا کہ وہ بے چاری کس حال میں تھی، اور دوبار خودکشی کی کوشش بھی کرچکی تھی، کیونکہ میں جانتا تھا شکیلہ ایک شریف زادی تھی۔

لڑکیوں اور عورتوں کی سوداگری کرنے والے کس طرح درونِ خانہ اپنا مکروہ کاروبار چلا رہے تھے، مجھے اس کا بہت قلق تھا۔ ان کی بیخ کنی کرنا انتظامیہ کا کام تھا۔ جو نجانے کیوں اپنے اس فرض سے پہلوتہی کیے ہوئے تھے۔ اپنی مہم کے دوران مجھے اب تک یہی پتا چلا تھا کہ ایسی مجبور لڑکیاں زیادہ تر محبت کے جھانسے میں آکر برباد ہوتی ہیں۔ یہ بھیانک انکشاف بھی میری عملی جدوجہد میں آشکارا ہوا تھا کہ بعض فلاحی اداروں یعنی دارالامان سے ایسی مجبور پناہ گزین لڑکیوں کو حاصل کیا جاتا رہا ہے۔

بہرحال میں نے اپنی شرٹ کے اندر پینٹ کی بیلٹ میں اڑسے ہوئے پستول کی موجودگی کا اطمینان کیا۔ تب وہ ٹھگنا آدمی مجھے لیے مذکورہ گیٹ نما دروازے سے لے کر اندر داخل ہوا۔ اندر تاریکی تھی۔ اس نے ہاتھ سے کوئی سوئچ بورڈ ٹٹول کر بٹن آف کیا۔ روشنی ہوتے ہی مجھے آس پاس اناج اور کھاد وغیرہ کی بوریوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ البتہ سامنے کی دیوار سے ایک کونے میں ایک سنگل پٹ والا دروازہ دکھائی دیا تھا جو بند پڑا تھا۔ ٹھگنا آدمی اس طرف بڑھا تھا اور میں اس کے پیچھے تھا۔

دروازے پر تالا نصب تھا۔ اس نے جیب سے چابی نکال کر اسے کھولا اور اندر داخل ہوا۔ مجھے اس نے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تھا۔

اندر ہلکے پاور کا بلب روشن تھا۔ اس روشنی میں مجھے ایک کونے میں ننگی اینٹوں کے فرش پر کوئی لڑکی ہاتھ پاؤں بندھی بے سدھ پڑی دکھائی دی۔ میں اس کی وضع قطع سے ہی اسے پہچان گیا تھا۔ وہ میرے دوست شوکت حسین عرف شوکے کی بدنصیب بہن شکیلہ ہی تھی۔ میرا دل خون کے

آنسو رو پڑا۔ وہ واقعی شکیلہ ہی تھی، میرے اطفال گھر کی ساتھی۔ میری طرح لاتعداد بدنصیب اور ٹھکرائے ہوئے بچوں کی ہم جولی۔ جو اطفال گھر میں ہی پرورش پا کر جوان ہوئے تھے۔ میں نے عقب میں آہستگی کے ساتھ دروازہ بند کر دیا۔

''چل اے اٹھ حرام زادی! بہت ڈرامے کر لیے تو نے۔'' ٹھگنے آدمی نے شکیلہ کے جسم کو پاؤں سے ٹھوکر مار کر حقارت سے کہا تو میرے وجود میں چنگاریاں بھرنے لگیں۔ شکیلہ شاید کچھ کچی نیند میں تھی، بے چاری یکدم ہڑبڑا کر اٹھی۔ پہلے اس نے ٹھگنے آدمی پر نگاہ ڈالی، پھر مجھ پر اور جیسے گویا مجھے پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ تب تک ٹھگنا آدمی میری طرف پلٹ کر بولا۔

''پہچان لو۔ اچھی طرح سے اپنا دانہ... پھر باہر نکل کر سودا کرتے ہیں۔''

''ہاں، ہے تو وہی۔'' میں نے اپنے اندر کے ابال پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے کہا اور پھر۔ ''فکر نہ کرو ادھر ہی سودا کر لیتے ہیں۔ اپنے پیسے لو... اور دانہ اسی وقت میرے حوالے کر دو۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے کھلے بٹنوں والی شرٹ کے اندر ہاتھ ڈال دیا۔ اس دوران حسب توقع شکیلہ مجھے دیکھ کر چلا اٹھی۔

''شہزی! تم...''

ٹھگنے آدمی کو زبردست حیرت کا جھٹکا لگا۔ تب تک میرا ہاتھ پستول سمیت باہر آ چکا تھا۔ اور میں نے وہ اس پر تان کر درندگی سے کہا۔

''تم نے اگر ذرا بھی آواز نکالی تو گولی تمہارا بھیجا پھاڑ دے گی۔'' ٹھگنے آدمی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ شکیلہ مجھے پہچان کر شدت جذبات سے رونے اور سسکنے لگی، میں نے اسے خاموش رہنے کی تاکید کی، پھر ٹھگنے آدمی کی تلاشی لی، اس کی جیب سے ایک چاقو برآمد ہوا، یہ عام پھل کاٹنے والا چاقو تھا، جس کی مدد سے میں نے پہلے شکیلہ کے ہاتھ کی رسی کاٹی اور پھر چاقو اسے تھما دیا تاکہ وہ اپنے پیروں کی رسی بھی کاٹ ڈالے۔ میں نے ٹھگنے پر پستول تانے رکھا تھا۔ وہ بے بسی سے بری طرح پیچ و تاب کھاتا نظر آ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد شکیلہ آزاد تھی۔ میں نے ٹھگنے آدمی کو اس کمرے میں بند کر دیا پھر شکیلہ کو لیے باہر آ گیا۔

پستول دوبارہ اپنی جگہ اڑس لیا، باہر وہی آدمی بیٹھا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

''جاؤ، اندر جا کر اپنا انعام وصول کر لو اپنے ساتھی سے، سودا ہو گیا ہے۔'' وہ فوراً اندر دوڑا اور میں شکیلہ کو لیے ایک طرف تاریکی میں بڑھتا چلا گیا۔

☆☆☆

شکیلہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی، اس کے کپڑے بری طرح مسخ ہو چکے تھے، چہرے اور ہاتھوں پیروں پہ بھی خراشوں کے نشانات تھے۔ بال بھی بکھرے ہوئے سے تھے۔ اول خیر نے مجھے کچھ روپے دے رکھے تھے، شکیلہ کے ساتھ فی الحال تفصیلی بات چیت کا موقع نہ تھا۔ میں اب اسے جلد از جلد یہاں سے ملتان لے جانا چاہتا تھا۔ پھر سرمد بابا کے ہاں اسے چھوڑنے کے بعد میرا ارادہ ''بیگم ولا'' جانے کا تھا۔ مجھے اول خیر کی خیریت بھی معلوم کرنا تھی۔

شکیلہ اور میرے درمیان البتہ مختصر بات چیت ہوئی تھی اور وہ میری بے حد ممنون تھی۔

میں بائی روڈ ملتان جانے کے بجائے کسی ٹرین وغیرہ کے ذریعے سفر کرنا چاہتا تھا۔ مجھے عابدہ کی بھی فکر تھی، اب تک اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اور سرمد بابا یقیناً میری طرف سے فکرمند اور پریشان ہوں گے۔ کوئی بعید نہیں، انہوں نے ٹی وی پر میری ویڈیو کلپ بھی دیکھ لی ہو۔

بلاشبہ مجھے احساس تھا کہ میں بہت سارے مسائل اور مصائب کا شکار ہو چکا ہوں۔ زبیر خان مجھے اپنے بیٹے کا قاتل سمجھ رہا تھا، اور سب سے بڑی پریشانی کی بات یہ تھی کہ وہ چوہدری الف خان اور ممتاز خان کا دوست تھا۔ اور میں خود ان دونوں کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوا تھا، میرا مقدمہ ملتان کی عدالت میں تھا، اور اب ممتاز خان وغیرہ کو میرے خلاف خم ٹھونکنے کے لیے زبیر خان کے ذریعے بڑا سہل راستہ ہاتھ آیا تھا۔ ملتان میں یقیناً گمبھیر مسائل اور پریشانیوں کا ایک انبار میرا منتظر تھا۔ کوئی بعید نہ تھی کہ پولیس میری تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہو۔

شکیلہ میرے چہرے کے پریشان کن تاثرات بھانپ کر اس کی وجہ پوچھ رہی تھی مگر میں ابھی اسے کوئی جواب نہیں دے پا رہا تھا۔

کسی سے پوچھ تاچھ کر ہم ریلوے اسٹیشن پہنچے تو انکوائری آفس سے معلوم ہوا کہ رات بارہ بجے ایک لوکل پسنجر ٹرین یہاں سے خانیوال روانہ ہوگی۔ اس وقت ساڑھے گیارہ ہو رہے تھے، ٹرین کے آنے میں بیس پچیس منٹ تھے، میں نے خانیوال کے دو ٹکٹ لیے اور پلیٹ فارم

پرسینٹ کی بینچ پر آبیٹھا۔
''کیا بات ہے شہزی؟ تم اتنے پریشان کیوں نظر آرہے ہو؟''
میں اب اسے اپنی پریشانیاں کیا بتاتا۔ بولا۔ ''کوئی خاص بات نہیں، بس ایک ہی فکر ہے کہ تمہیں تمہارے بھائی شوکت حسین کے پاس پہنچادوں۔''
''میں اب اپنے بھائی کا سامنا نہیں کرسکتی۔'' وہ بولی اور بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ چہرے پہ رکھ کر رو پڑی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کا جواب اس کے آنسو اور سسکیاں کافی تھیں۔ میں بے اختیار ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ عورت کچا برتن ہوتی ہے اور توڑنے والے ظالم ہاتھ بہت طاقت ور۔۔۔ جب تک وہ اطفال گھر کی چہار دیواری میں تھی، وہ اور اس کی عزت محفوظ تھی، مگر اس کی بدقسمتی تھی کہ واصل جہنم گل خان نے دیگر پانچ لڑکیوں کے ساتھ اس کا بھی سودا کیا تو پھر یہ بدنصیب شکیلہ نجانے کہاں سے کہاں پہنچادی گئی۔ اب شاید میں اس کی جان ہی بچاسکا ہوں یا پھر اسے اس جہنم سے نکال پایا ہوں۔ لیکن اس کے آنسو اور سسکیاں جو اس کی کھوئی ہوئی عزت کا پتا دیتے تھے، اس کے لیے شاید جان سے بڑھ کر تھی کہ وہ اپنے بھائی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔
''مجھے افسوس ہے شکیلہ۔ مجھ سے جو ہوسکا میں نے تمہاری خاطر کیا۔ تم شاید نہیں جانتی ہو کہ۔۔۔ میں نے اس نیک مقصد کے حصول کی خاطر کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی ہوگی۔۔۔ اس دوران ایک بڑی مصیبت کا بھی شکار ہوا، ابھی تم نے مجھ سے پوچھا تھا نا کہ میں اتنا پریشان کیوں نظر آرہا ہوں۔۔۔ تو اس مصیبت اور مشکل حالات کے باعث ہوں۔'' میں نے ہولے سے کہا اور پھر دھیرے دھیرے اسے ساری بات بتادی۔ یہ سن کر اس کے حلق سے پہلے سے زیادہ تکلیف دہ آہ برآمد ہوئی، پھر اس نے دھیرے سے میرے شانے کو اپنے ہاتھ سے چھوا تو میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر میرے لیے تفکرانہ جذبات عیاں تھے۔ مگر اس کے چہرے میں آزردگی اور دکھ کے بھی آثار محسوس ہوتے تھے۔ وہ اسی لہجے میں بولی۔
''ہماری خاطر تمہیں اپنے سر کتنی بڑی مصیبت مول لینا پڑی، شہزی! یہ احسان میں اور شاید وہ کم نصیب لڑکیاں کبھی نہیں بھلاسکتیں۔ مگر مجھے دکھ کے ساتھ تشویش بھی لاحق ہوگئی ہے کہ اب تم کس طرح اس پریشانی سے نجات حاصل کروگے؟''
''تمہارے ساتھ کس نے زیادتی کی تھی؟'' یکلخت میں نے پوچھ لیا۔ اس کا سوال میں نے نظرانداز کردیا تھا۔
''ان میں سے کچھ کو تم جہنم واصل کرچکے ہو۔'' اس نے سر جھکا کر دھیرے سے جواب دیا۔ ''لیکن میری زندگی برباد کرنے والا۔۔۔ ممتاز خان ہی تھا۔ اطفال گھر سے گل خان نے ہمیں سب سے پہلے ممتاز خان کے حوالے ہی کیا تھا۔ اس وقت عابدہ بھی ہمارے ساتھ تھی! بدقسمتی سے میں اور عابدہ۔۔۔ اس عیاش۔۔۔ کو زیادہ پسند آگئی تھیں۔''
''کک۔۔۔ کیا۔۔۔ عابدہ۔۔۔ بھی۔۔۔؟''
عابدہ کے ذکر پر میرے دماغ کی نسیں کھنچ گئیں اور میں نے فوراً اس کی بات کاٹ کر دھڑکتے دل سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ''نہیں۔''
اس کی نفی پر میں یکلخت پُرسکون سا ہوگیا۔ عابدہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔ کیونکہ میں نے اس ''خدشے'' کے بارے میں اس سے بھی پوچھا تھا اور اس نے مجھے تسلی دی تھی کہ اس کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ میں پھر مستفسرانہ نظروں سے شکیلہ کی طرف دیکھنے لگا۔
''ممتاز خان کی کمزوری تھی کہ وہ عیاش پرستی میں زبردستی کا قائل نہ تھا۔ بڑی عجیب فطرت کا آدمی تھا وہ مگر شیطان کا دوسرا روپ ضرور تھا۔ جبکہ میں اور عابدہ کسی بھی صورت میں اس کی عیش پرستی کا سامان نہیں بننا چاہتی تھیں۔ اور اس کے سامنے خودگزیدگی اختیار کرنا چاہی تو اس نے ہم پر تشدد کیا۔ مگر اس شیطان کو اس بات کا بھی احساس ہوچکا تھا کہ میں اور عابدہ ایک دوسرے کی قریبی سہیلیاں اور دکھ درد کی ساتھی ہیں۔ اس نے مجھے عابدہ کے حوالے سے بلیک میلنگ کا سہارا لیا اور دھمکی دی کہ اگر میں اس کے ساتھ دوستانہ ماحول میں اس کی دلبستگی کا سامان کروں تو وہ عابدہ کو کچھ نہیں کہے گا۔ بصورت دیگر وہ اسے اپنے وحشی درندوں کے حوالے کردے گا۔ عابدہ کو میری اس قربانی کا پتا بھی نہیں، لیکن میں نے ممتاز خان کی بات مان لی اور عابدہ کی عزت بچالی۔۔۔ وہ عابدہ کو چھوڑنے پر بھی رضامند ہوگیا تھا۔ میں نے شرط رکھی تھی کہ جب تک عابدہ آزاد ہونے کے بعد مجھے اپنی خیریت کی اطلاع نہیں دے گی میں اس کی (ممتاز خان کی) بات نہیں مانوں گی، دوسرے روز ممتاز خان نے مجھے خود ہی بتادیا کہ عابدہ کو تمہارے کچھ ساتھی، کارندوں کے چنگل سے چھڑا لے گئے ہیں۔ کچھ ایسی نشانیاں اور شواہد جانچنے کے بعد مجھے تسلی ہوگئی تھی کہ اب

عابدہ تمہارے پاس بہ خیر و عافیت پہنچ چکی تھی۔۔۔ اس کے بعد میں ممتاز خان کے لیے صرف ایک کھلونا بن کر رہ گئی۔ پھر جب اس کا دل بھر گیا تو مجھے اس نے اوکاڑہ کی ایک نائکہ چنی بائی کے ہاتھ فروخت کردیا۔ وہاں سے پھر میرا دوگنے داموں سودا کرادیا گیا اور میں شفقت راجا کے پاس پہنچادی گئی، اور وہاں سے منحوخان کے پاس۔
اپنی المناک داستان سنانے کے بعد وہ گردن موڑ کر پلیٹ فارم کے ایک تاریک ویران گوشے کی طرف دیکھنے لگی۔ میرے اندر ایک جوار بھاٹا سا بیدار ہونے لگا۔ دل و دماغ آندھیوں کی زد میں تھا۔ شکیلہ نے میرے اور عابدہ کے لیے عظیم اور ناقابلِ فراموش قربانی دی تھی، خود کو فنا کر کے عابدہ کو پراگندگی سے بچایا تھا۔ ایسی مثال قربانی تو اب خال خال ہی نظر آتی تھی۔ آج کل کون دوسرے انسان کے لیے اتنی بڑی قربانی دیتا ہے۔ میں نے اب تک شکیلہ کے لیے جو پریشانی اور مصیبت اٹھائی تھی، وہ تو مجھے اس عظیم لڑکی کے سامنے بالکل ہی ہیچ محسوس ہونے لگی۔ شکیلہ کے اس قابلِ لحاظ عمل اور انسانیت پرور قربانی سے میرا دل و دماغ اس کے لیے وفورِ جذبات سے جھیر جھیر ہونے لگا۔
''شکیلہ۔'' میں نے جب اسے ہولے سے پکارا تو میری آواز میں بے حد لرزش تھی۔
وہ ابھی تک تاریک پلیٹ فارم کے ایک ویران گوشے میں کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جمائے خاموش رہی مگر میں جانتا تھا کہ اس پر کیا بیت رہی تھی۔ میں نے بے اختیار اس کے مرمریں شانے پر ملائمت سے ہاتھ رکھ دیا اور اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ ایک بار پھر مجھے اس کے ہولے ہولے انداز میں سسکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے دوبارہ دل کی عمیق گہرائی سے اسے پکارا۔
''شکیلہ تم بہت عظیم ہو۔۔۔ تم نے عابدہ کی خاطر گویا میری خاطر۔۔۔ اتنی بڑی سزا جھیلی۔۔۔ اتنی بڑی تکلیف اپنے جسم پر ہی نہیں اپنی روح پر بھی برداشت کی، اس کے سامنے تو مجھ پر آنے والی مصیبت کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی، اور۔۔۔ اور عابدہ کو بھی یہ معلوم نہ ہوسکا کہ تم نے اس کے لیے خود کو کیسے قعرِ فنا میں دھکیل دیا۔ مگر نہیں، یہ قعرِ فنا نہیں یہ تو تمہاری ایک نیکی کی اعلیٰ درجے کی معراج ہے جو تم نے اس طرح کی۔۔۔ کہ گویا اس محاورے کی مثال بن گئی۔ نیکی کر۔۔۔ دریا میں ڈال۔۔۔ اللہ ہی تمہیں اس کا اجر دے گا۔۔۔ شکیلہ۔۔۔ لیکن میں پھر یہی کہوں گا کہ۔۔۔ تمہیں اپنے بھائی شوکت حسین سے ضرور ملنا چاہیے۔ دیکھو۔۔۔ بھائی بہن کا رشتہ بہت عظیم ہوتا ہے۔ یہ دنیا میں صرف ایک بار ہی ملتا ہے۔ وہ بھی بے چارہ تمہارے لیے پریشان ہو رہا ہوگا۔''
''شہزی!'' مجھ میں بھائی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو پارہی۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔
''پگلی ہو تم۔'' میں نے دوستانہ انداز میں اس کا گال تھپتھپایا۔ ''تمہاری نیکی تمہارے اعمال میں لکھ دی گئی، تم نے کوئی گناہ کوئی جرم نہیں کیا۔ اور جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا یا کیا گیا اس میں۔۔۔ تمہارا کوئی دوش نہیں، بس! تم میرے ساتھ چلو۔۔۔ اور سب کچھ بھلادو۔'' میں نے ذرا رک کر ایک گہری سانس خارج کی اور خودکلامیہ انداز میں بولا۔ ''پتا ہے وہاں (اطفال گھر) کے۔۔۔ کیا حالات ہیں۔ اس کا بھی مجھے پتا کروانا تھا۔ لیکن تم تب تک۔۔۔ سرمد بابا کے پاس رہوگی، وہ بہت اچھے اور نیک انسان ہیں، عابدہ بھی انہی کے پاس ہے۔ پھر آگے کا سوچیں گے۔''
اتنے میں ٹرین آگئی اور ہم اس میں سوار ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین روانہ ہوگئی۔ چونکہ یہ لوکل پسنجر ٹرین تھی اس لیے ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر رک۔۔۔ کر چل رہی تھی۔
رات کے دو بجنے والے تھے، میں نے شکیلہ کو برتھ پر لٹادیا اور خود نیچے سیٹ پر اونگھنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔
صبح میاں چنو پہنچے تو ہم نے چائے اور بسکٹ کا ناشتا کیا۔ شکیلہ اب برتھ سے اتر کر میرے سامنے والی سیٹ پر آن بیٹھی تھی۔
ٹرین رک چکی تھی، بوگیوں کو انجن سے علیحدہ کردیا گیا تھا۔ بوگیوں کی چھت پر ربڑ کے بڑے بڑے پائپوں سے پانی بھرا جارہا تھا۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کا رش تھا۔ اسپیکر پر آنے جانے والی ٹرینوں کا اعلان وقفے وقفے سے ہو رہا تھا۔
اسٹیشن پر عجیب منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہر طرف گہما گہمی اور افراتفری کا عالم ہوتا ہے۔
ایک نوعمر لڑکا ہاتھ میں اخبارات کے پلندے لیے بوگی میں سوار ہوا۔ تو قریب پہنچنے پر اچانک میری نظر اس کے ایک ہاتھ میں جھولتے ہوئے اخبار کی شہ سرخی پر پڑی اور مجھے گویا سانپ سونگھ گیا۔ میں نے یکدم سنبھل کر ہاکر لڑکے سے وہ اخبار خریدا۔۔۔ شہ سرخی کا لب لباب شفقت راجا کے قتل اور مجھ سے تھا۔ مگر اہم خبر جو جلی حروف میں تھی۔۔۔ وہ میرے خلاف ''ڈیتھ وارنٹ'' کی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا۔ بغیر

کسی تحقیق وتفتیش کے میرے خلاف پولیس انتظامیہ نے ڈ-یتھ وارنٹ جاری کردیے تھے، یہ ایک المیہ تھا۔ انصاف کے تقاضوں کی پامالی تھی، مجھے ایک خطرناک اشتہاری مجرم ہی نہیں بلکہ دہشت گرد بھی قرار دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ پوری تفصیل کے ساتھ... میرا نام مع عرفیت کے اخبار میں درج تھا اور میری تصاویر بھی تھیں۔ اطفال گھر میں افراتفری اور مارا... ماری بھی میرے کھاتے میں ڈال دی گئی تھی۔ اور نجانے کیا کیا میرے بارے میں لکھا تھا جس کا مجھ سے تعلق ہی نہیں بنتا تھا۔ اس میں ملتان کے معروف صنعت کار سیٹھ منظور وڑائچ یعنی سرمد بابا کا بھی ذکر تھا... انہیں میرا پشت پناہی کرنے والا سرپرست بتایا گیا تھا، یہی نہیں، بیگم ولا کی بیگم صاحبہ، اول خیر اور کبیل دادا کے نام بھی درج تھے، مذکورہ اخبار میں... کھلاں والی کے زبیر خان اور نیو ملتان کے چوہدری الف خان سمیت ممتاز خان کے بھی میرے خلاف بڑے تندوتیز بیان تھے۔ ان کے راتب خور... انسپکٹر روشن خان کا بھی میرے خلاف بیان تھا۔

اخبار میں چھپنے والے اس سفید جھوٹ پر میں نے غصے سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ اور مارے طیش کے اخبار کو توڑ مروڑ ڈالا۔ شکیلہ مڑا تڑا...... اخبار مجھ سے لے کر پڑھنے لگی۔

''ی... ی... یہ کیا ہے شہزی؟''

یہ ساری اخباری خرافات پڑھنے کے بعد شکیلہ کے چہرے پر تشویش کا جال بن گیا اور وہ متوحش سے لہجے میں میری طرف دیکھ کر بولی۔ میں کیا بولتا... خود پریشان تھا اور اس ناانصافی پر اندر ہی اندر کھول بھی رہا تھا۔ سب سے زیادہ میرے لیے تشویش کی بات یہ تھی کہ عدالت سے یہ چوہدری ممتاز خان کے خلاف مقدمہ بھی خارج کردیا تھا۔ انسپکٹر روشن کو... نہ صرف اپنی سابقہ پوسٹ پر بحال کردیا تھا بلکہ اسے میری تلاشی وغیرہ کے سلسلے میں چارج دیتے ہوئے کچھ اضافی اختیارات بھی خصوصی طور پر تفویض کردیے گئے تھے۔ یہ وہ تفاصیل تھیں جو اخبار کے اندرونی صفحات میں تفصیل کے ساتھ درج تھیں۔ کھلاں والی سے میرا کیس بھی ملتان کی ہائی کورٹ میں چلانے کا فیصلہ کیا اور ایسا یقیناً ممتاز خان اور زبیر خان کی ملی بھگت سے ہی ہوا ہوگا۔ انسپکٹر روشن خان جیسے راتب خور شخص کو میرے کیس پر متعین کرنا ایسا ہی تھا جیسے بھیڑیے کو بھیڑوں کی رکھوالی سونپ دی جائے۔

ان تمام باتوں سے متعلق کئی خدشات اور متوقع نتائج کے تشویشناک وسوسے میرے دل ودماغ میں پرورش پانے لگے، انسپکٹر روشن مجھ پر ادھار کھائے بیٹھا تھا اور ممتاز خان تو اطفال گھر والے واقعے کے بعد سے گویا میرا جانی دشمن بن چکا تھا۔ جب کہ زبیر خان مجھے اپنے بیٹے کا قاتل سمجھے ہوئے تھا۔ ان میں اشرف اور ممتاز خان میری ایک کمزوری سے واقف تھے۔ اور وہ تھی عابدہ... اگرچہ وہ بالکل محفوظ مقام پر تھی۔ اور سرمد بابا بھی معمولی حیثیت کے آدمی... نہیں تھے مگر پھر بھی جانے کیوں میں عابدہ کی طرف سے سخت بے چینی کا شکار ہونے لگا۔

شکیلہ میری پریشان کن سوچوں کو میرے چہرے سے محسوس کرتے ہوئے مجھے تسلیاں اور دلاسے دینے کی کوشش کررہی تھی، تھوڑی دیر بعد انجن کی تیز وسل نے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔ ٹرین شاید روانہ ہونے والی تھی، میں یونہی کھڑکی سے باہر پلیٹ فارم پر مسافروں کی طرف تکنے لگا تو معاً ایک لڑکی کو دیکھ کر بری طرح چونکا... نہ صرف اس لڑکی کو بلکہ اس کے ہمراہ اس نوجوان کو دیکھ کر بھی۔ میں ایک لمحے کے لیے بت سا بن گیا۔

لڑکی وہی تھی جس نے شفقت راجا کی بیٹھک کے باہر میری ویڈیو بنائی تھی اور میڈیا والوں کے سپرد کردی تھی جبکہ اس کے ہمراہ وہ لڑکا بھی میرا شناسا ہی نکلا۔ یہ وہی لڑکا تھا جس کی خاطر میں نے یہ سارا کھٹراگ مول لیا تھا۔ یہ وہی میرا ہم عمر نوجوان تھا، جب ہم ساہیوال سے اوکاڑہ کی طرف اپنی گاڑی میں جارہے تھے تو شفقت راجا کے جلوس کے جوشیلے کارکنوں نے اس لڑکے کی کار کو آگے جانے سے روک دیا تھا جس میں اس کی بیمار ماں موجود تھی۔

بڑی عجیب صورت حال تھی۔ ایک لڑکی وہ تھی جس نے ایک... ویڈیو کلپ جاری کرکے مجھے بڑی مشکل میں پھنسا دیا تھا اور دوسرا لڑکا وہ تھا جس کی وجہ سے میں آج اس حال کو پہنچا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ دونوں ساتھ ساتھ نظر آرہے تھے جس کا مطلب تھا کہ ان دونوں کا آپس میں یقیناً کوئی گہرا رشتہ تھا۔ گارڈ نے دوسری وسل دی اور گاڑی پلیٹ فارم پر رینگنے لگی۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

فطرت کی رنگینیوں کے اسیر نوجوان کی زندگی کے جلتے بجھتے قصے

تنویر ریاض

چنگاری

انسان ہزار بہانے تراشے... ہزار تاویلیں دے... مگر کچھ لوگوں سے بے تعلقی کے باوجود... ایک تعلق استوار رہتا ہے... چاہے درمیان میں کتنے ہی فاصلے حائل ہوں... وہ ذہن کے دریچے میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں... محبت کی ایک ایسی چنگاری کا فسانہ جو اب تک نہ بجھی تھی...

اسے جیم روم میں داخل ہوتا دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ آخری بار اسے کب دیکھا تھا۔ میرے لیے ان سالوں، مہینوں اور دنوں کا حساب رکھنا ممکن نہیں تھا کہ وہ کتنا عرصہ مجھ سے دور رہی۔ اس دوران میں نہ جانے کتنی بار اسے یاد کیا ہوگا لیکن ایسا بھی نہیں کہ اس کے جانے کے بعد میں نے جوگ لے لیا ہو۔ زندگی ہمیشہ آگے کی جانب بڑھتی ہے اور ماضی ایک بھولی بسری یاد بن کر رہ جاتا ہے۔

میری زندگی میں دو حادثے یکے بعد دیگرے رونما

ہوئے تھے۔ پہلا حادثہ وہ تھا جب میں ایک فٹ بال پریکٹس میچ کے دوران زخمی ہوکر اسپتال کے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے صاف صاف بتادیا تھا کہ وہ میرا گھٹنا اپنی جگہ پر بٹھا تو دیں گے لیکن میں اب کبھی فٹ بال نہیں کھیل سکوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ فٹ بال کا بڑا کھلاڑی بن کر بین الاقوامی مقابلوں میں حصہ لوں گا لیکن پل بھر میں خوابوں کا محل زمین بوس ہوگیا۔ میں دہاڑیں مار کر رونا چاہ رہا تھا مگر ایسا کر نہیں سکا۔ مجھے امید تھی کہ وہ یہ خبر سن کر میری دل جوئی کرے گی، میرا حوصلہ بڑھائے گی لیکن اس نے بڑے رسمی انداز میں میرا ماتھا چوما اور کچھ کہے بغیر چلی گئی۔

میں یونیورسٹی کی ٹیم میں صف اول کا کھلاڑی تھا۔ پوری یونیورسٹی میں ہماری دراز قامت جوڑی مشہور تھی۔ زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی اور مجھے پوری امید تھی کہ کسی بڑے کلب کی نمائندگی کرتے ہوئے بہت جلد کوئی بین الاقوامی میچ کھیل سکوں گا لیکن برا وقت کہہ کر نہیں آتا۔ اس روز پریکٹس کے دوران میں نے سامنے آنے والے کھلاڑی کو ڈاج دے کر گیند چھیننے کی کوشش کی کہ اچانک ہی میرا گھٹنا مڑ گیا اور میں توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ ایک دل خراش داستان ہے جسے دہراتے ہوئے بھی کلیجا منہ کو آتا ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی، شاید اس کا فیصلہ درست ہو۔ وہ ایک ایسے شخص کے ساتھ کیسے چل سکتی تھی جس کا تابناک مستقبل اندھیروں میں ڈوب گیا ہو۔

وہ چند قدم چل کر آئی اور تقریباً پوز بنانے کے انداز میں میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔ وہاں موجود تمام لوگوں کی نظریں اس کی جانب اٹھ گئیں۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح خوب صورت اور اسمارٹ تھی گو کہ اس کا وزن کچھ بڑھ گیا تھا لیکن لمبا قد ہونے کی وجہ سے وہ موٹی یا بھدی نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کی چال میں تمکنت اور وقار تھا۔ وہ ادائے بے نیازی سے مسکراتے ہوئے بولی۔ ''ہیلو ٹری!''

ہائی اسکول میں سب لوگ مجھے اسی نام سے پکارتے تھے۔ کالج میں بھی اس نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا جب میں فٹ بال کے میدان میں گیند لے کر آگے بڑھتا تو چاروں طرف سے یہی آوازیں آتیں۔ ''شاباش ٹری، آگے بڑھ ٹری۔ ویل ڈن ٹری۔'' عرصہ ہوا میرے کان یہ سننے کو ترس گئے اور ایک مدت بعد کسی نے مجھے اس نام سے پکارا تھا۔

''ہیلو ویل۔'' میں نے بمشکل تمام اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''یقیناً تم یہ توقع نہیں کر رہے ہوگے کہ دوبارہ مجھے دیکھ سکو گے؟''

''میں ہمیشہ یہی خواب دیکھا کرتا تھا کہ کسی دن تم مجھے راہ چلتے سڑک پر مل جاؤ گی۔ میں تمہیں دیکھ کر مسکراتا ہوا آگے بڑھ جاؤں گا۔''

''شاید میں اسی سلوک کی مستحق ہوں۔ تم یقیناً سب کچھ بھلا چکے ہوگے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''ہاں، میں نے حالات سے لڑنا سیکھ لیا ہے۔''

''اچھی بات ہے کہ تمہارے دل میں میرے بارے میں کوئی بغض نہیں ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولی۔ ''اب تمہارے گھٹنے کا کیا حال ہے؟''

''اس نے مجھے فٹ بال کے میدان سے دور کر دیا ہے۔ باقی سب ٹھیک ہے۔''

''یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم اس کے باوجود ایک کامیاب زندگی گزار رہے ہو۔''

''میرے بارے میں سوچنے کا شکریہ۔'' میں نے کہا۔ ''تمہاری آمد کو کیا نام دوں؟ یقیناً تم پرانا رشتہ جوڑنے تو نہیں آئی ہوگی۔ بظاہر تو یہی لگ رہا ہے کہ تم بہت اچھی زندگی گزار رہی ہو۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''یہی سمجھ لو۔'' پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہاں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم اکیلے میں بات کر سکیں؟''

''دفتر میں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' میں کاؤنٹر سے باہر آتے ہوئے بولا۔

وہ میرے پیچھے چلتی ہوئی آئی۔ دفتر کا دروازہ بند تھا۔ میں نے ہلکی سی دستک دی اور جواب کا انتظار کیے بغیر اندر داخل ہوگیا۔

ہولی ونگٹن میری میز پر بیٹھی فائلیں دیکھ رہی تھی۔ اس نے میرے ساتھ ایک مہمان کو دیکھا تو اخلاقاً کھڑی ہوگئی۔

''مجھے کچھ دیر کے لیے یہاں بیٹھنا ہوگا۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے کہا کیونکہ ہولی کام کے دوران کسی طرح کی مداخلت برداشت نہیں کرتی تھی۔

''ضرور۔'' اس نے کاغذات ایک جانب سمیٹتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں نے دروازہ بند کیا اور ویل کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اب بتاؤ، کیا بات ہے؟''

''مجھے ایک پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات درکار ہیں۔''

''شاید تمہیں معلوم نہیں کہ میرے پاس بھی لائسنس ہے۔''

''حیرت ہے۔ مجھے تو تمہارا نام کہیں نظر نہیں آیا۔ یہاں تک کہ اس عمارت میں داخل ہونے کے بعد بھی میں نہ جان سکی کہ تم پرائیویٹ سراغ رساں کے طور پر کام کر رہے ہو۔''

''دراصل یہ عمارت میرے ایک دوست کی ملکیت ہے جو اس نے میرے حوالے کر رکھی ہے۔ اسی لیے میں نے ضرورت نہیں سمجھی کہ اس جگہ کا نام تبدیل کروں یا اپنے نام کی تختی لگاؤں۔ میرا کام ایسے ہی چل رہا ہے۔ خیر، تم بتاؤ پرائیویٹ سراغ رساں کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟''

''میرے شوہر کی بھتیجی پر اس کے بوائے فرینڈ کو قتل کرنے کا الزام ہے اور دو ہفتے بعد مقدمہ شروع ہونے والا ہے۔ تمام واقعات اور شہادتیں اسے مجرم قرار دے رہی ہیں۔''

''کیا اس نے ہی یہ قتل کیا ہے؟''

''وہ اس سے انکار کر رہی ہے۔''

''صرف اس کا کہہ دینا ہی کافی نہیں۔''

''اس کے وکیل بھی یہی کہہ رہے ہیں۔''

''ملزم کا نام کیا ہے؟''

''کیتھی اینڈربیک۔ شاید تم نے یہ نام سنا ہو؟''

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ''ہاں، میں جانتا ہوں۔''

لاس ویگاس میں رہنے والا ہر شخص اس نام سے واقف ہوگا۔ اس خاندان کے کم از کم پانچ کیسینو اس ریاست میں چل رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اٹلانٹک سٹی میں جائدادیں اور یورپ میں کافی سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ میں نے آٹھ یا نو مہینے پہلے اس قتل کے بارے میں پڑھا تھا۔ پڑوسیوں نے گولی چلنے کی آواز سنی اور کیتھی کو گن ہاتھ میں پکڑے ہوئے اس کے بوائے فرینڈ کے اپارٹمنٹ سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس خبر کو پڑھتے ہی میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ کیتھی کا بچنا بہت مشکل ہے اور اینڈربیک کی دولت بھی اس کے کام نہیں آسکے گی۔ جب ویل نے بتایا کہ کیتھی اس کے شوہر کی بھتیجی ہے تو میں نے طنزاً کہا۔ ''گویا اب تم اینڈربیک خاندان کا حصہ ہو؟''

''اسٹیفن کے ساتھ میری شادی کو پانچ سال ہوگئے ہیں۔'' وہ میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ ایلن اینڈربیک کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔ جب اس سے پہلی بار ملاقات ہوئی تو محسوس ہوا کہ ہم دونوں کی جڑیں لاس ویگاس میں ہیں، پھر...''

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، اینڈربیک کی ساری دولت بھی تمہاری بھتیجی کے کام نہیں آسکتی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم مجھ سے کیا توقع کر رہی ہو... اس مرحلے پر میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''ہمیں امید ہے کہ تم اسے بے گناہ ثابت کر سکتے ہو۔''

''میں کوئی جادوگر نہیں ہوں۔''

''یہی رویہ اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ پولیس سمیت سب لوگ اسے ہی مجرم سمجھ رہے ہیں۔ کوئی بھی اس کا ساتھ نہیں دے رہا۔ یہاں تک کہ اس کے وکیل بھی اسے پلی بارگین کا مشورہ دے رہے ہیں۔''

''میرے خیال میں یہی بہترین راستہ ہے۔''

وہ میرے مشورے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ''ہمیں ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو اس کا ساتھ دے۔''

''اور تمہارے خیال میں وہ شخص میں ہو سکتا ہوں؟''

''تم ہماری آخری امید ہو۔ اگر تم کوئی ایسا ثبوت لانے میں ناکام رہے جس کے ذریعے لوگوں کو قائل کیا جا سکے کہ وہ بے گناہ ہے تو وہ یقینی طور پر مجرم قرار پائے گی۔ تمہیں اس کا معقول معاوضہ ملے گا۔''

''ہو سکتا ہے کہ تمہاری پُرکشش پیشکش مجھے لالچ میں مبتلا کر دے لیکن میں اپنے ضمیر کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟ اس لیے معاوضہ لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک مرتبہ اس سے مل لو تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ کم از کم اتنا تو کر سکتے ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ وقت ضائع کرنے کے برابر ہوگا۔ بہرحال میں کب اس سے مل سکتا ہوں؟''

''اگر تم چاہو تو ابھی مل سکتے ہو۔ وہ باہر میری کار میں بیٹھی ہوئی ہے۔''

کیتھی اکیلی نہیں تھی بلکہ اسٹیفن بھی اس کے ساتھ کار میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے انہیں دفتر میں بلا لیا۔ دونوں خواتین کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ بلکہ اسٹیفن ان کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ اس نے بند گلے کا سویٹر اور جینز پہن رکھی تھی۔ بال قدرے لمبے اور شانوں تک پھیلے ہوئے

تھے۔

''ہمیں ملاقات کا وقت دینے کے لیے شکریہ۔'' وہ قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں یہاں آتے ہوئے ہچکچا رہا تھا لیکن مسز بیلی کا کہنا تھا کہ صرف تم ہی اس معاملے میں ہماری مدد کر سکتے ہو۔''

بیلی میرے اسکول کی ساتھی تھی۔ اس کا شوہر بھی لاس ویگاس کے سرکردہ جرائم پیشہ لوگوں میں سے تھا۔ اب وہ بیوہ ہو چکی تھی۔ میں نے اس کے لیے کئی مرتبہ کام کیا اور وہ نتائج سے مطمئن تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے یہاں ملازمت کرلوں لیکن میں آزاد رہ کر کام کرنا پسند کرتا تھا تاہم ضرورت پڑنے پر وہ مجھے ہی فون کرتی۔ اس نے کئی لوگوں کو میرے پاس بھیجا جو کسی سراغ رساں کی مدد لینا چاہتے تھے۔

میں نے کیتھی کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ وہ ملکۂ حسن تو نہیں لیکن اس کے قریب قریب ضرور تھی۔ گہری نیلی آنکھیں، ہلکی سی خمیدہ ناک اور خوب صورت تراشیدہ ہونٹ... اسے دیکھ کر یقین کرنا بہت مشکل تھا کہ وہ کسی کو قتل بھی کر سکتی ہے۔

''اپنی طرف سے کچھ کہنے سے پہلے میں چاہوں گا کہ تم اپنی کہانی بیان کرو مس کیتھی۔''

اس نے اپنا گلا صاف کیا اور قدرے سیدھے ہوتے ہوئے بولی۔ ''مجھے یقین نہیں کہ میں نے رکی پر گولی چلائی۔''

''کیا واقعی تمہیں یقین نہیں ہے؟''

''مجھے یاد نہیں کہ حقیقت میں کیا ہوا تھا۔ صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں نے اس پر گولی نہیں چلائی ہوگی۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں اس سے محبت کرتی تھی۔''

''تم کچھ بھول رہی ہو؟'' میں نے کہا۔ ''جہاں تک مجھے معلوم ہے، موقع کے گواہوں نے گولی چلنے کی آواز سنی اور تمہیں اپنے بوائے فرینڈ کے اپارٹمنٹ سے گن ہاتھ میں پکڑے ہوئے بھاگتے دیکھا۔''

''جی ہاں، میرے خیال میں یہ سچ ہے لیکن اس شام میں نے بہت زیادہ پی لی تھی۔ یہاں تک کہ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ رکی مجھے اپنے اپارٹمنٹ میں لے گیا تھا۔''

''تمہیں کیا یاد ہے؟''

''کچھ آوازیں سن کر مجھے ہوش آیا۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''میرے ہاتھ میں گن تھی اور رکی بیڈ روم کے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ پھر کیا ہوا۔ شاید میں گھبراہٹ کے عالم میں باہر کی جانب دوڑ پڑی۔''

''تم نے اس گن کا کیا کیا؟''

''میں نے ضرور اسے عمارت کے باہر کہیں پھینک دیا ہوگا۔ پولیس کا کہنا ہے کہ انہیں وہ گن داخلی دروازے کے نزدیک جھاڑیوں میں سے ملی۔''

''وہ گن تمہاری تھی؟''

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، وہ رکی کی گن تھی۔ اسے ہتھیار جمع کرنے کا شوق تھا اور اس کے اپارٹمنٹ میں کئی گنیں تھیں۔ تقریباً ہر کمرے میں ایک تو ضرور ہوگی اور یہ سب اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ آپ اخبار اٹھائیں، صوفے کا کشن یا تکیہ... آپ کو وہاں ایک نہ ایک گن ضرور پڑی ہوئی ملے گی۔''

''لگتا ہے وہ خاصا بے پروا تھا؟''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' اس نے ایک بار پھر کندھے اچکائے۔

''تم نے شراب کہاں پی تھی؟''

''فورٹ ایپک پر ایک چھوٹا سا بار ہے۔ وہاں میں اور رکی اکثر جایا کرتے تھے۔ وہی ہمارے ملنے کی جگہ تھی۔''

''تم نے اتنی زیادہ پی لی کہ یہ بھی یاد نہیں رہا، وہ تمہیں کہاں لے جا رہا ہے؟ کیا تم ہمیشہ ہی اتنی زیادہ پیتی تھیں؟''

''نہیں۔ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ دراصل ہمارے درمیان جھگڑا ہو گیا تھا۔ دو ہفتے بعد دوبارہ اکٹھے ہوئے تو جوش میں آکر کچھ زیادہ ہی پی لی۔''

''تمہاری اور رکی کی ملاقات بار میں ہوئی یا تم دونوں ایک ساتھ وہاں گئے تھے؟''

''ہماری ملاقات بار میں ہوئی تھی۔''

''تمہارا کہنا ہے کہ وہ تمہیں اپنے اپارٹمنٹ لے گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مقصد کے لیے اس نے اپنی کار استعمال کی ہوگی اور تم نے اپنی کار کلب کے پارکنگ لاٹ میں ہی چھوڑ دی ہوگی؟''

''ایسا ہی ہوا تھا۔ میں نے کسی کو بھیج کر اپنی کار منگوائی تھی۔ کیا اس کی کوئی اہمیت ہے؟''

''محض خانہ پُری کے لیے پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے یہ کہنے کے بعد لمحہ بھر توقف کیا اور سوچنے لگا کہ کوئی خاص بات پوچھنے سے تو نہیں رہ گئی؟ پھر اچانک ایک سوال میرے ذہن میں آیا۔ ''تم نے ابھی بتایا کہ رکی سے کوئی

جھگڑا ہوا تھا۔ اس کی کیا وجہ تھی؟''

''رکی دوسری عورتوں پر نظر رکھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھ سے ملنے کے بعد اس کی یہ عادت چھوٹ جائے گی لیکن میری ایک دوست نے بتایا کہ اس نے اسے کسی دوسری عورت کے ساتھ دیکھا ہے۔ جب میں نے پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ تمہاری دوست کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھے اس کی بات کا یقین نہیں آیا لیکن وہ مجھے مسلسل فون کرتا اور قسمیں کھا کر یقین دلاتا رہا کہ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا اور یہ کہ مجھ سے دوبارہ ملنا چاہتا ہے۔ میں اسے انکار نہ کر سکی۔''

''تمہیں انکار کر دینا چاہیے تھا۔'' میں نے کہا۔ ''رقابت ہمیشہ کسی بھی قتل کی خاص وجہ ہوتی ہے۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی جیوری کے سامنے یہی نکتہ اٹھائے گا۔ تم اس کے اپارٹمنٹ گئیں۔ وہاں کوئی ایسی بات ہوئی جس کی وجہ سے تمہارا شک دوبارہ سر اٹھانے لگا۔ تم نشے میں چور تھیں۔ گن اٹھائی اور بوائے فرینڈ پر گولی چلا دی۔''

''جانتی ہوں کہ وہ یہی کہے گا۔''

''صرف وہی نہیں بلکہ دوسرے لوگ بھی اس کی تائید کریں گے۔'' میں نے کہا۔ ''سنا ہے کہ تمہارے وکیل پلی بارگین پر زور دے رہے ہیں؟''

''ہاں، ان کا یہی خیال ہے لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی جبکہ جانتی ہوں کہ میں نے رکی کو قتل نہیں کیا۔''

''شاید تمہارے لیے یہ بہترین موقع ہے۔ پلی بارگین کی صورت میں جرم کی شدت میں کمی واقع ہو جائے گی اور یہ غیر ارادی قتل کہلائے گا۔ تمہیں زیادہ سے زیادہ دو تین سال کی سزا ہوگی۔''

''میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ یقین کرو۔ میں نے اسے نہیں مارا۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اسٹیفن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''کیا تم ہماری کوئی مدد نہیں کرو گے؟''

''ہاں ٹری۔'' ویل آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ''ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

ان کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک سوچتا رہا کہ کیتھی کو کس طرح اس مشکل سے نکالا جائے۔ جانتا تھا کہ یہ تقریباً ناممکن ہے لیکن ویل کی التجا کو نظر انداز کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ اس لیے میں نے اندھیرے میں روشنی کی کرن تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے میں نے سارجنٹ جوئے گلوور کو فون کیا۔ اس نے دوسری گھنٹی پر میرا فون اٹھایا اور اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''خدا خیر کرے۔ نہ جانے آج کا دن کیسا گزرے گا۔''

وہ میرا کلاس فیلو تھا۔ اسے پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن ہمیشہ سے ہی پولیس میں جانے کا شوق تھا۔ میں اسے اپنا بہترین دوست سمجھتا تھا لیکن جب اس سے کوئی کام پڑتا تو وہ فوراً ہی روایتی پولیس والا بن جاتا۔ میں نے اسے اپنے نئے کیس کے بارے میں اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

''اسٹیفن اینڈر بیک نے میری خدمات حاصل کر لی ہیں تاکہ میں اس کی بھتیجی کو اس مصیبت سے نجات دلاؤں۔''

''بہتر ہوگا کہ تم اس معاملے میں نہ پڑو۔ تم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔''

''کیا تم نے اس کیس پر کام کیا ہے؟''

''ہاں۔ یہ میرا ہی کیس تھا۔''

''کیا تمہیں کسی اور پر بھی شک ہے؟''

''اس کی ضرورت ہی نہیں۔ پڑوسیوں نے گولی چلنے کی آواز سنی اور کیتھی کو گن ہاتھ میں پکڑے اس کے اپارٹمنٹ سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس نے عمارت سے باہر نکلتے ہی وہ گن جھاڑیوں میں پھینک دی۔ گن پر اس کی انگلیوں کے نشانات بھی موجود ہیں۔ اس کے پاس صرف ایک کمزور سا بہانہ ہے کہ اسے کچھ یاد نہیں۔ تم ہی بتاؤ کہ میں مزید کیا تفتیش کروں؟''

میں اسے کیا کہتا۔ میرے پاس کوئی معقول وجہ نہیں تھی کہ اسے دوبارہ تفتیش کے لیے کہوں۔

''میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ اپنے طور پر اس معاملے کی چھان بین کر رہا ہوں۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ جتنی چاہے چھان بین کرو۔ تم حقائق تبدیل نہیں کر سکتے۔ وہ لڑکی مجرم ہے۔''

ویلی روز اپارٹمنٹ کی طرف جاتے ہوئے جوئے کے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ کیتھی کا مقتول بوائے فرینڈ اسی عمارت میں رہا کرتا تھا۔ میں نے کیتھی سے اس کے وکیلوں کے نام، اس دوست کا نام جس نے رکی کو کسی دوسری عورت کے ساتھ دیکھا تھا اور ڈی فراسٹی مگ کا پتا پوچھ لیا تھا تاکہ اپنی تحقیقات کے سلسلے میں ان لوگوں سے رابطہ کر سکوں۔ گو کہ مجھے ان سے کسی قسم کی مدد ملنے کی بہت کم توقع تھی۔

ویلی روز اپارٹمنٹ ایک آٹھ منزلہ عمارت تھی جس میں رہنے والوں کے لیے عمارت کے اندر ہی پرائیویٹ

گیراج بنے ہوئے تھے جبکہ مجھ جیسے لوگوں کو گاڑی کھڑی کرنے کے لیے پارکنگ لاٹ میں جگہ تلاش کرنا پڑتی تھی۔ عمارت کی لابی میں ایک سیکیورٹی گارڈ بیٹھا ہوا تھا اور اس کی میز پر چھ مانیٹر نصب تھے۔ جن کے ذریعے وہ عمارت میں آنے جانے والوں اور گردونواح میں ہونے والی نقل و حرکت پر نظر رکھ سکتا تھا۔ وہ ایک مضبوط، توانا جوان اور گورا شخص تھا۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''کیا چاہتے ہو؟''

میں نے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''گڈ آفٹر نون۔ میرا نام ٹریوراوکس ہے اور میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنا کارڈ اس کی جانب بڑھا دیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اینڈربیک فیملی نے مجھے اس قتل کی تحقیقات پر مامور کیا ہے۔ مجھے اس سلسلے میں تمہاری مدد درکار ہوگی۔''

اس نے میرے کارڈ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں مسٹر اوکس؟''

''بہتر ہوگا کہ تم مجھے ٹریور کہو۔ کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں؟''

''مارک فیلو۔'' اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ضرور مسٹر ہینکس کے بارے میں جاننا چاہو گے۔''

''ہاں، جب یہ واقعہ پیش آیا تو کیا تم ڈیوٹی پر تھے؟''

''ہاں۔ میری رات کی شفٹ تھی۔ اس کی گرل فرینڈ گن ہاتھ میں پکڑے ہوئے میرے قریب سے گزری اور میں نے دیکھا کہ اس نے وہ گن جھاڑیوں میں پھینک دی جہاں سے پولیس والوں نے اسے تلاش کیا۔ میں اسے ضرور روکتا لیکن اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس نے کسی پر گولی چلائی ہے۔''

''بے شک۔'' میں نے کہا اور سوچنے لگا کہ اس کے ہاتھ میں گن دیکھ کر وہ کیسے اس کے سامنے جا سکتا تھا لیکن میں نے یہ بات اس سے نہیں کی بلکہ بولا۔ ''تم نے اپنی ملازمت کے دوران اس سے زیادہ دیوانگی نہیں دیکھی ہو گی۔''

''میں تمہیں ان جھگڑوں کے بارے میں بھی بتا سکتا ہوں جو اس اپارٹمنٹ میں ہوتے رہے ہیں۔''

''میں کبھی فرصت میں بیٹھ کر یہ کہانیاں سنوں گا۔ اس وقت صرف اتنا بتا دو کہ وہ عمارت میں کیسے داخل ہوئی تھی؟''

''وہ مسٹر ہینکس کے ساتھ گیراج کے راستے سے اندر آئی تھی۔''

''میرا خیال ہے کہ تم نے انہیں مانیٹر پر دیکھا ہوگا؟''

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''یہ کس طرح کام کرتا ہے؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''جب بھی کوئی گیراج کے راستے عمارت میں داخل ہوتا ہے تو اس کا سوئچ آن ہو جاتا ہے۔'' اس نے بائیں جانب رکھے ہوئے آخری مانیٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اگر چاہوں تو ایک دوسرے سوئچ کے ذریعے انہیں دیکھ سکتا ہوں۔''

''اور تم نے ایسا ہی کیا؟''

وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ''ہاں، وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ مسٹر ہینکس اسے اٹھا کر لفٹ تک لے گئے تھے۔''

''لفٹ میں کیمرے لگے ہوئے ہیں؟''

''وہ اس سے بری طرح چمٹی ہوئی تھی اور اس نے اسے تھوڑا سا اوپر اٹھا رکھا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس نے مسٹر ہینکس کی اس حرکت کا بُرا نہیں منایا پھر میں نے سوئچ کے ذریعے ان کے فلور کو چیک کیا اور جب تک وہ اپارٹمنٹ میں داخل نہیں ہوگئے، انہیں مانیٹر پر دیکھتا رہا۔''

''وہ کتنی دیر بعد گن ہاتھ میں پکڑے ہوئے اپارٹمنٹ سے واپس آئی؟''

''تیس یا چالیس منٹ بعد۔''

''کیا تم نے اسے اپارٹمنٹ سے باہر آتے ہوئے دیکھا تھا؟''

''نہیں لیکن جب وہ عمارت سے باہر نکلی تو میں نے مسٹر ہینکس کے فلور کا سوئچ آن کر دیا۔ مجھے مسز سیمسن اور مسٹر لیوس ہال میں کھڑے ہوئے نظر آئے اور پھر میرا فون بج اٹھا۔ مسٹر لیوس اپنے سیل فون پر مجھ سے کہہ رہے تھے کہ لفٹ کے ذریعے نیچے آنے والی عورت کو روکوں، اس نے چند لمحے قبل مسٹر ہینکس کا خون کر دیا ہے۔ میں اس کے پیچھے بھاگا لیکن وہ جا چکی تھی۔''

اس گفتگو سے ایک اور نکتہ سامنے آیا جس کو لے کر وکیل استغاثہ صفائی کے وکیلوں پر حملہ کرسکتا تھا۔ اگر کیتھی اتنی مدہوش تھی کہ اسے یہ بھی یاد نہیں کہ وہ ہینکس کے اپارٹمنٹ میں کس طرح گئی تھی تو پھر وہ اتنے موثر انداز میں وہاں سے نکلنے میں کیسے کامیاب ہوگئی؟

اس وقت مسز سیمسن اور مسٹر لیوس دونوں ہی گھر پر

موجود تھے۔ میں نے فرینک سے کہا کہ وہ انہیں فون کر کے پوچھے۔ کیا وہ مجھ سے مختصر سی گفتگو کرنا چاہیں گے۔ اس نے پہلے مسٹر لیوس کو فون کیا جو فوراً ہی تیار ہو گئے۔

قسمتی لیوس کا قد تقریباً میرے برابر ہی تھا۔ اس کے سر کے بال گھنے تھے جو آہستہ آہستہ سفید ہو رہے تھے۔ اس نے مجھے اندر بلا لیا اور میرا کارڈ دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر اوکس! فرینک نے بتایا ہے کہ تم اینڈر بیک فیملی کے لیے کام کر رہے ہو؟''

''ہاں، انہوں نے مجھے یہ ذمّے داری سونپی ہے کہ کچھ ایسی نئی معلومات حاصل کر سکوں جس سے مس کیتھی کے دفاع میں مدد مل سکے۔''

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ ڈسٹرکٹ اٹارنی نے مجھے استغاثہ کے گواہوں میں شامل کر لیا ہے۔''

''میں اسی لیے یہاں آیا ہوں۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ مجھے تم سے بات بھی کرنی چاہیے۔''

''میں تمہارے وقت میں سے چند منٹ لوں گا۔ مجھے صرف ایک یا دو سوالوں کے جواب چاہئیں۔''

اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں کے نیچے دبایا۔ میرے کارڈ پر ایک نظر ڈالی اور واپس کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا مصیبت ہے، اندر آ جاؤ۔ بیٹھو، کیا پیو گے کافی یا سوڈا؟''

''نہیں شکریہ۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔''

اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کے بالمقابل دیوار میں ایک اور فرانسیسی دروازہ لگا ہوا تھا جس کے ذریعے بالکونی تک رسائی ہو سکتی تھی۔ بالکونی کے سیدھے ہاتھ پر ایک اور دروازہ بیڈ روم میں کھلتا تھا۔ یہ ایک خاص کشادہ کمرا تھا جس کے عقب میں کھانے کی میز اور چھ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کچن کی طرف کھلنے والے دروازے سے اسٹین لیس اسٹیل کے برتنوں کی جھلک نظر آ رہی تھی اور دوسری جانب ایک راہداری تھی جو غالباً دوسرے بیڈ روم کی طرف جا رہی تھی۔

میں ایک صوفے میں دھنس گیا۔ میرے سامنے والی دیوار پر فلیٹ اسکرین ٹی وی لگا ہوا تھا۔ لیوس فرانسیسی دروازے کے بائیں جانب ایک پورٹیبل بار کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''تم واقعی کچھ نہیں پیو گے؟ میرے پاس بہت عمدہ جن ہے۔''

میں نے ایک بار پھر انکار کر دیا اور وہ اپنے لیے پیگ بنانے میں مشغول ہو گیا۔ پھر میرے قریب آتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر اوکس! تم کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟''

''صرف وہ بتا دو جو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا؟''

اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے مشروب کا ایک گھونٹ لیا اور بولا۔ ''یہ بالکل سیدھا سا کیس ہے۔ میں الیکٹرانک سیلز کا کام کرتا ہوں اور اس کے لیے مجھے بہت زیادہ سفر کرنا پڑتا ہے۔ میں اسی وقت گھر پہنچا تھا اور ابھی اپنا سامان رکھا ہی تھا کہ مجھے گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ میں فوج میں بھی رہ چکا ہوں اس لیے جانتا ہوں کہ گولی چلنے کی آواز کیسی ہوتی ہے۔ میں باہر نکلا اور مسز ہیمسن کے دروازے پر دستک دی۔''

''تم نے یہ سوچا کہ گولی چلنے کی آواز اس کے اپارٹمنٹ سے آئی تھی؟''

''نہیں۔'' اس نے مشروب کا ایک اور گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''تم دیکھ رہے ہو کہ ان اپارٹمنٹس کی دیواریں زیادہ موٹی نہیں ہیں۔ میں نے سمجھا کہ یہ آواز رکی کے اپارٹمنٹ سے آئی ہے لیکن بعض اوقات صحیح اندازہ نہیں ہوتا چنانچہ میں مسز ہیمسن کی طرف گیا تاکہ جان سکوں کہ اس نے بھی ایسی کوئی آواز سنی تھی۔ بہرحال جب وہ دروازے پر آئی اور میں نے اسے گولی چلنے کے بارے میں بتایا تو ہمیں اسی وقت کیتھی کو ایک گن کے ساتھ رکی کے اپارٹمنٹ سے نکلتے ہوئے دیکھا۔''

''کیا تم نے اسے روکنے کی کوشش؟''

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''میں نے ابھی تو بتایا ہے کہ اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ میں نے اس کے لفٹ میں جانے کا انتظار کیا اور اس کے بعد سیکیورٹی اسٹیشن کو فون کر دیا...''

''کیا تم رکی ہینکس سے اچھی طرح واقف تھے؟''

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ اچھا لڑکا تھا۔ ہماری بالکونی مشترکہ تھی اور ہم خوب باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ دوستوں کا دوست تھا۔ البتہ عورتوں کا رسیا تھا۔ اس نے اپنے رومانس کی کچھ کہانیاں سنائی تھیں جو واقعی انعام کی مستحق ہیں۔''

''کیا تم کبھی اس کے ساتھ کسی عورت کے پیچھے گئے؟''

''کون... میں؟ کبھی نہیں۔ میرا مطلب ہے جوانی میں ایسے شوق ضرور پورے کیے لیکن اب نہیں۔'' اس نے

انگلی میں پہنی ہوئی سونے کی انگوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔ ''شادی کو آٹھ سال ہو گئے ہیں اور میں بہت خوش ہوں۔''

ایک دروازہ کھلا اور بالکونی میں سے ایک بھورے بالوں والی عورت اندر آئی۔ اس نے لمبی آستینوں والا کھلے گلے کا بلاؤز اور لمبا اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خالی گلاس تھا اور اس میں برف کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔

''معاف کرنا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہاں کوئی ملاقاتی موجود ہے۔'' یہ کہہ کر وہ بار کی طرف چلی گئی۔

''یہ ایک سراغ رساں ہیں اور رکی کے قتل کے سلسلے میں مزید تحقیقات کر رہے ہیں۔'' لیوس نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ پھر اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر اوکس! یہ میری بیوی شیرون ہے۔''

ہم نے سر ہلا کر ایک دوسرے کو تعظیم دی پھر وہ سوالیہ انداز میں بولی۔ ''مزید تحقیقات سے تمہاری کیا مراد ہے؟ میرا خیال ہے کہ سب کچھ طے ہو چکا ہے۔ اب صرف مقدمہ شروع ہونے کا انتظار ہے۔''

''مسٹر اوکس اینڈر بیک فیملی کے لیے کام کر رہے ہیں ڈیئر۔'' لیوس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اوہ۔'' اس نے اپنے بلاؤز کا کالر بند کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکو گے۔''

''میں صرف کچھ چیزوں کو دوبارہ دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے وضاحت پیش کی۔

اس نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ تم اس کی کچھ مدد کر سکو گے۔ اس نے قتل کیا ہے، اس پر کیسے شک کیا جا سکتا ہے۔''

''جب یہ واقعہ ہوا تو تم اس عمارت میں موجود تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ اپنے بیڈ روم میں سو رہی تھی۔'' اس کے بجائے شوہر نے جواب دیا۔

''یعنی گولی کی آواز سے بھی تمہاری آنکھ نہیں کھلی؟''

''میں نے اسے جگا کر بتایا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔''

''کیا تمہاری مسٹر ہینکس سے جان پہچان تھی؟''

''ہاں، میں اسے جانتی تھی۔'' وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ شاید وہ توقع کر رہی تھی کہ اس مرتبہ بھی اس کا شوہر ہی جواب دے گا۔ ''وہ مجھ سے زیادہ میرے شوہر کا دوست تھا۔''

''کیا تم دونوں میں سے کسی نے پہلے بھی کیتھی کو یہاں آتے ہوئے دیکھا تھا؟''

دونوں نے نفی میں سر ہلا دیے۔ ''شاید ہم نے اسے دیکھا ہو۔'' لیوس نے اعتراف کیا۔ ''لیکن اس کے اپارٹمنٹ میں کئی عورتیں آتی رہتی تھیں۔ اس لیے یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔''

مجھے توقع نہیں تھی کہ ان لوگوں سے مزید کچھ معلوم ہو سکے گا اس لیے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''بس اتنا ہی کافی ہے۔ کیا مجھے مسز ہیمسن سے ملوا سکتے ہو؟''

''یقیناً۔'' لیوس بھی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور ہم ہال عبور کر کے مسز ہیمسن کے اپارٹمنٹ تک پہنچ گئے۔ اس نے دروازہ کھلنے پر میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''یہ مسٹر اوکس ہیں، پرائیویٹ سراغ رساں... اور اینڈر بیک فیملی کے لیے کام کر رہے ہیں۔''

''کیا وہ چاہتے ہیں کہ میں گواہی نہ دوں۔'' وہ غصے سے بولی۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''میں صرف کچھ معلومات اکٹھی کر رہا ہوں۔''

اس نے مجھے اندر آنے کے لیے نہیں کہا اور بولی۔ ''مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ پولیس کو پہلے ہی بتا چکی ہوں۔''

''میں جانتا ہوں مسز ہیمسن... لیکن کیا تم وہ سب میرے سامنے دہرا سکتی ہو؟''

اس نے اپنے دونوں ہونٹ سختی سے بھینچ لیے اور بولی۔ ''ٹھیک ہے تم کیا جاننا چاہتے ہو؟''

''صرف وہی جو تم نے وقوعہ والے دن دیکھا۔''

''میرے پاس بتانے کے لیے کوئی خاص بات نہیں۔ سوائے اس کے کہ مسٹر لیوس نے میرے دروازے پر دستک دی اور پوچھا کہ کیا میں نے کوئی گولی کی آواز سنی ہے۔ میں نے بتایا کہ نہیں اور اسی وقت کیتھی کو مسٹر ہینکس کے اپارٹمنٹ سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ لفٹ میں سوار ہو رہی تھی۔ مسٹر لیوس نے اسی وقت سیکیورٹی گارڈ کو فون کیا کہ وہ اسے روکیں۔''

''جب وہ اپارٹمنٹ سے باہر آئی تو کیا اس نے گن کا رخ تمہاری جانب کیا تھا؟''

''نہیں۔ بس اس نے لحہ بھر کے لیے ہماری جانب دیکھا اور لفٹ میں سوار ہو گئی۔''

''کیا وہ لفٹ کی طرف جاتے ہوئے لڑکھڑا رہی تھی؟''

"میں نے غور نہیں کیا۔ وہ بہت تیزی میں لفٹ کی جانب گئی تھی۔"

مسز یمسن سے مزید کوئی بات معلوم نہ ہوسکی۔ واپسی پر میں نے سیکیورٹی گارڈ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں اس سے بعد میں بھی رابطے میں رہوں گا۔ اس دورے کے دوران جو خاص بات معلوم ہوئی وہ یہ کہ مسٹر اور مسز لیوس دونوں ہی شام کے وقت ڈرنک کرنا پسند کرتے تھے لیکن اس سے کیتھی کو بے گناہ ثابت کرنے میں کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس بارے میں مزید معلومات کہاں سے مل سکتی ہیں۔ صرف ایک ہی جگہ باقی رہ گئی تھی جہاں میں کوشش کرسکتا تھا۔

دی فراسٹی مگ، درمیانے درجے کا کلب تھا۔ وہاں میزوں، بوتھ اور ڈانس فلور کے علاوہ بار کے ساتھ ساتھ اسٹول بھی رکھے ہوئے تھے۔ جب میں وہاں پہنچا تو کلب تقریباً ایک تہائی بھر چکا تھا۔ میں نے کاؤنٹر کے آخری سرے پر ایک اسٹول گھسیٹا اور بارٹینڈر کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

"جی جناب! میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟" اس نے شائستہ لہجے میں کہا۔

"صرف ایک بیئر۔"

اس نے میرے لیے بیئر کا گلاس بھرا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ساڑھے تین ڈالر۔"

میں نے اسے بیس ڈالر کا نوٹ دیا جب وہ بقیہ پیسے لے کر آیا تو میں نے اسے اپنا کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ "میں رکی ہینکس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں جو یہاں اکثر آیا کرتا تھا۔"

بارٹینڈر کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ بولا۔ "رکی! کیا تم اسے جانتے ہو؟ بہت اچھا لڑکا تھا۔ ہم سب اسے یاد کرتے ہیں۔"

"جس رات وہ آخری بار یہاں آیا، اس وقت تم ہی ڈیوٹی پر تھے؟"

"نہیں، اس شام اسٹین کی ڈیوٹی تھی۔" اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ سوائے اس کے... وہ مس کیتھی کو ساتھ لے گیا۔

"تمہارے خیال میں یہ غیر معمولی بات تھی؟"

"ہاں، رکی کا یہ طریقہ نہیں تھا۔ جس عورت سے اس کی علیحدگی ہو جاتی، اس کے ساتھ وہ دوبارہ نظر نہیں آتا تھا۔"

"یعنی وہ دوسری عورتوں کو بھی یہاں لے کر آتا تھا؟"

"ہاں، مس کیتھی سے علیحدگی ہوجانے کے بعد وہ دو مرتبہ ایک دوسری عورت کے ساتھ یہاں آیا تھا۔"

"کیا تم اس عورت کا حلیہ بتا سکتے ہو؟"

"اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ اس کے بال کالے تھے۔"

اچانک ہی ایک عورت میرے برابر میں آکر بیٹھ گئی اور بولی۔ "مجھے ایک ڈرنک لے دو۔ اس کے بعد تم جہاں کہوگے میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ڈرنک کوئی مسئلہ نہیں لیکن تمہیں ساتھ نہیں لے جاسکوں گا کیونکہ اس وقت بھی ڈیوٹی پر ہوں۔"

اس نے اپنی گہری سبز آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں اور بولی۔ "کیا تم پولیس والے ہو؟"

"نہیں۔ میں پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔"

"پھر تو تمہارے پاس گن بھی ہوگی؟"

"ہاں لیکن دفتر میں ہے۔ ہر وقت ساتھ لیے نہیں پھرتا۔"

"تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ میرا نام للی ہے۔ کیا تمہارے پاس میرے لیے بالکل وقت نہیں ہے؟"

"نہیں، البتہ تم چاہو تو میری مدد کر کے کام کو تیزی سے نمٹا سکتی ہو۔ کیا تم رکی ہینکس کو جانتی ہو؟"

"اس کلب میں آنے والا ہر شخص اسے جانتا ہے۔ میں اور رکی تو قریبی دوست تھے۔"

"کتنے قریب؟"

وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ "تم خود اندازہ لگا سکتے ہو۔ رکی جانتا تھا کہ کسی عورت کو کس طرح خوش کیا جاسکتا ہے۔"

"کیا کیتھی کے ساتھ بھی اس کا یہی رویہ تھا؟"

"تم اس لڑکی کی بات کر رہے ہو جسے اس نے قتل کر دیا... نہیں، وہ اس کے لیے کڑوی گولی ثابت ہوئی۔ تاہم علیحدگی ہوجانے کے بعد بھی وہ اس سے دوبارہ تعلق جوڑنے کی کوشش کرتا رہا۔ حالانکہ اس دوران میں وہ ایک دوسری عورت کے ساتھ بھی یہاں آیا۔"

"میرا خیال ہے کہ ایک کھلاڑی اپنے پتے ہمیشہ سنبھال کر رکھتا ہے۔"

"ہاں لیکن اسے کسی نئی عورت سے تعلق جوڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی کلب میں اسے دل بہلانے کے لیے کئی عورتیں مل سکتی تھیں۔ پھر یہ کہ وہ شادی شدہ بھی تھی۔"

"تمہیں یقین ہے؟"

"ہاں، میں نے اس کے ہاتھ میں انگوٹھی دیکھی تھی۔

دوسرے یہ کہ وہ رکی کے ساتھ بے چینی بھی محسوس کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے بغیر کسی عام جگہ پر جانے کی عادی نہیں تھی۔"

میں نے وہ سوال پوچھ لیا جس کا جواب پہلے سے معلوم تھا۔ "تم اس عورت کی بات کر رہی ہو جس کے بال سیاہ، دبلی پتلی اور لمبوترا چہرا ہے؟"

"ہاں وہی۔"

جب میں نے یہ کیس ہاتھ میں لیا تو بالکل یقین نہیں تھا کہ اس میں سے کچھ برآمد ہوسکے گا۔ سبھی جانتے تھے کہ کیتھی مجرم ہے۔ پولیس، اس کے وکیل اور وہ سب لوگ جنہوں نے ثبوت دیکھے، اس کے مجرم ہونے پر متفق تھے۔ یہاں تک کہ خود کیتھی کو بھی اپنی بے گناہی کا ثبوت نہیں تھا لیکن کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ بعض اوقات تھوڑی سی چھان بین کے بعد صورتِ حال کس طرح بدل سکتی ہے۔ میں جوئے اور اس کے دوسرے ساتھی کو غلطی پر نہیں سمجھتا۔ انہوں نے ایک ایسے کیس پر جو بالکل واضح تھا، اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے دوسرے معاملات پر توجہ مرکوز رکھی۔

جب میں واپس ویلی روز اپارٹمنٹ آیا تو مارک فیلو اس وقت بھی ڈیوٹی پر تھا۔ میں نے وہاں سے لیوس کو فون کیا اور وہ مجھ سے ملنے کے لیے تیار ہوگیا۔ جب میں لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچا تو وہ دروازے میں کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولا۔ "کیا کچھ پوچھنا بھول گئے تھے؟"

"ہاں یہی سمجھ لو۔" میں نے کہا۔

اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اس کی بیوی نظر نہیں آرہی تھی لیکن بالکونی کی طرف کھلنے والا فرانسیسی دروازہ بند نہیں تھا اور وہاں سے ہلکی ہلکی ہوا اندر آرہی تھی۔

"اب کیا پوچھنا باقی ہے؟" اس کے لہجے میں تلخی تھی اور آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔

"میں نے سوچا کہ جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے، وہ پولیس کو بتانے سے پہلے تمہیں ایک موقع اور دے دوں۔"

"یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" وہ غضب ناک ہوتے ہوئے بولا۔

"میں تمہاری بیوی کی سرگرمیوں کے بارے میں بتانا چاہ رہا ہوں جو وہ تمہاری غیر موجودگی میں کرتی رہی ہے۔ میں ہینکس کی بات کر رہا ہوں کہ کس طرح اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔"

"تم حد سے بڑھ رہے ہو اوکس۔"

"ابھی سب پتا چل جائے گا۔ میں ان لوگوں سے مل چکا ہوں جنہوں نے تمہاری بیوی اور ہینکس کو ایک ساتھ دیکھا تھا۔ تمہیں اس بات کا علم کب ہوا؟"

"میرا خیال ہے کہ تم نے دوبارہ واپس آکر غلطی کی ہے۔ بہتر ہے کہ چلے جاؤ۔"

"سچ تو سامنے آنے والا ہے جسے چھپانے کے لیے تم نے کئی جھوٹ بولے۔"

میں نے واپس آتے ہوئے تمام واقعات کو ایک ترتیب کے ساتھ جوڑنا شروع کیا۔ لیوس سے پہلی ملاقات کے دوران میں نے جن باتوں کو غیر اہم سمجھ کر نظرانداز کردیا تھا اب وہی اہم ہوگئی تھیں۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ لیوس یہ معلوم کرنے کے لیے یمسن کے پاس کیوں گیا کہ انہوں نے کوئی آواز سنی ہے جبکہ سب سے پہلے اسے اپنی بیوی کو اٹھانا چاہیے تھے۔ وہ ہینکس کو رکی کہہ رہا تھا جبکہ وہ رکی کے نام سے پہچانا جاتا تھا اور اس کی بیوی بھی یہی نام لے رہی تھی۔ جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے مابین کتنی بے تکلفی تھی۔

"جب تم نے سیکیورٹی اسٹیشن فون کیا تو مارک کو بتایا کہ ہینکس کو گولی لگی ہے جبکہ مسز یمسن نے اپنے بیان میں یہ نہیں کہا کہ تم ہینکس کے اپارٹمنٹ میں گئے تھے۔ پھر تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟"

"گیٹ آؤٹ۔" وہ زور سے چلایا۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگا اور سرخ آنکھیں مزید پھیل گئیں۔ "میں کہتا ہوں چلے جاؤ۔"

"کیا تم نے کبھی یہ سنا ہے کہ صفائی کا وکیل، استغاثہ کے گواہوں کو ہی یہ اعتراف کرنے پر مجبور کردے کہ وہ بھی شریک جرم ہیں؟ ایسا اکثر ہوتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ کیتھی کا وکیل تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟"

اس نے مجھے دھکا دیتے ہوئے میرے سینے پر ہتھیلی سے ضرب لگائی۔ میں نے اس کا وار سہہ لیا۔ میرے ہاتھوں میں کھجلی ہونے لگی لیکن میں نے کوئی حرکت نہیں کی تو وہ تیزی سے گھوما۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے وار سے بچانے کے لیے جسم کو بل دیا اور پیچھے کی طرف جھکا اور اس کا مکا میرے کندھے کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ میں نے پوری قوت سے اپنے بائیں ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی پر ضرب لگائی۔ وہ تھوڑا سا ڈگمگایا۔ میں نے یکے بعد دیگرے اس کے پیٹ پر دو زوردار ضربیں لگائیں۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پر جا گرا۔ میں نے اسے بائیں ہاتھ سے پکڑا اور دائیں ہاتھ سے ایک اور ضرب لگانے والا تھا کہ اس کی بیوی کے چلانے کی آواز آئی۔ وہ بالکونی میں آگئی تھی اور دروازے میں کھڑی کہہ رہی تھی۔

"رک جاؤ۔ میں زیادہ برداشت نہیں کرسکتی۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ کوئی نہ کوئی اس کا کھوج لگا لے گا۔"

لیوس اپنے آپ کو میری گرفت سے آزاد کراتے ہوئے بولا۔ "شیرون! چپ ہو جاؤ۔"

"نہیں، میں چپ نہیں رہ سکتی۔" وہ مڑی اور بالکونی کی طرف بھاگی۔ اس سے پہلے کہ میں یا کوئی اور اس تک پہنچتا، وہ ریلنگ پر چڑھ چکی تھی۔

میں صحیح راستے پر جا رہا تھا لیکن غلط گاڑی میں سوار ہو گیا۔ لیوس نے کبھی شیرون اور ہینکس کے بارے میں شک نہیں کیا۔ جہاں تک وہ جانتا تھا، اس کی بیوی اس کے ساتھ مخلص تھی اور ہینکس ہنسی مذاق کرنے والا شخص تھا۔ ایسے لوگوں کو سبھی پسند کرتے ہیں لیکن یہ حقیقت اس وقت واضح ہوئی جب وہ وقت سے پہلے گھر آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ دونوں فرانسیسی دروازے کھلے ہوئے تھے اور پھر اس نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ وہ بالکونی میں گیا اور وہاں دوسرے دروازے کے ذریعے ہینکس کے بیڈ روم میں داخل ہو گیا۔ جہاں اس کی بیوی گن ہاتھ میں پکڑے ہوئے کھڑی تھی اور ہینکس فرش پر مردہ حالت میں پڑا ہوا تھا اور کیتھی مدہوشی کے عالم میں بستر کے کنارے کھڑی ہوئی تھی۔ لیوس نے اپنے حواس برقرار رکھے اور بڑی تیزی سے کارروائی شروع کر دی۔ اس نے گن پر سے شیرون کی انگلیوں کے نشانات صاف کیے اور اسے کیتھی کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ پھر وہ بیوی کو لے کر ہینکس کے اپارٹمنٹ سے نکلا اور اپنے گھر چلا گیا۔ اس نے دونوں فرانسیسی دروازے بند کر دیے۔

اس کے بعد کی کہانی وہی ہے جو پولیس ریکارڈ میں موجود تھی۔ وہ بیوی کو بستر پر لٹا کر مسز کیمسن کے دروازے پر آیا اور پوچھا کہ انہوں نے گولی چلنے کی آواز سنی ہے۔ پھر اس نے سیکیورٹی اسٹیشن کو اطلاع دی۔ اسے امید نہیں تھی کہ کیتھی ہوش میں آنے کے بعد گن لے کر باہر نکلے گی لیکن اس سے اس کی گھڑی ہوئی کہانی کو تقویت ملی۔ میرا شبہ درست نکلا۔ شیرون اور ہینکس کے درمیان تعلقات قائم ہو چکے تھے لیکن جب وہ کیتھی کو لے کر آیا تو شیرون سے یہ برداشت نہ ہو سکا اور اس نے ہینکس پر گولی چلا دی۔

میں نے ہیڈ کوارٹر جا کر جوئے کے سامنے اپنی تحقیقاتی رپورٹ رکھ دی جس میں لیوس پر قتل میں مدد دینے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ پھر میں اینڈربیک کے گھر گیا جہاں میرا گرم جوشی سے استقبال ہوا۔ انہوں نے مجھے بونس کے طور پر ایک خطیر رقم دی۔ میں نے پہلے تو انکار کیا لیکن ان کے اصرار پر میں نے وہ چیک قبول کر لیا۔

میں واپس آنے کے لیے اپنی کار کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ویل نے آواز دے کر مجھے بلا لیا۔ "میں ایک بار پھر تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے میرے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے لباس سے پھوٹتی ہوئی خوشبو مجھے مسحور کر رہی تھی۔

"میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں۔"

"اگر تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید ہم یہ نتیجہ حاصل نہ کر پاتے۔" وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ "اس کے علاوہ بھی مجھ پر تمہارا ایک قرض باقی ہے۔ میں تم سے اس طرزِعمل کی معافی مانگنا چاہتی ہوں جب تم فٹ بال کھیلتے ہوئے زخمی ہو گئے تھے۔ اس وقت میں ناسمجھ تھی اور صرف اپنے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ مجھے تمہارا ساتھ دینا چاہیے تھا۔"

میں نے اس کے عقب میں تین منزلہ عمارت کی طرف دیکھا جو کہ اینڈربیک ایمپائر کا ایک چھوٹا سا حصہ تھی اور بولا۔ "اسے بھول جاؤ۔ ورنہ تمہیں ان سب چیزوں سے محروم ہونا پڑتا۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "یہ تو ہے۔ میں خوش قسمت ہوں۔ اسٹیفن مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے اور کہے بغیر میری ہر خواہش پوری کر دیتا ہے۔ ہماری زندگی بہت خوش گوار گزر رہی ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ تمہیں دوبارہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اور... اور یہ کہ تم سے بچھڑ کر میں آج بھی کسی چیز کی کمی محسوس کرتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی اور اس نے میرا ماتھا چوم لیا پھر تیزی سے واپس چلی گئی۔ اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہاں سے واپس آتے ہوئے میں راستے میں سوچ رہا تھا کہ اگر ماضی کو بھلا کر اس کے ساتھ چلوں تو میں بالکل بھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتا۔ میرے اندر اب بھی اس کے لیے ایک جذبہ تھا۔ شاید کچھ شعلے کبھی نہیں بجھتے۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہمارا دوبارہ ملنے کے بارے میں سوچنا غیر حقیقی ہوتا۔ وہ جہاں جانا چاہتی تھی۔ وہاں پہنچ گئی۔ اسٹیفن اس کے لیے ایک خزانے کی طرح تھا اور وہ اس کی دی ہوئی چیزوں کو پسند نہیں کرتی تھی۔ گو کہ اس نے یہ نہیں کہا کہ وہ اس سے محبت بھی کرتی ہے۔ واقعی وہ بالکل نہیں بدلی تھی۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ واپس چلی گئی ورنہ چنگاری کو شعلہ بنتے کتنی دیر لگتی ہے؟

کارنامہ

سیریناراض

ابتدا میں کچھ کام بہت مشکل لگتے ہیں... ان کے آغاز ہی سے ناکامی کا یقین ہونے لگتا ہے... ایک ایسے ہی پیچیدہ... بظاہر حل نہ ہونے والے کیس کی دلچسپ روداد... ہر شخص کا خیال تھا کہ یہ سادہ سا خودکشی کا کیس ہے...

محبت اور رقابت کے نتیجے میں زندگی کی بازی ہار جانے والوں کا المیہ...

ٹاؤن کانسٹیبل جارج اولیور دفتر میں داخل ہوا تو اس کی نگاہ میز پر رکھے ہوئے ایک کاغذ پر گئی جس پر ہاتھ سے لکھا ہوا تھا "تمہارے گھر فون کیا لیکن بات نہیں ہو سکی۔ جتنی جلدی ممکن ہو مجھ سے ملو۔" اس تحریر پر ڈونلڈ کے دستخط تھے۔ جارج فوراً ہی دفتر سے روانہ ہو گیا اور پارکنگ لاٹ عبور کر کے سڑک کی دوسری جانب واقع پوسٹ آفس میں داخل ہو گیا اور کھڑکی کی سلاخوں سے جھانکتے ہوئے بولا۔

"ہائے ڈونلڈ... تم واپس آ گئے۔"

اسسٹنٹ پوسٹ ماسٹر ڈونلڈ واکر نے اُس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''شکر ہے کہ تم آ گئے۔ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ صبح سے لوگ تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔''

جارج مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ مجھے وضاحت کرنے کی کوئی ضرورت ہے کیونکہ تم میرے باس نہیں ہو۔ ویسے بھی ابھی صرف گیارہ بجے ہیں۔ میرا نہ ملنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ میئر کی بلی شاہ بلوط کے درختوں میں کھو گئی تھی۔ اسے تلاش کر رہا تھا۔''

ڈونلڈ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تم ایمس جیکسن کو جانتے ہو؟ اُس کا گھر کونٹ کوٹ روڈ پر واقع ہے۔''

''ہاں، وہ میرے ڈیڈی کے فارم سے بیج، کھاد اور استعمال شدہ اوزار خریدتا رہتا ہے۔ اس کا رہن سہن گھریلو ملازم جیسا ہے لیکن اُسے کاشت کاری کا بھی شوق ہے۔''

''میرے لیے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ مر چکا ہے۔'' ڈونلڈ نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''اس نے درخت سے لٹک کر خودکشی کر لی۔''

جارج نے ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا۔ تمہیں یہ اطلاع کہاں سے ملی؟''

''اس وقت قصبے میں تم واحد شخص ہو جو اس بارے میں نہیں جانتے۔ تم اب تک کہاں تھے؟''

''پولیس کی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا جس کی مجھے تنخواہ ملتی ہے۔ ہمیں شکایت ملی تھی کہ کچھ لوگ چوری چھپے ہرن کا شکار کرتے ہیں، انہی کی تلاش میں پھر رہا تھا۔ خیر تم مجھے پوری بات بتاؤ۔''

''یہ آج صبح کی بات ہے۔ ٹیلر جونز اُس کے گھر کے سامنے سے گاڑی میں گزر رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ بے چارہ ایک درخت سے لٹکا ہوا ہے۔ ٹیلر دوڑتا ہوا ایمس کے گھر میں گیا اور اُس نے تم سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی لیکن تم اُس وقت دفتر نہیں پہنچے تھے۔ کلارا نے تمہارے گھر فون کیا۔ تمہاری بیوی نے بتایا کہ تم طلوعِ آفتاب کے وقت ہی گھر سے نکل چکے ہو۔ پھر کلارا نے مجھ سے رابطہ کیا کہ شاید تم یہاں مل جاؤ۔ مجبوراً اُسے ڈوک ایڈمز اور اسٹیٹ پولیس کو اطلاع دینا پڑی۔ وہ لوگ اب تک وہاں پہنچ چکے ہوں گے۔''

''ہاں۔'' جارج واپس جانے کے لیے مڑتے ہوئے بولا۔ ''میرا بھی یہی اندازہ ہے۔''

جارج کو ایمس کے بنگلے تک پہنچنے میں دس منٹ لگے۔ یہ بنگلا دو سو ضرب دو سو فٹ رقبے پر واقع تھا جس کے چاروں طرف شاہ بلوط اور صنوبر کے درخت تھے۔ اس سے متصل چوتھائی میل کے فاصلے پر جیک اور جوڈی ناش کا بڑا سا گھر تھا۔ ڈرائیو وے پر اسٹیٹ پولیس کی گاڑیاں بے ہنگم انداز میں کھڑی ہوئی تھیں۔ جارج کو ان کے درمیان ایڈمز کی پیکارڈ اور ایک سیاہ وین نظر آئی۔ اُس نے بھی اپنی سیاہ رنگ کی فورڈ پولیس کار ڈرائیو وے میں کھڑی کر دی۔

جارج نے دیکھا کہ گیراج کے ساتھ ہی ناشپاتی کے درخت کی شاخ میں موٹی رسی کا پھندا ابھی تک لٹکا ہوا تھا اور اس کے قریب ہی ایک سرخ بالوں والا شخص کریم کلر کے سوٹ میں ملبوس چھوٹی سی نوٹ بک میں کچھ لکھ رہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی وہ بولا۔ ''لگتا ہے کہ کوئی شخص تمہیں ڈھونڈنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔''

جارج نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''میں جارج اولیور ہوں۔ تم کون ہو؟''

''ڈان میتھیو، اسٹیٹ پولیس انسپکٹر جو مقامی پولیس کی مدد کے لیے بروقت دستیاب ہوتا ہے۔''

''یہاں کیا واقعہ پیش آیا؟''

میتھیو نے اپنی نوٹ بک کے چند صفحات پلٹتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں آج صبح آٹھ بج کر دس منٹ پر ٹیلی فون آپریٹر کلارا نے اطلاع دی کہ اس درخت پر ایک لاش لٹکی ہوئی ہے۔ اس اطلاع کے ملنے پر پہلی پولیس پارٹی آٹھ بج کر تیس منٹ پر یہاں پہنچ گئی۔ یہاں ان کی ملاقات سینتیس سالہ ٹیلر جونز سے ہوئی جس نے سب سے پہلے لاش دیکھی تھی۔ میں نو بج کر پانچ منٹ پر یہاں پہنچا۔ دو ڈاکٹر پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اس شخص کی موت واقع ہو چکی ہے۔ ہم نے لاش کی چند تصویریں لینے کے بعد اسے نیچے اُتار لیا۔''

جارج نے گیراج کے سامنے پختہ فرش پر نگاہ ڈالی جہاں وہ لاش رکھی ہوئی تھی اور اُسے ایک ترپال سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ نوجوان ڈوک ایڈمز لاش کے پاس کھڑا ایک باوردی پولیس آفیسر سے باتیں کر رہا تھا۔

میتھیو نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک جلا ہوا کاغذ ہے لیکن تم اس کے کچھ حصے پڑھ سکتے ہو۔ یہ مجھے برابر والے لان میں باربی کیو کے چولہے کے پاس پڑا ہوا ملا تھا۔ اس میں لکھا ہے۔ مجھے افسوس ہے میں ایسا نہیں کر سکتا۔ مجھے معاف کر دینا۔ میں نے گھر میں موجود دوسرے کاغذات سے اس تحریر کا موازنہ کیا تو ثابت ہو گیا

کہ مرنے والے نے ہی خودکشی سے قبل یہ تحریر لکھی تھی۔''

جارج نے وہ خط میتھیو کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلے اس نے یہ خط لکھا اور پھر اسے جلا دیا... آخر کیوں؟''

میتھیو نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ''کوئی نہیں جانتا کہ یہ بے وقوف لوگ ایسی حرکتیں کیوں کرتے ہیں۔ اسی لیے میں نے پوچھنا چھوڑ دیا ہے کہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں۔''

''ایک سراغ رساں کو یہ زیب نہیں دیتا۔'' جارج نے کہا۔ ''اس خط کو جلانے والی بات کچھ عجیب سی لگتی ہے۔''

میتھیو کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''میرا واسطہ ہمیشہ تم جیسے چھوٹے قصبے کے سپاہیوں سے پڑتا ہے جو بالعموم میئر کے بھانجے بھتیجے ہوتے ہیں۔ وردی پہن کر تم لوگ خود کو ایلیٹ نیس کے پائے کا سراغ رساں سمجھنے لگتے ہو لیکن یاد رکھو اولیور کہ تم ایلیٹ نیس نہیں ہو۔''

جارج نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''میں نے تین سال نیوی میں گزارے ہیں اور میرا واسطہ مختلف نوعیت کے جرائم سے پڑتا ہے۔''

''شراب کے نشے میں چور کسی بدمست ملاح کو غل غپاڑا کرتے دیکھ کر پکڑنا اور بات ہے لیکن یہ ایک خودکشی کا کیس ہے اور میں ہی اسے حل کروں گا۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔''

''تم واقعی ایک مشکل شخص ہو۔'' جارج نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ اسکول کے زمانے میں دوسرے لڑکے تمہاری خوب پٹائی کیا کرتے تھے۔''

میتھیو نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''برا مان گئے۔ ٹھیک ہے تم اپنا سراغ رسانی کا شوق پورا کر لو۔ اس کے لیے مشاہدہ بنیادی شرط ہے۔ غور سے دیکھو، تمہیں درخت کے گرد قدموں کے نشان نظر آ رہے ہیں جس سے لگتا ہے کہ مرنے والے نے ساڑھے نو نمبر کا جوتا پہن رکھا تھا۔ پھر تمہیں وہ چھ فٹ کی سیڑھی بھی نظر آ رہی ہو گی جسے جیکسن نے درخت پر چڑھنے کے بعد لات مار کر گرا دیا تھا۔ پھندے کے بالکل نیچے زمین کو دیکھو جس سے تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ کس طرح سیڑھی کے پائے نرم زمین میں دھنس گئے تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ متوفی اسی سیڑھی کے ذریعے درخت پر چڑھا اور اس کے وزن سے زمین پر گڑھے پڑ گئے۔ اگر یہ کوئی قتل ہوتا تو قاتل کبھی بھی سیڑھی کو گرانے کے بارے میں نہ سوچتا۔ یہ بات دوسری ہے کہ کوئی پیشہ ور قاتل صرف اس شخص کو قتل کرنے کے لیے نیویارک سے چھ سو میل کا سفر کر کے آیا ہو۔''

جارج نے زمین پر نگاہ ڈالی لیکن کچھ بولا نہیں۔

میتھیو اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ہم اس تحریر کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ٹھوس ثبوت ہے۔ تم نے پوچھا ہے کہ مرنے والے نے اس خط کو کیوں جلایا؟ یہ میں نہیں جانتا اور نہ ہی اس پر زیادہ توجہ دینا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے کہ خط لکھنے کے بعد اسے احساس ہوا ہو کہ اس سے حماقت سرزد ہو گئی ہے اور اس نے سوچا ہو کہ پولیس والے اس خط کو پڑھ کر اس کا مذاق اڑائیں گے۔ لہٰذا اس نے شرمندگی سے بچنے کے لیے اس خط کو جلا دیا ہو۔''

جارج نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے۔'' پھر اس نے پوچھا۔ ''اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں اس جگہ کا معائنہ کر لوں؟''

''ٹھیک ہے لیکن کسی کو ڈسٹرب نہ کرنا۔'' وہ اپنی نوٹ بک بند کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنا کام ختم کر چکا ہوں۔''

جارج نے بنگلے کے گرد ایک سرسری نگاہ ڈالی کیونکہ اس وقت تک وہاں دوسرے لوگ موجود تھے۔ ناشپاتی کے درخت کے پاس ہی ایک باغ تھا جس میں انواع و اقسام کی جڑی بوٹیاں اور پودے لگے ہوئے تھے۔ وہاں ٹماٹر، مرچوں، پھلیوں اور ککڑی کے پودے ایک ترتیب سے اپنی بہار دکھا رہے تھے اور ان تک پہنچنے کے لیے بڑی نفاست سے پگڈنڈی بنائی گئی تھی۔

لاش کے ہٹائے جانے اور لوگوں کے وہاں سے چلے جانے کے بعد جارج نے اپنی عقابی نگاہوں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ ٹہلتا ہوا گیراج میں چلا گیا تو اس کے نتھنوں سے مٹی کے تیل، آئل اور تازہ کٹی ہوئی گھاس کی مہک ٹکرائی۔ شمالی دیوار کے ساتھ ہی انگور سے شراب کشید کرنے والا لکڑی کا پریس لگا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر جارج کو یاد آ گیا کہ یہ پہلے ایک اطالوی جوڑے کی ملکیت تھی جو اپنے ذاتی استعمال کے لیے قانونی طور پر گھر میں ہی شراب تیار کر سکتے تھے۔

وہ واپس جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ اس کی نظر ایک کونے میں رکھے سفیدی کے ڈرم پر گئی۔ اس نے ایک خالی ڈرم کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھا۔ اندر کی سطح ابھی تک گیلی تھی اور سفیدی خشک نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ڈھکنا بند کیا تو اس کی نظر فرش پر پڑے ایک دھبے پر گئی۔ اس نے انگلی سے چھوا اور ناک کے قریب لے جا کر سونگھنے کی کوشش کی۔ یہ ایک

کیڑے مار دوا تھی جسے کسان برسوں سے استعمال کر رہے تھے۔ جارج بھی مقامی کاشتکاروں کو یہ دوا فروخت کرتا تھا جن میں ایس جیکسن بھی شامل تھا۔

جارج کھڑا ہو گیا اور اس نے دیکھا کہ گیراج کی کھڑکی کے نیچے اس دوا کا بھرا ہوا ڈرم رکھا ہوا ہے۔ وہ گیراج سے باہر آ گیا اور دوبارہ ناشپاتی کے درخت کے گرد چکر کاٹنے لگا۔ ایک بار پھر پودینے کی خوشبو نے اس کا استقبال کیا۔ وہ اس جانب گیا جہاں سے یہ خوشبو آ رہی تھی۔ اس کی نظر باغ میں لگے ہوئے دوسرے پودوں پر بھی گئی۔ ہر ایک پودے کے ساتھ لکڑی کی تختی پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ کالی تلسی، گاؤزبان، دھنیا، اجوائن، مونگا اور پودینہ۔ اس نے غور سے دیکھا تو لگا جیسے پودینے کے کھیت میں کوئی چیز دبائی گئی ہے جس کا ایک حصہ جزوی طور پر باہر سے نظر آ رہا تھا۔ اس نے جھک کر پودینے کے پتے ہٹائے تو اسے ایک بالکل نیا اسپرے کرنے والا پمپ نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک شیشے کی بوتل نصب تھی جس میں کیڑے مار دوا بھری ہوئی تھی۔ وہ تازہ ہوا میں سانس لینے کی خاطر اس جگہ سے ہٹ گیا پھر اس نے قریب میں لگی ہوئی ٹماٹر کی بیل دیکھی۔ اس نے نتھنے سکیڑ کر سونگھنے کی کوشش کی تو اسے اندازہ ہو گیا کہ اس جگہ پر حال ہی میں کیڑے مار دوا چھڑکی گئی ہے۔

وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظر ایک بار پھر گیراج پر گئی جس کی دیواریں سورج کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ صاف لگ رہا تھا کہ ان پر حال ہی میں سفیدی کی گئی ہے۔ اس نے گیراج کے گرد ایک چکر لگایا تو اسے کئی جگہ فرش پر سفیدی کے دھبے نظر آئے۔ اس نے وہاں رکھی ہوئی سیڑھی دیکھی۔ اس پر بھی سفیدی کے تازہ دھبے موجود تھے۔ پھر اسے انسپکٹر میتھیو کی بات یاد آئی جو اس نے جلے ہوئے خط کے بارے میں کہی تھی۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو کہ ایک شخص خودکشی کرنے سے پہلے خط لکھے اور پھر اس کے مندرجات پر دوبارہ غور کرنے کے بعد اسے جلا دے اور خود گلے میں پھندا ڈال کر لٹک جائے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسے خودکشی کرنا ہی تھی تو اس نے چند روز قبل گیراج پر سفیدی کیوں کی اور خودکشی سے کچھ دیر پہلے ٹماٹر کے پودوں میں کیڑے مار دوا کا اسپرے کیوں کیا؟ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا میتھیو نے بھی ان باتوں پر غور کیا ہوگا؟ اسے میتھیو کی بات یاد آئی کہ مشاہدہ بہترین کنجی ہے اور وہ دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

وہ چھوٹے سے لکڑی کے بنے ہوئے سفید مکان کی جانب بڑھا جس کی سبز رنگ کی چھت سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ اس مکان میں دو کمرے اور ایک لیونگ روم تھا جس میں ایک ریڈیو، کرسی، میز اور لیمپ رکھا ہوا تھا۔ اس کے برابر والے حصے کو کھانا کھانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس سے ملحق کچن تھا۔ وہ کچن کی میز پر بیٹھ گیا اور ان چیزوں کو دیکھنے لگا جو اس نے اب تک جمع کی تھیں۔ پھر وہ دیوار پر لگے ہوئے ٹیلی فون کی طرف بڑھا اور کلارا کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد بولا۔ ''کیا تم ہنری فالکن سے میری بات کروا سکتی ہو؟''

''اوہ میرے خدا!'' وہ اس کی آواز پہچانتے ہوئے بولی۔ ''جارج! تم کہاں ہو؟ میں کب سے تمہیں تلاش کر رہی ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ...''

''میں جانتا ہوں۔'' وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''میں اس وقت جیکسن کے گھر پر ہی ہوں۔ برائے کرم میری ہنری سے بات کروا دو۔''

''کیوں نہیں۔ ابھی کرواتی ہوں۔'' کلارا نے شوخ لہجے میں کہا۔

تیس سیکنڈ بعد اسے قصبے کے واحد پلمبر کی آواز سنائی دی جو اطالوی لہجے میں بول رہا تھا۔ ''بولو جارج! کیا بات ہے؟''

''جیکسن نے تم سے کسی کام کے لیے کہا تھا؟'' جارج نے ہوا میں تیر چلایا۔

''ہاں' میں گزشتہ جمعرات اسے تخمینہ دے چکا ہوں۔''

''کیا تم کام کی تفصیل بتانا پسند کرو گے؟''

''کیوں نہیں۔ گزشتہ ہفتے اس نے مجھے فون کیا تھا۔ وہ اپنے گھر کو جدید بنانے کے لیے کچھ کام کروانا چاہ رہا تھا۔ وہ ٹوائلٹ کے علاوہ باتھ روم مع ٹب شاور اور گرم پانی کی لائن وغیرہ... سب کچھ لگوانا چاہ رہا تھا۔''

''اور اس کام کے لیے اس نے تمہاری خدمات حاصل کی تھیں؟''

''ہاں اور ان سب کاموں کے لیے میں نے اسے تین سو ڈالرز کا تخمینہ بتایا تھا۔ اس کے ساتھ میں نے کافی رعایت کی کیونکہ اس نے یہ مکان میرے کزن سے خریدا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اس سے کم از کم ساڑھے چار سو ڈالرز مانگتا۔''

''وہ یہ کام کب شروع کروانا چاہ رہا تھا؟''

''جتنی جلدی ممکن ہوتا۔ میں نے اُسے اگلے سوموار کا وقت دیا تھا۔ کیونکہ کام زیادہ تھا اس لیے اسے مکمل کرنے میں ایک ہفتہ یا اس سے زیادہ بھی لگ سکتا تھا۔''

''تمہیں یقین ہے کہ وہ واقعی یہ کام کروانا چاہ رہا تھا؟''

''ہاں' اس نے مجھے چالیس ڈالر پیشگی دیے تھے جس سے میں نے الیکٹرک پمپ خرید لیا لیکن اب اس نے اپنے آپ کو ختم کر لیا۔''

''ہاں، مجھے افسوس ہے کہ تم ایک بڑے کام سے محروم ہو گئے۔''

ہنری ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''کام کو گولی مارو۔ اس کی زندگی زیادہ قیمتی تھی۔ مجھے اس کے مرنے کا بہت دکھ ہے۔''

جارج نے سلسلہ منقطع کرنے کے بعد میز پر نگاہ ڈالی۔ مکان کی تلاشی کے دوران اسے کام کی تین چیزیں ملی تھیں۔ ان میں سے ایک وہ تخمینہ تھا جو ہنری نے اسے دیا تھا۔ جارج یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ اگر جیکسن اس حد تک دل برداشتہ تھا کہ اس نے مایوس ہو کر خودکشی کر لی تو اس نے اپنے گھر میں کام کروانے کے لیے اتنا بڑا اور مہنگا منصوبہ کیوں بنایا؟

جارج نے وہ کاغذ میز پر رکھ کر دوسری چیز اٹھائی جو اُسے میز کی دراز میں سے ملی تھی۔ یہ ایک نوٹ پیڈ تھا۔ جارج کا ذہن فوراً ہی جلے ہوئے کاغذ کی طرف گیا اور اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کاغذ اسی نوٹ پیڈ سے پھاڑا گیا تھا۔ تیسری چیز سیاہ ویلوٹ میں لپٹا ہوا نو انچ لمبا باکس تھا جس پر سنہرے حروف میں کارلسن جیولری، ایسٹ مارینس، نیویارک لکھا ہوا تھا۔ اس باکس میں ایک چاندی کا بریسلیٹ بھی تھا جس کے ساتھ ایک زنجیر منسلک تھی۔ جس کے دوسرے سرے پر ایک نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی اور اس پر ایس کا نام کندہ تھا اور اس کے نیچے باریک الفاظ میں لکھا ہوا تھا۔ ہمیشہ کے لیے تمہاری مائی ڈارلنگ۔

جارج نے اس بریسلیٹ کو غور سے دیکھا اور سوچنے لگا کہ ایس جیسا دیہاتی شاید ہی اس طرح کا بریسلیٹ پہنتا ہو۔ یقیناً کسی نے اسے تحفہ دیا ہوگا اور وہ ممکنہ طور پر کوئی عورت ہی ہو سکتی ہے۔ اس نے وہ بریسلیٹ احتیاط سے میز پر رکھ دیا اور مکان سے باہر آ گیا۔ سہ پہر کا سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ وہ ناشپاتی کے درخت تلے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور جوتوں کے نشانات کا معائنہ کرنے لگا جن کی نشاندہی میتھیو نے کی تھی۔ اس نے ان نشانات کو غور سے دیکھا۔ ان میں سے ایک سیدھے جوتے کا نشان تھا جس کے تلے میں ایک باریک سا گولائی نما کریک نظر آ رہا تھا جبکہ دوسرا نشان بھی سیدھے پاؤں کے جوتے کا تھا جس میں کوئی کریک نہیں تھا۔ جارج نے غور سے سیدھے پاؤں کے جوتے کے تمام نشانات دیکھے۔ وہ تعداد میں کل دس تھے جن میں سے چھ میں کریک اور چار اس کے بغیر تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ دو مختلف جوتوں کے نشانات تھے لیکن ان کا نمبر ایک ہی تھا۔ میتھیو نے محض اندازے کی بنیاد پر سوچ لیا تھا کہ یہ سارے نشانات جیکسن کے جوتوں کے ہوں گے۔

جارج آہستہ سے کھڑا ہوا اور اپنے ہاتھ سے زمین کی گھاس ہٹانے لگا پھر وہ مڑا اور ڈرائیو وے سے گزرتا ہوا اینٹوں سے بنے ہوئے باربی کیو کے چولہے کے قریب آ گیا۔ اس نے لوہے کی گرل کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ وہاں اُسے جلے ہوئے کاغذ کے کچھ اور ٹکڑے نظر آئے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر احتیاط سے ان ٹکڑوں کو اٹھایا اور دوبارہ مکان میں آ گیا۔ کچن ٹیبل پر رکھ کر اس نے آہستہ سے ان ٹکڑوں پر سے راکھ ہٹائی تو ان پر لکھی ہوئی تحریر واضح نظر آنے لگی۔ اس نے تمام ٹکڑوں کو میز پر پھیلا کر جوڑا اور اس تحریر کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس میں لکھا تھا۔

''مائی ڈیئر، پلیز مجھے معاف کر دینا۔ یہ بتاتے ہوئے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ یہ سب کچھ بہت نامناسب ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ تم یقیناً اچھی طرح جانتی ہو۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا اور زندگی میں کوئی ایسا موقع آیا تو ہم دوبارہ اکٹھے ہوں گے لہٰذا مجھے معاف کر دینا۔ ہم نے جو وقت ساتھ گزارا، اسے میں ساری زندگی عزیز رکھوں گا۔ تمہارا ایس!''

جارج نے اس کاغذ کو جیولری باکس کے ساتھ رکھا اور اسے پیپر ویٹ کے نیچے دبا دیا۔ اس خط میں کہیں خودکشی کا ذکر نہ تھا بلکہ اسے ایک الوداعی تحریر سمجھنا چاہیے جو ایک ایسے شخص کی جانب سے لکھی گئی جسے گھر کو سجانے سنوارنے سے دلچسپی تھی اور وہ اس کی تزئین و آرائش کے لیے ایک خطیر رقم خرچ کرنے کے لیے تیار تھا اور ایک مطمئن زندگی گزارنے کے لیے پُرامید تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس نے یہ خط کسے لکھا اور کیوں؟ اور پھر اسے دوسرے کاغذات کے ساتھ جلا دیا۔

ڈرائیو وے میں کسی گاڑی کے انجن کی آواز سن کر وہ

اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ نیویارک اسٹیٹ پولیس کی کروزر گیراج کے پاس آکر رک گئی تھی۔ اس میں سے ایک نوجوان پولیس آفیسر اترا، اس نے جارج کی فورڈ پر نگاہ ڈالی اور مکان کی طرف بڑھا۔ جارج اسے پہلے بھی ڈوک ایڈمز کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور آفیسر سے ملنے کے لیے باہر آ گیا۔

''شاید تم یہاں کچھ بھول گئے تھے۔'' جارج نے ناشپاتی کے درخت کی طرف دیکھتے ہوئے اشارہ کیا۔

آفیسر جھجکتے ہوئے بولا۔ ''انسپکٹر میتھیو مجھ پر ناراض ہو گیا کہ میں یہ سیڑھی اور رسی یہاں کیوں بھول گیا۔ اس کے ساتھ کام کرنا بہت مشکل ہے۔''

جارج نے کہا۔ ''تم ابھی نوجوان ہو۔ آہستہ آہستہ سب سیکھ جاؤ گے۔ یہ رسی اور سیڑھی لے جاؤ اور انہیں ثبوت کے طور پر محفوظ کر لینا۔ کسی دن ہمیں ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

اس کے جانے کے بعد جارج نے اپنی دریافت شدہ اشیا اکٹھی کیں اور پودینے کی کیاری کے پاس آکر بڑی احتیاط سے اسپرے گن اٹھائی اور تمام چیزیں اپنی کار کی ڈکی میں محفوظ کر دیں۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اسے ڈوک ایڈمز سے ملنا تھا کیونکہ وہی ان جوتوں کے نشانات کے سانچے تیار کر سکتا تھا۔ گو کہ یہ کام اسٹیٹ پولیس کا تھا لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ انسپکٹر میتھیو انہیں فون کرتا۔

دوسری صبح وہ اپنے گھر کے کچن میں ناشتا کر رہا تھا اور اس کی بیوی سامنے بیٹھی اسے گھور رہی تھی۔ اس نے ناراض لہجے میں کہا۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ واقعی کوئی عقل مندی ہے؟ بہتر ہوگا کہ تم اس معاملے کو اسٹیٹ پولیس پر چھوڑ دو۔''

جارج مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یہ قصبہ 1683ء میں آباد ہوا اور 1842ء میں یہاں ریل کی پٹری بچھائی گئی۔ اس وقت سے لے کر اب تک لوگ یہاں بڑے اطمینان سے رہ رہے ہیں اور جہاں تک مجھے علم ہے، یہاں کبھی کوئی قتل نہیں ہوا۔ شاید یہ بھی خودکشی کا واقعہ ہو جیسا کہ پولیس والے کہہ رہے ہیں۔''

''تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔'' وہ غصے سے بولی۔ ''جو کچھ تم نے بتایا ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ تم ان لوگوں خاص طور پر انسپکٹر میتھیو کو غلط سمجھتے ہو۔''

وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس بارے میں بعد میں بات کروں گا۔ فی الحال کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ آج میں مزید کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''اور تم نے ڈوک ایڈمز کو اس معاملے میں کیوں شامل کر لیا؟ اس بے چارے کو قصبے میں آئے ہوئے بمشکل ایک سال ہوا ہے اور وہ یہاں کے لوگوں کو اچھی طرح جانتا بھی نہیں ہے۔''

''کیونکہ پولیس والوں نے جوتوں کے نشانات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اگر بارش ہو گئی تو سب نشان صاف ہو جائیں گے۔ اس لیے ان کے سانچے بنانا بہت ضروری ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے کافی کا آخری گھونٹ لیا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے، اب میں چلتا ہوں۔''

اس کی بیوی دروازے تک آتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے اگر تم کسی قاتل کا پیچھا کر رہے ہو تو کہیں وہ...''

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''میتھیو اور اس کے سپاہی مجھ سے صرف ایک کال کے فاصلے پر ہیں۔''

جارج نے پہلے ان لوگوں سے ملنے کا فیصلہ کیا جن سے ایمس جیکسن کے قریبی تعلقات تھے یا وہ اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ اس سلسلے میں جب وہ ول ٹرنر سے ملا تو اس نے کہا۔ ''یہ حیرت انگیز واقعہ ہے۔ میں اسے ایک عرصے سے جانتا ہوں۔ میں نے اس سے زیادہ اچھا آدمی نہیں دیکھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟''

جارج نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ کیا تم نے اسے کسی بارے میں پریشان دیکھا؟''

''ہاں، وہ تھوڑا سا بدحواس نظر آ رہا تھا جیسے کوئی بات اسے پریشان کر رہی ہو۔ میں نے اس سے پوچھا بھی تھا لیکن وہ ٹال گیا۔ اگر کوئی سنجیدہ معاملہ ہوتا تو وہ مجھے ضرور بتاتا۔ ہم حقیقت میں اچھے دوست تھے۔''

''کیا گزشتہ دنوں وہ کسی سے مل رہا تھا؟ میرا مطلب ہے کوئی عورت...؟''

ٹرنر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں، اسے عورتوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ اسکول کے زمانے میں اس کے ایک لڑکی اینی سے تعلقات ہوئے۔ وہ دونوں شادی کرنے والے تھے۔ پھر وہ لڑکی اچانک ہی شہر چھوڑ کر چلی گئی۔ شاید وہ اداکارہ بننا چاہتی تھی۔ چند برس پہلے وہ کیلی فورنیا میں کار کے حادثے میں ہلاک ہو گئی۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ اسے

بھول پایا ہو۔ ایس ساری زندگی اسے تلاش کرتا رہا۔ لگتا ہے کہ وہ اس کی موت کا صدمہ برداشت نہ کر سکا اور خودکشی کرلی۔''

جارج نے اس کی بات پر غور کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ اس کا اکثر ذکر کیا کرتا تھا؟''

ٹرنر نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور بولا۔ ''نہیں۔ صرف ایک مرتبہ چاندنی رات میں وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور اس نے قصبہ میں آخر اپنی محبوبہ کے بارے میں کچھ سخت الفاظ استعمال کیے تھے ورنہ بالعموم وہ خاموش ہی رہتا تھا۔''

''اور اس نے کبھی تمہارے سامنے کسی نئی دوست کا ذکر بھی نہیں کیا؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اسے کبھی دوسری عورتوں سے دلچسپی نہیں رہی۔ حالانکہ میری بیوی نے بہت کوشش کی کہ اس کی شادی اس کی کزن سنتھیا سے ہو جائے لیکن وہ راضی نہیں ہوا۔''

جارج نے دوبارہ تائیدی انداز میں سر ہلایا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے اگر تمہیں کوئی اور بات یاد آ جائے تو مجھے ضرور بتانا۔''

ٹرنر سے رخصت ہونے کے بعد وہ جم کورے سے ملا۔ اس نے بھی ایس کی زندگی میں کسی عورت کے امکان کو رد کرتے ہوئے کہا۔ ''جہاں تک مجھے علم ہے، اس کے کسی عورت سے تعلقات نہیں تھے۔ ہم دونوں کافی وقت ایک ساتھ گزارتے تھے اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو مجھے ضرور معلوم ہوتا۔''

''کیا تم نے کبھی اسے پریشان یا افسردہ دیکھا؟''

''نہیں، وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور اپنے مکان کی تزئین و آرائش میں لگا ہوا تھا بلکہ اس نے مجھ سے اپنے مکان کے عقب میں واقع دو ایکڑ زمین خریدنے کا بھی تذکرہ کیا تھا۔ شاید اس کا ارادہ وہاں چھوٹا سا فارم قائم کرنے کا تھا۔ ہفتے کی شب ہم دونوں کی ملاقات ہوئی تھی اور دو دن بعد ہی اس نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرلی۔''

جم سے کوئی خاص بات معلوم نہ ہوسکی چنانچہ اس نے گرین نیٹرن کا رخ کیا جہاں ہفتے کی شب اس کی ملاقات ایس سے ہوئی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا دیہاتی طرز کا شراب خانہ اور سرائے تھی جہاں لوگ فرصت کے لمحات میں آیا کرتے تھے۔ اسے پال ٹیلر چلا رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی خیر مقدمی انداز میں آگے بڑھا تو جارج نے کہا۔ ''صرف کافی۔ میں یہاں تفریح کرنے نہیں آیا بلکہ مجھے کچھ معلومات درکار ہیں۔''

''تم بیٹھو، میں کافی لے کر آتا ہوں۔''

جب وہ واپس آیا تو جارج نے پوچھا۔ ''کیا ایس یہاں اکثر آیا کرتا تھا؟''

ٹیلر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، وہ میرا باقاعدہ گاہک تھا۔ اسے یہاں کا سوپ بہت پسند تھا اور وہ ایک بڑی سی بوتل میں سوپ بھروا کر لے جاتا جو ایک ہفتے کے لیے کافی ہوتا تھا۔''

''کیا وہ کبھی کسی لڑکی کے ساتھ یہاں آیا؟''

''نہیں۔ وہ عام طور پر جم کورے یا ول ٹرنر کے ساتھ یہاں آیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی ٹرنر کی بیوی بھی ان کے ہمراہ ہوتی تھی لیکن وہ کسی لڑکی کے ساتھ یہاں نہیں آیا۔''

وہاں سے رخصت ہونے کے بعد جارج نے کارلسن جیولری جانے کے لیے اپنی گاڑی کا رخ ایسٹ ماریشس کی طرف موڑ دیا جو کاؤنٹی روڈ پر ایک دومنزلہ اینٹوں سے بنی ہوئی عمارت میں واقع تھی۔ دکان کا مالک میلون کارلسن شیشے کے شوکیس کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے پولیس کی وردی میں ملبوس ایک اجنبی چہرے کو دیکھا تو مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

جارج نے اسے اپنا شناختی کارڈ دکھایا اور کاؤنٹر پر سیاہ ویلوٹ میں لپٹا ہوا باکس رکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم میری خاطر اسے ایک نظر دیکھنا چاہو گے؟''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔'' کارلسن نے باکس کھولا اور بریسلیٹ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم کیا جاننا چاہتے ہو؟''

''یہ بریسلیٹ تمہارے باکس میں رکھا ہوا ہے لیکن ضروری نہیں کہ اسے یہاں سے خریدا گیا ہو۔ کچھ لوگ محض اپنے تحفے کی شان بڑھانے کے لیے ایسے اسٹورز کی پیکنگ استعمال کرتے ہیں جہاں سے خریداری کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ مجھے یہ بھی ایسی ہی ایک دکان لگ رہی ہے۔''

کارلسن مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اس تعریف کے لیے شکریہ لیکن یہ بریسلیٹ یہیں سے خریدا گیا ہے بلکہ اس کے لیے خصوصی آرڈر دیا گیا تھا۔''

''کیا تم اس کی وضاحت کرسکو گے؟'' جارج نے کہا۔

''یقیناً۔ جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو کہ یہ عمدہ چاندی کا بنا

ہوا نفیس بریسلیٹ ہے۔ عام طور پر مقامی لوگ انہیں نہیں خریدتے۔ اس لیے میرے پاس ان کا اسٹاک نہیں ہوتا۔ البتہ گاہکوں کو دکھانے کے لیے میرے پاس کئی کیٹلاگ ہیں۔ اگر انہیں ان میں سے کوئی چیز پسند آجائے تو میں اسپیشل آرڈر پر بنا دیتا ہوں، البتہ اس کی قیمت کچھ زیادہ ہوتی ہے۔''

''کیا یہ مہنگا بریسلیٹ ہے؟''

''ہاں۔ اس کی قیمت تقریباً پچاس ڈالرز ہوگی۔''

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ بریسلیٹ کس نے خریدا تھا؟''

''ہاں۔ میرے پاس اس کا ریکارڈ موجود ہے اور مجھے اس کا حلیہ بھی یاد ہے۔ وہ سادہ سے لباس میں تھی اور اس قصبے کی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ میں حیران رہ گیا جب اس نے بتایا کہ وہ یہی بریسلیٹ خریدنا چاہتی ہے۔ اس نے کیٹلاگ دیکھنے میں کافی وقت لگایا اور بالآخر یہ ڈیزائن پسند کرلیا۔''

جارج مسکراتے ہوئے بولا۔ ''پھر تو تمہیں اس کا نام بھی یاد ہوگا۔''

''ایسے گاہکوں کو کون بھول سکتا ہے۔ پھر بھی میں رجسٹر دیکھ لیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ رجسٹر نکالنے کے لیے مڑا پھر بولا۔ ''کیا کوئی مسئلہ ہے؟ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ ورنہ تم یہاں نہ آتے۔''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔''

''کہیں اس سے میرے کاروبار پر تو کوئی اثر نہیں پڑے گا؟''

''نہیں، بے فکر رہو۔ یہ ایک معمول کی کارروائی ہے۔''

''میں تمہاری بات پر اعتبار کرلیتا ہوں۔ دراصل میں نے بھی تمہارے قصبے میں ایس کی خودکشی کی خبر پڑھی ہے اور اس بریسلیٹ پر بھی یہی نام لکھوایا گیا ہے۔''

کارلسن صرف خریدار کا نام ہی بتا سکا۔ اس عورت کا کہنا تھا کہ اس کے گھر پر ٹیلی فون نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اسے بریسلیٹ تیار ہونے کی اطلاع نہیں دے سکے گا۔ البتہ وہ خود ہی فون کرکے معلوم کرے گی۔ اس نے اپنا پتا لکھوانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی کیونکہ اس نے پیشگی قیمت ادا کردی تھی۔ حالانکہ اس علاقے میں عام طور پر اوسط ہفتہ وار اجرت تیس ڈالر سے زیادہ نہیں ہوتی اور معمولی کپڑوں میں ملبوس کسی عورت کے لیے اتنا مہنگا زیور خریدنا بظاہر ناممکن ہے۔

''کیا تمہیں یہ بات کچھ عجیب نہیں لگی کہ اس نے نام کے علاوہ تمہیں اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

''بالکل نہیں۔'' کارلسن مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اس کاروبار میں ہمارا واسطہ اکثر ایسے لوگوں سے پڑتا ہے جو اپنے آپ کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب وہ کسی کو تحفے میں دینے کے لیے کوئی زیور خرید رہے ہوں۔ اس سودے میں صرف ایک بات عجیب لگی اور وہ اس عورت کا سادہ لباس تھا ورنہ یہاں تو ایسے خوش لباس مرد بھی آتے ہیں جن کے گھر پر ٹیلی فون نہیں ہوتا۔''

بریسلیٹ خریدنے والی عورت کا نام جوڈی ناش تھا جو ایس کے گھر سے دو دروازے چھوڑ کر رہا کرتی تھی۔ کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ ان دونوں کے بیچ کوئی تعلق قائم ہو چکا تھا اور اسی بنا پر جوڈی نے ایس کو وہ بریسلیٹ تحفے میں دیا۔ ایس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر کا مطلب اب پوری طرح واضح ہوگیا تھا۔ ایس اس ناجائز تعلق کے حوالے سے اپنے آپ کو گناہ گار سمجھتا تھا اور اسے ختم کرنے کا خواہاں تھا۔

ایسٹ ماریشس سے واپس آتے ہوئے جارج سوچ رہا تھا کہ جوڈی کا شوہر قصبے میں ہے یا باہر گیا ہوا ہے۔ اس کے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ وہ اکثر ایک ہفتہ یا اس سے بھی زیادہ دنوں تک گھر سے باہر رہا کرتا تھا۔ اب اسے یہی معلوم کرنا تھا۔

بدھ کی دوپہر وہ اپنے دفتر میں بیٹھا گزشتہ دو روز کے دوران ہونے والی معلومات اور ثبوتوں کو ترتیب دے رہا تھا۔ یہ تربیت اس نے نیوی کی ملازمت کے دوران حاصل کی تھی تاہم موجودہ ملازمت کے دس سالوں میں وہ کبھی اتنا چوکس نہیں رہا۔ جارج کو یقین ہوگیا تھا کہ وہ اس قصبے کی 256 سالہ تاریخ میں ہونے والے پہلے قتل کی واردات سے نمٹ رہا ہے۔ اسے امید تھی کہ یہ آخری قتل ہوگا۔ اس نے تمام کاغذات ایک بڑے لفافے میں رکھے اور اس پر انسپکٹر ڈان سینتھیو کا نام لکھ دیا۔

دفتر سے اٹھتے وقت اس نے ریوالور کی پیٹی اپنی کمر میں باندھی اور فورڈ میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ جوڈی کا مکان کونٹ کوٹ روڈ سے دو سو فٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہ ایک قدیم وکٹورین طرز کا مکان تھا لیکن ناش فیملی کو یہاں آئے ہوئے پانچ سال ہی ہوئے تھے۔ جیک ناش تینتیس برس کا الگ تھلگ رہنے والا شخص تھا اور اپنے ٹرک کے ذریعے سامانِ خورد و نوش بالخصوص سی فوڈ مختلف علاقوں میں لے کر جاتا تھا۔ اس

کے زیادہ تر پھیرے نیویارک سٹی کے لگتے جو اس قصبے سے ساٹھ میل کی مسافت پر تھا۔ اکثر وہ کئی کئی دن گھر سے باہر رہا کرتا۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران ایک دو مرتبہ جارج کا اس سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ ناش کو پینے کی عادت تھی اور وہ نشے میں دھت ہو کر اول فول بکنے لگتا۔ گرین نیٹرن میں اس کی کچھ لوگوں سے لڑائی ہو چکی تھی۔ ایک مرتبہ وہ جارج سے بھی الجھ گیا جس کے نتیجے میں اسے دو راتیں حوالات میں گزارنا پڑیں۔ جارج اس کی بیوی سے بھی واقف تھا۔ وہ ہمیشہ خوفزدہ اور گھبرائی ہوئی نظر آئی تھی۔ جارج کو شبہ تھا کہ جیک اس کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے لیکن اس عورت کی جانب سے ایسی کوئی شکایت درج نہیں کرائی گئی۔ البتہ ایک مرتبہ بوڑھے ڈاکٹر سمپسن نے جو اب ریٹائر ہو چکا تھا، جارج کو بتایا کہ جوڈی ناش پر جسمانی تشدد ہوا ہے۔

جارج نے اپنی گاڑی مکان کے سامنے کھڑی کی۔ اس نے دیکھا کہ جیک کا ٹرک بھی وہیں موجود ہے۔ وہ اپنی کار سے اترا اور اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ اس لیے اس نے احتیاطاً دروازے کے آگے پڑے ہوئے میٹ پر اپنے جوتے صاف کرنا شروع کر دیے۔ اچانک اس کی نگاہ پورچ کے فرش پر گئی۔ وہاں پہلے سے کیچڑ میں لت پت جوتوں کے نشان موجود تھے اور ان میں سے دائیں پاؤں کے بوٹ کے تلے پر ایک گول نشان نظر آ رہا تھا۔

اچانک ہی دروازہ کھلا اور جیک ناش غراتے ہوئے بولا۔ ''تم یہاں کیا کرنے آئے ہو... کیا ایک بار پھر مجھے حوالات میں بند کرنے کا ارادہ ہے؟''

جارج نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کی اور چہرے پر نرم مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ ''زحمت دینے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ تم گھر پر ہو گے۔''

''پھر تم یہاں کیا لینے آئے تھے؟'' جیک اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''اگر تمہارا اندازہ تھا کہ میں گھر پر نہیں ملوں گا تو پھر کیا میری بیوی سے ملنے آئے ہو؟''

جارج نے کن انکھیوں سے لیونگ روم کی جانب دیکھا۔ پندرہ فٹ کے فاصلے پر جوڈی کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے جارج کو دیکھتے ہی اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ جارج نے اس کی بائیں آنکھ کے نیچے ایک بدنما داغ دیکھا اور اس کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے جیک سے کہا۔ ''تمیز سے بات کرو۔ گرین نیٹرن والا واقعہ بھول گئے؟ میں تمہارے ساتھ دوبارہ وہی سلوک کر سکتا ہوں۔''

جیک ناش نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''مجھے بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟''

''مجھے اندر آنے کی اجازت دو۔ باہر بہت سردی ہے۔ تم نے اپنے پڑوسی ایمس کے بارے میں سنا ہوگا۔ اسی سلسلے میں تم سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

''دیکھو جارج... میں اس بے وقوف شخص سے ایک یا دو مرتبہ ہی ملا ہوں۔ وہ میرے مزاج کا آدمی نہیں تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ اس نے خودکشی کر لی لیکن میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا۔''

''پھر مجھے اپنی بیوی سے ملنے دو۔ شاید وہ کچھ بتا سکے۔''

''وہ اسے مجھ سے بھی کم جانتی ہے۔ ہم اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ تم میرے مقابلے میں زیادہ اچھی طرح قانون جانتے ہو۔ بہتر ہوگا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ گزشتہ بار میں تم سے الجھنے کا خمیازہ بھگت چکا ہوں۔''

جارج نے ایک ہاتھ سے اپنی تھوڑی کھجائی اور ایک نگاہ ناش کے جوتوں پر ڈالی۔ دیکھنے میں ان کا سائز ساڑھے نو لگ رہا تھا۔ وہ نرم لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے جیک... میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ میرا خیال تھا کہ تم اس تحقیقات کے سلسلے میں مجھ سے تعاون کرو گے جو کہ اچھے پڑوسیوں کا طریقہ ہے۔''

ناش کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھری اور وہ بولا۔ ''اچھے پڑوسی دوسروں کے معاملات میں دخل نہیں دیتے اور انہیں اپنی حدود کا علم ہوتا ہے۔ بہتر ہے کہ اب تم چلے جاؤ۔ مجھے دوپہر کے کھانے میں دیر ہو رہی ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کیا اور اندر چلا گیا۔ جارج چند لمحے کھڑا سوچتا رہا اور پھر وہاں سے چل دیا۔ وہ جانتا تھا کہ عموماً ٹرک ڈرائیور اپنی گاڑی کا فیول ٹینک بھر کر رکھتے ہیں تاکہ اگلے پھیرے کے لیے تیار رہیں۔ اس نے اپنی گاڑی کارلٹن ایونیو کی جانب کر لی جہاں قصبے کا واحد فلنگ اسٹیشن تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے پمپ پر کام کرنے والے لڑکے چیسٹر سے پوچھا۔ ''تم نے آخری بار جیک ناش کو کب دیکھا تھا؟''

چیسٹر کے چہرے پر ناگواری کا تاثر نمایاں ہو گیا اور وہ بیزار کن لہجے میں بولا۔ ''میں نے اسے پیر کی صبح دیکھا تھا۔ مجھے پمپ کھولے بمشکل چند منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ وہ اپنا

ٹرک لے کر آ گیا۔ اس نے ٹنکی فل کروائی اور چلا گیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس نے شہر سے باہر جانے کی بات کی تھی۔''

''تمہارے اندازے کے مطابق وہ کس وقت آیا تھا؟''

''ویسے تو میری ڈیوٹی چھ بجے شروع ہوتی ہے لیکن میں بالعموم کچھ پہلے آ جاتا ہوں۔ اس وقت بھی لگ بھگ پونے چھ بجے کا عمل ہوگا۔''

جارج نے گیراج کی دیوار پر لگے ہوئے کلاک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت ایک بج کر دس منٹ ہوئے ہیں۔ آج بدھ کا دن اور جون کی چودہ تاریخ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان جو گفتگو ہو رہی ہے، اسے تم اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ تم نے بتایا ہے کہ جیک ناش پیر بارہ جون کو چھ بجنے میں چند منٹ قبل قصبے میں موجود تھا۔ کیا تم میری خاطر یہ بات یاد رکھو گے؟''

چیسٹر کچھ پریشان نظر آنے لگا تاہم اس نے ایک ہاتھ سے اپنی ٹوپی سیدھی کی اور بولا۔ ''کیوں نہیں۔ میری یادداشت بہت اچھی ہے۔ اب تم نے کہہ دیا ہے تو اسے بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

دفتر پہنچ کر اس نے انسپکٹر میتھیو کا نمبر ملایا۔ انسپکٹر اس کی آواز پہچانتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

جارج بے ساختہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔'' اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور بولا۔ ''بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم دونوں مل کر اس قصبے کے لوگوں کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔''

''کام کی بات کرو۔ میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔''

''میں کام کی بات ہی کر رہا ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ چل کر ایک قاتل کو گرفتار کر سکتے ہو؟''

☆☆☆

پال ٹیلر نے دو گلاسوں میں بیئر انڈیل کر کاؤنٹر پر رکھی اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''گرین نیٹرن میں خوش آمدید! جارج کے دوستوں کو میں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔''

میتھیو نے مسکراتے ہوئے اپنا گلاس اٹھایا اور بولا۔ ''تب تو مجھے جارج کے لیے ایک اور بیئر کا گلاس خریدنا ہوگا تاکہ وہ واقعی مجھے اپنا دوست سمجھنے لگے۔ ہم ایک دوسرے کو غلط ہی سمجھتے رہے۔''

جارج نے اپنا گلاس فضا میں بلند کیا اور بولا۔ ''ہاں! یہ مجھے ایک احمق کانسٹیبل سمجھتا تھا اور میرے نزدیک یہ ایک معذور پولیس آفیسر تھا۔''

پال نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور بولا۔ ''میں حیران ہوں کہ یہ معاملہ ایک اسپرے گن سے شروع ہوا جو جارج کو پودینے کی کیاری سے ملا تھا اور کہاں جا کر ختم ہوا؟''

''پھر ایک کے بعد ایک کڑی ملتی چلی گئی اور ہم قاتل تک پہنچ گئے۔'' جارج نے کہا۔

''کیا تم ان الزامات کو ثابت کر سکو گے؟'' پال نے پوچھا۔

''اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔'' جارج نے کہا۔ ''ناش نے اعترافِ جرم کر لیا ہے اور ہمیں پوری کہانی سنا دی ہے۔''

''شروع ہو جاؤ۔'' میتھیو نے کہا۔ ''پھر میں کچھ بتاؤں گا۔''

جارج سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جوڈی ناش اور ایمس، جیک کی غیر موجودگی میں ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے۔ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کا محرک کیا تھا لیکن جوڈی اسے محبت سمجھتی تھی۔ بہرحال ایمس اس تعلق کو جائز نہیں سمجھتا تھا۔ وہ ایک شریف شخص تھا اور کسی دوسرے کی بیوی سے تعلق قائم کرنا اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے جوڈی کو ایک الوداعی خط لکھا۔ اس نے سوچا کہ اگلی بار جب جیک شہر سے باہر جائے گا تو وہ یہ خط جوڈی کے لیٹر بکس میں ڈال دے گا۔ اتفاق یہ ہوا کہ پیر کی صبح جیک مقررہ وقت سے دو گھنٹے پہلے ہی گھر پہنچ گیا۔ جوڈی اس وقت نہا رہی تھی لہٰذا اسے اس کی آمد کا پتا نہ چل سکا۔ پھر جانتے ہو کیا ہوا؟ جیک سیدھا بیڈروم میں گیا اور اس کی نظر اس محبت نامے پر گئی جو وہ ایمس کو لکھ رہی تھی۔ یہ خط پڑھتے ہی جیک سمجھ گیا کہ جوڈی اس کی غیر موجودگی میں کیا گل کھلا رہی ہے۔ اس نے جوڈی کی تواضع تھپڑوں سے کی اور غصے میں بھرا ہوا ایمس کے گھر پہنچ گیا اور اس سے گتھم گتھا ہونے لگا۔ ایمس کے ہاتھ سے اسپرے گن گر پڑی اور وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ ایمس کو لڑنے بھڑنے کی عادت نہیں تھی۔ اس لیے وہ جیک کے مقابلے میں کمزور پڑ گیا اور اس نے گلا دبا کر ایمس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اچانک ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے اپنے

آپ کو بچانے کے لیے فوری طور پر ایک منصوبہ تیار کرلیا۔''

''ہاں۔'' میتھیو نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ناش کو اندازہ تھا کہ جوڈی اس سے پہلے بھی ایمس کو خطوط لکھتی رہی ہوگی چنانچہ وہ مکان کے اندر گیا اور تھوڑی سی تلاش کے بعد اسے جوڈی کے لکھے ہوئے کئی محبت نامے مل گئے۔ اس کے ساتھ ہی اسے ایمس کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ خط بھی ملا جس میں اس نے جوڈی کو ترکِ تعلق کرنے کے لیے کہا تھا۔''

اب جارج کے بولنے کی باری تھی۔ اس نے کہا۔ ''وہ یہ تمام خط لے کر باہر آیا اور انہیں باربی کیو کے چولہے میں ڈال کر آگ لگادی پھر اس نے گیراج سے رسی نکالی اور اس کا پھندا بنا کر ایمس کی گردن میں ڈال دیا اور لاش کو گھسیٹتا ہوا ناشپاتی کے درخت تک لے گیا اور ایک سیڑھی درخت کے تنے سے لگادی۔ پھر وہ اس کی مدد سے اوپر چڑھا اور پوری قوت سے ایمس کی لاش کو اوپر اٹھا کر درخت کی شاخ سے لٹکادیا۔ اس کے بعد وہ نیچے اترا اور سیڑھی زمین پر گرادی۔ اب کوئی بھی دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ ایمس نے خودکشی کی ہے۔''

میتھیو کا گلاس خالی ہوچکا تھا۔ پال ٹیلر نے اسے دوبارہ بھردیا۔ میتھیو نے اسے تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔ ''جب جارج کو یہ معلوم ہوا کہ پیر کی صبح جیک ناش قصبے میں ہی تھا اور اس نے ناش کے پورچ میں کیچڑ آلود جوتوں کے نشانات دیکھے تو اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ ہم نے تلاشی کا وارنٹ حاصل کیا اور اس کے جوتے قبضے میں لے لیے اور جب ان کا موازنہ ڈاکٹر ایڈمز کے بنائے ہوئے سانچوں سے کیا گیا تو تصدیق ہوگئی کہ یہ اسی جوتے کے نشانات ہیں۔ ہم نے سیڑھی اور ایمس کے گھر کے مختلف حصوں سے جیک کی انگلیوں کے نشانات بھی حاصل کیے اور جب اسے گرفتار کیا گیا تو میں نے اس کے ہاتھوں پر رگڑ کے نشانات دیکھے جو دو سو پاؤنڈ وزنی لاش کو اوپر کھینچنے کی وجہ سے لگے ہوں گے۔''

''اس کے علاوہ رسی پر بھی اس کے خون کے دھبے ملے ہیں اور سب سے بڑھ کر جوڈی نے اس کے خلاف گواہی دی۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ کوئی عورت اپنے شوہر کے خلاف گواہی دے سکتی ہے۔'' پال منہ بناتے ہوئے بولا۔

''ہم نے اسے مجبور نہیں کیا۔ اس نے خود ہی رضا کارانہ طور پر گواہ بننے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ دہرانے کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں تھی اور اسی لیے ایمس کی جانب متوجہ ہوگئی لیکن وہ شریف آدمی تھا۔ اس کا ضمیر یہ گوارا نہ کرسکا کہ وہ کسی دوسرے شخص کی بیوی سے تعلق استوار کرے۔ جوڈی کو اپنے محبوب کی موت کا بہت صدمہ تھا۔ اسی لیے وہ شوہر کے خلاف گواہی دینے پر آمادہ ہوگئی۔''

''جرم ثابت ہونے پر جیک کو موت کی سزا ہوسکتی ہے۔'' جارج نے کہا۔ ''اگر اس کے وکیل نے بہت زور لگایا تب بھی عمر قید تو لازمی ہے۔''

''انتہائی حیرت انگیز کہانی ہے۔'' پال سرہلاتے ہوئے بولا۔ ''بے چارہ ایمس! مجھے اس کی موت کا بہت دکھ ہے۔''

جارج نے میتھیو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم کچھ بتانا چاہ رہے تھے؟''

''ہاں۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں آیندہ ہفتے ایک میٹنگ میں شرکت کرنے نیویارک جارہا ہوں جس میں ملک بھر سے سپروائزرز شریک ہوں گے جہاں بہت سے معاملات زیرِ غور آئیں گے۔ کوشش کروں گا کہ تمہارے محکمے کے لیے اضافی فنڈ حاصل کرسکوں کیونکہ میں محسوس کررہا ہوں کہ تمہاری پولیس کار میں ریڈیو ہونا بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اس بوڑھی کلارا کو بھی ہیڈ کوارٹر واپس بھیج دو۔ اس کی جگہ کسی نوجوان لیڈی آپریٹر کو رکھا جاسکتا ہے جو مستعدی سے کام کرسکے۔ اگر اس پیر کی صبح کلارا تمہیں تلاش کرلیتی تو میرا بہت سا وقت بچ جاتا۔''

یہ کہہ کر وہ لحہ بھر کے لیے رکا پھر چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ ''شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کسی کام میں مصروف ہوگے اسی لیے دفتر پہنچنے میں دیر ہوگئی۔''

جارج نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''تم نے اب بھی کچھ نہیں سیکھا۔ یہاں شرمندگی کی کوئی گنجائش نہیں۔''

''ہاں۔ کم از کم دوستوں کے درمیان تو بالکل نہیں۔'' میتھیو نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

جارج نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ کارنامہ انجام دینے کے بعد وہ اس قابل ہوگیا تھا کہ میتھیو جیسا بددماغ انسپکٹر اسے دوست کا درجہ دے سکے۔

سوداگر

احمد اقبال

خواب ہر سوچنے والے کا سرمایہ ہوتے ہیں... یہ خواب ہی تو ہوتے ہیں جو حقیقت کا روپ دھارتے ہیں... کچھ لوگوں کو خوابوں کا ایک طلسم گھیرے رکھتا ہے... بزدل کی زندگی بھی خوابوں... رنگینیوں... المناکیوں اور تلخیوں کا مجموعہ ہے... دشمنوں کے لیے دوستوں کی تلاش... اور دوستوں کے لیے اچھے لمحوں کی جستجو اسے ہمیشہ سرِراہ بھٹکائے رکھتی ہے... مجرموں اور ڈاکوئوں سے معاملات نمٹانے کی ذمے داری وہ کمال ہنرمندی سے پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے... اس دفعہ صائمہ کی دوست اور بزدل کی قائم مقام محبوبہ عجب کشمکش کا شکار ہے... آنے والے خطرات اور درپیش خدشات اس کی زندگی کی نائو کو ڈبو رہے ہیں مگر مہم جو بزدل کے ہوتے ہوئے کبھی کوئی نائو ڈوبی ہے... ہنستے مسکراتے مکالموں کے سنگ ڈرامائی صورت اختیار کرتی پُرمزاح تحریر...

اس شخص کی کھوج و جستجو کا معاملہ جو اپنا رشتہ جرم سے جوڑ بیٹھا تھا...

ساڑھے چار فٹ قد کا بنگالی سوا دو فٹ کی لنگی باندھتا تھا۔ یہ غالباً نیمل کور جیسی کوئی چیز ہوگی جسے اس نے لنگی کا درجہ دے کر اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ ستر پوشی کے سارے تقاضے پورے ہوئے۔

مقامی پولیس کے ساتھ ایک پُرامن بقائے باہمی کے سمجھوتے نے اسے میڈیکل کالج کے گرلز ہوسٹل گیٹ کے عین مقابل گنے کا رس نکالنے والی مشین لگانے کا غیر قانونی حق دلا رکھا تھا حالانکہ سڑک تنگ تھی۔ ایسے ہی حقوق دہی بھلے اور چاٹ کے ایک ڈیلر نے بھی حاصل کرلیے تھے لیکن اسے ہوسٹل میں مقیم ڈاکٹرز اور نرسز کی مالی اور غیر اخلاقی حمایت بھی حاصل تھی۔ چاٹ وہ ہر وقت چاٹتی رہتی تھیں اور ہوسٹل میں جانے والی ہر پلیٹ کے نیچے اندر داخلے کا اخلاقی لائسنس رکھنے والا بارہ سالہ ''چھوٹا'' بڑی صفائی سے کسی کا نامۂ الفت اسکاچ ٹیپ کی مدد سے یوں چپکاتا تھا کہ نہ گیٹ پر متعین پٹھان چوکیدار کی نظر دیکھ سکتی تھی اور نہ خفیہ کیمروں کی آنکھ... جب خالی پلیٹ واپس آتی تھی تو اس کے نیچے جواب موجود ہوتا تھا۔ علاوہ ٹپ کے وہ محبت کرنے والوں کی دعائیں مفت میں سمیٹ

رہا تھا۔

میں نے بنگالی کے جوس سینٹر کو ترجیح دی تھی۔ یہ جگہ عین اس کھڑکی کے مقابل تھی جہاں مجھ خانہ خراب مجنوں کو اپنی قائم مقام محبوبہ کی طرف سے ڈائریکٹ سگنل موصول ہوتا تھا۔ میرے اور بنگالی کے تعلقات میں رقابت کہیں نہ تھی۔ اس کا تخ بستہ جوس کا بزنس تھا اور میرا کاروبارِ عشق... اس کے باوجود ہمارے درمیان دشمنی کے جذبات سوکنوں جیسے تھے۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ موقع ملے تو مجھے بھی کسی گنے کے ساتھ مشین میں سے گزار دے اور میں صدق دل سے چاہتا تھا کہ اسے دشمن اٹھا کے لے جائیں۔

اس نے لنگی اٹھا کے سڑکتی ناک کو صاف کیا اور مجھ سے بولا۔ ”آخر تم کتنا دیر کھڑا رہے گا اِدھر۔ لمبا لوفر...“

میں نے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”جب تک میری ٹانگوں میں دم ہے اور تمہارا دم نہیں نکلتا۔“

اس نے خفگی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”ہم شوب جانتا ہے تم کس کا لیے آتا ہے... آز تک تم ایک گلاس شوربت نہیں پیا سالا۔“

”ابھی میں پُرامید ہوں دوست... جس دن وہ کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی یا اس نے تم سے شادی کرلی، اس دن میں ایک نہیں دو گلاس پی لوں گا۔ خودکشی کے لیے تو اب خالص زہر بھی نہیں ملتا۔ تمہارا یہ ٹانک بہترین ہے۔“

”کیشا ما فک بات کورتا ہے... یہ ایک دم خالص جوس ہے۔“

میں نے بند کھڑکی کو دیکھ کے کہا۔ ”نہیں، یہ آدھی یخنی ہے... یا واللہ... ہر گلاس میں اوسطاً دو درجن مکھیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔“

اس نے مزید خفگی کا اظہار کیا۔ ”تم شالا ہمارا بزنس خراب کرتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اگر تم غور کرو تو میری وجہ سے تمہاری سیل بڑھ جاتی ہے۔ میری وجاہت پر لڑکیاں ایسے ہی آتی ہیں جیسے کہ گنے کے رس کی مٹھاس پر مکھیاں۔“

اس سے پہلے کہ بنگالی میری بات سمجھتا، چھ فٹ سے نکلتے قد اور پہلوانوں جیسے جسم کے ساتھ... سوا نو بجانے والی ساڑھے چھ انچ کی کڑک مونچھوں والا ایک پیاسا نمودار ہوا اور اس نے گنے کے رس کا ایک کے بعد دوسرا گلاس اپنے حلق میں انڈیلنا شروع کیا... مجھے اس کی صورت کچھ دیکھی بھالی لگی مگر وہ میری طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔

”جلدی ہاتھ چلا چوہے کی اولاد۔“ اس نے غرا کے بنگالی سے کہا۔ مجھے اب اندیشہ لاحق ہو رہا تھا کہ رس بیچ کرنے والے کسی شوگر فیکٹری کے ٹینک کی طرح اس کا پیٹ ایک دھماکے سے پھٹا تو زندگی میں پہلی بار گنے کے رس سے غسل فرمانے کی سعادت حاصل ہوگی۔

جب اس نے گنے کا اسٹاک ختم ہوجانے کے بعد جوس پینا موقوف کیا تو بنگالی کی لنگی ڈھیلی ٹھیلی ہو رہی تھی۔ شاید اسے اندیشہ لاحق تھا کہ یہ ہول سیل میں جوس کو پیٹ کے ڈرم میں بھرنے والا پیسے دیے بغیر چل پڑا تو اسے کون روکے گا... اس کے کندھے پر بندوق بھی تھی اور سینے پر گولیوں کے ہار جیسا میگزین بھی... اس نے ایک ہزار کا نوٹ نکالا تو بنگالی ہکلانے لگا۔ ”ابھی کھلا... نہیں ہے... ہم لاتا ہے۔“

میں نے اس کو ایک دوستانہ آفر کی۔ ”یار مجھ سے لے لو۔“

اس وقت رس خور بلا نے میری طرف دیکھا اور ایک دم اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ ”ارے استاد! معاف کرنا میں نے دیکھا ہی نہیں تھا تمہیں۔“ اس نے مضحکہ خیز حد تک باریک آواز میں کہا اور مجھے گلے لگا لیا۔ ”بڑی گستاخی ہوگئی... معاف کرنا۔“

بنگالی نے یہ منظر حیرانی اور دلچسپی سے دیکھا جب میں رس سے بھرے ایک بہت بڑے لچک دار مٹکے میں آدھا مدفون تھا اور کافی تیزی سے دردناک آوازیں نکال رہا تھا۔ رہائی میسر آتے ہی میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”شاید میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔“

”جناب عالی! میں ماجھا ہوں... ننڈے ڈاکو کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔ آپ نے مجھے بچا لیا تھا۔ صرف تین سال کی سزا ہوئی تھی۔“

”اچھا اچھا۔“ میں نے اس سے بادلِ ناخواستہ مصافحہ کر کے خوشی کا اظہار کیا۔ ”کب رہا ہوئے؟“

”بس سیدھا جیل سے آ رہا ہوں جناب عالی... چار بندے مارے گئے تھے۔“

”چلو اب چھوڑو پرانی بات کو۔“ میں نے دیکھا کہ کافی لوگ اس منظر سے محظوظ بھی ہو رہے ہیں اور حیران بھی جو کسی زرافے اور گینڈے کے ملاپ جیسا تھا۔ بنگالی پر سکتہ طاری تھا۔

”اچھا استاد... میں اب چلتا ہوں۔ آج رات ہی پروگرام ہے، ڈی ایچ اے میں ایک مارواڑی سیٹھ کے گھر ڈاکا ڈالنا ہے۔“ اس نے شریکِ راز کیا اور پھر بنگالی سے مخاطب ہوا۔ ”رکھ باقی اپنے پاس چوہے... ہمارے پیر و مرشد سے خبردار جو بھی پیسے مانگے۔ جتنا رس چاہیں پی

لیں... انکار کیا تو تیرا خون پی جائیں گے ہم۔“

اس کے رخصت ہونے کے بعد میں نے دیکھا کہ بنگالی کی دھوتی ڈھیلی ہی نہیں گیلی بھی ہو رہی تھی اور وہ ایسے کانپ رہا تھا جیسے اسے جاڑا بخار آنے والا ہو۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کی عیادت کرتا... سامنے والی کھڑکی کھلی اور میری قائم مقام محبوبہ نے مجھے گرین سگنل دیا... میں نے بنگالی کو تسلی دی کہ کہیں اس کا ہارٹ فیل ہی نہ ہو جائے۔ ”یہ ڈاکو تھا مگر تمہیں نہیں لوٹے گا... بلکہ تم یہ کام کرنا چاہو تو مجھے بتا دینا۔“

آج زندگی میں پہلی بار اس نے نہ صرف ایک جیتے جاگتے کسی خونخوار ڈاکو کا دیدار کیا تھا بلکہ اس کے مالِ غنیمت میں سے ایک ہزار بھی وصول کیے تھے۔ میرے لیے یہ ملاقات باعثِ مسرت سے زیادہ باعثِ ندامت ہوئی تھی۔ مجھے اس کیس کے بارے میں زیادہ یاد بھی نہیں تھا۔

ڈاکٹر صائمہ اور میری داستانِ عشق اب لیلیٰ مجنوں کی کہانی سے زیادہ شہرت اختیار کر چکی تھی۔ اسے پھیلانے میں ڈاکٹر غزالہ کا بھی ہاتھ تھا مگر میں نے برا ماننا بہت پہلے چھوڑ دیا تھا... بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا...

”آخر کب تک میں تم سے کام چلاؤں... صائمہ کہاں ہے؟“ میں نے مایوسی سے کہا۔

کینٹین کے جوکر ویٹر نے پھر چنے کی دال تڑکے والی درمیان میں رکھی۔ ”سر جی! ہارس پاور ہے ہارس پاور... کھاؤ تے جان بناؤ۔“

اگر میں اس سے سوال کرتا کہ کیا میں گھوڑا نظر آتا ہوں تو اس کا جواب ہوتا... نہیں جی... اونٹ اور زرافے بھی کھا سکتے ہیں اور گھوڑے کی طرح دوڑ سکتے ہیں... چنانچہ میں نے اس کو معاف کر دیا۔

”صائمہ ڈلیوری میں ہے کل سے۔“ غزالہ بولی۔

لقمہ میرے ہاتھ سے گر گیا۔ ”کل سے؟ کیا مطلب... ایک ہفتہ پہلے ملی تھی تو... کچھ نہیں تھا۔“

”مجھے پتا تھا تم یہی کہو گے... وہ ڈبل ڈیوٹی دے رہی ہے لیبر روم میں کل سے... رات کو فارغ ہوگی۔“

”پھر مجھے ورغلا کے بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ گھوڑا دال کھلانے کے لیے...؟ میں تمہیں لنچ کے لیے باہر بھی لے جا سکتا تھا۔“

”کیا کہیں سے مال ملا ہے؟“ اس نے مجھے شک کی نظر سے دیکھا۔ ”میں حرام نہیں کھاتی... لیکن آج کھا لوں گی... چلو اٹھو... چائنیز چلتے ہیں۔“

میں بات کہہ کے خود ہی پھنس گیا تھا۔ صبر شکر سے وہ دال کھا لیتا اور گھوڑے کی طرح ہنہناتا چلا جاتا تو ہزار روپے بچا لیتا جو توپ صاحب سے میں نے تقریباً ڈاکا ڈال کے لیے تھے۔ ان کا ہاتھ جیب کی طرف جاتا ہی نہ تھا۔ مجبوراً مجھے اپنا ہاتھ استعمال کرنا پڑا تھا۔ میں نے دل پر جبر کا پتھر رکھ کے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہاں ہاں... چلو... آخر تم میری قائم مقام محبوبہ ہو پرانی... کبھی صائمہ کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی تو تم ہی کام آؤ گی میرے... فارسی میں کہتے ہیں کہ گندم نہ ملے تو جو پر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔“

جب وہ ریسٹورنٹ میں میرے مقابل بیٹھی تو میرے اس شبہے کی تصدیق ہوگئی کہ اس نے بشاشت صرف اخلاقاً طاری کر رکھی ہے ورنہ اندر سے وہ کسی بات پر مضطرب اور اپ سیٹ ہے۔ سوال یہ تھا کہ ایسی صورت میں اسے مجھے بلانے یا میرے ساتھ آنے کی کیا ضرورت تھی... اخلاقاً میں نے ہی اس سے سوال کیا۔ ”کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان ہو؟“

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”میرا لنچ کا بالکل موڈ نہیں تھا لیکن کینٹین میں بات نہیں ہوسکتی تھی۔ تم میری مدد کرو گے؟“

میں نے کہا۔ ”اس کے لیے پہلے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ مسئلہ کیا ہے اور مسئلہ سننے سے پہلے لنچ ضروری ہے... انکار میں کیسے کر سکتا ہوں... صائمہ سے بھی ڈر لگتا ہے۔“

اس نے میرے بار بار کہنے پر لنچ ختم کیا۔ اس دوران میری ہلکی پھلکی گفتگو بھی اس کی اداسی نہ دور کرسکی۔ لنچ کے بعد اس نے بلاتمہید کہا۔ ”تم جانتے ہو... میں غزالہ خان ہوں۔“

”بہت اچھی طرح... پانچ سال سے تم اس پوسٹ پر ہو۔“

اس نے مذاق کو نظرانداز کر دیا۔ ”میرا مطلب تھا کہ جدی پشتی خالص آفریدی پٹھان... خیبر ایجنسی سے ہے میرا تعلق۔“

”ایسا لگتا تو نہیں۔“

”میرا قبیلہ پہلے وہاں آباد تھا اب تو میرے فیملی ممبر کراچی، لاہور سے آگے امریکا، کینیڈا تک آباد ہیں... مگر اصلاً اور نسلاً ہم وہی ہیں۔“

”وہی روایتی پٹھان... طرہ مونچھ اور سات گز گھیر کی شلوار... سینے پر گولیوں کا میگزین... رائفل اور نسوار۔“

”خوامخواہ ہمیں بدنام مت کرو... ہم سے زیادہ باصلاحیت اور ترقی یافتہ قوم اور کوئی نہیں۔“

میں نے سر کھجایا۔ ''خاتون! اس دعوے میں خاصا شاعرانہ مبالغہ ہے۔''

''بالکل نہیں... ایوب خان، نور خان، یحییٰ خان کو لو... پھر عمران خان اور ورلڈ اسکواش کنگ جہانگیر خان کی پوری فیملی... روشن خان، ہاشم خان... ہے کوئی ان کی ٹکر کا، پھر فلم انڈسٹری کو لے لو، شاہ رخ خان... سلمان خان... عامر خان... سیف علی خان اور مزید کئی خان... اس سے بہت پہلے یوسف خان عرف دلیپ کمار... ممتاز بیگم عرف مدھو بالا... اور موسیقی نواز... علی اکبر خان... سرود نواز... بسم اللہ خان... شہنائی نواز... عبدالحلیم، جعفر خان ستار نواز... ذاکر خان طبلہ نواز... اور اس سے بہت پہلے آفتاب موسیقی فیاض خان... عبدالکریم خان اور پاکستان میں مہدی حسن...'' اس نے پٹھان قوم کی جذباتی ترجمانی جاری رکھی۔

میں نے فوراً ہاتھ جوڑ دیے۔ ''میں مانتا ہوں دلیل کے بغیر بھی۔''

''جوتے پالش کرنے والے سے لے کر خیبر ایجنسی کے ڈھائی سو بیڈ والے محل کا مالک... چائے پراٹھا سے کڑاہی گوشت تک... کباڑی بازار سے لے کر ٹرانسپورٹ بزنس تک... کون کرسکتا ہے ان کا مقابلہ... خیر...'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میرے جیسی لڑکیاں باہر بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کررہی ہیں۔ میرے کچھ کزن امریکا، کینیڈا میں ہیں۔ ایک چچا نیٹو فورسز کو آئل سپلائی کرتا ہے... دوسرا اسلحہ...''

''کیا میں رومانٹک انداز میں تمہارا نازک ہاتھ تھام کے معافی مانگ سکتا ہوں اور ایک درخواست کرسکتا ہوں؟''

''ڈراما مت کرو... کیا کہنا ہے... کہو...''

''ایک تو میں بزدل ہوں... پھر تم نے خود کو جینوئن آفریدی ثابت کردیا ہے اس لیے میں اجازت لے رہا ہوں... تم نے یہ سب پہلے بتایا ہوتا تو میں کب کی تمہاری پروموشن کرچکا ہوتا... تم محبوبہ ہوتیں اور صائمہ قائم مقام... اس صحافت میں جھک مارنے کے بجائے میں تمہارے چچا کے بزنس میں پارٹنر بن کے لاکھوں میں کھیلتا۔''

وہ شرارت سے مسکرائی۔ ''موقع تمہیں اب بھی مل سکتا ہے... مگر سوچ لو... جان کی بازی لگانی پڑے گی... میرا منگیتر قبائلی علاقے سے تم پر راکٹ داغ دے گا۔''

''تمہارا منگیتر... یعنی تمہارے مستقبل کے مجازی خدا کی پوسٹ کے لیے کاغذات نامزدگی داخل کرچکا ہے کوئی؟''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''اور وہ بلا مقابلہ منتخب بھی ہوگا... بلکہ ہوگیا... یہ ہے اس کی تصویر... نام ہے گلباز خان۔''

غزالہ نے بیگ کے کسی خفیہ خانے سے ایک تصویر برآمد کرکے میری طرف بڑھائی۔ ''یہ ہے'' میں نے سوٹ والے ایک خوش شکل چھ فٹ قد کے خطرناک حد تک توانا آدمی کو دیکھا جو مجھے بہ آسانی سوکھی لکڑی کی طرح توڑ سکتا تھا۔ وہ ایک کار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا اور ایسی کار ابھی تک میں نے خواب میں دیکھنا بھی شروع نہیں کی تھی۔

''یہ ہے تمہارا منگیتر؟''

اس نے اداسی سے اقرار میں سر ہلایا۔ ''اور یہی ہے میرا مسئلہ... جو جان کا روگ بنا ہوا ہے میرے لیے۔''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے جواب میں مجھے کیا کہنا چاہیے۔ ''ڈاکٹر صاحبہ... میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنے دماغ کا معائنہ کرائیں۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو فخر و غرور میں اس کا پوسٹر اٹھائے پھرتی... اس سے زیادہ خوش قسمتی کی بات کیا ہوسکتی ہے لڑکی؟''

اس کا چہرہ فکرمندی میں ڈوبا رہا۔ ''بزدل... یہ دماغ کا نہیں دل کا معاملہ ہے۔''

مجھ پر کپکپی طاری ہونے لگی۔ ''دیکھو... خدانخواستہ تم مجھ پر فریفتہ ہو یا ڈورے ڈال رہی ہو تو سمجھ لو کہ تمہارے اس منگیتر سے پہلے صائمہ مجھے کوئی زہر کا انجکشن لگا کے ہلاک کردے گی۔ پوسٹ مارٹم میں کچھ پتا نہیں چلے گا۔''

''میں کسی کا حق نہیں مارسکتی... اور معاف کرنا... کچھ عقل بھی ہے میرے پاس جو صائمہ کے پاس ہوتی تو وہ بھی کسی ٹیلی فون پول کو پسند نہ کرتی... مگر...'' اس نے پھر ایک آہ بھری۔ ''یہ دل کا معاملہ ہے... اور دل تو پاگل ہے... میں کسی اور کو چاہتی ہوں۔''

میں نے اس کے بیان کا برا نہیں مانا۔ ''اچھا وہ کون ہے؟ میرا قائم مقام رقیب۔''

اس نے پہلی تصویر واپس لے کر بیگ کے خزانے میں سے دوسری تصویر برآمد کی اور مجھے پکڑا دی۔

ایک لمحے کے لیے مجھے دھوکا ہوا کہ میں اس بنگالی جوس مرچنٹ کا کوٹ پتلون والا ایڈیشن دیکھ رہا ہوں جو شاید کسی کیمرا ٹرک سے ایک فٹ لمبا کردیا گیا ہے... میرے حلق سے آواز بھی مشکل سے نکلی۔ ''یہ... دیکھنے میں تو انسان کا بچہ لگتا ہے... مگر؟''

''بزدل...'' اس نے تصویر مجھ سے چھین لی۔ ''تمہیں میری بے عزتی کرنے کا کوئی حق نہیں... مجھے

تمہاری مدد چاہیے۔''

میں نے اپنا سر تھام لیا۔ ''صائمہ نے بھی آج تک نہیں بتایا تھا... ورنہ... خیر، اجازت ہو تو تمہاری بات سننے سے پہلے میں ایک کپ کافی کا پی لوں تاکہ میرا دماغ کچھ کام کرنے لگے۔'' اور ویٹر کو کافی لانے کے لیے کہا۔

''اس راز کو راز رکھنا، میری زندگی بچانے کے لیے ضروری تھا... صائمہ جانتی تھی... اب تم نے جان لیا ہے... لیکن جس دن گلباز خان کو یہ بات معلوم ہوگئی، وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا... اور شاید تمہاری زندگی کا بھی۔''

میں نے رو کے کہا۔ ''بی بی... میرا کیا قصور ہے آخر...''

''تم نے پانچ سال سے قائم مقام محبوبہ کے عہدے پر جو فائز کر رکھا ہے مجھے... اور وہ انتہائی غیرت مند ہے... گلباز خان۔''

میں نے کافی کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔ ''اس وقت بقول شاعر... جگر چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے اور خود میرا جنازہ جارہا ہے گویا... تم جانتی ہو میں بزدل ہوں... اس غیور کے سامنے آنے سے پہلے مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ نکاح یا خودکشی... جلد از جلد... مگر مجھے پہلے یہ بتادو کہ بقول شاعر... دل تو پاگل ہے دل دیوانہ ہے، تو اب تک تم اس نمونے کے ساتھ فرار ہوکے ٹمبکٹو یا ہونولولو کیوں نہیں چلی گئیں؟''

''اب تم سیریس ہوکے میری بات سنو... ہم انتہائی تعلیم یافتہ اور ماڈرن ہونے کے باوجود اپنی خاندانی اور قبائلی اقدار میں آج بھی وہی ہیں جہاں سو سال پہلے تھے یا ہزار سال پہلے... میری پیدائش کے فوراً بعد میرے والد اور تایا نے گلے مل کر اپنے خونی اور خاندانی رشتے کو مزید استوار کردیا... میری منگنی میرے تایازاد گلباز خان سے کردی گئی۔''

میں نے سوچ کے کہا۔ ''گویا پچیس سال پہلے۔''

وہ برا مان کے بولی۔ ''تم اعتراف کرانا چاہتے ہو میری عمر کا... کیا یہ پوچھنا کافی نہیں تھا کہ پرانی بات ہے لیکن بات کے پرانا ہونے سے رشتے میں تو فرق نہیں پڑ سکتا۔ میرے تایا اب اس دنیا میں نہیں... میرے والد ان کی جگہ قبیلے کے سردار ہیں۔ فیملی کی طرف سے ایک سال سے مجھے سمجھایا جارہا ہے کہ بس اب مجھے شادی کرلینی چاہیے۔ مجھے سمجھانے والے اس نظریے کو تسلیم نہیں کرتے کہ... دل تو پاگل ہے دل دیوانہ ہے۔''

''اس بنگالی... میرا مطلب ہے بنگالی کے بڑے بھائی سے کہو تمہیں لے جائے دنیا کے اس ٹکڑے... جتھے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے... آخر وہ ہے کون... کیا کرتا ہے؟''

''وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔''

''لاحول ولاقوۃ... یار وہ کام کیا کرتا ہے... ابھی تک نام پتا تک تو بتایا نہیں اس مجنوں کے بھوت کا۔''

غزالہ نے کچھ شرمانے کی اداکاری کی۔ ''وحید مراد ارمان... ارمان تخلص ہے ان کا۔''

میں نے پھر اپنا سر پکڑ لیا۔ ''خدا کے لیے غزالہ! اس سے کہو کہ اپنا نام بدل دے... ذرا سوچو وحید مراد کتنے دلوں کی دھڑکن تھا۔ اس چاکلیٹی ہیرو کی روح کو کتنی اذیت ہوگی اور تخلص کا مطلب ہے کہ خیر سے جناب شاعر بھی ہیں... پھر بھی ارمان تو وحید مراد کی فلم تھی... اس سے بہتر تھا وہ اپنا تخلص ہیرا اور پتھر رکھ لیتا... ہیرا اصل وحید مراد... پتھر موصوف...''

غزالہ کے چہرے پر دکھ کی بدلی چھم چھم برسنے کے قریب ہوگئی۔ ''تم کو میرے جذبات کا کوئی احساس نہیں؟''

میں نے فوراً معذرت کرنا ضروری سمجھا۔ ''دیکھو... میرا مقصد تمہاری دل آزاری نہیں تھا۔ یہ تو بس میری مذاق کی عادت ہے... آئی ایم سوری، ظاہر ہے تمہاری پسند اتنی غیر معیاری بھی ہوسکتی ہے... آخر صائمہ نے بھی تو میرے جیسے نمونے کو پسند کر رکھا ہے۔''

غزالہ نے پانی کا ایک گھونٹ لیا۔ ''وہ پہلے ہمارے میڈیکل کالج میں پروفیسر آف ایناٹومی تھے۔''

''اب کیا کارپوریشن کی نالیاں صاف کرتے ہیں'' یہ سوال میرے دل میں پیدا ہوا مگر لب تک نہیں آیا... ایناٹومی عام زبان میں علم الابدان ہے اور پڑھاتا کون ہے جس کے اپنے بدن کی کوئی کل سیدھی نہیں۔

''جانِ من۔'' خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد میں نے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری پرابلم کیا ہے... ایسا ہی ہے تمہارا اور وحید مراد کا عشق تو پھر گڈ لک... ایک دوسرے کا ہاتھ تھامو اور نکل جاؤ... بقول فلمی شاعر... پیار کیا تو ڈرنا کیا... ساری دنیا تمہیں خوش آمدید کہنے کے لیے چشم براہ ہوگی۔ پیار کی ایک اور لازوال کہانی لکھو... نہ تمہیں وسائل کی کمی ہے... اور وسائل میں عقل بھی شامل ہے۔''

غزالہ نے کہا۔ ''میرے دل میں آگ لگی ہوئی ہے... آئس کریم منگواؤ۔''

''دیکھو... تم کافی استحصال کرچکی ہو میرا... مجھ سے

مشورہ یا مدد مانگنے والے مجھے فیس ادا کرتے ہیں... تم مجھ سے فیس وصول کر رہی ہو مگر کیا کروں... تمہارا حسن سوگوار مجھ پر زیادہ اثر کر رہا ہے۔'' میں نے ویٹر کو طلب کر کے آئس کریم منگوائی۔

''بات نہ قیمت کی ہے اور نہ وسائل کی... پاسپورٹ، ویزا ٹکٹ سب حاصل کیا جاسکتا ہے اور ہم واقعی کہیں بھی جا کے روپوش ہو سکتے ہیں لیکن تاریخ کا عبرت ناک سبق کچھ اور ہے۔ ہماری قبائلی روایات کچھ ایسی ہیں کہ رسم و رواج کی زنجیریں توڑ کر فرار ہونے اور خاندان کی عزت کا جنازہ نکالنے والوں کا جنازہ نکالنا سب پر لازم ہو جاتا ہے۔ لواحقین بندوقیں، دوربین اور خوردبین... سراغ رسانی کے پلان اور عزمِ مصمم لے کر نکل کھڑے ہوتے ہیں اور خواہ اس میں نصف صدی بیت جائے... وہ گلی گلی نگر نگر ملک ملک کی ہوا میں اپنے لہو کی خوشبو کا سراغ لگا کے بالآخر مجرمان تک پہنچ جاتے ہیں... ان کی یہ حسِ سراغ رساں کتوں سے زیادہ پاورفل ہے۔''

''فی الحال میں تمہاری بات پر یقین کرتا ہوں... حالانکہ مجھے یہ ناممکن لگتا ہے۔''

''میں نہیں چاہتی کہ پچاس سال بعد جب میں بے فکر ہو جاؤں تو کسی دن گلباز خان سفید داڑھی، رعشہ زدہ ہاتھ میں رائفل لیے میرے شوہر... بیٹوں، بہوؤں اور پوتا پوتیوں کے سامنے نمودار ہو اور مصطفیٰ قریشی کی طرح ڈائیلاگ بولے اور پھر دھائیں سے مجھے شہیدِ محبت بنا دے۔''

''چلو مانا یہ سب تمہاری فلمی پروازِ خیال نہیں... درحقیقت ایسا ہو سکتا ہے... ایسی صورت میں تمہارے لیے میرے دو ہی مشورے ہوں گے... تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو... ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو۔''

''تم سے مجھے یہ امید نہیں تھی... یہ تو سب ہی کہتے رہتے ہیں... مجھے تمہاری مدد چاہیے... پریکٹیکل۔''

''اچھا؟ اس رومانی خونی کہانی میں میرا رول کیا ہو سکتا ہے؟''

''تم جا کے گلباز خان سے بات کرو۔ اسے قائل کرو کہ وہ مجھ پر دعوے سے دستبردار ہو جائے۔''

میرے ہاتھ سے کافی کا مگ گر گیا اور مجھے اُچھو لگ گیا۔ ''عزیزہ! کیا میں نے وہی سنا... جو تم نے کہا... ایسا ہے تو خدا حافظ... قائم مقام محبوبہ کے عہدے کے لیے میں ''درخواستیں مطلوب ہیں'' کا اشتہار دیتا ہوں... تم نے جو کہا... اس سے آسان یہ ہے کہ میں ''کتے مار گلاب جامن'' نوش فرما کے صائمہ کے قدموں میں جان دے دوں... یا ماؤنٹ ایورسٹ سے دیوارِ چین پر کود جاؤں۔''

غزالہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ ''صائمہ نے کہا تھا کہ تم صرف نام کے بزدل ہو۔''

''ٹھیک ہی کہا تھا اس نے۔ میں ذرا بھی بہادر ہوتا تو اب تک اسے اغوا کرا کے عقد مسنونہ کر لیتا... گن پوائنٹ پر... اپنے حامی ڈاکوؤں سے میں یہ کام بر وقت کرا سکتا ہوں۔''

غزالہ کا چہرہ پھر روشن ہو گیا۔ ''یہ بھی ٹھیک ہے، تم خود کچھ نہ کرو... اپنے ڈاکو عقیدت مندوں سے کہو کہ یہ کارِ خیر وہ کریں... گلباز خان کو اٹھا لائیں۔''

''اور اس کے بعد؟ کیا گلباز خان کے جو والی وارث ہیں... وہ میرے یا تمہارے ساتھ کیا کریں گے... نہ بی بی۔ میں باز آیا ایسی محبت سے، اٹھا لو پاندان اپنا... اب چلو... صائمہ بھی ڈلیوری سے فارغ ہو گئی ہو گی اور مجھے بھی جانا ہے ڈیوٹی پر... کچھ دیر اور ٹھہرا تو تم ڈنر کی فرمائش کر بیٹھو گی۔'' میں غزالہ کی مایوسی کی پروا کیے بغیر کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ روزنامہ ''حقیقت ساز'' میں یوم حساب کا سین تھا۔

مدیر اعلیٰ جناب تفنگ چنگیزی یعنی توپ صاحب ایک دیوار سے پشت لگائے بہت کچھ کر رہے تھے مثلاً وہ بید مجنوں کی طرح تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اپنے منہ کے مکر میں بارہ مسالے والے پان کو بھی گھوٹ رہے تھے۔ عالم نزع جیسی کیفیت طاری کر کے اپنے دیدوں کو گول گول گھما رہے تھے۔

ان کے عین مقابل پانچ فٹ کی دوری پر ایک بندوق کی نال تھی جس کا رخ بظاہر ان کے دلِ داغ دار کی طرف تھا۔ بندوق بھی دوسری جنگِ عظیم میں کسی گورے کے ناپاک ہاتھوں سے جاپانی یا جرمنی فوجیوں کی ہلاکت کا سبب بنی ہو گی۔ بندوق تھامنے والے ہاتھوں میں بھی رعشہ تھا کیونکہ جس بدن سے یہ ہاتھ منسلک تھا توپ صاحب جتنا ہی قدیم تھا۔ وہ بزرگوار جو یہ آلۂ قتل تھامے توپ صاحب کو فائرنگ اسکواڈ کی طرح اس عالمِ فانی سے رخصت کرنے پر کمربستہ نظر آتے تھے... ڈر یہ تھا کہ تاخیر کی صورت میں خود اللہ کو پیارے نہ ہو جائیں۔ ان کی طبعی عمر یقیناً پوری ہو چکی تھی۔

اندر قدم رنجہ فرماتے ہی اس منظر پہ مجھے روایتی انداز میں پہلے رونا آیا پھر ہنسی آئی۔ ہونے والے قاتل اور مقتول کسی کامیڈی فلم کا کردار لگتے تھے لیکن ان کے درمیان

مشرق اور مغرب کی دوری تھی۔ قاتل اس گوراشاہی دور کی یادگار تھا جو بہت پرانی بلیک اینڈ وائٹ فلموں میں نظر آجاتی تھی۔ اس نے ایک سولر ہیٹ لگا رکھا تھا اور ایک ایسا سوٹ پہن رکھا تھا کہ مجھے ضمیر جعفری کا شعر یاد آیا۔ کسی مرے ہوئے گورے کی یادگار ہے یہ... مقتول اس تہذیب کا نمونہ تھا جو اب کہیں نہیں رہی سوائے تاریخی کتب کے حوالوں کے... اور اب بھی قاتل ولایت کی گم شدہ روایات کی تصویر تھا۔

میں نے لہجہ پُرسکون رکھتے ہوئے پنجابی میں سوال کیا۔ ''بزرگو! ایہہ کی ناٹک ہو رہیا ہے۔''

قاتل کے حلق سے بیمار مرغ جیسی آواز نکلی۔ ''ناٹک... یو فول... تمہاری جرأت کیسے ہوئی... کاش ہم رخ بدلے بغیر ایک گولی تمہیں بھی مار سکتے... اس دو نال والی شکاری بندوق میں میرے گریٹ گرینڈ فادر ہمیشہ دو گولیاں ڈال کے رکھتے تھے... ہم کرنل شوکی ہے... شوکت علی فرام انفنٹری۔''

''میں آپ کو اس کا موقع بھی دوں گا... اگر پہلی گولی چل گئی۔''

''واٹ؟ واٹ ڈو یو مین... یو ایڈیٹ... اس سے ہم نے کرنل جم کاربٹ کے ساتھ سندربن میں کئی آدم خور شیر شوٹ کیے۔''

''ضرور کیے ہوں گے... اب اس سے ایک چوہے کو مارنا کیا آپ کے شایانِ شان ہے کرنل؟''

توپ صاحب نے رقت انگیز لہجے میں کہا۔ ''میاں بزدل! تم نے ہمیں چوہا کہا، اس پر ہم حشر میں دامن گیر ہوں گے۔''

پہلے میں نے کرسی پر بیٹھ کے کیس کی سماعت کا سوچا پھر بہتر سمجھا کہ قاتل و مقتول کو مذاکرات کی میز پر لاؤں... کسی دشواری یا رسک کے بغیر میں گولی اور ہدف کے درمیان حائل ہو گیا۔ ''کیا حرج ہے اگر شرفا کی طرح معاملات اصولی بنیاد پر طے کر لیے جائیں... کشت و خون کوئی شرفا کا قاعدہ ہے... مغل تہذیب کے علم بردار آپ ہیں محترم تفنگ چنگیزی صاحب اور برٹش سویلائزیشن کے پرفیکٹ جنٹلمین آپ کرنل شوکی... کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

کرنل نے چشمہ درست کر کے مجھے غور سے دیکھا اور پھر سر ہلایا۔ ''آف کورس۔''

توپ صاحب نے منہ اوپر اٹھا کے فرمایا۔ ''دریں چہ شک۔'' پھر وہ جان کی پروا کیے بغیر کھڑکی کی طرف لپکے۔ ان کے منہ میں بارہ مسالے والے پان کے پیچر کی مقدار ذخیرہ کرنے کی حد سے آگے بڑھ گئی تھی۔ بڑی پھرتی سے انہوں نے کرسی کے پیچھے والی کھڑکی کھولی اور منہ کا سارا خونی مواد فضا میں اگل کے اسی پھرتی سے بند کی جس کی انہیں بہت مشق تھی۔ پھر انہوں نے سکون کی وہ سانس لی۔

تب تک میں کرنل کو مذاکرات کی میز کی طرف لانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے ایک بار پھر بیمار مرغ جیسی آواز نکالی۔ ''یو سی... یہ پھر وہی کر رہا ہے جو اس نے کچھ دیر پہلے میرے ساتھ کیا تھا مسٹر... کیا نام تھا تمہارا... کچھ سنگ دل... شیر دل...'' کرنل میرے دائیں طرف اچھلا۔

میں نے توپ صاحب کی کرسی پر قبضہ کر رکھا تھا چنانچہ بادل ناخواستہ وہ بائیں طرف والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ''یہ بزدل ہے۔''

''اوہ نو... یہ بہت بہادر ہے۔ یہ توپ کے دہانے پر آ کے بے خوفی سے کھڑا ہو گیا تھا۔''

میں نے کرنل کو یقین دلایا۔ ''ایسا مشہور ہے... مگر آپ مجھے بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی کہنے میں آسانی محسوس کریں تو...''

کرنل کا جبڑا لٹک گیا۔ ''اس میں تو بہت ٹائم لگے گا... نو مسٹر بزدل... اس کو میں نے رنگے ہاتھ... بلکہ رنگے منہ کے ساتھ پکڑا... ادھر ہمارا بیوٹی فل ہیڈ کو دیکھو... اسی وقت ہم اپنا ہیٹ اتارا تھا صاف کرنے کے لیے۔''

کرنل کے سر کی سطح ایک تربوز سے زیادہ چکنی تھی مگر اس پر گہرے سرخ رنگ سے غالباً برطانیہ کا نقشہ پرنٹ ہو گیا تھا۔ ساری بات میری سمجھ میں پہلے ہی آ چکی تھی۔ توپ صاحب کھڑکی سے رنگ کی پچکاری بڑی مہارت سے چلاتے تھے اور اس سے زیادہ مہارت اور پھرتی سے اپنا سر واپس اندر لا کے کھڑکی یوں بند کرتے تھے کہ آج تک اس کی زد میں آنے والے ان کا سراغ نہیں لگا پائے تھے۔ اوپر دیکھنے پر انہیں ایک جیسی پچاس کھڑکیاں دکھائی دیتی تھیں... کچھ کھلی تو کچھ بند... متاثرین میں سفید پوش بھی ہوتے تھے... برانڈڈ سوٹ پہن کر کار سے برآمد ہونے والی وینائیں اور میرائیں بھی... دہی بھلے نوش فرمانے والے ایک پہلوان کو اچانک پلیٹ میں لہو کی سرخی نظر آئی... ارادہ قتل لے کر اوپر تک آنے والوں میں دو تین ایسے بھی تھے جو عین جائے واردات پر پہنچ گئے مگر یہ کہتے گئے۔ میں کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کروں... توپ

صاحب غائب ہوجاتے تھے اوران کی کرسی پر طویل تورانی داڑھی والا کاتب سر جھکائے کام میں مصروف ملتا تھا جس کے اجلے دانت ثابت کرتے تھے کہ اس کی سات پشتوں میں کسی نے پان نہیں کھایا۔

آج توپ صاحب کا یوم حساب یوں آیا کہ گوروں کے زمانے کا کرنل شو کی بجلی کے تار پر بیٹھی کسی چیل کا نشانہ لے رہا تھا۔ چیل کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ کرنل کو اندیشہ تھا کہ سر اٹھا کے اوپر دیکھنے سے اس کا کنٹوپ نالی میں گر جائے گا... میر صاحب زمانہ نازک ہے ... دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار... اس نے ہیٹ اتار کے ایک متروک ریڑھی پر رکھا ہی تھا کہ توپ صاحب کی لال اجابت اس کے سر پر نازل ہو گئی۔ اسے توپ صاحب کے رخِ انور کا اور اس کھڑکی کا جائزہ لینے کا پورا موقع ملا تھا جو فوراً بند بھی ہو گئی تھی۔ وہ سیدھا توپ صاحب کے مقتل تک آ پہنچا۔

فریقین کے اپنے اپنے دلائل تھے۔ توپ صاحب بضد تھے کہ ان کا نشانہ کرنل کا سر نہیں تھا۔ وہ سر بیچ میں نہ لاتا تو کچھ نہ ہوتا چنانچہ ان پر قتلِ عمد کی طرح "رنگ اندازیٔ عمد" کا جرم نہیں بنتا۔ جو ہوا حسنِ اتفاق تھا یا کرنل کی سوشل اندازی... کرنل اس کو قتل عمد سے زیادہ سنگین جرم قرار دیتا تھا کہ اس کے مقدس سر کو جس پر آج تک کسی چڑیا نے بیٹ کی خیرات نہیں کی یوں سرِعام لال تربوز بنایا جائے... میں نے قصاص کے اصول پر فیصلہ کیا اور دونوں کو اتفاق پر مجبور بھی کر دیا۔

فیصلے کی رُو سے اب کرنل شو کی بارہ مسالے والا پان کھا کے اسی طرح سرخ ملغوبا تیار کرے اور توپ صاحب نیچے عین اسی جگہ سرِ تسلیم خم کریں جہاں کرنل کھڑا تھا۔ پھر کرنل کھڑکی سے ان کے سر کا نشانہ لے کر توپ صاحب سے ٹٹ فار ٹیٹ کرے۔ ظاہر ہے فیصلہ کرنل کو مہنگا پڑا۔ توپ صاحب نے اسے بارہ مسالے والے پان کی گلوری پیش کی اور خود نیچے نشانے پر سر جھکا کے کھڑے ہو گئے مگر دیسی گورا کرنل اپنی بتیسی میں گلوری کو مکسر کی طرح کیسے پیستا... اس کے لیے برسوں کی ریاضت درکار تھی۔ بارہ مسالوں نے اس کو دومنٹ میں ہیروئن سے زیادہ مدہوش کر دیا۔ وہ میز پر لمبا لمبا لیٹ کر لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے اپنی وصیت پڑھنے لگا۔ اور کسی ناقابلِ فہم زبان میں کوئی دعا یا منتر دہرانے لگا۔ پھر توپ صاحب کے حکم پر سابق پہلوان بارلش کاتب کرنل کا "جنازہ" کندھے پر اٹھا کے لے گیا۔ واپسی پر اس نے رپورٹ دی کہ کرنل کو اس نے چیچو کی ملیاں جانے والی بس میں بٹھا دیا تھا۔ بتا دیا تھا کہ بابا بیمار ہے۔

خطرہ دور ہوتے ہی توپ صاحب نے آواز میں رقت پیدا کر کے میری طرف دردناک نظروں سے دیکھا۔ "افسوس برخوردار... آج وقت آیا تو تم نے حقِ نمک ادا نہیں کیا۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "جان ہتھیلی پر رکھ کے میں آپ کے اور فرشتۂ اجل کے درمیان آ گیا۔ گولی لگتی تو میرے دلِ داغ دار میں... آپ کو پھر بھی گلہ ہے؟"

"تم پر واجب تھا کہ اس سے وہ آلۂ قتل چھین کے اسی کو توپ دم کرتے... مگر تم بزدل ہو۔"

"ایک دن یہ ہونا تھا توپ صاحب... خدا کے لیے اب بھی باز آ جائیں ورنہ کسی دن گلباز خان آ جائے گا۔"

وہ چونکے۔ "یہ کون گلباز خان کرائے کا قاتل ہے جس سے تم ہمیں ڈرا رہے ہو؟"

میں نے انہیں ٹالا۔ "نام میں کیا رکھا ہے۔ وہ بازگل خان بھی ہو سکتا ہے... آپ باعزت طبعی موت مر سکتے ہیں لیکن آپ مقتول ہونے کی کوشش میں مصروف ہیں۔"

انہوں نے ایک آہ بھری۔ "میاں بزدل! عمر ساری محرومیوں، ناکامیوں اور اداسیوں میں کٹ گئی۔ غمِ جاناں... غمِ دوراں... اپنا غم، تیرا غم جہاں کا غم... سب نے زندہ درگور رکھا... اب دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے... ایک یہ نام کا اخبار... ایک تم اور ایک یہ شغلِ بارش رنگ..."

ظاہر ہے اب وہ ناقابلِ اصلاح ہو چکے تھے۔ میں نے درخواست ان کے سامنے رکھ دی۔ "مجھے چھٹی چاہیے... غیر معینہ مدت کے لیے۔"

توپ صاحب کے حلق سے جو قہقہہ برآمد ہوا وہ ڈبل زردی کا انڈا دینے والی مرغی کی فریاد جیسا تھا۔ "غالباً تم ملازمت کے نام پر ایسی ہی چھٹی سے مستفید ہو رہے ہو... پھر بھی پوچھنا ہم پر فرض ہے کہ کیا جو ناممکن تھا وہ ممکن ہو گیا ہے۔ وہ دوراندیش، غیر جذباتی مسیحا جو تمہارے دامِ الفت میں گرفتار تھی... عقدِ مسنونہ کی خودکشی پر رضامند ہو گئی ہے۔"

"ایسی کوئی امید نہیں... وہ مجھے خیبر ایجنسی بھیج رہی ہے۔"

"بھئی سبحان اللہ... کیا ذہانت پائی ہے اس نیک بخت نے... تمہیں زہر کا انجکشن لگانے کا رسک کیوں لے... اور طالبان کے ساتھ اس جہاد فی سبیل اللہ سے

تمہیں بھی شہادت کے منصب پر فائز ہونے کی سعادت حاصل ہو گی..."

"آپ صرف یہ بتائیے کہ وہ جو آپ کا فاتر العقل عقیدت مند تھا... مولوی سبحان اللہ... وہ وہیں تھا۔"

"اب وہاں اس کی قبر ہے۔" توپ صاحب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ "شہید کے لیے دعا کرو... تاکہ کل تمہارے لیے بھی ہو۔"

"توپ صاحب... میں ایک مصالحتی مشن پر جا رہا ہوں بلکہ بھیجا جا رہا ہوں۔ صائمہ نے ذاتی گھر کی شرط سے دستبردار ہو کے یہ جان لیوا شرط عائد کر دی ہے۔ کامیابی ہو نہ ہو... میں گلباز خان سے بات کروں گا۔"

توپ صاحب نے ایک نئی گلوری کی تیاری کے لیے لوازمات نکالے۔ "میاں بزدل! یہ نام ہم دوسری بار سن رہے ہیں تمہارے لبوں سے... آخر کون ہے یہ ذات شریف...؟"

اگرچہ ابھی صائمہ نے صرف اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں غزالہ کے مسئلے کو جیسے چاہوں حل کروں کیونکہ اس کے لیے یہ زندگی اور موت کا سوال ہے مگر اس کے تیور بتاتے تھے کہ وہ مجھے حکم بھی دے سکتی ہے اور ٹرمپ کارڈ یعنی میری لگام بہرحال اس کے ہاتھ میں تھی۔ چنانچہ توپ صاحب سے میں نے صرف تمہید باندھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ مولوی سبحان اللہ کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلانے سے شاید میری وفات ہلاکت یا شہادت ٹل جائے لیکن مولوی پہلے ہی نچا دے کر اوپر جا بیٹھا تھا۔

گلباز خان کا ذکر خیر ابھی جاری تھا کہ میرا فون گنگنانے لگا۔ اب نام کی جگہ اس پر عکسِ رخِ یار سامنے آ جاتا تھا۔ میرے بولنے سے پہلے ہی اس نے پوچھ لیا۔ "کیا کر رہے ہو؟"

"حسبِ معمول وہی جو مجھے نہیں کرنا چاہیے... یعنی تمہیں یاد کر کے خون کے آنسو بہا رہا تھا۔"

"میں نیچے گاڑی میں بیٹھی ہوں... کتنی دیر میں اترو گے؟"

"انشاء اللہ صبح تک... ہارس پاور والی چنے کی دال روٹی کے ساتھ یہاں ادھار بھی مل جاتی ہے... تمہیں ڈنر پر لے جانے سے منہ چھپانا بہتر ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو... توپ صاحب سے لو... تمہارے واجبات ہیں لاکھوں کے۔"

"کیسی انہونی باتیں کرتی ہو بلبل جان... توپ صاحب سے جان مانگنا آسان ہے... مال لینا ناممکن۔"

"اچھا بابا... تم آؤ تو سہی... بھوکے کو کھانا کھلانے کا ثواب میں کما لوں گی۔"

میں نے کہا۔ "تو سمجھو میں ابھی ٹپکا۔" اب اچانک میرے دل میں پیار کے جذبات یوں بیدار ہو گئے جیسے الیکشن کے نام پر لیڈر کے دل میں قوم کا درد بیدار ہو جاتا ہے۔ غالباً باہر رات بھی جوان تھی اور چاند بھی بادلوں کی لوڈشیڈنگ کے باوجود چمک رہا تھا۔ میں اٹھا ہی تھا کہ توپ صاحب نے گول دستے والی واکنگ اسٹک میرے گلے میں ڈال دی۔

"ایسے کیسے برخوردار... مال مسالا نکالو ورنہ اس سے کہو بقول شاعر... کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر۔"

میں نے جیب سے ایک کاغذ نکال کے لہرایا۔ "ہزار روپے صرف۔"

توپ صاحب نے للچائی نظروں سے دیکھ کے منہ اٹھایا اور منہ میں بھری پیک کے ساتھ کچھ غرارے کیے۔ "دس روپے لے لو ابھی۔"

میں نے کہا۔ "بولی دس فیصد کے حساب سے بڑھتی جائے گی... گیارہ سو... یا کل قطعے کے بغیر جانے دیں ایڈیشن۔"

رات کے وقت خطرہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ توپ صاحب نے کھڑکی سے منہ نکال کے خون اگلا اور پھر شیروانی کی اندرونی جیب میں سے گیارہ سو کے نوٹ دو بار گن کے میرے حوالے کیے۔

کاغذ ہاتھ میں آتے ہی توپ صاحب کے حلق سے صدائے بلغ جیسا قہقہہ برآمد ہونے سے پہلے میں سیڑھیاں اتر چکا تھا۔ اس کی ڈبیا جیسی کار میں سرنگوں بیٹھنے سے قبل ہی میں نے اس کی چھت کی اجلی سفید سطح پر وہ لہو رنگ گلکاری دیکھ لی تھی جو توپ صاحب نے اپنے منہ کے اگالدان سے فرمائی تھی لیکن صائمہ ہنوز اس سے بے خبر تھی۔ ایک رومانٹک رات اور ساحلِ سمندر کی لہروں پر بکھری چاندنی میں ڈنر کے خیال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اسے فوراً اس المناک واقعے کی خبر دینا ضروری نہیں سمجھا اور بڑی سعادت مندی سے سر جھکائے بیٹھا رہا حالانکہ اس طویل سفر میں کم سے کم دس بار میرا سر کسی اسپیڈ بریکر پر سے گزرتے ہوئے ٹن سے چھت کے ساتھ لگا تھا اور میری گردن کے مہرے فریاد کر رہے تھے۔ مجھے بڑی مسرت آمیز حیرانی ہوئی جب کلفٹن کے ساحل نما گاڑیوں کے درمیان اپنی منی سی ڈبیا کو

فٹ کرتے ہوئے اس نے یہ خونی منظر دیکھا مگر خفا ہونے کے بجائے ہنس پڑی۔

''یہ تمہارے انہی توپ صاحب کی حرکت ہوگی... پتا نہیں اب تک وہ مقتول کیوں نہیں ہوئے۔''

میں نے سر کو دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ''آج ہوجاتے... بس خدا نے مجھے بروقت بھیج دیا اور میں نے فرشتۂ اجل کو قائل کرکے واپس کردیا۔''

اس نے ایک ادائے ناز سے سر کے بالوں کو جھٹکا اور اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اور تب مجھ کور چشم کی نظر نے اس اہتمام کا مشاہدہ کیا جو آج صائمہ نے لباس اور آرائشِ حسن میں کیا تھا۔ میں نیم مدہوشی کی کیفیت میں اس نیل تک گیا جو ریت پر تھی مگر کوئی شریر موج اٹھکیلیاں کرتی اس کے قدموں تک آجاتی تھی۔ ویٹر نے ہمارے درمیان ایک شیشے کے جار میں روشن کینڈل لاکے رکھی تو میں نے نظر جما کے صائمہ کو دیکھا اور شاید پلک جھپکانا بھول گیا۔

اس نے شرما کے کہا۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو تو میرا دل لوٹن کبوتر ہوگیا۔''

''کچھ نہیں دیکھ رہا ہوں... میری نظریں خیرہ ہوگئی ہیں۔''

اسی وقت مؤدب ویٹر پھولوں کا گلدستہ لیے نمودار ہوا اور مؤدبانہ جھک کے صائمہ کو پیش کیا۔ ''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو میڈم۔'' اور واپس لوٹ گیا۔

صائمہ نے کسی سحر زدہ کی طرح چاندنی سے اجلی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا۔ ''تمہیں... یاد تھا...''

''ابھی میرے یاد رکھنے کے لیے یہی ایک دن تو ہے جانم۔'' میں نے کھڑے ہوکے سرنیاز خم کیا۔ ''ایک اور دن کا مجھے انتظار ہے ابھی۔''

حیا اور خوشی سے اس کا چہرہ گلنار ہوگیا۔ ''اور کون سا دن ہوگا؟''

مجھے یقین تھا کہ وہ جانتی تھی لیکن اس سوال کا جواب وہ مجھ سے سننا چاہتی تھی۔ ''جس دن کے آسرے پر ہر دن گزر رہا ہے۔'' میں نے کہا اور اپنی جیب میں سے ایک مخملی ڈبیا برآمد کی۔

وہ شرما کے ہنسی۔ ''کیا کررہے ہو... لوگ دیکھ رہے ہیں۔''

میں نے بہ آوازِ بلند اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے حضرات و خواتین کو مخاطب کیا۔ ''لیڈیز اینڈ جنٹلمین... آپ سب گواہ ہوں... آج اس لڑکی کی برتھ ڈے پر میں اس سے دائمی رفاقت کے رشتے کی توثیق کررہا ہوں۔'' پھر میں نے آہستہ سے اس کا نازک ہاتھ تھاما اور اس میں جگ مگ کرتی ہیرے کی انگوٹھی پہنا دی۔ چند لوگوں نے خوش دلی سے تالی بجائی... ایک نوجوان اٹھ کے ہمارے قریب آیا۔

''اس مبارک دن پر میں آپ کو اس خوش قسمتی پر مبارک باد دیتا ہوں۔'' اس نے انگریزی میں کہا۔ صائمہ کی طرف سر خم کیا اور واپس چلا گیا۔ صائمہ پلک جھپکائے بغیر ساکت بیٹھی رہی۔

اس نے پھر کہا۔ ''تمہیں یاد تھا۔'' اور انگوٹھی کو غور سے دیکھا۔ صائمہ کے گالوں کی لالی اب چاندنی میں بھی جھلکنے لگی تھی۔ خلافِ توقع اس نے میری پبلک پرفارمنس پر کسی ناراضی کا اظہار نہیں کیا۔ ''بیوٹی فل۔''

ویٹر پھر نمودار ہوا اور اس نے پلیٹ میں سجا ہوا چھوٹا سا خوب صورت کیک درمیان میں رکھ دیا۔ خوشی سے چمکتے چہرے کے ساتھ صائمہ نے نازک سی چھری اٹھائی اور کیک کاٹ کے درمیان کی شمع کو پھونک مار کے بجھا دیا۔ آس پاس کچھ لوگوں نے گانا شروع کیا۔ ''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔'' فرطِ مسرت سے سرشار صائمہ چاندنی کے ساتھ ساحل پر اتری کوئی مخلوق نظر آنے لگی۔

میں نے ایک پیس لے کر باقی کیک ویٹر کے حوالے کردیا۔ ''یہ سب دوستوں تک لے جاؤ۔'' وہ سب اجنبی تھے جن کو میں نے اپنی خوشی میں شریک کیا تھا۔

ڈنر کے بعد ہم ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پانی کی لہروں پر چلتے دور نکل گئے۔ صائمہ نے نازک جوتے اپنے ہاتھ میں اٹھالیے تھے۔ اسے اتنا خوش میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ رات کے بارہ بجے جب تاریخ بدل چکی تھی، اس نے اپنی گاڑی قطار سے نکالی۔ ''تھینک یو ویری مچ... تم نے اس دن کو یادگار کردیا۔'' اس نے میرے کندھے پر سر ٹکا کے کہا۔

خوشبو نے مجھے مدہوش سا کردیا تھا۔ میں نے آہستہ سے اسے چوما۔ ''میں ایک اور یادگار دن کے انتظار میں ہوں۔''

اس نے آہستہ سے سرگوشی کی۔ ''وہ دن ضرور آئے گا... اور بہت جلد۔''

اس رات میں کسی پرندے کی طرح روشن آسمانوں... گل رنگ وادیوں اور خواب سے بھی کرنوں کے ساتھ پرواز کرتا رہا...

ایسی خوب صورت سپنوں سے سجی رات کا انجام ایک ایسی صبح پر ہوگا جو مجھے حقائق کی سنگین دنیا میں اتنی بے رحمی سے کھینچ لائے گی، یہ میرے وہم و گمان میں نہیں تھا۔ میرے سب ہی جاننے والے یہ جانتے تھے کہ میری صبح بھی دوپہر کے ساتھ ہی ہوتی ہے چنانچہ فون پر گالیاں کھا کے بے مزہ ہونے سے سب بچتے ہیں... نہار منہ دس بجے دروازے کو توڑنے کی نیت سے بجانے والی جرأت صرف صائمہ کرسکتی تھی۔

مختصر ترین انڈر ویئر کے لباسِ شب خوابی میں مجھے دروازے تک دوڑ لگانی پڑی۔ صائمہ ایک بگولے کی طرح اندر داخل ہوئی۔ میری نیم عریانی پر اس نے حسبِ معمول نگاہ ہی نہیں ڈالی۔ جب میں باتھ روم سے جامۂ انسانیت میں منہ دھو کے باہر آیا تو اس کی ناصحانہ تقریر جاری تھی جو مجھے واش روم میں بھی شارٹ ویو نشریات کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ موضوع ہمیشہ کی طرح وہی تھا۔ میری کباڑی پن کی عادت اور ناقابلِ علاج پھوہڑپن... اِدھر اُدھر پھیلے کپڑوں کو سمیٹ کر اپنی اپنی جگہ رکھنے کے بعد وہ ہفتے بھر کے استعمال شدہ برتن... چائے کے کپ... سگریٹوں سے بھری ایش ٹرے... پلیٹیں اور چمچے جو فرش پر بھی پھیلے ہوئے تھے، تکیے کے نیچے سے بھی برآمد ہورہے تھے ٹی وی پر بھی سجے ہوئے تھے... سب کو وہ دھونے کے لیے کچن کے سنک پہنچا رہی تھی۔ حسبِ توقع اس نے چائے کے لیے پانی ابلنے رکھ دیا تھا اور ناشتے کے دیگر لوازمات بھی تلاش کرلیے تھے۔ ڈھیٹ بن کے خاموشی سے سب دیکھنے اور سننے کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

جب اس نے ناشتا میرے سامنے رکھا تو پوچھا۔ ''مجھے لگتا ہے پرسوں ہی یہاں چنڈال چوکڑی جمع تھی۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''ہاں تھی... پھر؟''

''یہ چائے کے کپ میں سگریٹوں کے مختلف برانڈ کے ٹوٹے... گندا تولیا... چادر سے صاف کیے گئے سالن بھرے ہاتھ اور تکیے کے غلاف پر گھٹیا خوشبودار تیل۔''

''دیکھو... وہ میرے دوست... جگری اور لنگوٹیے یار ہیں... ان کے خلاف میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔''

خلافِ معمول اس نے کچھ نہیں کہا اور اپنے مطلب پر آتے ہوئے کہا۔ ''تم سے غزالہ نے بات کی تھی... گلباز خان... اپنے منگیتر کے بارے میں۔''

''تمہاری اس عزیز سہیلی نے کم استحصال کیا میرا... کینٹین میں چنے کی دال کا لنچ کرلیتا تو اچھا تھا... لے گئی مجھے چائنیز... آخر وہ کیا سمجھتی ہے مجھے... میں اس کے لیے بھی جان کی بازی لگا سکتا ہوں... اتنی فالتو ہے میری جان...''

''ہمیں اس کو بچانا ہے گلباز خان سے... کل کوئی ایسی بات ہوئی کہ وہ اچانک پشاور چلی گئی اپنے ماں باپ کے پاس... بہت زیادہ اپ سیٹ تھی۔ کہنے لگی کہ وہی گلباز والی مصیبت ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اس سے کہو آیت کریمہ کا وِرد کرائے... صدقہ خیرات سو بلاؤں کو ٹالتا ہے۔''

صائمہ نے مجھے شرمندہ کرنے والی نظروں سے گھورا۔ ''تم نے اسے دیکھا نہیں... میں ملی ہوں اس شہباز خان کے بیٹے گلباز خان سے... غزالہ جیسی لڑکی کا اس کے ساتھ ایک دن گزارہ نہیں ہوسکتا... زمین آسمان کا فرق ہے ان کے مزاج، عادات اور رویوں میں... وہ ایک خوش حال آدمی ہے پڑھا لکھا ہونے کے باوجود... صرف پیسا ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا نا... غزالہ مرجائے گی مگر اس سے شادی نہیں کرے گی۔''

''گویا مرنا اسے ہر صورت میں ہے۔ شادی کرے یا نہ کرے۔ ایسا ہے تو اللہ کی مرضی۔'' میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''یعنی تم کچھ نہیں کروگے؟''

میں نے کہا۔ ''ایک کام کرسکتا ہوں جان کی بازی لگا کے... اس سے بھی عقدِ مسنونہ کرلوں... جو وہ چاہتی تھی اس سے زیادہ ناممکن ہے... اسے میں کیا سمجھاؤں اور کیسے... وہ کہتی ہے اغوا کرالو۔''

میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ صائمہ کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ چند سیکنڈ میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ فون اسی کا ہے جس کا ذکر تھا۔ دو منٹ میں یک طرفہ ڈائیلاگ سن کے... صائمہ کے چہرے کا حال پریشان دیکھ کر اور اس کی بدحواسی دیکھ کے میں نے یہ بھی اندازہ کرلیا کہ غزالہ پر کسی آفت کا نزول ہوا ہے۔ وہ میرے اور صائمہ کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنی ہوئی تھی اور مذاق کی بات اپنی جگہ... اسے میں قائم مقام محبوبہ کے منصب پر فائز نہ کرتا تب بھی اس صورتِ حال میں غزالہ کی خاطر جان کی بازی لگانا لازم ہوتا۔ وہ صائمہ کی واحد سب سے عزیز رازدار سہیلی تھی اور صائمہ اس کے لیے میری جان کی بازی لگا سکتی تھی۔

جب صائمہ نے فون بند کیا تو اس کی حالت مجھے غزالہ سے بھی زیادہ غیر لگی۔ ''کیا ہوا... کیا غزالہ نے اپنی جگہ تمہیں گلباز کو پیش کردیا... اس علاقے میں ونی کا بھی

رواج ہے۔''

''ہمیں آج ہی پشاور جانا ہوگا۔'' صائمہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''چلو اٹھو۔''

میں نے خود پر نظر ڈالی۔ ''ان کپڑوں میں باہر جانا مشکل ہے... تم پشاور کی بات کرتی ہو۔''

''میں دیکھتی ہوں آج کون سی فلائٹ مل سکتی ہے۔'' اس نے فون پر نمبر ملانا شروع کیا۔

''یار مجھے کچھ بتاؤ تو سہی... آخر ہوا کیا ہے؟''

صائمہ نے جیسے میری بات ہی نہیں سنی اور ایک کے بعد دوسرے نمبر پر سوال جواب میں لگی رہی۔ بالآخر وہ کامیاب ہوگئی۔

میں نے کہا۔ ''تم میرے ساتھ جنگی قیدیوں سے بدتر سلوک کرتی ہو۔''

''چار بجے کی فلائٹ ہے اسلام آباد کی... وہاں سے ہم بائی روڈ جائیں گے... میں غزالہ کو بتادوں؟''

میرا کچھ بھی کہنا لاحاصل تھا۔ غزالہ کے لیے میں کچھ کرسکوں یا نہیں... اب خوشی مجھے صائمہ کے ساتھ جانے کی ہو رہی تھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ اس بہانے مجھے پورا ہفتہ اس کے ساتھ رہنے کا موقع مل جائے۔ پشاور کسی طرح بھی تفریح کے لیے آئیڈیل جگہ نہیں تھی لیکن یہ موسم بھی نہ برف باری کا تھا نہ گرمی کا اور نہ بہار کا... غزالہ کی بیان کی ہوئی صورتِ حال میں کوئی فیلڈ مارشل بھی کیا کرسکتا تھا پھر ایک بزدل، توپ چلاتا... مگر مجھے بکنگ کنفرم کرانے صائمہ کے ساتھ ائرپورٹ جانا پڑا... صائمہ نے بس یہ بتایا کہ غزالہ بہت رو رہی تھی اور اس نے کہا ہے کہ فوراً آجاؤ بزدل کے ساتھ... اب بارہ بج چکے تھے چنانچہ وقت کم تھا۔ صائمہ کے حکم پر میں نے اپنے لیے ضروری کپڑے ایک بیگ میں بھر لیے۔

یہ دوپہر کا ایسا وقت تھا جب ٹریفک زیادہ ہونے کے باوجود کم تھی۔ پھر بھی سول اسپتال تک جانے اور صائمہ کے تیار ہو کے سوٹ کیس کے ساتھ آنے اور ہمارے واپس ائرپورٹ پہنچنے تک قواعد وضوابط کے تحت ملنے والی مہلت تمام ہوچکی تھی۔ فلائٹ ٹائم میں مشکل سے ایک گھنٹا باقی تھا۔ ہم چیک ان کرکے لاؤنج پہنچے ہی تھے کہ مسافروں کے جہاز میں تشریف رکھنے کا اعلان نشر ہونے لگا۔ فلائٹ ٹائم سے صرف بیس منٹ پہلے سیٹ پر بیٹھ کے صائمہ نے اطمینان کا سانس لیا اور بیلٹ باندھتے ہوئے میری طرف دیکھ کے مسکرائی۔

''تھینک یو... تم نے مجھے مایوس نہیں کیا۔'' اس نے اپنے ہاتھ کو سامنے کرکے ہیرے کی جگمگاتی انگوٹھی کو بڑے پیار سے دیکھا... پھر کون کافر تھا جو اسے خط غلامی لکھ دینے پر بھی غرور نہ کرتا۔

ہم اسلام آباد کے لاؤنج سے نکلے بھی نہ تھے کہ صائمہ کا فون بجنے لگا۔ اس نے کہا۔ ''اچھا... ٹھیک ہے... تھینک یو۔'' اور پھر میری طرف دیکھا۔ ''غزالہ کی گاڑی پشاور سے آگئی ہے ہمیں لے جانے کے لیے۔''

حیات آباد میں غزالہ کی جدید وضع کی کوٹھی کسی طرح بھی لاہور یا کراچی کے کسی پوش علاقے کی کوٹھی سے کم نہیں تھی اور کوئی اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ اس کے مکین آج بھی قبائلی علاقے کے مخصوص مزاج اور قدیم روایات پر کاربند لوگ ہیں اور گھر کا مالک آفریدی قبیلے کی کسی شاخ اور ذیلی قبیلے کا سردار ہے۔ گھر کی آرائش کا انداز بھی جدید تھا۔ ہمیں غزالہ باہر ہی ملی۔ اس کے چہرے کی اداسی ہی نہیں آنکھوں کی لالی بھی بتاتی تھی کہ اس نے گزشتہ رات سوتے نہیں روتے گزاری ہوگی... لیکن اندر جب اس کے سرخ سپید چہرے والے دراز قد اور کلین شیو والد سے ملاقات ہوئی جو قمیص پتلون میں تھے اور پھر غزالہ کی ماں سے جو دگنے وزن کی مگر گلابی چہرے اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی باوقار خاتون تھیں تو ان کے چہروں پر لکھی غم کی تحریر نے بھی مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں مدد کی کہ مسئلہ صرف غزالہ کا ہی نہیں۔

غزالہ کے والد نے شفقت سے کہا۔ ''آپ لوگ بڑی دور سے آئے ہیں... پہلے فریش ہو کے کھانا کھالیں... غزالہ بیٹا! مہمانوں کو ان کے کمرے دکھاؤ۔''

صائمہ کو غزالہ نے اپنے بیڈ روم میں رکھا تھا اور میرے لیے گیسٹ بیڈ میں انتظام کیا گیا تھا۔

میں ابھی تیار ہوا ہی تھا کہ غزالہ ناک کرکے اندر آگئی۔ ''صائمہ ابھی تیار ہورہی تھی۔ میں نے سوچا ایک ضروری بات تمہیں بھی بتادوں... یہاں میں نے کہا ہے کہ آپ دونوں میاں بیوی ہیں... سوری... یہ جھوٹ بولنا ضروری تھا ورنہ میرے والدین پرانے خیالات رکھتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا کیا پہلے بتادیا... یہ آدھا سچ تو بہرحال ہے... مجھے بتاؤ سب خیریت ہے۔''

''ابھی تک کچھ ہے... اصل بات تو میں نے تمہیں بتا ہی دی تھی۔ اب ایک اور مشکل پیدا ہوگئی ہے۔ کھانے کے بعد امی ڈیڈی خود تمہیں بتائیں گے اور پلیز... یہ کراچی نہیں ہے... مجھ سے بات کرتے ہوئے بے تکلفی مت دکھانا۔''

''فکر مت کرو... مجھے خیال رہے گا۔''

کھانے کی میز پر بہت کم اور صرف رسمی بات ہوئی۔ ''ہم تو بھئی کاروباری لوگ ہیں... میٹرک پاس کرکے کام شروع کیا تھا... اب اللہ کا فضل ہے بزنس باہر تک پھیلا ہوا ہے ہم نے بھی شہر میں رہائش لے لی مگر آبائی گاؤں سے رشتہ نہیں توڑا... توڑ بھی نہیں سکتے۔''

وقفہ آتے ہی غزالہ کی ماں نے موضوع بدل دیا۔ ''کب ہوئی آپ کی شادی... ابھی بچے تو نہیں ہیں نا؟''

صائمہ کا رنگ لال ہوا... میں نے بال اس کے کورٹ میں پھینک دی۔ ''بتاؤ بھئی۔''

صائمہ نے بڑی مشکل سے کہا۔ ''ابھی... زیادہ دن نہیں ہوئے۔''

کھانے کے بعد غزالہ غائب ہوگئی۔ ڈرائنگ روم میں سبز قہوہ پینے والے ہم چار افراد رہ گئے تو غزالہ کے والد نے کہا۔ ''یہ کچھ حساس معاملہ ہے... غزالہ نے کہا کہ آپ پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک کہا اس نے... مجھے آپ اپنا بیٹا ہی سمجھیں۔''

یہ ڈائیلاگ کام کر گیا۔ صائمہ نے بھی مجھے تعریفی اور شکرگزار نظروں سے دیکھا۔

''دراصل... ماڈرن نظر آنے کے باوجود ہم پرانے خیال کے لوگ ہیں۔ حد درجہ روایت پسند۔ میں نے قبیلے کی روایت کے مطابق غزالہ کی نسبت بچپن ہی میں اپنے بڑے بھائی کے گھر کردی تھی۔ وہ قبیلے کے سردار تھے۔ پھر ان کا قتل ہوگیا اور یہ ذمے داری مجھ پر آگئی۔ غزالہ ڈاکٹر بن گئی کیونکہ اس کی خواہش تھی لیکن اس کے منگیتر گلباز خان نے زیادہ نہیں پڑھا۔ وہ بھی بزنس کرتا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ باہر سے کیا لاتا ہے اور یہاں سے کیا لے جاتا ہے... میرے خیال میں ہانگ کانگ، سنگاپور، دبئی سے سب وہی لاتے ہیں... عام استعمال کی چیزیں... کپڑے... کراکری... کاسمیٹک... جیولری... پھر وہ گاڑیاں لانے لگا... ری کنڈیشنڈ... اس میں کچھ لوگ گڑبڑ کرتے ہیں... یہاں سے چوری ہو کے جانے والی گاڑیاں وہاں سے ری کنڈیشن کرکے منگواتے ہیں۔ اس نے کراچی میں ایک شوروم قائم کرلیا تھا۔ میں اسے منع نہیں کرسکتا تھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ یہ سو فیصد رسک فری کام نہیں ہے۔ ایسی کوئی بات کسی نے کہی بھی نہیں۔ وہ اچھا خاصا دولت مند ہوگیا لیکن رہا میرا بھتیجا۔ مجھے اپنے باپ کی جگہ سمجھنے والا... ہمارے لیے تو وہ بہرحال بیٹا تھا۔ ایک وقت آیا جب اس نے ہمیں یاد دلایا کہ اس کی منگنی غزالہ سے ہوئی ہے اور اب وہ چاہتا ہے کہ ہم اسے رخصت کریں... ہمیں کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔''

''غزالہ اسے بالکل پسند نہیں کرتی تھی؟'' غزالہ کی ماں نے اچانک درمیان میں کہا۔

غزالہ کے والد نے خفگی سے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے... لیکن یہ معاملہ کچھ اور ہے۔''

''خود تم بھی اسے پسند نہیں کرتے... بات کھل کے کیوں نہیں کرتے؟''

''میں بتا رہا ہوں... سب بتا رہا ہوں... اگر کچھ چھپاؤں تو تم بتادینا۔'' شوہر نے ضبط کا مظاہرہ کیا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''ہم نے گلباز سے کچھ مہلت مانگی تو اس نے کہا کہ مہلت وہ پہلے ہی کافی دے چکا ہے۔ غزالہ ڈاکٹر بن گئی... اس نے ہاؤس جاب کرلی... اب جاب کررہی ہے تو یہ غیر ضروری ہے۔ میں نے کہا کہ اس تعلیم اور تجربے کو ہم بھی ضائع کرنا نہیں چاہتے... نوکری وہ مالی فائدے کے لیے نہ کرے... ہم یہاں ایک خیراتی شفاخانہ بنا دیتے ہیں۔ اس پر وہ راضی ہوگیا اور ہم نے کوئی مناسب جگہ حاصل کرنے اور اسے اسپتال کے ساز و سامان سے آراستہ کرنے کے لیے چھ ماہ مانگے... اس پر وہ راضی ہوگیا۔''

میں نے آہستہ سے کہا۔ ''ظاہر ہے غزالہ بھی مان گئی ہوگی۔''

وہ کچھ دیر چپ رہے۔ ''میری بات ماننا اس کی مجبوری تھی۔ کیونکہ میری مجبوری یہ تھی کہ میں بچپن میں اپنے مرحوم بھائی کو زبان دے چکا تھا اور ہم اپنے قول سے مکر جانے اور بدعہدی کو غیرت کے منافی سمجھتے ہیں... پھر میں اب تک اس قبیلے کا سردار ہوں... حالانکہ قبیلہ اب سارے پاکستان بلکہ ساری دنیا میں بکھر چکا ہے... جو لوگ ملک چھوڑ کے چلے گئے ہیں انہوں نے باہر شادیاں بھی کرلی ہیں مگر جو یہاں ہیں وہ روایات سے بندھے ہوئے ہیں... گلباز کم تعلیم یافتہ ہے اور ایمان داری سے موازنہ کروں تو میری بیٹی غزالہ کے اور اس کے مزاج میں بہت فرق ہے... لیکن یہ فرق کہاں نہیں ہوتا... بعد میں سب ایڈجسٹ کرلیتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ برا نہ مانیں تو میں ایک سوال

کروں... بہت پرسنل... مگر آپ نے مجھے ذاتی معاملے میں ہی مشورے کے لیے بلایا ہے۔'' میں نے مدد کے لفظ کے استعمال سے گریز کیا۔

غزالہ کے والد نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''ویسے مجھے اندازہ تو ہے کہ تم کیا پوچھو گے۔''

''کیا غزالہ کسی اور کو پسند کرنے لگی ہے... دیکھیے میڈیکل کالجز میں طلبا اور طالبات پانچ سال ایک ساتھ رہتے ہیں کم سے کم... اور کراچی کا ماحول بھی بہت مختلف ہے۔''

''میں جانتا تھا تمہارا سوال یہی ہوگا... جواب ہے وہ جو تم جانتے ہو... مگر میری مجبوری ایک باپ کی عام مجبوری نہیں ہے جو کراچی میں، لاہور میں رہتا ہے یا ان قبائلی روایات میں جکڑا ہوا نہیں ہے... میں انکار کردوں گا تو یہ زندگی اور موت کا مسئلہ بن جائے گا... میرے لیے بھی اور غزالہ کے لیے بھی... رسوا ہوکے مارے جانے سے بہتر ہے کہ ہم باعزت طور پر خودکشی کرلیں۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا... اب زمانہ بدل گیا ہے۔'' غزالہ کی ماں نے کہا۔

''زمانے کی بات مت کرو... میں گلباز کو جانتا ہوں... وہ غزالہ کو بھی گولی ماردے گا اور مجھے بھی۔''

''اچھا ہوتا اگر تم نے اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانے دیا ہوتا۔'' غزالہ کی ماں نے آہ بھری۔

''اس سے فرق نہ پڑتا خانم... گلباز بھی باہر ہی رہتا ہے... پھر غزالہ ہماری ایک ہی بیٹی ہے۔ بیٹا تو باہر ایسا گیا کہ شاید ہمارا نام بھی بھول گیا ہوگا... بس لکھا ہوگا کہیں اس کے پاسپورٹ میں شاید۔'' غزالہ کے باپ نے ایک آہ بھری اور بیوی سے کہا کہ وہ کافی لائے۔

میں نے کہا۔ ''یہ بہت سخت آزمائش ہے آپ کے لیے... میں مانتا ہوں۔''

''بس بیٹا... اللہ پر سب چھوڑ دیا تھا میں نے... گلباز کو بھی سمجھاتا رہتا تھا اور غزالہ کو بھی لیکن اس کے بعد مجھے کچھ ایسی رپورٹیں ملیں کہ گلباز جعلی دستاویزات پر چوری کی گاڑیاں حاصل کرنے کے کسی کیس میں ملوث ہوگیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے صاف انکار کیا۔ مجھے ایف آئی اے سے معلوم کرنے کے لیے کہا۔ ایف آئی اے میں واقعی کوئی کیس نہیں تھا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ رشوت دے کر کیس دبادیا گیا ہے۔ میں نے گلباز سے کہا کہ وہ ری کنڈیشنڈ گاڑیوں کے بزنس کے علاوہ بھی بہت کچھ کرسکتا ہے۔ اس نے وعدہ تو کیا مگر یہ کام چھوڑا نہیں۔ میں نے معلوم کیا دبئی سے اور کراچی سے تو گلباز کی گڈول اچھی نہیں تھی۔ لیکن کچھ بھی ثابت کرنا مشکل تھا۔ میرے نزدیک پیسا ہی سب کچھ نہیں ہوتا... یہی غزالہ بھی سمجھتی ہے۔ ہمارے لیے عزت زیادہ اہم ہے۔ جتنا ہے ہمارے پاس وہ کم تو نہیں... ہوس کی کوئی انتہا نہیں۔''

خلافِ توقع صائمہ نے ایک سوال داغ دیا۔ ''آپ نے اس کے پرسنل کریکٹر کے بارے میں معلوم کیا کبھی؟''

میں یہ سوال کبھی نہ کرتا مگر صائمہ نے شاید پرسنل انفارمیشن کی بنیاد پر جو ایک سہیلی دوسری سہیلی کو ہی دے سکتی ہے یہ سوال کیا تھا۔ غزالہ کے والد نے قدرے توقف سے کہا۔ ''پیسا بڑی خرابیاں لاتا ہے خصوصاً ایسے ذرائع سے اور اچانک حاصل ہوجانے والا... پھر دبئی اب عیاشوں کی جنت ہے... میں جانتا ہوں کہ یورپ اور امریکا میں بھی کچھ پابندیاں ہیں... وہاں پیسے والوں کے لیے پابندی کوئی نہیں... مگر مجھے گلباز پر اعتماد تھا۔''

غزالہ کی ماں نے کافی میز پر رکھی اور بیٹھ گئی۔ ''جو دلدل میں گر کے خود کو کیچڑ سے بچا سکے وہ انسان نہیں فرشتہ ہوگا۔''

''جانے دو خانم... ہونے والے داماد کے بارے میں ایسی تفتیش کرتے ہوئے خود مجھے شرم آتی تھی کہ وہ پیتا پلاتا تو نہیں اور اس کا سوشل سرکل کیسا ہے... اس کے روز و شب کیسے گزرتے ہیں۔''

''یہ سب غزالہ ہی بھگتے گی نا... تم تو وہی پرانی بات کروگے کہ شادی کے بعد سب ٹھیک ہوجاتے ہیں۔''

''اچھا اب تم بات کرلو... میں اٹھ کے چلا جاتا ہوں... یا مجھے بات ختم کرنے دو۔''

میں نے کہا۔ ''آپ بولیں انکل... مائیں جذبات پر کنٹرول نہیں رکھ پاتیں۔''

صائمہ نے میری رائے کو مسترد کردیا۔ ''بعض اوقات ان کی جذباتیت ہی حقیقت پسندی کا پہلو ہوتا ہے جسے آپ مرد حضرات اہمیت نہیں دیتے... غلط راہ پر جانے والے کے بعد میں لوٹ آنے کے امکانات سو فیصد کیسے ہو سکتے ہیں... یہ جُوا بہرحال ہے اور غزالہ کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔''

غزالہ کی ماں نے ممنونیت کے ساتھ صائمہ کی طرف دیکھا۔ ''خدا نہ کرے ایسا ہو۔''

میں نے کہا۔ ''انکل... آپ نے مجھے کیوں بلایا

ہے... میں کیا کرسکتا ہوں اس معاملے میں؟''

''غزالہ نے کہا تھا کہ ایک معاملہ ایسا ہے جس میں تم سے مدد لی جاسکتی ہے۔'' غزالہ کے والد نے سکون کا سانس لے کر اپنی بات پھر شروع کی۔ ''تقریباً تین مہینے ہوئے... ایک عورت نے مجھے کال کی... کراچی کا نمبر تھا... اس نے پوچھا کہ کیا میں گلباز کا والد بول رہا ہوں۔ میرے ہاں کہنے پر اس نے کہا کہ میں گلباز کی بیوی ہوں۔''

صائمہ کے ساتھ میں چونکا۔ ''اس کی بیوی؟''

''یس... مگر اس کے ساتھ ہی کال کٹ گئی۔ یوں جیسے کسی نے کاٹ دی ہو۔ فون چھین کر یا اس عورت کے منہ پر ہاتھ رکھ کے۔ میں نے بعد میں اس نمبر کے بارے میں معلوم کیا تو کچھ معلوم نہیں ہوا۔ وہ بوگس نام اور پتے پر رجسٹرڈ سم تھی۔ اور اب کسی سبزی کی ریڑھی لگانے والے کے زیرِ استعمال تھی۔ اس نے چوری کا فون مارکیٹ میں کسی گھومتے پھرتے شخص سے لیا تھا۔ اس بات کا ذکر میں گلباز سے کیسے کرتا... کسی نے شرارت یا دشمنی کی تھی۔ الزام الٹا غزالہ پر آجاتا... پھر؟ کانٹا میرے دل میں ضرور چبھ گیا مگر ایک ہفتے بعد جو معلوم ہوا سب لاحاصل تھا لیکن ایک مہینا بھی نہیں گزرا تھا کہ مجھے ڈاک سے ایک لفافہ موصول ہوا۔ اس میں سے ایک نکاح نامہ نکلا... نکاح نامہ دیکھ کے واقعی میرے ہوش گم ہوگئے۔ اس میں منکوحہ کا نام عائشہ صدیقہ... دختر پرویز مسیح لکھا تھا۔''

میں اور صائمہ پھر ایک ساتھ بولے۔ ''پرویز مسیح؟''

انہوں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''ظاہر ہے اس کا باپ کرسچن تھا۔ یہ کرسچن لڑکیاں جب کسی مسلمان سے شادی کے لیے اسلام قبول کرتی ہیں تو ان کے نام بھی خالص اسلامی رکھے جاتے ہیں۔ اس کے شوہر کا نام گلباز خان لکھا ہوا تھا۔ باپ کا نام بھی درست تھا اور پتا بھی۔ دوسری چونکا دینے والی بات حق مہر کی رقم دس لاکھ تھی۔ عام لوگوں میں اتنی بڑی رقم کہاں لکھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ شرائط میں اس کے نام رہائشی مکان بھی تھا جو کراچی کے کسی علاقے پی سی ایچ ایس میں تھا۔ مجھے کیسے اندازہ ہوسکتا تھا کہ پتا نامکمل ہے۔ وہ شاید نامکمل لکھا گیا۔ قاضی کی غلطی سے یا عمداً... مجھے کچھ نہیں معلوم... اس میں بلاک سکس بھی تھا مگر سب سے اہم مکان کا نمبر نہیں تھا۔ میں خود کراچی گیا خاموشی سے کسی کو بتائے بغیر اور اس پتے پر پہنچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ وہاں نمبر کچھ ایسے تھے کہ ایک عدد اور ایک انگریزی حرف... سولہ ایف یا بتیس آر... میں جھک مار کے واپس آگیا... نکاح نامہ رجسٹرڈ نہیں تھا۔ سیریل نمبر نہیں تھا کیونکہ فوٹو اسٹیٹ میں کاغذ چھوٹا تھا یا مشین چھوٹی تھی۔ گواہوں کے نام اور دستخط تھے مگر اور کچھ نہیں تھا۔''

میں نے کہا۔ ''دولہا دلہن کا شناختی کارڈ نمبر بھی ہوتا ہے عموماً۔''

''گلباز خان کا شناختی کارڈ نمبر تھا اور ٹھیک تھا لڑکی کا نہیں تھا۔ دراصل اس کی عمر تھی سترہ سال۔ کارڈ بنتا ہے اٹھارہ سال کی عمر میں۔''

''آپ نے خاصی جاسوسی کرلی اس کی۔''

''اگر میں کیس پولیس کو دے دیتا جو مشکل نہیں تھا تو وہ سراغ لگا لیتے شاید... مگر میں نے یہ رسک نہیں لیا کیونکہ مجھے بدنامی کی صورت میں زیادہ خرابی نظر آرہی تھی۔''

صائمہ نے کہا۔ ''آپ نے غزالہ کو بھی نہیں بتایا انکل؟''

اس نے اعتراف کیا۔ ''مجھ میں ہمت نہیں تھی... اور میرے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں تھا۔''

''اسے معلوم ہوتا تو ہم پتا چلا لیتے۔ ہمارے میڈیکولیگل آفس کے پولیس والے ہر جرم کا سراغ لگا سکتے ہیں۔''

''مگر لگاتے نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''جب تک دباؤ نہ ہو۔''

''دباؤ بہت تھا۔'' صائمہ نے احتجاج کیا۔ ''ہم ڈاکٹرز تھے... اور تم تھے۔''

میں نے کہا۔ ''انکل آپ آگے بتائیں۔''

''میں واپس آگیا مگر میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ گلباز خان سے ضرور پوچھوں گا اور میں نے پوچھا... لیکن ایک بنیادی غلطی ہوئی مجھ سے... میں نے کچھ کہے بغیر وہ نکاح نامہ اسے پکڑا دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس نے اپنے ردِعمل کو کنٹرول کرلیا۔ یا ردِعمل تھا ہی نہیں۔ پھر وہ چیخنے لگا اور بولا۔ ''چاچا! پتا نہیں کون دشمن میرے پیچھے لگ گیا ہے۔'' اور ایک دم نکاح نامہ کو پھاڑ کے پرزہ پرزہ کردیا۔ میں کچھ نہ کر سکا۔ میں نے اس کی فوٹو کاپی بھی نہیں رکھی تھی۔ مجھے ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی اور جو گلباز نے کیا غیر متوقع تھا اور اچانک... اس نے مجھ سے کہا کہ میں ایسی فضول باتوں پر توجہ نہ دوں۔ ہوسکتا ہے مجھے کوئی کال کرے اور کہے کہ میں گلباز کی بیوی بول رہی ہوں... اب میں کیا کہتا کہ یہ کال تو پہلے ہی آگئی تھی۔ ایسی صورتِ حال نے میرے لیے بڑی مشکل اور پریشانی پیدا کردی ہے اور اس کا ذکر غزالہ

سے کرتا تو زیادہ خرابی ہوتی... مجھے تو یہ احساس بھی ہے کہ میں نے گلباز سے کیوں بات کی۔ وہ بدگمان ہوا... اور نہ پوچھتا تو کیا کرتا... گھر کا معاملہ ہے... باہر کیسے لے جاؤں... اچانک غزالہ نے ایک دن تمہارا حوالہ دیا کہ اس کی سہیلی کے ایک شوہر بہت قابلِ اعتماد ہیں... شادی حال ہی میں ہوئی ہے۔''

میں نے کھنکھار کے صائمہ کی طرف دیکھا۔ ''بالکل ٹھیک کہا اس نے۔'' صائمہ کی نظر فرش سے نہیں اٹھی۔

''مجھے معلوم ہوا کہ تمہارے خاصے تعلقات ہیں... صحافیوں کے ہوتے ہیں... ماشاء اللہ تم وکیل بھی ہو اور کچھ اپنی ذہانت سے تم نے لوگوں کے ایسے مسائل حل کیے ہیں جو بے حد ذاتی تھے اور اس کے اصرار پر میں نے تمہیں زحمت دی۔''

''زحمت کیسی انکل... گھر کی بات گھر میں رہنی چاہیے... مسئلے ہر گھر میں ہوتے ہیں۔''

بزرگوار کچھ جذباتی ہو گئے۔ ''کاش میرے بیٹے تم ہوتے۔ وہ جو ہے خون کے رشتے سے... اس کا تو خون سفید ہو گیا ہے۔ ایسا میں نے کسی کو سب بھولتے نہیں دیکھا۔ اخلاقاً رسماً عید کارڈ یا فون کال تک نہیں ہے اب... ہمیں نہیں معلوم وہ ہے کہاں... اور اسے کب پتا ہوگا کہ ماں باپ زندہ ہیں یا مر گئے۔ سب کچھ اب غزالہ ہے ہمارے لیے... بیٹا بھی اور بیٹی بھی... اور تم واقعی ویسے ہی ثابت ہو رہے ہو جیسا اس نے بتایا تھا۔''

میں نے انکساری سے کہا۔ ''ابھی تو میں نے کچھ بھی نہیں کیا انکل... مجھ سے زیادہ توقعات وابستہ مت کریں... کیا پتا میں بھی کوئی مدد نہ کر سکوں آپ کی... لیکن معاملہ میری سمجھ میں آ گیا ہے اچھی طرح... اور میں کوشش ضرور کروں گا پوری... اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' رات بہت ہو گئی تھی۔ سب شب بخیر کہہ کے اٹھ گئے۔

اپنے بیڈ روم میں جانے سے پہلے صائمہ کچھ دیر کے لیے میرے کمرے میں رکی۔ ''بہت اترا رہے تھے۔''

میں نے سینہ فتح یاب مرغ کی طرح پھلا کے کہا۔ ''تعریفیں کیا غلط ہو رہی تھیں... تم سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔''

''مجھے کیا ضرورت ہے جلنے کی۔''

''دھواں نکل رہا تھا تمہارے کانوں سے... دنیا اعتراف کرتی ہے کہ میرے جیسا ہمہ صفت...''

وہ بھنا کے بولی۔ ''زیادہ ٹرٹر مت کرو... میں بتا دیتی نا تمہارے تعلقات کی نوعیت کہ سارے زمانے کے لوفر، جواری تمہارے یارِ غار ہیں... ایک کباڑی... ایک جیب کترا... اور تم ڈاکوؤں کے ساتھی ہو... مال میں حصہ بناتے ہو... تو سب ہیکڑی نکل جاتی۔''

''تو جاؤ اب بتا دو... ڈر کس کا ہے۔ اپنے مجازی خدا کے خلاف زہر اگلتی اچھی لگو گی، یقین کون کرے گا؟''

''مجازی خدا... مائی فٹ۔'' وہ پیر پٹختی دروازے تک گئی اور پھر رک کے پلٹی۔ ''پھر بھی... تھینک یو ڈارلنگ، تم نے میرا وقار رکھا... شب بخیر۔'' جاتے جاتے اس نے میری طرف ایک فلائنگ کس اچھال دیا۔

اب یہی وہ ادائے ناز کے راکٹ کا ڈرون حملہ ہے جس سے صائمہ جیسی تمام حسینانِ عالم اپنے عشاق کے دل کا بار بار خون کرتی ہیں اور ان کو تمام جور و ستم کے باوجود مزید دیوانہ بنا دیتی ہیں۔ میں نے ایک جست لگائی۔ ''یاہو...'' اور اندازے کی غلطی کے باعث بیڈ کے سینٹر میں لینڈ نہیں کیا چنانچہ میرا بے حد قیمتی اور قابلِ فخر اثاثہ یعنی میرا سر بیڈ کے سرہانے سے لگا اور صبح میں نے عین اپنی پیشانی کے وسط میں دیو کی تیسری آنکھ جیسا گومڑ ملاحظہ فرمایا۔ لیکن اسے نشانِ محبت کا میڈل قرار دیا۔ جو جانتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ محبت میں ترے سر کی قسم ایسا ہی ہوتا ہے... اپنا سر خراب ہوتا ہے۔

صبح میں عادت کے مطابق دوپہر میں ہونے والی صبح تک صائمہ کے ساتھ خوابوں کے وہ سیریل دیکھتا رہتا جن میں کچھ یقیناً سنسر سے اے سرٹیفکیٹ پاتے لیکن نہ جانے کیوں آنکھ کھل گئی۔ میں نے کچھ دیر کباب سیخ کی طرح کروٹیں بدلنے کے بعد اٹھ جانے کا فیصلہ کیا۔ ہاتھ منہ دھوتے ہوئے اپنے سر کے درمیان ہیڈ لائٹ جیسا ابھار دیکھا اور جسے کوئی اسلامی ٹوپی بھی نہیں چھپا سکتی تھی۔ صرف سکھوں کی پگڑی کام آتی۔ بشرطیکہ میں بزدل سنگھ ہوتا...

فضول خیالوں کو جھٹک کر میں نے دروازہ کھولا۔ کاریڈور میں کوئی نہیں تھا۔ مجھے کافی کی طلب محسوس ہوئی مگر یہ خالہ جی کا گھر نہیں تھا کہ میں کچن میں گھس جاتا اور ساری کیبنٹ کی خاک چھان کے کافی ایجاد کر لیتا۔ میں کاریڈور کے راستے باہر نکلا تو ایک خوب صورت صحن چمن میرا منتظر تھا جس میں لان پر دو بلبلیں چہک رہی تھیں۔ یہ غزالہ اور صائمہ تھیں۔ وہ کافی بھی پی رہی تھیں۔ کسی سنگ دل حسینہ نے مجھے کافی پیش نہیں کی حالانکہ ایک مستقل محبوبہ تھی اور دوسری قائم مقام محبوبہ کی پوسٹ پر پانچ سال سے فائز تھی۔

بقول فلمی شاعر... محبت کرنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے کہ قسمت ان پہ روتی ہے زمانہ ان پہ ہنستا ہے۔

تاہم اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ اس نے مجھ مسکین کے لیے آنٹی کو کافی دے کر بھیج دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ناشتے کی میز پر جب انکل سے ملاقات ہوگی تو شاید ان کا پہلا سوال یہی ہوگا کہ پھر تم نے کیا سوچا اور میرا جواب یہی ہوگا کہ ابھی تو میں نے سوچنا بھی شروع نہیں کیا۔

چنانچہ مجھے اور مجھ سے زیادہ صائمہ کو حیرانی ہوئی جب میں نے کہا کہ سب سوچ لیا ہے میں نے...

انکل نے سوالیہ انداز میں کہا۔ ''اچھا۔''

میں نے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ آپ سمجھ لیں کہ ہم یہاں آئے ہی نہیں... اور آپ سے ملے بھی نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''ابھی تو آپ مجھے گلباز کے بارے میں ضروری تفصیلات دے دیں۔ اس سے پہلے کہ کسی کو ہمارے یہاں آنے کی خبر ہو ہم نکل جاتے ہیں... آپ کی گاڑی ہمیں اسلام آباد لے جائے۔''

''لیکن اتنی جلدی تمہیں شاید فلائٹ نہ ملے۔''

''ہم اسلام آباد میں انتظار کر لیں گے... کسی ہوٹل میں... یا مری چلے جائیں گے... کیوں بیگم؟''

صائمہ نے مجھے قاتل نظروں سے دیکھا۔ ''میرا خیال تھا... اور غزالہ کا بھی کہ...''

''اپنا خیال تو تم رہنے دو... یہ تمہارے مجازی خدا کا حکم ہے۔'' میں نے کہا۔ ''گناہ گار مت بنو انکار کر کے۔''

صائمہ کے سوا سب مسکرانے لگے۔ ''اچھا پھر یہ گاڑی تمہارے پاس ہی رہے گی... جب تک تمہیں فلائٹ نہیں مل جاتی۔'' انکل نے کہا۔

آدھے گھنٹے بعد ہم واپسی کے لیے پھر جی ٹی روڈ پکڑ چکے تھے۔ صائمہ اس بیوی کی طرح بیٹھی تھی جو مجبوراً اسی گاڑی میں بیٹھ کے طلاق لینے شوہر کے ساتھ کورٹ جا رہی ہو... مگر مجھے اس کو منانا آتا تھا اور گاڑی میں خود چلا رہا ہوتا تو اس کے ہونٹوں پر صرف ایک پیار کی مہر کافی ہوتی۔ مگر ڈرائیور بے غیرتی کے اس مظاہرے پر غصے سے گاڑی دریائے کابل کے پل سے گرا دیتا۔ ہمارے پشاور میں بارہ گھنٹے کی رات کے قیام کی رازداری برقرار رکھنے کے لیے فوری واپسی ضروری تھی۔

حسبِ توقع کراچی کے لیے دو دن تک کوئی سیٹ نہ تھی۔ یہ صائمہ نے خود کنفرم کیا۔ تب تک اس کے موڈ کو میں رومانٹک بنانے کے بارے ہنگامی اقدام کر چکا تھا۔ دو دن مری کی خواب ناک فضا میں خواب کی طرح گزارنے کے بعد واپسی کی فلائٹ میں صائمہ نے میرے کندھے پر سر رکھ کے کہا۔ ''ایک بات بتاؤں؟ سیٹ تو تھی دو دن پہلے بھی۔''

ایک اور ڈرون اٹیک... قومی ائرلائن والے اجازت دیتے تو میں صائمہ کا ہاتھ پکڑ کے چالیس ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے بادلوں میں کود جاتا۔

☆☆☆

انسپکٹر رحمدل خان جس کو اس کی ذاتی صفات اور اصلیت کے باعث میں نے ظالم خان کا لقب دیتے وقت ایسا ہرگز نہیں سوچا تھا کہ ذاتی تعلقات کی یہ بے تکلفی کیا گل کھلائے گی۔ نہ جانے کیسے یہ شہرت عام ہوئی کہ اب اس کے ماتحت اور ساتھی بھی اسے اسی نام سے بلاتے تھے۔

حسبِ معمول تھانے کے اندر باہر خلقِ خدا یوں کھڑی تھی جیسے ماتم والے گھر کے باہر نظر آتی ہے۔ میں دندناتا ہوا اندر جا پہنچا۔

اس محرر سے اب تک میری ملاقات نہیں ہوئی تھی کیونکہ ظالم خان کی پوسٹنگ کے بعد میرا ادھر آنا نہیں ہوا تھا۔ میں اس کی میز پر ٹانگیں لٹکا کے بیٹھ گیا۔ ''یار! یہ نئی گاڑی کس کی کھڑی ہے باہر... سیاہ ہنڈا اسوک؟''

اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ''تیرے باپ کی...'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے سامنے چھ انچ کے فاصلے پر کھڑے ہو کے میں نے اپنی بتیسی چمکائی۔ ''ابا نے بتایا تھا... ٹھیک ہے واپسی پر میں لے جاؤں گا... تمہارا باپ کہاں ہے... اصلی باپ... ظالم خان...''

اس نے مجھے دھکا دیا اور ایک گالی دی۔ ''سالے... نشے میں ہے... ابھی اتارتے ہیں تیرا نشہ... کون ہے تو...؟''

''میں بزدل ہوں۔'' میں نے اپنا کارڈ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ''تم بہت بہادر ہو تو...'' جو چیلنج میں نے اسے دیا، وہ لکھا نہیں جا سکتا۔

اس نے کارڈ کو پکڑ کے دیکھا اور ایک دم اس کو جیسے دن میں تارے نظر آ گئے۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ... مذاق کی عادت ہے آپ کو... پہلے ہی فرما دیتے جناب... آپ بیٹھو... میں اپنے لیے دوسری کرسی منگواتا ہوں۔''

میں نے کارڈ واپس جیب میں رکھ لیا۔ ''میں انچارج

کے کمرے میں بیٹھوں گا۔ اسے بتاؤ کہ تمہارا سالا آیا ہے۔“
”جی... جی سر۔“ اس نے موبائل فون اٹھالیا۔
”آپ تشریف رکھو، میں چائے بھیجتا ہوں۔“
”سموسے ضرور کھاتا ہوں میں چائے کے ساتھ...“
رحمدل خاں اس وقت نمودار ہوا جب میں دونوں سموسے نگل گیا تھا۔ ”معاف کرنا دوست! دو دن سے کچھ کھایا نہیں تھا۔“
وہ خفگی کے ساتھ اپنی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ ”حوالات میں بہت کچھ تھا تمہاری خاطر تواضع کے لیے... یار نئی جگہ کچھ تو میری پوزیشن کا خیال رکھنا چاہیے تھا تمہیں۔“
میں نے کہا۔ ”خیال بہت رکھا میں نے... یہ کہا کہ میں تمہارا سالا ہوں... باپ نہیں کہا۔ نئی گاڑی کی مبارک باد دینے آیا تھا۔“
”مجھے پتا چل گیا تھا باہر ہی تمہارے نازل ہونے کا... دیکھو ایس پی آنے والا ہے۔“
میں نے کہا۔ ”آنے دو۔ میں اسے روک تو نہیں سکتا۔“
”لال دین چودھری بہت سینئر افسر ہے۔ تم کام کی بات کرو۔“
میں نے کہا۔ ”اس کے آنے سے پہلے مجھے حوالات میں بند کردو۔ میرے پاس سے چوری کی چار گاڑیاں برآمد ہوئی ہیں۔ روزنامچے میں کچا اندراج بھی کرلو۔“
”یار میں نے کہا نا مذاق کا وقت نہیں ہے۔“
”میں کب مذاق کررہا ہوں۔“ میری بات پوری ہونے سے قبل ہی اس کا موبائل بجا۔ ”ہیلو... یس سر... جی سر... ٹھیک ہے سر۔“ کے سوا اس کے ہونٹوں سے کوئی بات نہیں نکلی۔
”چلو، ان کا وزٹ ٹل گیا کل پر... علاقے میں کہیں دھماکا ہوا ہے۔“
میں نے کہا۔ ”اب تم میری عرض داشت پر غور کر سکتے ہو۔“ میں نے جیب سے گلباز خان کی تصویر نکالی۔ ”اس بندے کا سراغ لگانا ہے۔“
اس نے تصویر کو غور سے دیکھا۔ ”کون ہے یہ... اور اس کا جرم؟“
”یہ کار ڈیلر ہے۔ دبئی سے ری کنڈیشن گاڑیاں منگواتا ہے۔ ایف آئی اے والے بہت اچھی طرح پہچانتے ہوں گے لیکن تم ابھی ان کو درمیان میں مت لاؤ۔ جو ایسی کاروں کی خرید و فروخت کا دھندا کرتے ہیں۔ ان سے معلوم کرو مگر سامنے آئے بغیر... کسی مخبر کے ذریعے جو بھروسے کے قابل ہو۔“
اس نے تصویر میز پر رکھ دی۔ ”کل تک پتا چل جائے گا... پھر؟“
”پھر اسے مجھ سے ملواؤ۔ تھانے میں مگر ایسے جیسے تم مجھے جانتے ہو... میں کاریں چوری کرنے والے ایک گینگ کا رکن ہوں اور گلباز خان کے لیے میرے پاس گاڑیاں ہیں۔ تمہارے بھروسے کا آدمی ہوں۔ یعنی تمہارا حصے دار ہوں۔“
وہ مجھے دیکھتا رہا۔ ”آخر چکر کیا ہے؟“
”ظالم خان... چکر تمہیں چلاتا ہے۔ اس کے ساتھ میری ڈیل ہو جائے۔ وہ مجھ سے سودے کی بات کرے۔ ابھی نہ سہی... بعد میں اپنے شوروم میں... اگر تم مجھے کسی حقیقی چور سے ملوادو۔ دو چار گاڑیوں کا بتادو جو حال ہی میں اٹھائی گئی ہوں... مجھے بریف کردو کہ اس سے کیسے ڈیل کروں۔“
”یار تم یہ کیوں نہیں بتاتے کہ اس کی ضرورت کیا ہے؟“
میں نے اسے مختصراً ضرورت بھی سمجھادی۔ ”میں اس شخص سے ذاتی مراسم پیدا کرنا چاہتا ہوں۔“
کچھ دیر غور کرنے کے بعد اس نے سر ہلایا۔
اس نے مجھے ایک جگہ کا پتا سمجھایا... اور کسی دل مراد راجا سے کس طرح ملنا ہے... اتنی تفصیلات میرے لیے کافی تھیں۔ وہ ہر برے وقت میں میرے کام آتا تھا۔
”تمہیں وہاں جا کے حاجی انور کا حوالہ دینا ہے۔ اپنا نام... ملک مرشد مرزا بتا دینا۔ ٹرپل ایم... اور ہو سکے تو اس حلیے کو بھی تھوڑا بہت بدل لینا۔“
میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ”میں آج ہی ملاقات کرتا ہوں راجا سے... شام کے وقت۔“
تھانے سے باہر آکے میں نے طے کیا کہ اس کارِ خیر کا آغاز مجھے اپنے دوستوں کی مدد سے کرنا چاہیے۔ جو بڑے خلوص کے ساتھ مجھے تاش کے کھیل میں اپنے ہاتھ کی صفائی دکھا کے لوٹتے تھے۔ ایک حکیم تھا۔ صرف نام کا مگر اس نے بتایا کہ وہ اب نیم حکیم ہو گیا ہے کیونکہ اس کی شیر شاہ میں گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس کی دکان کے سامنے ایک نیم کا درخت تھا جس کے نیچے وہ قیلولہ بھی فرماتا تھا اور ضرورت مندوں کو مجرب خاندانی نسخوں سے بھی فیض یاب کرتا تھا۔

محفلِ دوستاں میں اس نے ہنستے ہنستے بتایا تھا کہ اس کی دو بیویوں اور چودہ بچوں کی تعداد سے متاثر ہو کے ایک الو کا پٹھا دوسری شادی کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

حکیم ایک ہمہ صفت شخص تھا۔ سیلف میڈ... وہ بڑے خلوص سے اعتراف کرتا تھا کہ اس نے اپنا کام گاڑیوں کے وھیل کیپ چرانے سے کیا تھا۔ کچھ تجربے کے بعد اس نے سائڈ ویو مرر اتارنے شروع کیے۔

وقت آیا کہ اس نے مزید ترقی کی اور گاڑیوں کے اندر سے ٹیپ ریکارڈر... کیسٹ پلیئر... پھر سی ڈی پلیئر اور بالآخر اے سی نکالنے لگا۔ نئی گاڑیوں میں پورا چینل نکل آتا تھا۔ اور ''جینوئن'' کی تلاش کرنے والا آدھی قیمت میں خوشی خوشی لے جاتا تھا۔ اب حکیم خود شیر شاہ کی ایک دکان کا مالک تھا اور گاڑیوں کے ''جینوئن'' پارٹس بھی ڈیل کرتا تھا۔

حکیم کی دکان پر میں کبھی نہیں گیا تھا۔ اس کی ضرورت مجھے تب پڑتی جب میری اپنی کوئی چھوٹی موٹی کھٹارا کار بھی ہوتی۔ ایک بار صائمہ کے لیے چوری ہو جانے والے سائڈ ویو مرر اس نے گفٹ کر دیے تھے۔ کسی دشواری کے بغیر میں شیر شاہ کی گندی، ڈیزل کی بو میں بسی ہوئی تنگ گلیوں کے پیچ و خم سے گزرتا اس کے اسٹور تک پہنچ گیا۔ حکیم کباڑی اسے کوئی نہیں کہتا تھا کیونکہ وہاں سب کباڑی تھے۔

وہ لنگی میں ملبوس کھڑی چارپائی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے کھلے آسمان کو تک رہا تھا کہ اچانک فوکس میں میرا چہرہ آ گیا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔ ''ابے تو لم ڈھنگ... میری نظر کو دھوکا تو نہیں ہو رہا؟''

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ''نہیں یار! کام سے آیا تھا تیرے پاس۔ کچھ معلومات لینے ان چوری کی گاڑیوں کے بارے میں۔''

''سیدھی بات کرنا سالے کہ کوئی نیچر بنائے گا اپنا... ہمارا فیوچر خراب کرے گا... اچھی یاری ہے۔''

میں نے اسے تسلی دی۔ ''مجھے ایک ماہر چاہیے تالے کھولنے والا۔'' میں نے کاغذ کا ایک پرزہ اس کے حوالے کیا۔ ''اس فلیٹ کی چابی بنا کے لا دے۔''

''یہ بھی کوئی کام تھا۔ تو فون کر دیتا۔ مگر اچھا کیا آج اپنے مزار پر بھی حاضری دینے آ گیا۔ اب چائے پی یہاں کی۔''

کباڑی بازار کی چائے ویسی ہی تھی جیسی ہونی چاہیے مگر اس میں دوستی کا خلوص شامل تھا۔ چنانچہ میں نے اس کی تعریف کی۔ ''دراصل مجھے اور بھی کچھ پوچھنا تھا تجھ سے... یہ جو گاڑیاں چوری ہوتی ہیں۔''

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ''آخر یہ چکر کیا ہے کولمبو... تو ریکارڈ تو نہیں کر رہا کچھ... دکھا مجھے۔''

میں نے ہاتھ اٹھا دیے۔ ''تلاشی لے کر اطمینان کر لے۔ ابے ہم یاروں سے غداری کریں گے؟''

پھر میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ ''مجھے پوری انفارمیشن چاہیے۔ اس سب انسپکٹر سے ملنے جاؤں تو میری پول نہ کھل جائے کہ اسے تو کچھ پتا ہی نہیں۔''

''پھر ٹھیک ہے۔'' وہ بولا۔ ''مگر ایسی جلدی کیا تھی تو گھر بلا لیتا مجھے۔''

''جلدی تھی یار... ایک دو دن میں مجھے گلباز خان سے ملنا ہے۔ وہ تیری بھابی پیچھے لگی ہوئی ہے میرے۔''

وہ ہنسا۔ ''کبھی نہ ہونے والی بھابی بول۔'' حکیم نے کہا۔ جب میں اٹھا تو خاصا پر اعتماد اور مطمئن تھا۔

سب انسپکٹر راجا کے پاس جانے سے پہلے میں نے پتلون قمیص کی جگہ شلوار قمیص پہنی۔ سر پر ایک گول قراقلی ٹوپی رکھی۔ آنکھوں پر زیرو نمبر کے شیشوں والی عینک لگائی اور عہد کیا کہ میں صرف پنجابی بولوں گا۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ راجا مجھے تھانے کے باہر ہی مل گیا۔ میں نے ایک روایتی تربوز جیسی توند والے نصف گنجے سب انسپکٹر کو اندر جاتے دیکھا اور اس سے راجا کا پوچھا تو وہ رک گیا اور مجھے گھورنے لگا۔

''میں ہی راجا ہوں... تو کون ہے؟''

میں نے عقیدت سے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''حاجی انور صاحب نے بھیجا ہے مجھے... ملک مرشد مرزا۔''

اس نے میرے ہاتھ کو نظر انداز کر دیا۔ ''رحمدل خان نے بتایا تھا تیرے بارے میں۔''

''کیا ہم اندر بیٹھ کے بات کر سکتے ہیں؟''

وہ مجھے باہر لے گیا۔ ایک پٹھان کے چائے خانے کے باہر ہم آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ایک بار ناتجربہ کاری کے باعث کرسی نے مجھے گرا دیا۔ پھر میں نے اس پر بیٹھنا سیکھ لیا۔ گاڑھی شیرے جیسی چائے پیتے ہوئے ہم نے مفید کاروباری گفتگو کی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اس وقت میرے پاس کون کون سے ماڈل کی کون سی گاڑی ہے اور میرے ساتھ گروپ میں کون لڑکے ہیں۔

اپنی معلومات کی بنیاد پر میں نے گروپ کے لڑکوں کے نام بتائے۔ ''یہ مردان اور سوات سے بھیجے گئے ہیں... کام

جانتے ہیں۔ دوسرے گروپ کے نام میں نے وہی لیے جو مجھے پہلے سے معلوم تھے۔ یہ حاجی انور کے کارکن تھے اور یہ اطلاعات مجھے ظالم خان نے دی تھیں۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ راجا مطمئن نہ ہوتا۔ اس نے کہا۔ ''ایک ہنڈا سٹی چاہیے۔ سفید آٹومیٹک... بڑے صاحب کے سالے نے کہا ہے۔''

''دیکھتے ہیں راجا جی دو چار دن میں ہو جائے گی انشاءاللہ... یہ بتاؤ گلباز کہاں ملے گا؟''

''کون گلباز... وہ خیبر ایجنسی والا گلباز خان... تم جانتے ہو اسے؟''

میں نے کہا۔ ''اس سے کام کی بات کرنی ہے... سنا ہے کھرا بندہ ہے۔''

راجا نے تائید میں سر ہلایا۔ ''ادھر خالد بن ولید روڈ پر ملے گا۔ خریدار بن کے جانا... پھر میرا حوالہ دے دینا۔''

''تم اسے بتا دینا پہلے سے۔'' میں ہاتھ ملا کے کھڑا ہو گیا۔ ''شام کو چلا جاؤں؟''

''ابھی چلے جاؤ بے شک... میں بتا دوں گا اسے... لیکن وہ یاد رکھنا... سفید ہونڈا سٹی۔''

''راجا جی... اب بڑے صاحب کے سالے کو بول دو کہ گاڑی مل گئی۔ معاملات تم کرنا... میں بیچ میں نہیں آؤں گا۔'' میں نے دوستانہ بے تکلفی اور اعتماد کے ساتھ کہا۔

ایک گھنٹے بعد کسی سے پوچھے بغیر میں نے خالد بن ولید روڈ پر گلباز کو تلاش کر لیا۔ درجنوں شو رومز کے اندر باہر کھڑی ہزاروں گاڑیوں نے سڑک بلاک کر رکھی تھی مگر بادشاہت انہی کی تھی جو نئی پرانی امپورٹڈ اور چوری کی گاڑیوں کو... ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز... کے قول پر عمل کرتے ہوئے بڑی ایمان داری سے زیادہ ایمان دار گاہکوں کو فروخت کر رہے تھے۔ وہ چار چھ اپنے جیسے لوگوں کے غول میں کھڑا گپ لگا رہا تھا۔ تصویر دیکھ لینے کی وجہ سے اس کو شناخت کرنا میرے لیے دشوار نہ تھا مگر شک سے بچنے کے لیے میں نے چند قدم دور کھڑے ایک کاریں صاف کرنے والے سے بلند آواز میں پوچھا۔ ''اوئے، گلباز خان کدھر ہے؟''

ظاہر ہے میری آواز سے گلباز خان کے کان کھڑے ہو گئے۔ لڑکے نے اشارہ کیا۔ ''وہ سامنے... چار خانے کے کرتے والا۔''

میں نے قریب جا کے اس سے ہاتھ ملایا۔ ''مجھے ایک سفید ہونڈا سٹی چاہیے... آٹومیٹک... دو سال پہلے کی... ابھی ہو تو تین سال کی بھی چلے گی۔''

وہ مجھے الگ لے گیا۔ ''لو جی ابھی آئی ہے آپ کی مرضی کی گاڑی... اسے بھی آپ جیسے گاہک کا انتظار تھا۔''

کچھ دور آ کے میں نے آہستہ سے کہا۔ ''مجھے راجا نے بھیجا ہے۔ ایم تھری... ملک مرشد مرزا۔''

اس کا جوش و خروش سرد پڑ گیا۔ ایک اچھے سیلز مین سے وہ فوراً ڈیلر بن گیا۔ وہ مجھے سڑک کے پار ایک ایرانی ہوٹل میں لے گیا۔ اس نے وہی پوچھا جو راجا نے پوچھا تھا اور میں نے جوابات بھی وہی دیے۔ پھر میں نے کہا کہ ''چار گاڑیاں ہیں میرے پاس۔''

''دکھا دو۔'' اس نے سرد مہری سے کہا۔ ''آج کل مندی ہے۔ اخبار والے بہت شور کر رہے ہیں۔ گاہک ڈرتا ہے۔''

''دیکھو نخرے مت کرو میرے ساتھ... سودا کسی اور سے بھی ہو جائے گا میرا... تم اپنا فائدہ دیکھتے ہو تو میں اپنا۔''

وہ سیدھا ہو گیا۔ ''کہاں ہیں گاڑیاں؟''

''کھڑی ہیں کہیں۔ تم بتاؤ کب دیکھو گے... آج رات؟''

اس نے کچھ سوچ کے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے دس بجے آ جاؤ ڈیرے پر۔''

میرے دل کی مراد بر آئی۔ ''پتا سمجھا دو... میں آ جاؤں گا۔''

اس نے اپنا پتا کاغذ کے ایک پرزے پر لکھ کے میرے حوالے کیا۔ یہ بہادر آباد کا ایک فلیٹ تھا۔ گیٹ پر چوکیدار نے مجھے بتایا۔ ''گلباز خان رات کو ملے گا۔''

میں نے کہا۔ ''اس کی فیملی تو ہو گی؟''

''فیملی۔'' اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''جب ایک سال پہلے آیا تھا فلیٹ کرائے پر لینے کے لیے تو بیوی ساتھ تھی۔''

''اب نہیں ہے؟''

''دو تین مہینے سے گاؤں گئی ہے۔ بچہ ہو گا تو واپس آئے گی۔ تم کون ہو اس کے؟''

''میں اس کا رشتے کا بھائی ہوں۔ اُدھر ہی رہتا ہوں بنارس کالونی میں۔ دیکھو اس کو میرے آنے کا مت بتانا، سال بھر پہلے اس نے دس ہزار لیے تھے مجھ سے۔ اب ملتا نہیں۔ مجھے بتایا تھا کہ شادی کرنے گاؤں گیا ہے۔ تم کہہ رہے ہو سال بھر پہلے آیا تو بیوی ساتھ تھی۔ بڑی مشکل سے اس کا پتا ملا ہے۔ میں رات کو چکر لگاؤں گا آج یا کل۔''

چوکیدار نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''ادھار دینے والا بےوقوف ہوتا ہے۔ رونا روتا ہے تمہاری طرح۔''

میں نے مظلوم صورت بنالی۔ ''بالکل ٹھیک کہتے ہو تم... اب مجھے ماں کے علاج کے لیے پیسا چاہیے۔ اس کے آپریشن کے لیے... اپنی ٹیکسی بیچ کے رکشا لیا ہے پھر بھی کم ہے... اسے پتا چلا تو وہ پھر بھاگ جائے گا۔''

چوکیدار کو میری مظلومیت پر ترس آرہا تھا۔ ''مجھے کیا ضرورت ہے اور ملاقات کہاں ہوتی ہے اس سے میری... رات کو ہوتا ہے دوسرا چوکیدار۔''

میں نے کہا۔ ''اسے بھی مت بتانا... بڑی مہربانی ہو گی تمہاری۔''

یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ مجھے کام کی بہت سی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ یقیناً اس کا کرمنل ریکارڈ بھی ہوگا اور صرف پولیس ہی نہیں ایف آئی اے اور موٹر رجسٹریشن والے بھی اس سے پورا تعاون کر رہے ہیں۔ غزالہ جیسی لڑکی کا اس کے ساتھ کیا مستقبل ہوسکتا تھا۔

☆☆☆

تجربے نے مجھے اکیسویں صدی کے عشق کی وہ ٹیکنالوجی سکھا دی تھی جس سے مجنوں اور فرہاد ناواقف رہے۔ ایک ریگستانوں میں بھٹکتے رہے اور دوسرے کو کوالیفائڈ انجینئر ہونے کے باوجود دودھ کی نہر نکالنے کے چکر میں ڈال دیا گیا کیونکہ اس زمانے میں یہ ملک پلانٹ وغیرہ نہیں تھے جو کنٹریکٹ پر یہ کام بہ آسانی کر دیتے۔

ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ بیک وقت میری مستقل اور قائم مقام محبوبہ کی گوٹ پھنس گئی تھی اور میں صورتِ حال کو پوری طرح ایکسپلائٹ کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ صبر کی حکمت عملی... جس کا پھل اب بھی میٹھا ہوتا ہے۔ میں نے ویک اینڈ پر اداسی، بےصبری سے گریز کیا اور فون بند کیے اپنے مرقد میں لیٹا رہا۔ اس سے دو شر پسند عناصر نے فائدہ اٹھایا۔ پہلی دستک پر میں دل کی دھڑکن دبا کے دوڑا تھا کہ دروازہ کھلتے ہی اس حسنِ دلآرام کی دید ہوگی جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا لیکن میری امیدوں کا یونگ اس وقت کریش کر گیا جب میرے سامنے دنیا کی سب سے ناپسندیدہ صورت آئی۔

میرے یہودی صفت اور جوکر صورت مالک مکان نے بےخبری میں حملہ کر کے نہ صرف مجھ سے ہاتھ ملا لیا بلکہ میرے گلے بھی لگ گیا۔ ''ارے اپنا بزدل بھائی... آپ کے درشن کو اتنا جمانہ ہوا کہ لگتا ہے بچپن میں دیکھا تھا آپ کو...''

میں نے کہا۔ ''بچپن میں پھر دیکھ لو... مگر کرائے کی بات مت کرنا۔ دل کا ایک دورہ آج پڑ چکا ہے مجھے... دوسرے سے جانبر نہ ہوا تو قتل کا کیس بن جائے گا تم پر...''

وہ ڈھٹائی سے بیٹھ گیا۔ ''بات بالکل نئیں کرے گا بزدل بھائی... اپن بھی کوئی... بہادر نہیں ہے، یہ حساب دے کر چلا جائے گا۔''

مجبوراً میں نے ایک فٹ لمبا اور تین انچ چوڑا اعمال نامہ لے لیا۔ ''جو اس میں ہے اپنی جگہ... لیکن ایک حساب میرا بھی ہے... تم نے مالک مکان کی حیثیت سے مجھے جو ذہنی اذیت دی اور میری زندگی کو خطرات سے دوچار کیا، جو ذمے داریاں نبھانے سے قاصر رہے... ان کا خمیازہ یا ہرجانہ قانون کے مطابق گیارہ لاکھ پچاس ہزار دو سو گیارہ روپے بنتا ہے۔''

''ارے بزدل بھائی! اپن کا دل تو بجلی کے نظام کا مافک چل رہا ہے اور لوڈ مت ڈالو... لائف کا فیوز اڑ جائے گا، آپ بس ایک مہربانی کرو... حساب کرو... اپنا پراپرٹی ٹیکس سالا کینسر کا مافک بڑھ رہا ہے۔ اس کو خلاص کرا دو... جان پہچان ہے تو حساب برابر۔''

میں نے چٹکی بجا کے کہا۔ ''یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اب مجھے گولی کھا کے فوراً سونا ہے۔''

گولی میں نے ایسی دی تھی کہ وہ فوراً دفع ہوگیا مگر پھر دروازہ بجا اور میں نئی امید کے ساتھ دوڑا تو استاد بجلی کی شکل دیکھ کے مجھے نیا شاک لگا۔ اس نے مصافحہ کر کے مجھے مبارک باد دی۔ ''آج آپ کی پھٹ پھٹی کو اسٹارٹ کر ہی دیا... آخر استاد بجلی نام ہے میرا بھی۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں... دو سال میں پرزے جوڑ کے موٹر سائیکل بنا لینا زیادہ آسان تھا میرے لیے۔''

''لو جی اپنے بزدل صاحب! آج میں نے ٹرائی کیا۔''

''کہاں؟ موت کے کنوئیں میں... سرکس لگا ہوا ہے آج کل۔''

وہ کھی کھی کر کے ہنسا۔ ''ادھر بھی کر سکتا ہوں، دو سال مقصود ملک کے مقابلے پر موت کے گولے میں موٹر سائیکل چلا چکا ہوں۔ ٹھٹھہ کی طرف سو کلومیٹر پر دوڑا کے دیکھا... واہ جی وا... ہوا کے گھوڑے والی بات تھی۔ آپ بے شک دنیا کا چکر لگا لو... تمام پرزے ایک دم جینوئن ڈالے ہیں... خرچہ ہوا صرف سینتیس ہزار... نیچے ریڈی کھڑی ہے۔''

سینے پر ہاتھ رکھ کے میں نے ایک لمبی سانس لی۔ ''استاد بجلی! جب میری جوانی تھی تو میں نے یہ سواری تمہیں دی تھی لیکن اس کے ٹھیک ہوتے ہوتے میرا حال خراب ہو گیا۔ اب دل کا عارضہ لاحق ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر نے صاف کہا ہے کہ وصیت کر لو... تو اب تم یہ نایاب تاریخی موٹر سائیکل نیلام کے لیے رکھ دو... یہ نوادرات میں شمار ہوتی ہے... میں ریسرچ سے ثابت کروں گا کہ دوسری جنگ عظیم میں اسے فیلڈ مارشل منٹگمری نے استعمال کیا تھا... تمہیں مل جائیں گے قدر دانوں سے ایک لاکھ ڈالر۔''

استاد بجلی کا چہرہ موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ کی طرح روشن ہوگیا۔ ''کیا کہہ رہے ہو بزدل صاحب؟''

''سچ کہہ رہا ہوں استاد بجلی... جب ہم نہ ہوں گے تو ہمیں یاد کرو گے۔''

استاد بجلی جب گیا تو اس کی دونوں آنکھوں میں ڈالروں کی چمک تھی۔ آج میں نے زندگی کا روگ بن جانے والے دو مسائل سے جان چھڑالی تھی۔ ایک مالک مکان اور ایک استاد بجلی... شگون اچھا تھا تیسری بار دروازے پر توپ خانے کے حملے کے ساتھ ہی ایک زنانہ چیخ سنائی دی تو میرے دل کی مراد بر آئی۔ گولہ باری صائمہ کر رہی تھی۔ غزالہ پہلی بار آئی تھی چنانچہ ناتجربہ کاری کے باعث اس نے گھنٹی بجانے کی غلطی کی... ہر نئے ملاقاتی کی آمد کی خبر مجھے بہرحال مل جاتی تھی۔ گھنٹی تو بہت بجتی تھی مگر بٹن سے لگنے والے شاک پر ملاقاتی جو آہ بلند کرتا تھا وہ صاف سنائی دیتی تھی۔

صائمہ نے ایک مثالی مشرقی بیوی کی طرح مجھ پر چڑھائی کی۔ ''آخر یہ کیا ہے... سارا دن سے فون کیوں بند ہے؟''

میں نے کہا۔ ''عزیزہ! میری کیا اوقات ہے... یہاں بڑے بڑوں کی بولتی بند ہوجاتی ہے۔''

اس نے میری وضاحت سنی ہی نہیں۔ ''اور یہ پھر بنا دیا گھر کو کباڑ خانہ... دو دن پہلے ہی سب ٹھیک کر کے گئی تھی۔''

میں نے غزالہ کو ایک کرسی پر سے کتابیں، رسالے، اخبار ہٹا کے بیٹھنے کی جگہ پیش کی۔ ''یہ گھر کہاں ہے جان من... یتیم خانہ... کباڑ خانہ... غریب خانہ بھی نہیں ایک لاوارث کا ٹھکانا ہے... اسے ایک مستقل کیئر ٹیکر کی ضرورت ہے۔''

غزالہ مسکرائی۔ ''ہو جائے گا بہت جلد اس کا بندوبست... مگر یہ بتاؤ تم یہاں کیوں روپوش ہو؟''

صائمہ نے کہا۔ ''ہر جگہ معلوم کر لیا... پھر خود آنا پڑا...''

''وہ دراصل... فون کی بیٹری فوت ہوگئی تھی... اور چارجر ملا نہیں۔''

صائمہ نے تکیے کے نیچے سے موبائل فون نکال لیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ کال ہسٹری دیکھے گی اور ایسا ہی ہوا۔ اس نے ایک منٹ بعد فون میرے سامنے پھینک دیا۔ ''جھوٹے، ابھی دس منٹ پہلے تک کالیں کی ہیں تم نے... اور بیٹری آدھی ہے۔''

''معزز خواتین! کیا ہم کوئی اور بات نہیں کر سکتے... پیار محبت کی۔ آپ کے آنے سے پہلے میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا خودکشی کے بارے میں۔ غریب کی بھی کوئی زندگی ہے... جیب میں زہر کھانے کے لیے پیسے نہیں... پکا کے محبت سے کھلانے والی کوئی نہیں۔''

غزالہ ہنس پڑی۔ ''چلو اب ڈراما بند کرو... ہم لے جا رہے ہیں تمہیں ڈنر پر۔''

صائمہ مسکرائی۔ ''کیا کہا تھا میں نے؟ ملک کے نامور صحافی کیا فرمائیں گے... میں تو رگ رگ سے واقف ہوں۔''

غزالہ نے مطلب کی بات چھیڑنے میں دیر نہیں کی۔ ''جب تم نہیں آئے تو ہمیں آنا پڑا... دو دن میں کچھ کیا تم نے... ڈیڈی کا بھی فون آیا تھا۔''

''سر سے کفن باندھ کے میں اپنے رقیب روسیاہ سے ملنے گیا تھا اور واپسی میں اپنے مدفن کے لیے گورکن کو آرڈر بھی دے آیا تھا۔ اس نے پوچھا کہ غزالہ کیا لگتی ہے تمہاری اور میں چونکہ... حق گوئی و بےباکی آئین جواں مردی... پر یقین رکھتا ہوں میں نے بتا دیا کہ وہ میری قائم مقام محبوبہ ہے... فوری طور پر اس کے پاس آلۂ قتل دستیاب نہیں تھا مگر اس نے بتا دیا ہے کہ دبئی سے وہ نئی ایجاد ہونے والی رائفل سے ایک گولی چلائے گا جو میزائل کی طرح اپنے ہدف کا سراغ لگاتی عین میرے دل میں پیوست ہوجائے گی... خواہ میں قطب شمالی پر جا بیٹھوں۔ وہ ایک ماڈرن رقیب ہے، چنانچہ آج تمہارے ساتھ میرا یہ آخری طعام ہوسکتا ہے۔''

''کتنی فضول چلتی ہے تمہاری زبان... تمہارے قلم کی طرح۔'' صائمہ نے کلفٹن کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کے کہا۔

''سویٹ ہارٹ! آج ہی تو موقع ملا ہے مجھے سودے بازی کا... ہمیشہ تم ایکسپلائٹ کرتی رہی ہو۔''

''بڑے کمینے ہو... ہر معاملے میں تمہارا ساتھ دیا ہے میں نے۔'' صائمہ بولی۔''کیا کچھ نہیں کیا ہے تمہارے لیے۔''

''سوائے شادی کے... تو اب مجھے موقع ملا ہے ایک ڈیل کا... مائی ڈیئر غزالہ! تم ڈیل کرا سکتی ہو۔''

''کیسی ڈیل؟'' غزالہ نے مینیو کارڈ کا مطالعہ کرتے ہوئے کہا۔ آرڈر صائمہ نے دیا۔

ویٹر کے جانے کے بعد میں نے کہا۔''اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ میں تمہاری شادی منسوخ کرا سکتا ہوں۔ تم بدلے میں صائمہ کی شرط منسوخ کرا دو۔''

غزالہ نے فوراً ہاتھ آگے بڑھا دیا۔''منظور۔''

صائمہ نے خفگی سے کہا۔''غزالہ! میری مرضی کے بغیر تم نے کیسے شرط مان لی؟''

''اب تو مان لی۔'' غزالہ نے کہا۔

میری دو دن کی کارکردگی نے انہیں متاثر نہیں کیا۔ ''ابھی صرف یہ معلوم ہوا ہے کہ اس کا بزنس غیر قانونی ہے۔''

میں نے اسے گلباز خان کے فلیٹ کی چابی دکھائی۔ ''کل صبح جب گلباز خان نکل جائے گا تو صائمہ برقع اوڑھ کے اندر جائے گی اور فلیٹ کھولے گی۔''

صائمہ کی صورت پر کچھ پریشانی نمودار ہوئی۔''اور کسی کو شک ہو گیا... پھر؟''

''گیٹ پر چوکیدار نے مجھے روک لیا تھا کسی برقع پوش کو وہ نہیں روک سکتا۔''

''میرا مطلب تھا پاس پڑوس میں۔''

''ان سے تم خود ملو گی۔ خود کو گلباز خان کی بیوی کے طور پر متعارف کراؤ گی۔ اگر ممکن ہو تو کہیں سے کوئی ڈریس لے لینا۔ جیسا نئی دلہن پہنتی ہے۔''

''وہ میں لا دوں گی... میری ایک سہیلی کی گزشتہ مہینے شادی ہوئی تھی۔'' غزالہ بولی۔

''ویری گڈ... تم سب کو بتاؤ گی کہ گلباز خان تمہارا شوہر ہے۔ تمہاری دس دن پہلے شادی ہوئی ہے پشاور میں... ساتھ والے فلیٹوں کی خواتین میں بڑی سنسنی پھیلے گی کیونکہ وہ کچھ عرصے پہلے بھی ایک بیوی کو دیکھ چکی ہیں۔ وہ آٹھ مہینے سے زیادہ اس فلیٹ میں رہی تھی اور اب انہیں یہی معلوم ہے چوکیدار کی طرح... کہ وہ ڈلیوری کے لیے ماں باپ کے گھر پشاور گئی ہے... جتنا عرصہ وہ یہاں رہی اس کے سب سے نہ سہی کسی ایک سے زیادہ مراسم ہوں گے۔ اکیلی عورت تھی۔ نئی دلہن تھی۔ ہر پڑوسن کو اشتیاق ہو گا ملنے کا... اور اسے وقت گزارنا مشکل ہو گا تو وہ کسی سے زیادہ ملتی ہو گی۔ جس سے بنی ہو گی... تمہیں اس کے بارے میں خاصی انفارمیشن مل سکتی ہے... کوئی پڑوسن لگائی بجھائی کرنے والی اور ٹوہ لینے والی ہو گی۔ وہ سب جانتی ہو گی اور تمہارے سامنے سنسنی خیز انکشافات کرے گی۔ تمہارے بارے میں بھی بہت کچھ پوچھے گی۔ ماشاء اللہ سے تم ذہین ہو... یہ رول کامیابی سے نبھا سکتی ہو۔''

صائمہ نے جو بڑے غور سے سن رہی تھی اتفاق میں سر ہلایا۔''یہ میں کر سکتی ہوں... غزالہ کے لیے۔''

''میں بھی جو کر رہا ہوں غزالہ کے لیے ہی ہے... کاش ہم ایک دوسرے کے لیے بھی کچھ کرتے۔'' میں نے کہا۔

''اگر گلباز خان آ گیا... پھر... کسی بھی کام سے؟''

میں نے کہا۔''یہ رسک تو لینا پڑے گا تمہیں۔ وہ آدمی خطرناک ہے اور تم اکیلی... بھیڑیے کے قبضے میں بھیڑ۔''

صائمہ نے کھانا چھوڑ دیا۔''میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی۔''

''بس... دوستی کا جذبۂ خلوص؟ دوستی میں قربانی دینے کا وقت آیا تو...''

''حد کرتے ہو تم بھی... اسے قربانی کہتے ہو؟ تم کچھ نہیں کرو گے... تم ساتھ چلو... اندر چھپ کے بیٹھے رہنا۔''

میں نے کہا۔''آئی ایم سوری... دن کا چوکیدار مجھے پہچان گیا ہے۔ وہ مجھے کہاں جانے دے گا اور میرا نہ ہونا ہی بہتر ہے۔ اس کا قتل ہو جائے گا میرے ہاتھوں۔''

''مجھے اتنی بے غیرتی کے ساتھ جھونک رہے ہو خطرے میں۔'' صائمہ بگڑ گئی۔ غزالہ کا چہرہ بھی اتر گیا۔

میں نے ہنس کے کہا۔''لیڈیز... چیئر اپ... آپ کا یہ مشترکہ پرستار بزدل ہے مگر بے غیرت بہرحال نہیں ہے۔ میں جو سارا دن باہر رہوں گا تو کیا یہاں لمبی تان کے سوتا رہوں گا۔ میں اس بات کو یقینی بناؤں گا کہ گلباز کسی صورت دن میں گھر جانے کا نہ سوچے۔ خواہ مجھے سارا دن کے لیے اسے حوالات میں بند کرانا پڑے... تمہارے لیے میں سب کچھ کر سکتا ہوں تو میرے لیے رحمدل خان بہت کچھ کر سکتا ہے۔''

ان دونوں کے چہرے کی رونق لوٹ آئی۔''ان معلومات سے کیا ہو گا؟'' غزالہ بولی۔

''یہ معلومات کی نوعیت پر ہے۔ ہو سکا تو میں تمہیں

ایک ایف ایم مائیک دوں گا۔ چھوٹا سا ہوتا ہے۔ تم لاکٹ کی طرح گلے میں پہن سکتی ہو۔ اس سے ہر آواز دو ڈھائی سو میٹر کے دائرے میں نشر ہو جاتی ہے۔ نیچے کسی گاڑی کے عام ریڈیو پر اسے سنا جا سکتا ہے اگر ایف ایم بینڈ کو ٹیون کیا جائے تو کہیں نہ کہیں آواز آ جائے گی۔ پھر وہ آواز ریکارڈ بھی ہو سکتی ہے۔''

غزالہ بہت پرجوش نظر آنے لگی۔''یہ تو بالکل فلمی قسم کی سراغ رسانی ہے... حالانکہ تم ہو صحافی۔''

میں نے عاجزی سے کہا۔''خاتون! زمانہ سخت قدر ناشناس ہے...'' میں نے آہ بھر کے صائمہ کی طرف دیکھا۔''ورنہ ایسا ہمہ صفت شخص ٹارچ یا لیزر لائٹ لے کر بھی تلاش کرو تو نہیں ملے گا۔''

صائمہ مسکرائی۔''اپنی تعریف میں قصیدہ راستے میں پڑھنا۔ اب چلو ورنہ ہوسٹل کی وارڈن سے بک بک ہو گی۔''

''آج تو میں اوپر سے سڑک پر پھینک دوں گی اس چوہیا کو۔'' غزالہ نے مردانہ اسٹائل میں غیر موجود مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔

یہ غزالہ کی گاڑی تھی جس میں مجھے مؤدبانہ سر جھکا کے نہیں بیٹھنا پڑا۔ انہوں نے مجھے راستے میں روزنامہ ''حقیقت ساز'' کے دفتر کی سیڑھیوں کے سامنے اتار دیا۔ توپ صاحب بڑے انہماک سے ایک باتصویر فلمی رسالے کی رنگین تصویر پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔

میں نے تصویر کو دیکھ کے کہا۔''یہ تو خیر سے اپنے پیارے پاکستان کا نام روشن کرنے والی وینا ملک ہے۔''

''تم نے اس جان لیوا حسینہ کو بنظر غائر نہیں دیکھا برخوردار... ورنہ بڑے چشم کشا انکشافات ہوتے گویا۔''

''آپ پر تو چودہ طبق روشن ہو رہے ہیں... اس پر آپ روشنی ڈالیے۔''

''بھئی واقعی تم اتنے کور چشم اور کوتاہ بیں وغیرہ ہو گویا... تمہیں اس کی مماثلت کسی میں نظر نہیں آتی؟''

میں نے اپنی کوتاہی کا اعتراف کر لیا۔''میری دور کی نظر خراب ہے بچپن سے... جو آپ کی بچپن میں ہوتی۔''

''میاں بزدل! بخدا یہ اپنی عزیزہ صائمہ کا نقش ثانی لگتی ہے... بلکہ وہ اس کا نقش ثانی ہے گویا۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔''یہ آپ صائمہ کی کردار کشی کر رہے ہیں... خدا نہ کرے۔''

''یہ خدا کر چکا۔ اور ماتم تمہاری عقل پر کر رہے تھے ہم کہ جب نعم البدل موجود ہے تو تم نے اس دگنے وزن کی غزالہ کو قائم مقام محبوبہ کی جگہ کیوں دی؟ لازم تو یہ تھا کہ تم اصل محبوبہ اس دختر وطن وینا ملک کو مقرر کرتے... عزائم ضرور بلند ہونے چاہئیں برخوردار...''

''اب مجھے آپ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دینا چاہیے۔ آپ واجب القتل ہو چکے۔''

انہوں نے رسالہ بند کیا۔''قتل تم بھی کر دینا برخوردار... اس سے پہلے نہ جانے کس کس نے کئی بار کیا... لیکن پہلے یہ فرماؤ کہ آج مشہور کی مرغی نے کون سا انڈا دیا ہے؟'' وہ بلبخ کی طرح ہنسے اور گلوری کے اسباب سامنے رکھ لیے۔

میں نے جیب میں سے کاغذ کا پرزہ نکالا۔''عرض کیا ہے بعوض ایک ہزار نقد سکہ رائج الوقت کے۔''

''آج تو برخوردار معاشی حالت اپنی ملک سے زیادہ دگرگوں ہے گویا... ہم یہ کر سکتے ہیں کہ شیروانی ہی نہیں پاجامہ بھی اتار دیں۔''

میں نے کہا۔''لاحول ولاقوۃ... آپ کو لباس قدرت میں دیکھ کے ہم کیا کریں گے؟''

''میاں بزدل! فقیر کے جبہ و دستار کے عوض جو مل جائے وہی غنیمت گویا ہزار نقد تو ہیں نہیں... ان کو بیچ دینا۔''

میں نے کہا۔''آپ ذرا اِدھر تشریف لائیے۔ ایک منٹ کے لیے۔''

توپ صاحب نے کچھ حیران ہونے کے باوجود میری یہ درخواست قبول کی۔ میں نے ان کی کرسی کے قریب جا کے سیٹ اٹھائی اور اس کے غلاف میں ہاتھ ڈالا۔ وہ ''ہائیں ہائیں یہ کیا نامعقولیت ہے گویا۔'' کرنے لگے مگر تب تک میرے ہاتھ میں ہزار ہزار کے دو نوٹ آ چکے تھے۔

میں نے کہا۔''شرافت اور انصاف کے اصول کے مطابق... میں صرف ایک رکھتا ہوں قطعے کے لیے... دوسرا کالم کا معاوضہ۔''

انہوں نے ایک آہ سرد بھری۔''سارا مزہ تو غارت کر دیا تم نے گویا۔''

میں آداب بجا لا کے سیڑھیاں اتر گیا۔

☆☆☆

ساڑھے دس بجے میں نے صائمہ کو جائے واردات سے سو گز کے فاصلے پر گاڑی روکنے کے لیے کہا۔''نورِ چشم... یہ ہیں وہ فلیٹس... یہاں سے ہمارے راستے جدا ہوتے ہیں۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے اسی صدی میں۔ ورنہ گورِ

غریباں میں لیٹ کر بقول شاعر... ہم انتظار کریں گے ترا قیام تک۔"

صائمہ نے صورتِ حال کا جائزہ لے لیا تھا۔ "گاڑی لے جاؤں اندر۔"

"لے جاؤ... تمہیں کون روکے گا۔ دربان کی نظریں خیرہ ہوجائیں گی۔"

"اچھا چلو اترو۔ تم گھر پر ہی رہنا۔ کام جلدی ہوگیا تو میں نکل آؤں گی۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نظر رکھوں گا اس رقیب روسیاہ کی نقل و حرکت پر۔ اسے ادھر آنے سے بھی تو روکنا ہے۔ ظالم خان سے کہوں گا کہ اسے رات کو مہمان رکھے۔ تم فون کردینا نکلنے سے پہلے۔"

میں ایک سائن بورڈ کے پیچھے سے صائمہ کی کار کو فلیٹوں کے اندر جاتا دیکھتا رہا۔ حسبِ توقع کسی نے اسے روکا نہیں۔ اگر مکینوں کے سوا کسی کو اپنی کار اندر لانے کی اجازت نہ ہو تب بھی دن میں کچھ رعایت ہوتی ہے۔ اور صائمہ تو صائمہ تھی اسے کون روکتا۔

گلباز خان کو میں نے دس منٹ پہلے ہی باہر آتا دیکھا تھا۔ خالد بن ولید روڈ کے شوروم عام طور پر بارہ بجے دوپہر کے بعد ہی کھلتے ہیں۔ شوروم کے ملازم کچھ پہلے آکے گاڑیاں ترتیب سے لگانے اور جھاڑ پونچھ کے چمکانے میں لگ جاتے ہیں۔ ابھی میرے پاس خاصا وقت تھا مگر میں اس بات کا یقین کرلینا چاہتا تھا کہ وہ شوروم ہی گیا ہے۔ ایسا نہ ہو پیچھے کسی دکان تک گیا ہو اور لوٹ آئے۔ آدھے گھنٹے تک میں گیٹ پر نظر جمائے کھڑا رہا۔ خدانخواستہ وہ لوٹ آتا تو میں اسے کسی بہانے سے روکتا اور صائمہ کو خطرے کا سگنل دے دیتا۔ وہ نیچے اتر کے کچھ دیر اپنی گاڑی میں بیٹھتی یا باہر نکل آتی اور دوبارہ اس وقت جاتی جب آل کلیئر کا سگنل ملتا۔ یہ متبادل سیکیورٹی کا نظام تھا جس پر میں اسے بریف کرچکا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ نصف شب کے بعد ہر ایس ایچ او کی طرح تفتیش کے عمل کی ذاتی نگرانی کرکے رات دو تین بجے سونے گھر جاتا ہوگا۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہ دوپہر سے پہلے ہی اٹھتا ہوگا۔ بیوی کے سامنے اسے بلیک میل کرنا آسان ہوتا تھا۔ جب میں اس کے گھر پہنچا تو وہ سو کے اٹھا ہی تھا۔ حسبِ توقع اس نے کہا۔ "بس نظر آگئی آج تیری صورت... اب دن برا ہی گزرے گا۔"

اس کی بیوی نے مجھے خوش آمدید کہا۔ "بھائی بہت دن بعد آنا ہوا۔ ناشتا کروگے نا؟"

"دوبارہ کروں گا۔ آنے سے تمہارے اس مجازی خدا نے منع کر رکھا تھا مگر میں نے بھی آج کہا کہ بہن بھائی کی محبت کے درمیان کوئی دیوار نہیں بن سکتا۔ قسم اللہ کی خون خراب ہوجاتا۔ چھری سے قتلِ عام کردیتا۔"

وہ ہنسنے لگی۔ "اور میرا کیا ہوتا بھائی؟"

"یہ سالا سوچتا بعد میں ہے... کرتا پہلے ہے سکھ کی اولاد..." ظالم خان بولا۔

"تمہارے لیے اس سے لاکھ درجہ بہتر مل جاتا بہنا... یہ بندر کا بچہ کیا چیز ہے۔"

"میرا خیال تھا کہ اب تک تو اس پٹھان کی گولی کا نشانہ بن چکا ہوگا۔" وہ بولا۔

میں نے بہتر سمجھا کہ ناشتے کی میز پر ہی بات کی جائے۔ "ظالم خان... آج تو اسے اپنا مہمان بنالے۔ شام کے بعد سے رات دس بجے تک کے لیے۔"

ظالم خان نے شکایتی نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ "دیکھا تم نے اس سالے کو... مجھ سے غیر قانونی کام کرائے گا اور پھر لکھ دے گا میرے ہی خلاف..."

میں نے کہا۔ "چھوڑ ظالم خان... تم تو بادشاہ لوگ ہو۔ الزام کوئی نہیں لگانا... بس روکنا ہے چار چھ گھنٹے... پھر بے شک سوری کہہ کے چھوڑ دینا کہ غلط فہمی ہوگئی تھی۔"

"اب اس کا مقصد بھی بتادیں آپ تو بڑی عنایت ہو۔" وہ بولا۔

"اب تجھ سے کیا پردہ دوست... میں یہ وقت اس کے گھر میں گزاروں گا۔ ایسے کہ اسے پتا بھی نہیں چلے گا۔ ایک تنکا ادھر سے ادھر نہیں ہوگا۔ بس جو انفارمیشن چاہیے مجھے وہ کچھ تو صائمہ اکٹھی کررہی ہے اس وقت۔" میں نے گھڑی دیکھی۔

"کیا مطلب؟ ایک ڈاکٹر کو بھی لگا دیا اپنی لائن پر... نصیب پھوٹ گئے اس کے۔"

"جیسے میری بہن کے پھوٹے... اب کون کہہ سکتا ہے کہ یہ خوش نہیں... بڑی صابر شاکر قوم ہوتی ہے بیویوں کی۔"

اس نے پوچھا۔ "وہ کیسے گئی اندر؟ تالا توڑ کے؟"

"چابی تھی اس کے پاس... جیسے میری تقدیر کی چابی ہے اس کے پاس... فنکار ہے وہ بھی برادرِ ان لا۔"

"اب مجھے تو جانا ہے ڈیوٹی پر۔"

"مجھے وہاں ڈراپ کردینا۔ خالد بن ولید روڈ پر... اور شام کو ایسے وقت میں اٹھانا میرے رقیب روسیاہ کو جب

میں اس کے ساتھ ہی ملوں... تین بجے کے بعد۔ میں اسے لنچ بھی کرادوں گا۔"

اس کی بیوی نے کہا۔ "مجھے نہیں بتاؤ گے بھائی یہ کیا اسٹوری ہے؟"

میں نے سر کھجا کے کہا۔ "یوں سمجھو بہنا... کہ اسٹوری جاسوسی کی ہے... پاکیزہ بہنوں کے لائق نہیں۔"

وہ دن بڑا صبر آزما تھا۔ میں، گلباز خان کو ایک بجے ملا۔ وہ حسبِ معمول اپنے ہم پیشہ لوگوں کے ساتھ گپ لگا رہا تھا۔ "ہاں یارا... لگتا ہے کوئی اچھی خبر ہے تمہارے پاس۔"

"بالکل ہے... شام تک ملے گی... تم نے جس سفید ہونڈا سٹی کے لیے کہا تھا۔"

"اچھا۔" وہ خوش ہوا۔ "کہاں ہے... ماڈل کون سا ہے اور قیمت۔"

"شام تک کنفرم ہوجائے گی قیمت بھی۔" میں نے کہا۔

ان پروفیشنل کار ڈیلرز کی صحبت میں ایک دن گزارنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ صائمہ کی طرف سے ایک بلینک کال مجھے بہت پہلے موصول ہوچکی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہی ہے۔ میں گلباز خان کو کھانے کے لیے لے گیا اور اسے اپنے بارے میں جھوٹ سچ سے بہلاتا رہا۔ شام چار بجے تک صائمہ کی طرف سے اور کوئی کال نہ ملنے کا مطلب تھا کہ وہ مصروفِ عمل ہے۔

یہ کال ساڑھے چار بجے موصول ہوئی۔ اس نے کہا۔ "میں نکل آئی ہوں۔ پریس کلب آجاؤں؟"

میں نے صرف ایک لفظی جواب دیا۔ "یس۔"

تقریباً اسی وقت ایک کار سے اترنے والے دو شریف صورت اور بے ضرر نظر آنے والے گلباز خان کو بلا کے ایک طرف لے گئے۔ میں نے انہیں پروفیشنل اسٹائل میں گلباز خان کو گاڑی میں ڈال کے لے جاتے دیکھا۔ سب کے ساتھ اظہارِ حیرانی و پریشانی کا ڈراما رچانے کے بعد میں نے پریس کلب کی راہ لی جہاں صائمہ مجھ سے پہلے موجود تھی اور میرے ایک صحافی دوست سے حالاتِ حاضرہ پر گپ شپ لگا رہی تھی۔ اسے یہ بتا رہی تھی کہ آج سارا دن اس نے کیسا مشکل آپریشن کرتے گزارا۔ یہ بات سو فیصد درست تھی۔ کیونکہ اس نے بھی سرجیکل آپریشن نہیں کیا تھا۔

میں نے کہا۔ "صائمہ! میں جذباتی ہورہا ہوں۔ اور یہ جگہ جذبات کے مظاہرے کے لیے قطعی نامناسب ہے۔"

وہ خوش تھی۔ "کلفٹن چلتے ہیں۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔ "سمجھو دو گھنٹے ہیں میرے پاس... چلو۔"

ساحل کی بھیگی رات پر شام کی نمی سے بوجھل ہوا میں اس کے جوتے اٹھا کے چلنا ایک رومانٹک تجربہ تھا جو میں پہلے بھی کرچکا تھا۔ تاہم دیکھنے والے نئے تھے اور ایک روایتی فرمانبردار شوہر کے جذبات پر اپنے تبصرے دیے جاتے تھے۔ سالا زن مرید... ابھی نئی نئی شادی ہے نا... اِسے سب کو کہنا پڑتا ہے نکاح کے بعد رسموں میں کہ بیوی آنکھیں کھولو میں تمہارا غلام... تمہاری جوتیاں اٹھاؤں گا... ایسے لوگ بعد میں بچے اٹھائے پھرتے ہیں... میں نے عاشقانہ فراخدلی کے ساتھ مسکرا کے سب سنا۔

"اس کی بیوی کا نام تھا نورجہاں... مجھے ایک پڑوسن نے بتایا۔ رہنے والی تو قصور کی تھی۔ ماں باپ یہاں آکے آباد ہوگئے تھے۔" صائمہ نے اپنی رپورٹ دی۔ "بھائی تین تھے۔ ایک کسی حادثے میں مرگیا تھا۔ دو میں سے ایک سعودی عرب چلا گیا۔ دوسرا دبئی۔"

"شادی کب ہوئی تھی؟ گھر کہاں ہے؟"

"شادی سال بھر پہلے ہوئی تھی۔ ماں باپ دونوں تھے اس وقت۔ ماں پہلے مری... غالباً اسے کینسر ہوا تھا۔ ظاہر ہے اس کے بعد باپ کو نورجہاں کی فکر لاحق ہوئی کہ میں مرگیا تو اس کا کیا بنے گا۔ نورجہاں کے بھائی تو لاپتا تھے۔ وہ گئے ہی غیر قانونی طور پر تھے۔ ماموں نورجہاں کو لے گیا واپس اپنے آبائی گاؤں... وہاں اس کا کوئی چچا تھا۔ راولپنڈی، پشاور کے درمیان کوئی جگہ ہے... اکوڑہ خٹک۔"

"ہاں ہے... دریائے اٹک یا کابل کے کنارے۔"

"گلباز خان نے وہیں شادی کی۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ نورجہاں تک پہنچا کیسے... یہ سب نے کہا کہ تھی وہ واقعی نورجہاں... بہت خوب صورت اور صحت مند۔ شادی کے بعد وہ یہاں آگئے۔"

"تم نے کہا کہ اس کے ماں باپ یہاں سیٹل ہوگئے تھے۔"

"باپ پہلے سے بیمار تھا۔ وہ اپنے گاؤں میں ہی رک گیا بھائی کے پاس اور چھ مہینے ہوئے وہ بھی مرگیا۔"

میں نے کہا۔ "وہ یہاں سیٹل تھا... تو کوئی گھر بھی ہوگا اس کا... یا کرائے پر رہتا تھا وہ بھی؟" میں نے پوچھا۔

"ایک پڑوسن نے بتایا تھا کہ لانڈھی میں اپنا گھر تھا۔"

"پھر وہ شادی کے بعد اپنے گھر میں کیوں نہیں رہی؟

کرائے کے فلیٹ میں کیوں آئی ؟“
صائمہ نے غور کیا۔ ”ہوسکتا ہے گلباز کو وہ جگہ دور پڑتی ہو۔ اس کا یہ کاروں کا بزنس یہاں سے قریب ہے۔ پیدل کا راستہ تھا۔“
”غالباً یہی وجہ ہوگی۔“
”مکان اس نے بیچ دیا ہوگا۔ کرائے پر کون اٹھاتا ہے... خوامخواہ کا دردِسر۔“
”یہ تو ٹھیک ہے بلبل جان... لیکن اب وہ ڈلیوری کے لیے کون سے میکے گئی ہے؟ نہ ماں ہے نہ باپ اور بھائی۔“
”چچا کا گھر بھی تو اپنا ہی ہوتا ہے۔ بھروسا نہ ہوتا تو باپ وہاں کیوں لے جاتا اور وہاں جا کے کیوں مرتا۔“
”ایڈریس وغیرہ کچھ نہیں ملا... تلاشی میں؟“
”مجھے موقع ہی نہیں ملا۔ ایک پڑوسن نے مجھے اندر جاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ آئی... پھر دوسری... تیسری... بہت کرید رہی تھیں کہ صرف ایک سال بعد گلباز خان نے مجھ سے دوسری شادی کیوں کی... میں تو مظلوم بن گئی کہ مجھ سے بچپن کی منگنی تھی... میرے لیے تو یہ انکشاف ہے کہ اس نے کسی نور جہاں سے شادی کرلی تھی۔ آج آئے میں خبر لیتی ہوں... خواتین کی ساری ہمدردی میرے ساتھ تھی۔“
”اپنے بارے میں کیا فرمایا آپ نے؟“
”وہ کھل کے جھوٹ بولا جو تم نے سکھایا تھا۔ پھر بھی رسک تو ہے۔ بعد میں کوئی پہچان جائے۔“
”ایسی بات کرنے والا خود ملزم بن جائے گا۔ تم سول اسپتال کی ڈاکٹر... ایک سو ایک تمہارے گواہ... تم کیا جانو کسی گلباز کو... ہم شکل والا نظریہ چلے گا... خیر... اس عظیم کارنامے پر جو تم نے سرانجام دیا۔“ میں نے ایک دم اسے پکڑ کے چوم لیا۔
اس نے مجھے غصے سے دھکیلا۔ ”پاگل ہوئے ہو... لوگ دیکھ رہے ہیں۔“
میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ”کون لوگ... ہم بہت دور نکل آئے ہیں۔ چلو اب واپس چلتے ہیں۔“
”سچ بہت بے شرم ہو تم۔“
”جس نے کی شرم... اس کے پھوٹے کرم... ہمت ہے کسی میں تو ایسے محبت کر کے دکھائے...“ میں نے ہنس کے کہا۔ ”جوتیاں اٹھانے کا معاوضہ ابھی باقی ہے۔“
وہ پیچھے ہٹ گئی۔ ”میں ماروں گی زیادہ بدتمیزی کی تو۔“
شام کا اندھیرا کچھ گہرا ہو گیا تھا جب میں ان فلیٹوں کے گیٹ سے گزرا جہاں گلباز رہتا تھا۔ دن کی ڈیوٹی والا چوکیدار بدل چکا تھا اور اب میں کار میں برقع پوش صائمہ کے ساتھ تھا۔ اس نے پہلے چابی دی اور پانچ منٹ بعد جب میں اوپر جا چکا تھا وہ گاڑی لے کر نکل گئی۔ میں نے بڑے اطمینان سے تالا کھولا اور اندر چلا گیا۔ صائمہ کے مقابلے میں رسک میرے لیے یقیناً زیادہ تھا لیکن خوش قسمتی سے کسی نے بھی مجھے اندر جاتے نہیں دیکھا۔
میں نے کسی پروفیشنل سراغ رساں والے اعتماد کے ساتھ اپنا کام شروع کیا۔ ایک ایک کر کے میں نے تمام الماریوں اور درازوں کو کھول کے دیکھا۔ مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ ایک گھنٹے میں مجھے اصل نکاح نامہ بھی مل گیا اور چند تصویروں والا ایک البم بھی۔ میں نے صرف ایک تصویر لی۔ صائمہ کو موقع ملتا تو یہ کام وہ بھی کرسکتی تھی۔
اس کے بعد میرا وہاں ٹھہرنا لاحاصل تھا۔ اس بات کا خطرہ آج نہیں تھا کہ گلباز خان کو واپسی پر اس کی دوسری بیوی کے آنے کی خبر ملے۔ تشویش میں مبتلا بیویاں رات کو شوہروں کے آنے کے بعد انہیں یہ بریکنگ نیوز دیں گی جو ظاہر ہے اسے اتنی اہمیت نہیں دیں گے کہ فوراً گلباز خان سے پوچھنے جائیں۔ وہ بھی رات کو آئے گا اور سو جائے گا۔ یہ سنسنی تو صبح پھیلے گی جب معلوم ہوگا کہ دوسری بیوی فریب خیال و نظر تھی۔ تو دن بھر سنسنی پھیلی رہے گی اور شام کو جب شوہرانِ کرام دن بھر پرندوں کی طرح رزق کمانے کے بعد آشیانوں کو لوٹیں گے تو ان کے لیے ایک اور سنسنی خیز بریکنگ نیوز یہ ہوگی کہ دوسری بیوی بھی بھاگ گئی... سب شوہر گلباز خان کی خوش قسمتی پر رشک کریں گے جن کی ایک ہی جان نہیں چھوڑ رہی۔

☆☆☆

رات کو اپنے سیکرٹ مشن کی تکمیل کے بعد آٹھ بجے کے قریب میں نے ظالم خان کو فون پر مطلع کیا۔ ”اب تم چاہو تو گلباز خان کو چھوڑ سکتے ہو... اور مہمان رکھنا چاہو تو اس کا بھی جواز ہے۔“
”کوئی ایسی بات ہے تو ضرور بتا جس سے تمہارے دوست کا فائدہ ہو؟“ وہ بولا۔
میں نے کہا۔ ”اس سے پوچھو کہ نور جہاں نام کی ایک بیوی تھی اس کی۔ وہ بیوی تھی یا نہیں اور تھی تو اب کہاں ہے... اگر اس سے تمہیں کچھ مالی فوائد حاصل ہوسکتے ہیں تو ہمیں کیا۔ ہم تو یاروں کے یار ہیں... دس پرسنٹ ہمارے لیے بھی نکال دینا زکوٰۃ۔“

”مسٹر مین پرسنٹ... اگر یہ کیس بنتا ہے۔“
میں نے کہا۔ ”وہ تمہاری مرضی... میں اس میں فریق نہیں بنوں گا۔“ میں نے کہا۔
اپنی معلومات میں فوری طور پر مسماۃ صائمہ اور غزالہ تک پہنچاتا تو ان کی خوشی دوچند ہوتی لیکن زمانہ نفسانفسی کا ہے۔ مجھے اپنی خوشی اور اپنا مفاد بھی تو دیکھنا تھا۔ یہ اچھا موقع تھا کہ میں ان کے جذباتی بحران کو طول دے کر مالی اور دیگر فوائد حاصل کرتا رہوں۔ یہ اطلاع بھی غزالہ کے لیے خوش خبری ہوگی کہ گلباز خان نے اپنے روایتی ”قول“ سے بدعہدی میں پہل کرتے ہوئے ایک شادی نہیں اور کرلی تھی۔ ظاہر ہے اس کے بعد غزالہ سے کیا گیا منگنی کا معاہدہ ازخود کالعدم ہو جاتا تھا۔ لیکن ابھی تصدیق ضروری تھی کہ نور جہاں سچ مچ اس کی منکوحہ تھی یا محض ٹائم پاس... ابھی نکاح نامے کے اصلی نقلی ہونے کی تصدیق کا مرحلہ باقی تھا۔
صبح مجھے غزالہ کے ڈیڈی کا فون موصول ہوا۔ ”غزالہ نے بتایا کہ تم نے گلباز خان کے غیر قانونی کاروبار اور ایک شادی کے بارے میں معلوم کرلیا ہے۔“
میں نے کہا۔ ”غیر قانونی کاروبار میں تو کوئی شک نہیں۔ اس میں پولیس اور دیگر محکمے بھی شریک ہیں تو ہمیں پنگا لینے کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں شادی ثابت ہو جائے تو آپ کی پریشانی دور ہو جائے گی۔ مجھے شک ہے کہ یہ شادی بھی شاید فراڈ تھی۔ جعلی نکاح سے اس نے کسی کو چکر دیا ہو... آج تصدیق ہو جائے گی۔“
”یہ ہو گیا تو تمہارا احسان میں تاحیات نہیں بھولوں گا۔ میرے سر پر بڑا بوجھ تھا اور یہ احساس تو مجھے قبر میں بھی چین نہ لینے دیتا کہ میں نے اپنی انا پر بیٹی کی زندگی کو جہنم میں جھونک دیا۔“
”آپ تسلی رکھیں... اور آنٹی کو بھی بتا دیں کہ گلباز اب زبردستی غزالہ کو نہیں لے جاسکتا۔“
نکاح نامے میں بہت سی تفصیلات تھیں مگر ایسا لگتا تھا کہ کچھ عمداً گول کردی گئی ہیں۔ گلباز خان کے شناختی کارڈ نمبر پر بھی مجھے شک تھا۔ اس کی تصدیق بہ آسانی کی جاسکتی تھی۔ نور جہاں کے شناختی کارڈ کا نمبر بھی نہیں تھا۔ گواہان کا معاملہ بھی ایسا ہی لگتا تھا۔ ان کے نام اور دستخط تھے۔ پتے نامکمل تھے اور شناختی کارڈ نمبرز پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مختلف شہروں کے ہوسکتے ہیں۔ نکاح رجسٹرار سے اور دلہن کے لانڈھی والے پتے سے بہت کچھ معلوم ہوسکتا تھا۔
میں نے نو بجے کے قریب صائمہ کو فون کیا۔ ”مجھے لانڈھی جانا ہے۔“
”تو جاؤ... مجھ سے کیا اجازت مانگ رہے ہو؟“
”دیکھو... یہ قانونی تفتیش ہے اور میں نے بطور سراغ رساں تم سے کوئی فیس نہیں لی ہے مگر مجھے آمدورفت کی سہولت فراہم کرنا تمہارا اخلاقی فرض بنتا ہے۔“
”کیا مطلب... میں گاڑی لے کر آؤں... تم ٹیکسی میں کیوں نہیں چلے جاتے؟“
”جانم... وہ جو ایک صابن دانی جیسی ڈبیا ہے تمہاری چار پہیوں والی... وہ مجھے سگِ لیلیٰ کی طرح عزیز ہے اس میں سفر سے مجھے جو روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔“
”مگر آج میں چھٹی کیسے کروں... کل بھی کی تھی۔“ وہ نیم رضامندی سے بولی۔
”سب کچھ کرسکتی ہو تم... محبت کے لیے یہ نوکری بھی چھوڑ سکتی ہو... اگر انارکلی نے دنیا چھوڑ دی تھی۔“
”فضول ڈائیلاگ مت مارو... میں آتی ہوں۔ لیکن تم نے لانڈھی تک ایک بار بھی میری گاڑی کو کچھ کہا تو میں تمہیں راستے میں اتار کے لوٹ جاؤں گی۔“
”تم غزالہ کو بھیج دو... وہ خود تم سے اچھی نہیں مگر اس کی گاڑی۔“
ایک گھنٹے بعد صائمہ کے ساتھ میں لانڈھی کی طرف ایسے جارہا تھا جیسے ہنی مون کے لیے سوئٹزرلینڈ جارہا ہوں۔ ساری بات ذہانت کی ہے ورنہ سوئٹزرلینڈ بھی جلا وطنی... صائمہ بڑے اہتمام سے آئی تھی اور میری عاشقانہ تابعداری پر بہت خوش نظر آتی تھی کہ صرف اس کے لیے میں نے دن رات ایک کردیے۔ نقشہ میں نے کچھ ایسا ہی کھینچا تھا۔ ایک گھنٹا اِدھر سے اُدھر بھٹکنے کے بعد ہم نے بالآخر لانڈھی میں وہ چھوٹا سا گھر دریافت کرلیا جو گویا نور جہاں کا اصل میکا تھا۔ گھر خالی نہیں تھا۔ اندر سے کچھ تھانے کی تفتیش جیسی فریاد و فغاں سنائی دے رہی تھی۔ ملزم زیرِ تفتیش آواز سے مرد لگتا تھا اور تفتیشی افسر کوئی نیک دل خاتون۔
میری دستک پر ایک صوفی نمودار ہوا جس کی آنکھوں میں فریاد اور مظلومیت تھی۔ ”کس سے ملنا ہے؟“ وہ منمنایا۔
میں نے نور جہاں کا اور اس کے باپ کا نام لیا۔ ”یہ انہی کا گھر ہے؟“
صوفی کے عقب سے ایک آتش فشاں حسینہ برآمد ہوئی جس کے وجود سے دھواں اٹھتا محسوس ہوتا تھا۔ کسی

تکلف یا تمہید کے بغیر اس نے ایک مختصر تقریر کی۔ ''ہزار بار بتا چکے ہیں تمہیں کہ یہ گھر ہم نے خرید لیا تھا۔ تم بار بار آجاتے ہو پریشان کرنے۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن ہم تو پہلی بار آئے ہیں۔''

''اچھا آئندہ مت آنا ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔'' وہ صوفی کو گھسیٹ کے واپس اندر لے گئی۔ ''تم بتاؤ مجھے آخر وہ ہے کون؟'' دروازہ بند ہوگیا اور اندر سے صوفی کی دردناک ہائے سنائی دی۔

میں نے عبرت پکڑ کے کہا۔ ''لگتا ہے ان کی بھی لو میرج ہوئی ہوگی صوفی بھی میری طرح بزدل ہے۔''

''مگر میں تو اس جیسی آدم خور ڈائن نہیں ہوں۔''

''تم نے اس چوہے کا کیس نہیں سنا جو شیر کی شادی میں ناچ رہا تھا۔ کسی نے پوچھا کہ بھائی اس شادی میں تم کیسے؟ تو وہ آہ بھر کے بولا کہ شادی سے پہلے میں بھی شیر تھا۔''

اب ایک آسرا نکاح خواں کا تھا۔ تھوڑی سی پوچھ گچھ کے بعد ہم نے نکاح خواں کے نام سے ان کا گھر بھی تلاش کرلیا۔ باہر نام کی تختی دیکھ کے شک کی کوئی بات نہ رہی۔ کال بیل کی جگہ کنڈی بجانے پر ایک نوجوان کا بارِیش ڈھانچا برآمد ہوا۔

''یہ قاضی قدوس قاسمی صاحب کا گھر ہے؟'' تین بار حلق سے قاف نکال کے مجھے کچھ خراش سی محسوس ہوئی۔

ڈھانچے نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ تو چلے گئے۔''

''چلے گئے؟ کہاں... ہمیں ان کا پتا بتادو۔'' میں نے کہا۔ ''ہم انہی سے ملنے آئے تھے۔''

اس نے اوپر دیکھا۔ ''گو عالمِ ارواح میں چلے جاؤ... قبر پر لے جاسکتا ہوں... نکاح میں بھی پڑھا سکتا ہوں۔''

مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ آج ناکامیوں اور مایوسیوں کا عالمی دن ہے۔ مگر میں نے ہمت نہیں ہاری اور اسے نکاح نامہ دکھایا۔ ''ہم اس کی تصدیق چاہتے تھے یہ اصل ہے کہ نقلی؟''

صائمہ نے بہت بروقت ترپ کا پتا پھینک دیا۔ ''اور اس کارِ خیر کے لیے ایک ہزار کا ہدیہ بھی پیش کرسکتے ہیں۔''

جانشین کے مالی حالات اس کی صحت کی خستہ حالی سے ہی عیاں تھے۔ یہ پتا کام کرگیا۔ اس نے نکاح نامے کو ایک ماہرانہ نظر سے دیکھا اور آبدیدہ ہو کے فرمایا۔ ''بے شک یہ دستخط والد ماجد خلد آشیانی کے ہیں۔''

''اور یہ گواہ... ان میں سے کوئی گرد و نواح میں دستیاب ہے؟''

اس نے پھر غور فرمایا اور بولا۔ ''ان سے آپ مل سکتے ہیں۔ ذرا اونچا سنتے ہیں، جواب اتنا نیچا دیتے ہیں کہ آپ کو ان کے پاس بیٹھنا پڑے گا زمین پر۔''

صائمہ نے ہتھیلی پر ایک ہزار صدقہ کیے اور ہم نے گواہ کو ایک گلی کے کونے پر جوتے گانٹھتا دیکھ لیا۔ آدھے گھنٹے کی سخت مشقت کے بعد نتیجہ حسبِ دل خواہ برآمد ہوا جب ہمارے ساتھ ہمارے گلے بھی بیٹھ گئے تھے۔ جو معلوم ہوا یہ تھا کہ بے شک نور جہاں کا نکاح اسی گھر میں ہوا تھا جو اس کے باپ کی ملکیت تھا۔ وہ خود بھی اس میں شریک تھا۔ اللہ معاف کرے۔ نور جہاں کا باپ ایک لالچی شخص تھا۔ اس نے اپنی بیٹی تصدیق تفتیش کے بغیر اس گلباز خان کو بیچ دی تھی اور نقد قیمت وصول کرلی تھی اور اس سودے کو یوں شرعی جواز عطا کیا تھا کہ لڑکی کا مہر ایک لاکھ روپے عندالطلب نکاح کے فوراً بعد لے لیا تھا۔ یہ غلط ہے کہ نکاح اس کے گاؤں اکوڑہ خٹک میں ہوا تھا۔ اس کا داماد شادی کے بعد اسی گھر میں اس کے ساتھ رہا اور جاننے والے جانتے ہیں کہ ایک روز اس نے سسرِ محترم کو جانبِ خلد بریں روانہ کیا اور خود مکان موجودہ رہائش پذیر شخص کو بیچ دیا۔ اس کی بیوی نے بیچا اور رقم اس نے وصول کی۔ پھر وہ بیوی کو لے کر شہر چلا گیا تھا۔ اس نے دوسرے گواہ کے بارے میں بتایا کہ وہ ایک عامل ہے اب... جن بھوت اتارتا ہے اور ''کنگالی بابا'' کہلاتا ہے کیونکہ جو اس کے پاس جاتا ہے کنگال ہوجاتا ہے۔

واپسی پر ایک ناقابلِ بیان شرمناک واقعہ پیش آیا جس کا انجام ایک المناک حادثے کی صورت میں ہوسکتا تھا اور اس کے نتیجے میں ہم بچ بچ اصل قاضی صاحب سے عالمِ ارواح میں شرفِ ملاقات حاصل کرنے کے لیے پہنچ سکتے تھے۔ صائمہ اس کامیابی پر بے حد خوش تھی اور ایسی ایکسائیٹڈ تھی کہ اس کا جذباتی سنسر انگلش فلموں والا ہوگیا۔ ایک ویران سی جگہ سے گزرتے ہوئے اس نے فلمی انداز میں چلا کے کہا۔ ''یاہو... ڈارلنگ یہ سب تمہاری محنت اور ذہانت سے ممکن ہوا اور بے قابو ہو کے مجھے چوم لیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو گاڑی ایک گڑھے میں کھڑی تھی۔ صائمہ کے ساتھ وہ بھی بے قابو ہو کے راہِ راست سے اتر گئی تھی۔

ایسا سنسنی خیز واقعہ بزدل کی زندگی میں دوبارہ پیش نہیں آیا۔

سرورق کی دوسری کہانی

تختۂ مشق

کاشف زبیر

دورانِ سفر نئے نئے منظر اُبھرتے ہیں... فطری مناظر کے آئینے میں جہاں ہم کائنات کے رنگا رنگ نمونوں سے آگہی حاصل کرتے ہیں... وہاں زندگی کے اسرار اور حقائق سے بھی پردہ اٹھتا چلا جاتا ہے... ان منظروں کے ساتھ کبھی تو ماضی کی یادیں جڑی نظر آتی ہیں... اور کبھی عصری زندگی کے حوالوں کو سامنے لاتے ہیں... یہ ایک اَن دیکھی اور طلسماتی دنیا محسوس ہوتی ہے... اردگرد پھیلا ماحول اپنے اندر بہت سے اسرار اور بھید لیے نظر آتا ہے... شامی اور تیمور کی ہمراہی میں شروع ہونے والا ایک یادگار سفر... جہاں قدم قدم پر پاتالیں اور چٹانیں تھیں کہ اچانک ہی ہر طرف کشت و خون کا بازار گرم ہوگیا... سنسنی خیز لمحات اور مہمات سے بھرپور شاہکار...

ارضِ پاک سے جڑے محبتوں اور چاہتوں کے رشتوں سے منسلک تیز رفتار سرورق کے نشیب و فراز

شامی کا موڈ سخت خراب تھا اور اس خرابی کی وجہ گاڑی میں پیچھے بیٹھی تھی۔ اس کے برابر میں تیمور تھا جبکہ جوجی نوشی کے ساتھ تھا اور دونوں سر جوڑے سرگوشی میں محوِ گفتگو تھے۔ تیمور لینڈ کروزر چلا رہا تھا جبکہ فولاد خان نواب صاحب کی مرسیڈیز ڈرائیو کر رہا تھا اور یہ قافلہ ایک ہل اسٹیشن کی طرف رواں دواں تھا۔ پروگرام شامی نے بنایا تھا اور تیمور و جوجی اس کا ایک حصہ تھے۔ شامی نے سوچا تھا کہ اس بار وہ گرمیوں میں ان ہل اسٹیشنوں کا رخ نہیں کریں گے جہاں وہ کئی بار جاچکے تھے اور بہ قول شامی وہ جگہیں اسے حفظ ہوگئی تھیں اور وہ آنکھ بند کرکے بھی وہاں گھوم سکتا تھا۔ اس پر تیمور نے لقمہ دیا۔ ''اور پھر تیری آنکھ کسی اسپتال کے ہڈی وارڈ میں کھلتی۔''

''منہ سے بدفالیں مت نکال۔'' شامی نے ایک غیر ملکی ہائکر میگزین لہراتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو ذرا، جگہیں ہماری ہیں اور ہمیں بتاتے یہ گورے ہیں۔''

تیمور بھی دیکھ کر حیران ہوا۔ رسالے میں شمالی علاقے کے ایک نیچرل

پارک کے ساتھ بننے والے اس ہل اسٹیشن ریسورٹس کی تصویریں اور سہولیات کا ذکر تھا۔ یہاں سے کئی معروف ٹریکس اور ہائکنگ سائٹ شروع ہوتے تھے۔ یہ ریسورٹس چند سال پہلے معروف ہوا تھا اور اب وہاں دارالحکومت میں موجود غیر ملکی گرمی سے بچنے کے لیے جاتے ہیں۔ ان میں خاصی بڑی تعداد خواتین کی ہوتی ہے۔ تیمور نے اس کا ارادہ سنتے ہی کہہ دیا کہ شامی انہی خواتین کے چکر میں وہاں جا رہا ہے۔ شامی نے تردید کی۔ ''نہیں یار! وہاں دیکھنے کو اور بھی بہت کچھ ہے اور پھر اس گرمی سے تو نجات ملے گی۔ ویسے آپس کی بات ہے فطرت کا حسن خواتین کے بغیر ادھورا سا لگتا ہے۔''

مگر تیمور فی الحال صرف گرمی کے معاملے میں شامی سے متفق تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے ایسی گرمی پڑی تھی کہ وہ لڑکیوں کو بھی بھول گئے تھے۔ شامی کا کہنا تھا کہ اسے زندگی میں پہلی بار صنفِ نازک سے الجھن محسوس ہوئی تھی۔ کیونکہ ان کے قریب جانے سے بھی گرمی لگتی ہے۔ تیمور نے میگزین میں اس ریسورٹس کا جو احوال پڑھا اور اس کی تصویریں دیکھی تھیں تو وہ فوراً وہاں جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ برف پوش پہاڑوں کی قربت میں یہاں یا تو گھنے جنگل تھے یا بہتے اور شور مچاتے چشمے۔ نیچرل پارک ہونے کی وجہ سے آبادی بہت کم تھی اور سیاحوں کے لیے چند اعلیٰ درجے کے ہوٹل تھے۔ چونکہ یہاں شاپنگ کا کوئی بندوبست نہیں تھا اس لیے مقامی خواتین یہاں کا رخ کرنے سے گریز کرتی تھیں اور صرف غیر ملکی خواتین آتی تھیں جن کے اپنے ملک میں اس قسم کے مناظر کم دیکھنے کو ملتے تھے۔ اسی طرح بعض مقامی ٹریکنگ اور ہائکنگ کے شوقین بھی اس طرف کا رخ کرتے تھے۔ شامی کے خیال میں غیر ملکیوں اور خاص طور سے خواتین کی ریل پیل میں چند مقامیوں کو برداشت کیا جا سکتا تھا۔ تیمور نے اسے یاد دلایا کہ وہ خود بھی مقامی تھے۔

میگزین کی تصاویر میں فطری مناظر سے زیادہ ان غیر ملکی خواتین کی تصاویر تھیں جن کو دیکھ کر لگتا تھا کہ ان کو ان برف پوش پہاڑوں کی قربت میں بھی گرمی لگ رہی ہے اور اس کا اظہار وہ کم لباسی سے کر رہی تھیں۔ شامی کے بارے میں رائے دینے کے بعد تیمور نے تصاویر دیکھ کر اتفاق کیا کہ شامی حق بہ جانب تھا۔ یہ خواتین اس قابل تھیں کہ انہیں دیکھنے اور ان سے ملنے کی خاطر وہ ان کے ملک چلے جاتے۔ وہ تو پھر بھی یہاں دستیاب ہو رہی تھیں۔ تیمور نے اس موقع پر شامی کی موقع شناسی کی صلاحیت کی داد بھی دی۔ تیمور کا ایم بی اے کا آخری سیمسٹر نمٹ گیا تھا اور شامی پہلے ہی بی اے سے فارغ تھا۔ اس نے نواب صاحب کے استفسار پر ما[illegible] کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور اس سے پہلے وہ ایک دو سال کا [illegible] دینا چاہتا تھا۔ اس پر نواب صاحب نے فرمایا۔

''برخوردار! اگر آپ اسی طرح آرام سے تعلیمی مدارج مناسب وقفوں سے طے کرتے رہے تو امکان ہے پی ایچ ڈی کرتے کرتے آپ ریٹائرمنٹ کی عمر تک پہنچ جائیں گے۔''

شامی نواب صاحب کے اس اندیشے سے خوش ہوا تھا کیونکہ نوکری کے خیال سے اسے ویسے ہی ہول آتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے نوکری کی کیا ضرورت ہے۔ جدی پشتی اتنی دولت تھی کہ ان کی سات نسلیں بیٹھ کر کھا سکتی تھیں۔ بہرحال ذکر ہو رہا تھا ہل اسٹیشن کا۔ شامی اور تیمور نے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ جوجی کے بارے میں طے پایا کہ اسے بالکل آخری موقع پر بتایا جائے گا کیونکہ ان دنوں اس کے اور نوشی کے تعلقات میں بہت بڑا یوٹرن آیا تھا اور اب ان دونوں میں گاڑھی چھن رہی تھی۔ نوشی باضابطہ جوجی کی بگ سسٹر بن گئی تھی۔ جوجی کا کہنا تھا اب وہ نوشی کے بغیر [illegible] بھی نہیں جائے گا۔ شامی کو یقین تھا کہ اس یوٹرن کے پیچھے نوشی خود تھی۔ جوجی کو برادرِ خرد بنانے کا مقصد شامی کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا تھا۔ شامی جوجی کو باز نہیں رکھ سکا تھا۔

''یار اسے چھوڑ دو۔'' تیمور نے مشورہ دیا۔ ''تم [illegible] روانگی سے ایک منٹ پہلے بھی بتایا تو ضرور اپنی آپا کو اطلاع کرے گا اور اس کے پاس بی ایم ڈبلیو ہے۔ [illegible] آجائے گی۔''

شامی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں یار! اب جوجی کے بغیر مزہ نہیں آتا ہے۔''

تیمور نے شانے اچکائے۔ ''تمہاری مرضی... [illegible] میں خود بھگتو گے۔''

مگر بدقسمتی نوشی نہیں بلکہ نواب صاحب کی صورت میں آئی۔ شامی اور تیمور نے ان سے اجازت طلب کی اور [illegible] طلبی ان کے گلے پڑ گئی۔ نواب صاحب ایک نئے ہل اسٹیشن کا سن کر چونکے اور جب انہوں نے میگزین میں تصاویر دیکھیں تو وہ بھی جانے پر آمادہ ہو گئے۔ یہاں تک تو [illegible] گوارا تھا۔ شامی اور تیمور کو امید تھی کہ دادا جان زیادہ [illegible] ہوٹل میں یا اس کے ٹیرس پر گزاریں گے کیونکہ ان کی [illegible] ان راستوں پر ہائکنگ کی بس رہی تھی۔ اس سفر میں ہا[illegible] کا پروگرام بھی شامل تھا۔ مگر اسی رات نوشی بن بلائے مہمان

کی طرح آئی اور نواب صاحب کے اصرار پر ڈنر میں شامل ہوئی تو کچھ دیر بعد وہی ہوا جس کا شامی کو خطرہ تھا۔ یعنی نواب صاحب نے نوشی کو اس پروگرام سے آگاہ فرما دیا اور اس نے معنی خیز انداز میں شامی کا چہرہ دیکھا جس پر بارہ بج گئے تھے اور اسی وقت پروگرام میں اپنی شمولیت کا اعلان کر دیا۔ شامی کی بھوک مر گئی اور خود اس کا بھی فوت ہونے کو دل چاہ رہا تھا۔

ڈنر کے بعد وہ یوں کمرے میں ٹہل رہا تھا جیسے اس نے ڈبل کھا لیا ہو اور اب اسے ہضم کرنا چاہ رہا ہو۔ تیمور راکنگ چیئر پر جھول رہا تھا۔ شامی نے اس سے ایک درجن ویں بار کہا۔ ''تیمور کچھ کر۔''

''میں کیا کر سکتا ہوں؟'' تیمور نے مزے سے کہا۔ ''نہ میں دادا حضور کو سمجھا سکتا ہوں اور نہ تو نوشی کو۔''

''میں خودکشی کر لوں گا۔'' شامی نے احتیاط سے اپنے بال نوچے کیونکہ ایک ہفتہ پہلے اس نے یہ ہیئر اسٹائل [illegible] تھا اور اسے دیکھ کر نواب صاحب نے فرمایا تھا کہ اسے ہیئر کٹ کی اشد ضرورت ہے۔

''پرانے وقتوں میں شرفا ایسا ہی کرتے تھے۔ میرا مطلب ہے بات بات پر خودکشی۔'' تیمور نے سر ہلایا۔ ''لیکن دوست اب یہ آؤٹ آف فیشن ہو گیا ہے۔ بندہ قتل ہو تو دشمن پکڑے جاتے ہیں لیکن خودکشی کرلے تو پولیس پہلے لواحقین کو لے جاتی ہے۔''

''پولیس کی خیر ہے مگر خودکشی کرنے والے کو فرشتے ڈائریکٹ جہنم میں لے جاتے ہیں۔'' شامی نے کہا۔ ان دنوں وہ ایک چینل سے آنے والے مذہبی پروگرام باقاعدگی سے دیکھ رہا تھا اور اس کی دینی معلومات میں خاصا اضافہ ہوا تھا جس کا وہ وقتاً فوقتاً اظہار بھی کرتا رہتا تھا۔ اگرچہ لڑکیوں کے بارے میں اس کے خیالات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔

''تب صبر کر۔'' تیمور نے مشورہ دیا۔ ''اللہ صبر کرنے والوں کو صبرِ جمیل بھی عطا کرتا ہے، خوب تر کرکے۔''

''یہ بھی صبر کی ایک قسم ہے۔ صنفِ نازک کی نہیں۔'' شامی نے تصحیح کی۔

''اچھا۔'' تیمور مایوسی سے بولا۔ ''میں تو سمجھتا تھا کہ ایک بیوی یا گرل فرینڈ ہاتھ سے نکل جائے اور بندہ صبر کرے تو اس کا متبادل ملتا ہے۔''

کیونکہ نوشی کو پہلے ہی علم ہو گیا تھا اس لیے اب جوجی کو بتا دینے میں کوئی حرج نہیں تھا مگر اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''نوشی باجی جائیں گی؟''

''کیوں نہیں۔'' شامی غرایا۔ ''تمہاری آپا جان چیچڑا چھوڑنے والی چیز ہے۔''

جوجی ہنسا۔ ''ہاں وہ کہہ رہی تھیں کہ جہنم تک آپ کا پیچھا کریں گی اور جب آپ اندر جائیں گے تو وہ دروازے سے پلٹ آئیں گی۔''

''نہیں، وہ مجھے دھکا دے کر آئے گی۔'' شامی نے بھنا کر کہا۔

اس مرحلے پر سب سے خوش باش تیمور اور فولاد خان تھے۔ فولاد خان کو اس گرمی میں گیٹ پر بیٹھنا پڑتا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ اس کا مغز فرائی ہو جاتا تھا۔ اس نے شامی اور تیمور سے کہا۔ ''کابی کابی ام کو فرائی مغز کا بو بی آتا اے۔''

شامی کا خیال تھا کہ بو اصل میں بھوسہ جلنے کی آتی ہو گی مگر اس نے خیال کے اظہار سے گریز کیا کیونکہ بدقسمتی سے وہ گزشتہ تین مہینے سے فولاد خان سے لیے قرض پر سود ادا نہیں کر پا رہا تھا اور فولاد خان فراخ دلی سے اسے چھوٹ دے رہا تھا مگر وہ سود پر سود لگانا نہیں بھول رہا تھا۔ بہرحال یہ رعایت بھی کم نہیں تھی اس لیے شامی اس کی خوشنودی کا خصوصی خیال رکھ رہا تھا۔ تیمور اس لیے خوش تھا کہ نواب صاحب کے ساتھ ہونے کے بعد وہ اخراجات کی فکر سے آزاد ہو جائیں گے۔ نواب صاحب نے پہلے ہی ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں کمرے بک کرا لیے تھے۔ یہ ایک ہفتے کا پروگرام تھا۔ وہ ایک اتوار کی صبح روانہ ہوتے اور دوسرے اتوار کو واپسی ہوتی۔ روانگی سے پہلے شامی نے چپکے سے تیمور سے کہا۔ ''ہم دونوں واپسی سے دو دن پہلے ٹریک پر نکل جائیں گے اور جب واپس آئیں گے تب تک دادا جان اور نوشی جا چکے ہوں گے۔''

''یہ پروگرام میں شامل نہیں ہے۔'' تیمور نے اسے یاد دلایا۔

''شامل کیا تو جا سکتا ہے۔'' شامی نے اصرار کیا۔

''اگر نوشی ساتھ گئی تو؟'' تیمور منفی امکانات پر زیادہ غور کر رہا تھا۔

''اب وہ ہر جگہ ہمارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ ہم راستے کی مشکلات کا کہہ کر انکار کر دیں گے اور اسے بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔''

''اس صورت میں جوجی کو چھوڑ کر جانا ہوگا۔''

شامی نے تیمور کو راضی کر لیا۔ نوشی سے بچنے کے لیے وہ جوجی کو بھی چھوڑ کر جانے کے لیے تیار تھا۔ سفر تقریباً

سات آٹھ گھنٹے کا تھا اس لیے وہ لنچ کا بندوبست کر کے نکلے۔ روانگی صبح سات بجے ہوئی۔ اس وقت بھی سورج نکلتے ہی آگ برسانے میں لگ گیا تھا۔ اس لیے سب خوش تھے کہ آج شام تک وہ اس گرمی سے دور جا چکے ہوں گے سوائے شامی کے۔ ایک گھنٹے بعد وہ پہاڑوں میں داخل ہو چکے تھے اس لیے شامی نے اے سی آف کر کے کھڑکیاں کھول دیں۔ وہ خنک اور خوشبودار ہوا سے محظوظ ہو رہے تھے۔ اچانک نوشی نے کہا۔ ''جب ہم اتنی دور جا رہے ہیں تو ٹریک بھی رکھ لیتے ہیں۔''

شامی اچھلا اور گاڑی لہرائی۔ مگر اس نے فوراً قابو کر لی اور جلدی سے بولا۔ ''ٹریک کی کیا ضرورت ہے؟''

''کیا فائدہ؟ بس ہوٹل میں جا کر رکو اور بس آس پاس دیکھ کر آجاؤ۔'' نوشی بولی۔ ''میں نے تو سوچ لیا ہے ٹریک پر جانے کا... اور کون کون ساتھ جائے گا؟''

''کوئی نہیں۔'' شامی نے جل کر کہا۔

''میں تم سے پوچھ بھی نہیں رہی ہوں۔'' نوشی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ جوجی نے اس کا ساتھ دینے کا اعلان کیا۔

''میں جاؤں گا باجی کے ساتھ۔''

''ٹھیک ہے جب راستے میں کوئی ریچھ حملہ کرے گا تو تم نوشی کی حفاظت کرنا۔'' شامی نے مشورہ دیا۔

''ریچھ۔'' جوجی فکرمند ہو گیا۔ ''راستے میں ریچھ ہوں گے؟''

''سنا ہے، ریچھ خوب صورت لڑکیوں پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ تم لوگوں کے لیے مسئلہ یہ نہیں ہوگا مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ راستے میں کوئی بدذوق ریچھ نہ مل جائے۔''

''اس کے لیے اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے۔'' نوشی نے جواب دیا۔ ''وہ تو شہر میں بھی مل جاتے ہیں۔''

شامی نے کھسیاہٹ ظاہر نہیں کی اور پھر وہ گاڑی روکنے پر مجبور ہو گیا کیونکہ سامنے گاڑیوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ اس نے گاڑی ایک طرف روکی لیکن اس طرح کہ ریورس کرنا پڑے تو کوئی مشکل نہ ہو۔ ایسا لگ رہا تھا آگے سلائڈنگ ہوئی تھی۔ نواب صاحب کی مرسیڈیز پیچھے تھی۔ تیمور نے کھڑکی سے جھانکا اور اطلاع دی۔ ''لینڈ سلائڈنگ ہوئی ہے۔''

''اس سفر میں بس اسی کی کسر رہ گئی تھی۔'' شامی نے ٹھنڈی سانس لی۔

اس دوران میں فولاد خان اتر کر آیا۔ ''نواب صیب فرماتا اے کہ واپس چلو۔''

''واپس کہاں؟''

''اور کوئی راستہ اے، نواب صیب جانتا اے۔''

''جلدی کرو۔'' تیمور نے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ پبلک واپسی کا راستہ بھی بند کردے اور ہم بیچ میں پھنس کر رہ جائیں۔''

شامی نے عجلت میں گاڑی موڑی۔ اس تنگ جگہ یہ خاصا مشکل کام تھا مگر اس نے کسی طرح کر ہی لیا۔ چند مہینے پہلے وہ برف باری دیکھنے گئے تھے اور اسی طرح سے ایک ٹریفک جام میں پھنس گئے تھے۔ انہیں پورے دو دن شدید سردی میں وہیں گزارنے پڑے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے توبہ کر لی تھی کہ ایسی جگہوں سے دور رہیں گے جہاں ٹریفک جام کا احتمال بھی ہو۔ بہرحال نواب صاحب کے بروقت فیصلے نے انہیں بچا لیا۔ اگر وہ اتر کر معلومات حاصل کرنے میں لگ جاتے تو تب تک پیچھے گاڑیوں کی ایک ناقابلِ واپسی لائن لگ چکی ہوتی اور وہ پھر شاید ایک دو دن گاڑی میں ہی گزارتے۔ محفوظ حد تک پیچھے آنے کے بعد نواب صاحب کی گاڑی رک گئی۔ شامی اور تیمور اتر کر ان کے پاس آئے۔ نواب صاحب کے پاس اس پورے علاقے کا نہایت تفصیلی نقشہ تھا اور وہ اسی کا معائنہ فرما رہے تھے۔ انہوں نے ایک باریک سی لکیر پر انگلی رکھی۔

''یہ راستہ ہے۔''

تیمور نے غور کیا۔ ''یہ تقریباً دوگنا ہے اور ہمیں مظفر آباد کے اوپر سے بھی گزرنا پڑے گا۔''

''تاخیر سے سہی لیکن ہم آج ہی پہنچ سکتے ہیں۔'' نواب صاحب نے کہا۔ ''اب روانگی اختیار کی جائے۔''

''تعمیل ہوگی عالی جاہ۔'' شامی اور تیمور دونوں بیک وقت کورنش بجا لائے اور پھر اپنی گاڑی کی طرف بھاگے۔ نواب صاحب نے پہلے انہیں گھورا اور پھر مسکرا دیے۔ ان کے اشارے پر فولاد خان نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس راستے پر مڑتے ہی ہائی وے اور عام سڑک کا فرق سمجھ میں آ گیا تھا اگرچہ یہ مرسیڈیز تھی اور اس کا سسپنشن سسٹم بہترین حالت میں تھا، اس کے باوجود جھٹکے لگ رہے تھے۔ سڑک گڑھوں اور ابھاروں سے بھری ہوئی تھی۔ بعض اوقات تو چاروں ٹائر الگ الگ سطحوں پر ہوتے تھے۔ اچانک نواب صاحب نے فولاد خان سے پوچھا۔ ''تمہارا پستول کہاں ہے؟''

''امارا بیلٹ کے ساتھ اے نواب صیب۔'' اس نے

جواب دیا۔ ''کوئی خطرا اے تو ام تیار رے گا۔''

''ہم عام راستے سے ہٹ گئے ہیں اس لیے کسی بھی صورت حال کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

راستہ نہ صرف طویل بلکہ بہت خراب بھی تھا۔ وہ بارہ بجے اس پر مڑے تھے اور تین بجے تک نصف راستہ بھی طے نہیں ہوا تھا۔ اس اچھلتے کودتے سفر نے سب کے معدوں کو مہمیز دی تھی اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ لنچ کے لیے رک گئے۔ البتہ نواب صاحب نے خبردار کر دیا کہ صرف بیس منٹ کا وقفہ ہے اور اس کے بعد لازمی روانہ ہونا ہے۔ صرف اسی صورت میں وہ رات سے پہلے ریسورٹس تک پہنچ سکتے تھے۔ اس لیے سب جلدی جلدی کھانے میں مصروف تھے۔ اس وقت وہ مظفر آباد سے کہیں اوپر تھے۔ یہ ویران اور سنسان نظر آنے والا علاقہ تھا۔ یہاں سڑک کے دونوں طرف گھنا جنگل تھا اور اس میں راستے بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ یعنی یہاں عام افراد کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ سڑک پر درختوں سے گرے سوکھے پتوں کا ڈھیر تھا اور یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ یہاں گاڑیوں کی آمد بھی کم ہوتی تھی۔ یہ جگہ سطح سمندر سے خاصی بلند تھی کیونکہ موسم گرما میں بھی یہاں سردی لگ رہی تھی۔ رات تو یقیناً بہت سرد ہو جاتی ہوگی۔ کہیں کہیں سے دور برف پوش پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ لنچ سے فارغ ہو کر وہ روانہ ہوئے اور ابھی مشکل سے سو گز آگے گئے ہوں گے کہ سڑک کی پہاڑ والی سمت سے ایک شخص لڑکھڑاتا ہوا آ کر نواب صاحب کی گاڑی کے آگے گرا۔ فولاد خان نے پھرتی سے بریک لگائے اور بے ساختہ بولا۔ ''خدائی خوار مرے گا کیا؟''

☆☆☆

انگریزوں کے زمانے میں یہ عمارت ریسٹ ہاؤس ہوا کرتی تھی جس میں اعلیٰ حکام ٹھہرتے تھے۔ مگر آزادی کے بعد یہ بیکار ہو گئی۔ حکام نے یہاں آنا چھوڑ دیا پھر عملہ بھی واپس بلا لیا گیا اور تب سے یہ عمارت ویران پڑی تھی۔ مضبوط پتھروں سے بنی اس عمارت پر کھپریل کی چھت تھی۔ تقریباً ایک کنال رقبے پر محیط اس عمارت میں کئی بڑے کمرے اور ہال تھے۔ اس کے چاروں طرف کسی زمانے میں بڑا سا باغ ہوتا تھا مگر اب وہاں گھنا جنگل اگ آیا تھا جو اس عمارت کو چھپا رہا تھا۔ نصف صدی تک ویران رہنے کے بعد چند سال پہلے یہ عمارت غیر آباد نہیں رہی تھی۔ یہاں پراسرار افراد کی آمد و رفت شروع ہوئی اور پھر انہوں نے یہاں باقاعدہ قبضہ کر لیا۔ بہت خاموشی سے یہاں سامان لایا جاتا اور عمارت کے اندرونی حصے میں تبدیلیاں ہوئیں۔ وہ بالکل بدل کر رہ گئی لیکن اس کا ظاہری روپ ویسا ہی رہا۔ اسے بالکل نہیں چھیڑا گیا تھا۔ حد یہ کہ عمارت میں آمد و رفت کے لیے ایک الگ سے سرنگ نما راستہ بنایا گیا اور اسے خفیہ رکھا گیا تھا۔

ریسٹ ہاؤس کی عمارت کے اندر اور تہ خانے کا اسٹرکچر توڑ کر اس میں نہایت جدید قسم کے کمرے بنائے گئے تھے۔ تہ خانہ صرف اس خفیہ پروجیکٹ کے لیے مخصوص تھا جس کے لیے یہ لوگ یہاں آئے تھے اور وہاں ہر کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ البتہ اوپری عمارت میں کام اور رہائش کے لیے کمرے بنائے گئے تھے۔ ایسے ہی ایک کمرے میں جوناتھن ایڈ موجود تھا۔ اس نے ڈاکٹروں جیسا لباس پہن رکھا تھا اور چھوٹے سے گلاس میں موجود وسکی کے گھونٹ لیتے ہوئے کسی سوچ میں گم تھا۔ تین سال پہلے وہ ڈپلومیٹک پاسپورٹ پر یہاں آیا تھا۔ اس کے بعد وہ سلپ ہو گیا۔ لیکن ان تین سالوں میں وہ دو بار اپنے وطن گیا اور آیا تھا۔ اس کی یہ آمد و رفت پاکستان کے پڑوسی ملک میں قائم ایک فوجی ہوائی اڈے سے ہوئی تھی۔

اس کا اصل نام کچھ اور تھا لیکن وہ جوناتھن ایڈ نام کے پاسپورٹ پر یہاں آیا تھا۔ چند سال پہلے اس نے مائکرو بائیولوجی میں اعلیٰ ڈگری حاصل کی اور ایک کمپنی میں ملازمت کرنے لگا۔ مگر دوران ملازمت اس سے ایک سنگین غلطی ہوئی۔ اس نے ایک مہنگے پروجیکٹ کے آخری مرحلے میں پروسیس غلط کر دیا اور کروڑوں ڈالرز مالیت کا پروجیکٹ ضائع گیا۔ اسے پھر سے شروع کرنا تھا اور کمپنی نے شروع کیا بھی لیکن پہلے اس نے جوناتھن کو ملازمت سے فارغ کیا۔ عملاً اسے دھکے دے کر دفتر سے نکالا گیا تھا اور ظاہر ہے اس کے بعد اسے کہیں اور ملازمت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہ چھوٹی موٹی ملازمتیں کر کے گزارہ کرنے لگا۔ چند سالوں میں اس کے ہوش ٹھکانے لگ گئے۔ اس کی ساری جمع پونجی ٹھکانے لگ گئی تھی اور وہ ایک بدحال سے کمرے میں رہتا تھا۔

وہ ایک کارخانے میں چوکیدار کی ملازمت کر رہا تھا اور اسے لگتا تھا کہ اس نے اعلیٰ تعلیم کا خواب دیکھا تھا۔ اب اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ انہی دنوں ایک پراسرار سا شخص اس سے ملا۔ جوناتھن ملازمت کے بعد خاصا وقت ایک گھٹیا سے بار میں گزارتا تھا۔ اس پراسرار شخص سے وہیں ملاقات ہوئی اور پھر دوسری ملاقات میں اس نے جوناتھن کو کام کی

پیشکش کی۔ اس نے بتایا کہ تین سال کا پروجیکٹ ہوگا اور کام بھی اس کی ڈگری کی مناسبت سے ہوگا۔ اس دوران میں اسے نہایت پرکشش معاوضہ دیا جائے گا اور کام مکمل ہونے پر اسپیشل بونس الگ ملے گا۔ معاوضہ اور خصوصی بونس کی رقم کا سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ کام کی نوعیت جانے بغیر اسے کرنے کو تیار ہو گیا۔ تب اس کی دوسری شناخت بنائی گئی اور اس کے تحت اس کا پاسپورٹ اور دوسری دستاویزات بنیں۔ وہ بہ ظاہر سفارتی عملے میں شامل ہو کر یہاں آیا تھا۔

مگر اس سرزمین پر اترتے ہی اس کی تمام دستاویزات ضائع کر دی گئیں۔ پھر اسے اس عمارت تک پہنچایا گیا۔ پروجیکٹ کے بارے میں بھی اسے یہیں پہنچ کر علم ہوا مگر اسے کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ ایک سال کی تنخواہ وہ پیشگی وصول کر چکا تھا۔ دوسرے اسے معلوم تھا کہ اس سے کوئی غیر قانونی اور غیر انسانی کام ہی لیا جائے گا۔ وہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا تھا۔ جوناتھن نے چند سالوں میں جس طرح کی زندگی گزاری تھی، وہ دولت اور پُرآسائش زندگی کے لیے شیطان کا چیلا بننے کے لیے بھی تیار تھا۔ اس نے آتے ہی پروجیکٹ پر کام شروع کر دیا اور اس کا کام تقریباً مکمل ہو گیا تھا مگر آج صبح ایک مسئلہ ہوا۔ اسے بتایا گیا کہ چیمبر فائیو کا آدمی نہ جانے کس طرح وہاں سے نکل گیا تھا، یہی نہیں وہ عمارت سے بھی غائب تھا۔

جوناتھن یہاں کا انچارج تھا اور اسے نصف درجن تربیت یافتہ افراد دیے گئے تھے جو ہر طرح کی صورتِ حال سے نمٹنا جانتے تھے۔ خاص پروجیکٹ کے لیے اس سمیت چھ افراد تھے اور یہ سب غیر ملکی تھے البتہ ان کا تعلق مختلف مغربی ممالک سے تھا۔ اسپیشل سروس کے افراد بھی مغربی ممالک سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا کام اس جگہ کی حفاظت کرنا اور یہاں کسی کو دخل اندازی کرنے سے روکنا تھا۔ اس جگہ کی خاص اور جدید ترین الیکٹرانک سیکیورٹی بھی تھی۔ معمولات اتنے منظم تھے کہ کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، ہر شخص اپنا کام جانتا تھا۔ ایک درجن غیر ملکیوں کے ساتھ یہاں صرف دو مقامی تھے۔ وہ پروجیکٹ اور اپنی شناخت کو خفیہ رکھنے کے معاملے میں بہت محتاط تھے۔ غیر ملکی بھی جب باہر جاتے تھے تو مقامی وضع قطع اور حلیہ بنا کر جاتے تھے۔

انہوں نے اپنی آمدورفت کے روٹس ایسے رکھے تھے جن میں عام لوگوں سے کم سے کم واسطہ پڑے۔ ریسٹ ہاؤس کی عمارت کے چاروں طرف کیمرے لگائے گئے تھے۔ ان کے علاوہ ایسے سینسرز تھے کہ اگر کوئی عمارت کے ایک خاص حد تک قریب آتا تو اندر الارم بج جاتا۔ عمارت کے درمیانی حصے اور اس کے نیچے موجود تہ خانے کو خاص طور سے دھات اور فائبرز کے ٹکڑوں سے بنایا گیا تھا۔ یہ جگہ مکمل طور پر ائر ٹائٹ تھی اور فرار ہونے والا شخص یہیں سے نکلا تھا۔ سیکیورٹی انچارج کرنل سوین نے اس کی غیر موجودگی جانتے ہی ہنگامی حالت کا الارم بجا دیا تھا۔ جوناتھن کی سمجھ سے بالاتر تھا کہ وہ اس جگہ سے نکلا کیسے؟ تین گارڈز اب اسے باہر تلاش کر رہے تھے۔ جوناتھن فکر مند تھا۔ اگر وہ آدمی نہ ملتا تو اس سے پوچھ گچھ ہوتی اور اس کا بھاگ نکلنا پروجیکٹ کے خاتمے کا سبب بھی بن سکتا تھا۔

وہ یہ بات چھپا بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ یہاں ہونے والے کیمروں کی ریکارڈنگ باقاعدگی سے باہر بھیجی جاتی تھی اور اس سے وہ لوگ جان جاتے تھے کہ پروجیکٹ پر کس حد تک کام ہو رہا ہے اور کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی ہے۔ یہاں ان کے سونے کے کمروں تک میں کیمرے لگے ہوئے تھے۔

جوناتھن فکر مند ہو رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک لڑکی اندر آئی۔ وہ مقامی اور کسی قدر موٹے نقوش کی حامل تھی لیکن اس میں نسوانی دلکشی کی کمی نہیں تھی۔ اپنی کسی قدر سفید رنگت کو اس نے میک اپ سے سرخ کیا ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں عجیب وضع کے ٹاپس تھے۔ گول دھاتی ٹاپس پر بندر نما شبیہ کندہ تھی۔ ''رانیا۔'' جوناتھن نے اسے دیکھ کر کہا۔ ''کچھ پتا چلا؟''

جوناتھن نے رانیا کو لگایا تھا کہ وہ باہر جانے والوں سے رابطے میں رہے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ریش، مائیکل اور کارل اس کے پیچھے ہیں۔ وہ بچ نہیں سکے گا۔ ویسے بھی وہ بس آخری وقت پر تھا۔''

جوناتھن نے گھڑی کی طرف دیکھا جس میں شام کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ اس نے سر ہلایا۔ ''اسے بس ختم سمجھو لیکن اس کا کسی کے سامنے آنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس سے وائرس کسی کو لگ سکتا ہے۔''

''ہاں، یہ خطرہ ہے۔'' رانیا فکر مند ہو گئی۔ اس کا تعلق پڑوسی ملک سے تھا۔ جوناتھن سے اس کی ملاقات وہیں ہوئی تھی۔ وہ کال گرل تھی اور جوناتھن سے پہلی ملاقات اسی سلسلے میں ہوئی تھی۔ لیکن جوناتھن اس سے اتنا خوش ہوا کہ اسے اس پروجیکٹ میں جاب دے کر ساتھ لے آیا۔ ایک طرح سے وہ مددگار تھی۔ تجربات کے لیے مقامی جوان وہی مہیا

کرتی تھی۔ وہ انہیں اپنے حسن کے جال میں پھنساتی اور پھر یہاں لے آتی تھی۔ مگر اس کا کام بہت کم تھا۔ مہینے میں شاید ایک دو بار ہی اسے کام کرنا ہوتا تھا اور باقی وقت وہ آرام کرتی تھی۔ یوں جوناتھن نے ایک طرح سے سرکاری خرچ پر محبوبہ رکھ لی تھی۔ رانیا یہاں کے معاملات سے خاصی حد تک واقف ہو گئی تھی اور بہ وقتِ ضرورت وہ کسی کی جگہ کام بھی کر سکتی تھی۔ اس لیے بھی جوناتھن کو فکر نہیں تھی کہ بات کھل گئی تو اسے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ وہ جس پروجیکٹ سے متعلق تھا، اس کی کوئی بات کھل ہی نہیں سکتی تھی۔ ہاں اگر اس کی غلطی سے پروجیکٹ ناکام ہوتا یا وہ پکڑے جاتے تو پھر اسے ہی ذمے دار سمجھا جاتا۔ اسی لمحے جوناتھن کے سامنے رکھے واکی ٹاکی سے بپ کی آواز آئی۔ اس نے واکی ٹاکی اٹھا کر بٹن دبایا۔

''یس؟''

دوسری طرف کرنل سوین تھا، اس نے کہا۔ ''ہم نے تلاش کر لیا ہے لیکن یہاں دو گاڑیوں میں کچھ لوگ بھی ہیں۔ مائیکل نے ان کی طرف ٹیسٹ شاٹ کیا ہے۔''

''جواب آیا؟''

''نہیں، عام لوگ لگ رہے ہیں۔''

''نمبر فائیو کہاں ہے؟''

''سڑک پر موجود ہے اور ساکت ہے۔'' دوسری طرف سے ریش نے کہا۔ ان سب کے واکی ٹاکی آپس میں منسلک تھے اور یہ خاصی دوری سے بھی کام کرتے تھے۔

''ان کا کیا کیا جائے؟''

جوناتھن نے سوچا اور بولا۔ ''سب کو ختم کر دو اور لاشیں جلا دو۔ کوئی خطرہ مول مت لینا۔ کام یقینی ہونا چاہیے۔''

''یس سر۔'' ریش نے جواب دیا۔

☆☆☆

پیچھے تیمور نے گاڑی روک دی۔ اب وہ ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ سب ہی اتر آئے تھے لیکن ان سے پہلے نواب صاحب اتر آئے تھے اور اس شخص کے پاس پہنچ گئے تھے جو سڑک پر اوندھے منہ پڑا مل رہا تھا۔ نواب صاحب اس کا معائنہ کر رہے تھے مگر انہوں نے اسے ہاتھ لگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تیمور اس کی طرف بڑھا تھا کہ نواب صاحب نے روک دیا۔ ''چھونا مت... یہ دیکھو۔''

آدمی مقامی تھا اور اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کی قمیص کا کالر جہاں سے ہٹا ہوا تھا، وہاں اس کی گردن اور منہ پر آبلے سے دکھائی دے رہے تھے اور یہ صرف آبلے نہیں تھے، بہت تیزی سے بڑھتے ہوئے زخم تھے۔ اچانک وہ تڑپ کر سیدھا ہوا تو اس کا چہرہ دیکھ کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کا چہرہ چھوٹے چھوٹے آبلوں سے بھرا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں کی جگہ تاریک گڑھے تھے۔ ان گڑھوں سے گندی سی رطوبت خارج ہو رہی تھی۔ اس کا منہ کرب آمیز انداز میں کھلا ہوا تھا مگر وہ چیخ نہیں پا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے سانس نہیں آ رہی ہے۔ پھر اس نے اپنا گلا تھام لیا اور سانس کے لیے تڑپنے لگا۔ شامی نے کہا۔ ''اسے مدد کی ضرورت ہے۔''

''کوئی پاس نہ جائے۔'' نواب صاحب نے سخت لہجے میں کہا۔ ''سب پیچھے ہٹو... یہ کسی کیمیائی یا حیاتیاتی ہتھیار کا شکار ہوا ہے۔''

اسی لمحے پہاڑ کی طرف سے کسی نے فائر کیا اور گولی شامی اور تیمور کے درمیان سے گزر گئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ سب مرسیڈیز کی آڑ میں ہو گئے۔ فولاد خان نے پستول نکال لیا تھا مگر نواب صاحب نے اسے فائرنگ سے روکا۔ ''انہوں نے آزمانے کے لیے فائر کیا ہے۔''

''کیا مطلب دادا حضور؟'' تیمور نے پوچھا۔

''یہ کسی خودکار رائفل کا فائر ہے۔ اس نے مارنا ہوتا تو وہ برسٹ مارتا۔ وہ زیادہ دور نہیں ہے، شاید سو گز کا فاصلہ ہو گا۔ شاید وہ چیک کر رہا ہے کہ ہمارے پاس ہتھیار ہیں یا نہیں۔''

جوجی ایک ٹائر کے ساتھ سجدے والی پوزیشن میں پڑا تھا اور غالباً ان کے ساتھ آنے پر پچھتا رہا تھا۔ نوشی گاڑی سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ وہ ہراساں نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی ان لوگوں کے ہمراہ مشکل مراحل سے گزر چکی تھی۔ تیمور پیچھے سے اور شامی سامنے والی طرف سے جھانک کر دیکھ رہے تھے کہ فائر کرنے والے کہاں تھے؟ مگر بہت گھنے درختوں اور پھر سورج کی روشنی دوسری طرف ہونے کی وجہ سے وہاں تقریباً اندھیرا تھا اور اس میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جوجی نے کانپتے لہجے میں پوچھا۔ ''شامی بھائی، یہ کیا ہے؟''

''کسی رائفل کا فائر۔'' شامی نے جواب دیا اور نواب صاحب سے پوچھا۔ ''کوئی اضافی ہتھیار ہے؟''

''گاڑی میں ایک پستول ہے۔''

شامی نے دروازہ کھولا اور لیٹے لیٹے اندر سرک کر گاڑی سے پستول اور اس کا اضافی میگزین نکال لیا۔ یہ اعشاریہ تین آٹھ کا کولٹ پسٹل تھا۔ فولاد خان کے پاس بڑا بریٹا تھا۔ تیمور نے کہا۔ ''ہمیں ڈھلان پر جانا ہوگا۔ یہاں

پر ہم آسانی سے نشانہ بن جائیں گے۔"

"پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کے عزائم کیا ہیں اور یہ کتنے ہیں؟" شامی نے کہا۔ اس کی نظر ساکت ہو جانے والے آدمی پر تھی، اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ شلوار قمیص، نقوش اور سرخ بالوں سے وہ مقامی ہی لگ رہا تھا مگر اب اس کے چھالے بہت تیزی سے بڑھ رہے تھے اور اس کا چہرہ تقریباً ناقابلِ شناخت ہو گیا تھا۔ خاصی دور سے بھی اس کے پاس سے بہت عجیب اور چبھتی ہوئی بدبو ان تک آ رہی تھی۔ "یہ معاملہ پراسرار لگ رہا ہے۔ دادا حضور کا کہنا ہے کہ یہ کسی کیمیائی ہتھیار کا شکار ہوا ہے۔"

"دادا جان! آپ یہ بات کیسے کہہ سکتے ہیں؟" تیمور نے ادب سے پوچھا۔

"تم بھول رہے ہو، ہم دوسری جنگِ عظیم لڑ چکے ہیں۔" نواب صاحب نے کہا۔ "اس دوران میں کیمیائی ہتھیاروں کے یونٹ میں بھی کام کیا تھا۔ جرمنوں کے پاس کیمیائی ہتھیار تھے اس لیے ٹریننگ کے دوران ہمیں خاص طور سے ان سے نمٹنے اور بچنے کی تربیت دی گئی تھی۔ پھر ہم نے اس بارے میں مطالعہ بھی کیا ہے۔"

اس میں شبہ نہیں کہ نواب صاحب کی معلومات اور تجربہ ان سے کہیں زیادہ تھا۔ "لیکن یہاں اس علاقے میں کوئی کیمیائی ہتھیار کہاں سے آ گیا؟"

"یہ تو یہی بتا سکتا ہے جس نے فائر کیا ہے۔" نواب صاحب بولے۔ "ایسا لگ رہا ہے یہ آدمی کسی قید سے نکل کر بھاگا ہے اور مسلح شخص اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ ممکن ہے اور مسلح افراد ہوں یا آنے والے ہوں۔ ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا ہوگا۔"

"ہم سر نیچے کر کے بی ڈرائیو کر سکتا اے۔" فولاد خان نے اپنی خصوصیت سے آگاہ کیا۔

"خطرہ شیشوں سے ہے۔" نواب صاحب بولے۔ "باڈی بلٹ پروف ہے۔"

"تب ہمیں نکل جانا چاہیے۔" تیمور نے دروازہ کھولا۔

"ایسے نہیں۔" نواب صاحب نے اسے گھورا۔ "فولاد خان گاڑی ڈرائیو کر کے لے جائے گا اور ہم اس کی آڑ میں ہوں گے۔ اندر ہم سب اتنے محفوظ نہیں ہوں گے۔"

فولاد خان اندر گھسا اور اس نے انجن اسٹارٹ کر کے گیئر بدلا اور مرسیڈیز کو آگے بڑھایا۔ وہ نشستوں کے درمیان گھسا ہوا تھا اور مرسیڈیز میں خاصی گنجائش ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ آنے والے پہلے برسٹ سے بچ گیا۔ برسٹ نے پہاڑ والی سائڈ کے دونوں شیشوں کو چکنا چور کر دیا تھا، البتہ باڈی سے گولیاں اچٹ گئی تھیں۔ تیمور جو پیچھے کی طرف تھا اور اس کے پاس فولاد خان کا بریٹا تھا، اس نے دیکھ لیا اور اسی طرف دو فائر کیے۔ اس کا مقصد جتانا تھا کہ وہ نہتے نہیں ہیں۔ مگر وہ ان کا ارادہ بھانپ گئے۔ اگلے برسٹ نے مرسیڈیز کے دونوں ٹائرز تباہ کر دیے اور وہ ایک طرف سے بیٹھ گئی۔ اس بار فائر ایک اور سمت سے ہوا تھا۔ یعنی کم سے کم دو خودکار ہتھیاروں سے مسلح افراد اوپر موجود تھے۔ نواب صاحب نے فولاد خان کو فوری باہر آنے کا حکم دیا کیونکہ گاڑی ایک طرف جھکنے سے اب وہ خطرے میں آ گیا تھا۔ فولاد خان سرک کر باہر آ گیا۔ شامی مضطرب ہو رہا تھا، اس نے نواب صاحب سے کہا۔

"ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

"کیسے؟" نواب صاحب نے دور کھڑی لینڈ کروزر کی طرف دیکھا، اس تک جانا اب ممکن نہیں رہا تھا۔ درمیان میں کم سے کم بیس گز کا فاصلہ تھا۔ اگر وہ بہت تیزی سے بھاگتے تب بھی امکان تھا کہ اوپر گھات لگائے لوگ انہیں... بہ آسانی نشانہ بنا لیں گے۔

"ہمیں ڈھلان پر اترنا ہوگا۔" شامی نے کہا۔ سڑک یہاں مشکل سے دس فٹ چوڑی تھی اور فولاد خان نے کچھ دور تک جو ڈرائیو کی تھی، اس کے نتیجے میں کار ڈھلان کی طرف آ گئی تھی۔ ویسے بھی اسے آبلہ زدہ آدمی سے بچ کر گزرنا پڑا تھا۔ اب ڈھلان ان سے دو فٹ دور تھی اور وہ کوشش کرتے تو بچ کر اس پر اتر سکتے تھے۔

"یہ جگہ نشانے پر ہے؟" نواب صاحب نے کہا۔

"ابھی چیک کر لیتے ہیں۔" شامی نے کہا اور جوجی سے بولا۔ "ذرا نیچے جا کر دکھاؤ۔"

"نہیں جی۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔ "میں آپ کو فالتو نظر آتا ہوں یا قربانی کا بکرا ہوں؟ آپ خود جائیں۔"

"تب یہیں بیٹھے رہو، وہ آ کر سب سے پہلے تمہارا کام تمام کریں گے۔" شامی نے کہا اور اچانک دوڑ کر ڈھلان سے اتر گیا۔ نواب صاحب کا دل ایک لمحے کو رکا۔ ناخلف سہی مگر وہ بہرحال ان کا پوتا تھا۔ اوپر سے ایک فائر ہوا مگر گولی کہیں اور گئی۔ شامی اتنی تیزی سے گیا تھا کہ اسے ڈھلان پر رکنے کے لیے ایک درخت سے ٹکرانا پڑا اور نہ وہ

خاصا نیچے جاتا۔ اسے چوٹ آئی تھی مگر وہ رک گیا۔ اگر وہ اسی رفتار سے نیچے جاتا تو اس میں ہڈیاں پسلیاں ٹوٹنے کے امکانات روشن تھے۔ پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "سب ایک ایک کر کے آئیں، میں روک لوں گا مگر آنا تیزی سے ہوگا... جھجکنا یا رکنا بالکل نہیں ہے۔"

سب سے پہلے نواب صاحب آئے اور شامی نے بہ مشکل انہیں روکا کیونکہ وہ خاصے بھاری بھرکم تھے۔ وہ تقریباً گزر گئے تھے بس عین موقع پر شیروانی ہاتھ میں آ گئی۔ انہوں نے اس حال میں بھی ڈانٹا۔ "برخوردار، اس طرح روکتے ہیں۔"

"سوری دادا جان۔" شامی نے خفت سے کہا اور عقب سے ان کی شیروانی چھوڑ دی۔ پھر فولاد خان آیا تو کام آسان ہو گیا۔ نوشی کا بوجھ شامی نے خوشی سے برداشت کیا اور اس پر دانت بھی نکالے جس پر نوشی شرمائی اور پھر اسے گھورا۔ اس کے پاس سے نیچے جاتے ہوئے وہ زیرِ لب بولی۔

"بدتمیز۔"

"بسروچشم۔" شامی نے جواب دیا۔ وہ بالکل بھول گیا تھا کہ نوشی کے ساتھ آنے پر وہ کتنا دکھی تھا۔ پھر جوجی جھجک کر آیا اور مرتے مرتے بچا کیونکہ گولی اس کے سر کے پاس سے گزری تھی۔

"دیکھا جی۔" اس نے ہانپتے کانپتے ہوئے کہا۔ "آپ کی طرح یہ بھی میرے دشمن ہو رہے ہیں، مجھ ہی پر گولی چلائی۔"

"نیچے ہو جاؤ ورنہ گولی سر میں لگے گی اور اس میں بھرا بھوسا بکھر جائے گا۔"

"میرے سر میں بھوسا نہیں ہے۔" جوجی نے جلدی سے سر نیچے کر لیا۔ تیمور اوپر رہ کر جواب دے رہا تھا۔ فولاد خان اس کا ساتھ دینے پر آمادہ تھا۔ مگر شامی نے اسے نیچے جانے کو کہا۔ "ان دونوں کی مدد کرو، یہ خود سے نیچے نہیں جا سکیں گے۔"

"میں چلی جاؤں گی۔" نوشی نے کہا۔

"میں نہیں جا سکتا۔" جوجی نے نفی میں سر ہلایا۔ فولاد خان اس کا بازو پکڑ کر نیچے اترنے لگا۔ سب سے آخر میں تیمور نیچے آیا۔ اس دوران میں اوپر سے رہ رہ کر فائرنگ ہو رہی تھی اور گولیاں درختوں کے اوپری حصوں پر لگ رہی تھیں۔ تیمور نے آتے ہی کہا۔

"جلدی کرو، وہ تین ہیں اور تینوں ہی خودکار رائفلوں سے مسلح ہیں۔"

"یہ کیا مصیبت ہیں۔" شامی نے تقریباً لڑھکتے ہوئے کہا۔

"مجھے لگ رہا ہے یہاں کوئی چکر چل رہا ہے۔ یہ ویران علاقہ ہے کیونکہ پہاڑ بہت مشکل اور ناقابلِ عبور ہیں۔ آگے تو برف پوش پہاڑ ہیں۔ آبادی بہت کم ہے۔"

"مگر کیمیائی یا حیاتیاتی ہتھیار سمجھ سے بالاتر ہیں۔" تیمور نے ایک گری شاخ کو پھلانگتے ہوئے کہا۔ "تم نے اس شخص کا حشر نہیں دیکھا، وہ کسی ایسی ہی چیز کا شکار ہوا ہے۔"

"ہو سکتا ہے اسے کوئی بیماری ہو یا کسی نے اس پر تیزاب پھینک دیا ہو۔"

اسی لمحے انہیں اوپر سے بہت تیز گیس خارج ہونے جیسی آواز سنائی دی۔ انہوں نے رک کر دیکھا۔ سڑک کی طرف سے ایسی روشنی جھلک رہی تھی جیسے وہاں کوئی تیز شعلہ جل رہا ہو۔ تیمور نے کہا۔ "میرے خدا! وہ اس کو جلا رہے ہیں۔"

"جلا رہے ہیں... وہ کیوں؟"

"میرا خیال ہے یہ کیمیائی کے بجائے بائیولوجیکل ایجنٹ ہے۔ اسی وجہ سے وہ اسے آگ لگا رہے ہیں تاکہ وائرس پھیل نہ سکے۔"

شامی اور تیمور دونوں نے محسوس کیا کہ چکر زیادہ بڑا تھا اور ان کا اس سے دور رہنا ہی مناسب تھا۔ وہ دوبارہ نیچے اترنے لگے۔ اچانک شامی نے رک کر کہا۔ "یہ لوگ کہاں ہیں؟"

انہیں آس پاس کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہاں جنگل بہت گھنا نہیں تھا اس لیے روشنی نیچے تک آ رہی تھی۔ اس روشنی میں انہیں دور تک وہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ مگر اسی لمحے انہیں فولاد خان نے روکا۔ وہ ایک درخت کی آڑ میں تھا اور اس کے ساتھ جوجی بھی تھا۔ البتہ نوشی اور نواب صاحب نظر نہیں آ رہے تھے۔ شامی نے پوچھا۔ "دادا جان اور نوشی کہاں ہیں؟"

"وہ آگے اے۔" فولاد خان نے کہا۔ "ام آپ کا انتظار فرماتا۔"

"ہمیں ایک جگہ رہنا چاہیے۔" شامی نے کہا۔ "ہمیں واپس ہائی وے کی طرف جانا ہوگا۔"

"اور گاڑیاں؟" تیمور نے پوچھا۔

"وہ یہیں پڑی رہیں، بعد میں منگوا سکتے ہیں۔ اس

وقت تو جان بچانے کی فکر کرنی چاہیے۔"
کوئی سو گز نیچے آنے کے بعد ڈھلان کم اور آسان ہو گئی تھی۔ مگر اتنی بھی آسان نہیں ہوئی تھی کہ وہ دوڑتے چلے جاتے۔ اس صورت میں نواب صاحب اور نوشی کو پاس ہونا چاہیے تھا مگر وہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ شامی فکر مند ہو گیا۔
"دادا حضور اس عمر میں کس رفتار سے گئے ہوں گے۔"
اگر نواب صاحب لڑھک گئے ہوتے تب بھی نوشی ساتھ تھی، اگر وہ ان کو سنبھال نہ پاتی تو انہیں تو بتا سکتی تھی۔ اس طرح خاموش نہ رہتی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ صحیح سلامت تھے مگر کہیں اور نکل گئے تھے۔
"آواز دی جائے۔" تیمور نے تجویز پیش کی اور وہ نواب صاحب کو پکارنے جا رہا تھا کہ شامی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے اوپری درختوں میں کسی کی جھلک دیکھی تھی۔
"شش... نیچے جھک جاؤ۔"
وہ سب پھرتی سے درختوں کی آڑ میں ہو گئے۔ چند لمحے بعد انہیں اوپر تین افراد حرکت کرتے دکھائی دیے اور وہ ان سے ڈھائی تین سو گز سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اپنے ہتھیاروں اور انداز سے وہ تربیت یافتہ قاتل لگ رہے تھے۔ وہ خطرے میں تھے۔

☆☆☆

نواب صاحب اور نوشی ساتھ ساتھ تھے۔ دراصل نوشی نواب صاحب کو سہارا دے رہی تھی۔ اسے احساس تھا کہ اس خطرناک ڈھلان پر نواب صاحب اس عمر میں آسانی سے حرکت نہیں کر سکیں گے اور انہیں سہارے کی ضرورت پڑے گی۔ جہاں مشکل گزرگاہ آتی، نوشی انہیں سہارا دیتی تھی۔ یہ کام وہ اتنے غیر محسوس انداز میں کرتی کہ نواب صاحب کو احساس نہیں ہوتا تھا۔ نواب صاحب اس معاملے میں روایتی وضع داری رکھتے تھے کہ ضرورت کے باوجود اپنے چھوٹوں سے مدد نہیں طلب کر سکتے تھے اور یہاں حکم دینے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے وہ نوشی کا سہارا قبول کرتے رہے۔ اس کی وجہ سے نواب صاحب بہت کم وقت میں خاصا نیچے آ گئے تھے پھر ایک جگہ وہ سانس درست کرنے کے لیے رکے تو انہوں نے نوشی کو شاباشی دی۔ "اللہ خوش رکھے، بہت سعادت مند بچی ہو۔"
نوشی شرمائی۔ "میں نے تو کچھ نہیں کیا۔"
"یہ لوگ کہاں ہیں؟" نواب صاحب نے اوپر دیکھا مگر ان میں سے کوئی نظر نہیں آیا۔ دراصل وہ ڈھلان پر دائیں طرف اتر آئے تھے جبکہ باقی سب بائیں طرف تھے۔ نوشی جس جھاڑی کے پاس تھی، اس نے اسے ہٹایا تو اس کے عقب میں ایک نالہ دکھائی دیا۔ اس نے نواب صاحب کو دکھایا۔
"اگر اس میں اتر جائیں تو ہم آرام سے سفر کر سکتے ہیں۔"
"ہاں مگر باقی سب سے الگ ہو سکتے ہیں۔"
نوشی نے سوچا اور سر ہلایا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہمیں ان کو تلاش کرنا ہوگا۔"
"ہمیں ہائی وے کی طرف جانا ہوگا، وہیں سے ہم مدد حاصل کر سکتے ہیں۔"
اسی لمحے اوپر کہیں کوئی شاخ چٹخی اور وہ تیزی سے جھاڑی کی آڑ میں ہو گئے۔ آواز بہت دور سے نہیں آئی تھی۔ پھر اوپر ایک چٹان پر ایک سایہ نمودار ہوا۔ اس کے شانے سے لٹکی خودکار رائفل بتا رہی تھی کہ وہ ان میں سے نہیں تھا۔ نواب صاحب نے نوشی کا بازو تھاما اور خاموشی سے نالے میں اتر گئے۔ اس کے دونوں طرف گھنی جھاڑیاں تھیں اور یہاں وہ اوپر سے آنے والوں کی نظر سے محفوظ تھے۔ وہ نالے میں رک گئے تھے مگر چند منٹ بعد آہٹ نزدیک سے آئی تو انہیں مجبوراً نالے میں ہی آگے سفر کرنا پڑا۔ نالا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ مشکل سے چار فٹ چوڑا ہوگا اور اس کی تہ تو بس ایک ڈیڑھ فٹ چوڑی تھی۔ اس پر چھوٹے پتھروں اور بجری کی تہ جمی تھی۔ اس پر چلنا آسان تھا اور سہارے کے لیے وہ جھاڑیوں کو پکڑ سکتے تھے مگر یہاں احتیاط سے کام لے رہے تھے کہ جھاڑی ہلنے سے پیچھے آنے والوں کو پتا چل جاتا۔ مگر جب وہ تقریباً سو گز نیچے آ گئے تو اچانک نوشی کا پاؤں کسی پتھر پر آیا اور وہ چیخ اٹھی۔ فوراً ہی اوپر سے کسی نے کہا۔ "ہیئر... لک ڈیٹ۔"
"امریکی۔" نواب صاحب نے زیرِ لب کہا اور نوشی سے پوچھا۔ "کیا ہوا ہے؟"
"پاؤں مڑ گیا ہے۔" وہ کراہی۔ اصل میں اس نے عام سینڈل پہنا ہوا تھا اور اس کا تلا سپاٹ لیکن پیچھے سے خاصا اونچا تھا۔ پہاڑی اور ناہموار راستوں پر سفر کے لیے ناموزوں تھا۔ مگر اس نے کب سوچا تھا کہ اسے یوں پہاڑوں پر بھاگ دوڑ کرنا پڑے گی۔ نواب صاحب نے اس کا پاؤں ٹٹولا تو ٹخنے کے پاس ورم محسوس ہوا۔ چوٹ سنگین لگ رہی تھی ورنہ اتنی تیزی سے ورم نہ ہوتا۔ اب تک نوشی انہیں سہارا دیتی آئی تھی مگر اب انہیں اسے سہارا دینا

تھا۔ انہوں نے نوشی کا ہاتھ تھاما اور بولے۔
"اپنا بوجھ مجھ پر ڈال میری بچی۔"
"شکریہ انکل۔" نوشی نے کہا اور وہ دونوں پھر نیچے کی طرف بڑھنے لگے۔ اسی لمحے کسی نے اوپر سے برسٹ مارا۔

☆☆☆

فائرنگ کے شور نے انہیں چونکا دیا تھا۔ آواز دائیں طرف سے آئی تھی اور ان سے خاصے فاصلے پر فائرنگ ہوئی تھی۔ شامی نے کہا۔ "میرا خیال ہے دادا جان اور نوشی اسی طرف گئے ہیں۔"
"تو یہ فائرنگ..." تیمور کہتے کہتے رک گیا۔
"ہمیں اسی طرف جانا ہوگا۔" شامی نے کہا۔ وہ ڈھلان کے نچلے حصے تک آ گئے تھے اور یہاں انہیں دو پہاڑوں کے درمیان بہنے والا دریا نظر آ رہا تھا مگر وہ ابھی خاصا نیچے تھا۔ یہاں درخت کم اور جھاڑیاں زیادہ تھیں اس لیے روشنی بھی زیادہ تھی۔ اس لیے ان کے دیکھ لیے جانے کا امکان بھی زیادہ تھا۔ مگر وہ رک نہیں سکتے تھے اور اس فائرنگ نے ان کو پریشان کر دیا تھا۔ اگرچہ ایک برسٹ کے بعد دوبارہ کوئی آواز نہیں آئی تھی لیکن دو افراد کے لیے یہ ایک برسٹ بھی کافی سے زیادہ تھا۔ اب ہتھیار تیمور اور فولاد خان کے پاس تھے۔ تیمور کا نشانہ بہتر تھا اس لیے کولٹ اس نے اپنے پاس رکھا۔ شامی نے ایک شاخ اٹھالی تھی... بہ وقتِ ضرورت وہ اس سے ہتھیار کا کام لے سکتا تھا۔ اچانک انہیں کسی نے للکارا۔
"ہینڈز اپ۔"
"بھاگو۔" تیمور نے کہا تو وہ سب بھاگے، اسی لمحے اوپر سے برسٹ مارا گیا مگر وہ ان سے دور گیا تھا۔ وہ کھلی جگہوں کے بجائے جھاڑیوں میں دوڑ رہے تھے۔ جوجی ویسے تو مر مر کر چل رہا تھا مگر جب جان پر بنی تو وہ بھاگنے میں سب سے آگے تھا۔ شامی نے کہا۔
"دریا کی طرف نکلو، وہاں زمین ہموار ہے۔"
"کلا جگا اے، سب مارا جائے گا۔" فولاد خان نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ایک برسٹ کے بعد دوبارہ فائرنگ نہیں ہوئی تھی مگر وہ رکے بغیر بھاگتے چلے گئے۔ پھر یہاں ڈھلان ایسی تھی کہ تیز رفتاری کی کوشش میں وہ سب خود بہ خود دریا کے کنارے جا نکلے۔ یہ اصل میں ندی تھی مگر گرما کی وجہ سے پانی بہت زیادہ تھا اور یہ دریا کا منظر پیش کر رہی تھی۔ فولاد خان کی بات درست نکلی۔ کھلی جگہ آتے ہی وہ پیچھا کرنے والوں کی نظر میں آ گئے تھے۔ وہ مشکل سے دو سو گز آگے گئے ہوں گے کہ عقب سے دو مسلح افراد نمودار ہوئے۔ شامی مڑ کر دیکھ رہا تھا اور اس کا دیکھنا کام آ گیا۔ اس نے چلا کر کہا۔
"لیٹ جاؤ۔"
وہ گرے اور گولیاں ان کے سروں پر سے گزر گئیں۔ وہ پتھروں کی آڑ لے رہے تھے اور حملہ آور مسلسل گولیاں برسا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ انہیں مارنے کا تہیہ کر کے آئے تھے۔ فائرنگ کرتے ہوئے وہ ان کی طرف ہی آ رہے تھے۔ اگر وہ کچھ آگے آ جاتے تو پھر یہ معمولی پتھر انہیں نہیں بچا سکتے تھے۔ ایسے میں تیمور نے ہمت کی اور پلٹ کر پستول ان کی طرف کر کے لگاتار فائر کیے۔ اس نے پورا میگزین خالی کر دیا تھا مگر اس کا فائدہ ہوا۔ آگے والا اچانک الٹ کر گرا۔ اسے گولی لگی تھی اور اس کا ساتھی فائرنگ بھول کر اسے گھسیٹ کر ایک بڑے درخت کی آڑ میں لے جانے لگا۔ فائرنگ رک گئی تھی۔ فولاد خان اس پر فائرنگ کرنے جا رہا تھا مگر شامی نے اسے روک دیا۔
"یہاں سے نکلو... ہم خطرے میں ہیں۔"
"کہاں جائیں؟" جوجی نے پوچھا۔
"دریا میں۔" شامی نے دھارے کی طرف دیکھا۔ "یہ تیزی سے ہمیں یہاں سے دور لے جائے گا۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ اٹھ کر ہم چار قدم بھی نہیں بھاگ سکتے۔"
"اس کا دھارا دیکھ رہے ہو، یہ ہمیں مار دے گا۔" تیمور نے اعتراض کیا۔
"میں تیرنا نہیں جانتا۔" جوجی نے بھی انکار کیا۔
مگر فولاد خان نے تائید کی۔ "شامی صیب ٹیک فرماتا اے... ام ندی سے نکل سکتا اے۔"
پیچھا کرنے والے نے محفوظ مقام پر پہنچتے ہی ان کی طرف برسٹ مارا تھا اور وہ بحث بھول کر بے ساختہ ندی کی طرف سرکنے لگے۔ اس بار بھی جوجی نے سبقت رکھی۔ حالانکہ اسے تیرنا نہیں آتا تھا۔ البتہ اسے پانی میں دھکا فولاد خان نے دیا۔ جوجی نے چیخ ماری اور واپس آنے کی کوشش کی۔ تیمور اور شامی ایک ساتھ پانی میں اترے تھے۔ اس دوران میں بچنے والا رہ رہ کر گولیاں برسا رہا تھا مگر درمیان میں اتنے پتھر تھے کہ اس کی چلائی گولیاں ان تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر رہی تھیں۔ فولاد خان نے دھارے میں جانے سے پہلے جوجی کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی ورنہ وہ وہیں

رہ جاتا اور مارا جاتا کیونکہ اس میں پانی میں اترنے کی ہمت نہیں تھی۔ پانی کی رفتار بہت تیز تھی، وہ سیکنڈوں میں کہیں کے کہیں جا نکلے تھے۔ جوجی غوطے کھا رہا تھا اور فولاد خان اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''خدائی... خوار... آرام سے... انسان کا بچہ بنو... آت مت چلاؤ... ٹانگ چلاؤ... او بدبخت امارا گردن مت پکڑو...''

تیمور اور شامی اسی چکر میں آگے نکل گئے تھے۔ فائرنگ کرنے والا انہیں یوں فرار ہوتے دیکھ کر آڑ سے نکل کر ان کی طرف دوڑا۔ مگر ان کی رفتار کہیں تیز تھی۔ پھر بھی اس نے انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کی مگر اس بار بھی ناکامی اس کا مقدر رہی۔ تیز رفتار دھارے میں وہ اس طرح ڈوبتے ابھرتے جا رہے تھے کہ حملہ آور کو ٹھیک سے نظر بھی نہیں آ رہے تھے۔ ایک منٹ سے بھی پہلے وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے اور اب کنارے کی طرف آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تیمور کسی طرح ندی کی ایک چٹان کو پکڑنے میں کامیاب رہا۔ پھر شامی نے تیمور کو پکڑا اور اسی چٹان پر چڑھ گیا۔ تب اس نے دیکھا آگے ندی آبشار کی صورت میں گر رہی تھی۔ اگر فولاد خان اور جوجی اس آبشار سے گرتے تو ان کا بچنا محال لگ رہا تھا۔ اگر بچ جاتے تب بھی جوجی فولاد خان کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ الگ ہوتا تو فوراً ڈوب جاتا۔ شامی نے چلا کر تیمور کو بتایا۔ پھر اس نے چٹان پر لیٹ کر تیمور سے کہا۔ ''میں تمہارا ہاتھ پکڑتا ہوں، تم فولاد خان کو پکڑنے کی کوشش کرو۔''

''فولاد خان۔'' تیمور نے اپنی طرف آتے فولاد خان اور جوجی کو دیکھا۔ ''کہیں یہ مجھے بھی نہ لے جائیں۔''

اس دوران میں شامی نے اپنی تجویز میں ترمیم کرتے ہوئے اپنی پتلون سے بیلٹ کھینچ لی اور تیمور نے اسے تھام کر چٹان چھوڑ دی۔ یہ زیادہ آسان تھا۔ شامی خود کو چٹان پر قائم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر جب تیمور نے فولاد خان کو پکڑا تو جھٹکا اتنا شدید تھا کہ وہ بس پانی میں جاتے جاتے بچا۔ نہ جانے کیسے اس نے خود کو اپنی جگہ قائم رکھا۔ پھر اس نے بیلٹ کھینچی اور وہ تینوں ایک ایک کر کے کنارے پر چڑھ گئے۔ جوجی خاصا پانی نوش کر چکا تھا اور اس کی حالت بری تھی۔ وہ بری طرح کھانس رہا تھا اور اس کے ناک منہ سے پانی نکل رہا تھا۔ وہ دہرا ہوا جا رہا تھا۔ جب فولاد خان نے اس کی کمر پر دو کے مارے تو اس کے پھیپھڑوں میں پھنسا پانی نکلا اور اس کی کھانسی رکی۔

''میں... مرتے... مرتے بچا۔'' اس نے رک رک کر کہا۔

''لیکن مرے نہیں۔'' تیمور نے اسے تسلی دی۔

''ہمیشہ کی طرح۔'' شامی نے کہا۔

فولاد خان کا پستول محفوظ تھا کیونکہ اس نے اسے ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ تیمور نے پہلے ہی بیلٹ میں اڑس لیا تھا۔ دونوں ہتھیار بھیگ گئے تھے مگر اعلیٰ درجے کے تھے اس لیے انہیں امید تھی کہ وہ بہ وقتِ ضرورت کام کریں گے۔ وہ تقریباً ایک کلومیٹر آگے نکل آئے تھے۔ اب انہیں نواب صاحب اور نوشی کی فکر ہو رہی تھی۔

☆☆☆

برسٹ اندازے سے یا انہیں ڈرانے کے لیے مارا گیا تھا اس لیے گولیاں کہیں دور گئیں اور وہ محفوظ تھے۔ نواب صاحب نے بروقت نوشی کے منہ پر ہاتھ رکھا ورنہ وہ چیخ مارنے والی تھی۔ وہ آہستہ سے بولے۔ ''آواز نہ نکلے۔ اب وہ آواز سے ہمارا پتا چلانے کی کوشش کریں گے۔''

نوشی کے پاؤں کی تکلیف کسی قدر کم ہوئی تھی اور اب وہ اس پر بھی زور دے کر چل رہی تھی۔ ''یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟''

''خدا جانے مگر یہ ہمارے درپے ہیں۔ سامنا ہوتے ہی مارنے کی کوشش کریں گے اس لیے ان سے دور رہنا ہی مناسب ہوگا۔''

نالا اب نشیب کی طرف جا رہا تھا اور اگر اوپر بارش ہوئی ہوتی تو اس میں پانی ہوتا لیکن وہ خشک تھا۔ کہیں کہیں مٹی گیلی تھی اور گھاس اگ آئی تھی۔ نواب صاحب کا کلا جھاڑیوں سے الجھ رہا تھا اس لیے انہوں نے اتار کر وہیں چھوڑ دیا۔ یہ کلا انہیں بہت عزیز تھا مگر بہرحال جان سے بڑھ کر نہیں تھا۔ بالآخر وہ کسی قدر ہموار زمین تک پہنچے اور انہیں سامنے دریا نظر آنے لگا۔ اس میں پانی خاصا زیادہ تھا۔ اچانک ہی فائرنگ کی آواز آئی۔ خودکار رائفلیں گولیاں برسا رہی تھیں پھر جواب میں پستول کی آواز بھی آئی اور اس کے بعد انہوں نے اپنے سامنے سے دریا میں شامی، تیمور، جوجی اور فولاد خان کو گزرتے دیکھا۔ ''انکل! وہ دیکھیں۔'' نوشی نے جوش سے کہا۔

وہ باہر نکلنا چاہتی تھی مگر نواب صاحب نے روک لیا۔ ''صبر... وہ لوگ بھی پاس ہیں۔''

نواب صاحب کی بات درست ثابت ہوئی۔ جب ایک سفید فام دکھائی دیا جو ان چاروں پر فائرنگ کر رہا تھا مگر

نواب صاحب کو امید تھی دریا جس رفتار سے بہہ رہا تھا، وہ خاصا آگے جا چکے ہوں گے۔ انہوں نے خود سے کہا۔

''کوئی بڑی گڑبڑ ہے۔''

''کیا مطلب؟'' نوشی بولی۔

''جس نے ہمیں للکارا تھا، وہ امریکی لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔ ابھی جو شخص نظر آیا ہے، وہ بھی سفید فام ہے۔ یہ اس علاقے میں کیا کر رہے ہیں؟ ہماری معلومات کے مطابق اس علاقے میں ایسا کوئی ادارہ نہیں ہے جس میں غیر ملکی کام کرتے ہوں۔ ویسے بھی یہ علاقہ بین الاقوامی طور پر متنازعہ ہے۔''

''آپ جانتے ہیں پچھلے دورِ حکومت میں یہاں غیر ملکیوں کا اثر رسوخ بہت بڑھ گیا تھا۔ بے تحاشا ڈپلومیٹک ویزے ایشو کیے گئے۔ کہا جا رہا ہے ان میں بہت سے جاسوس اور ایسے لوگ بھی ہیں جو یہاں سازشوں کا جال بچھانے آئے ہیں۔''

نواب صاحب گہری سانس لے کر رہ گئے۔ ''ان کو ویزے ہمارے لوگوں نے دیے۔ وہ بھی اس ملک کی جڑیں کاٹنے والوں میں شامل ہیں۔''

''اصل مجرم یہی لوگ ہیں۔'' نوشی نے کہا۔ وہ ذرا آگے بڑھی اور جھاڑیوں سے باہر جھانکا۔ اسی لمحے رائفل کی نال آ کر اس کے سر سے لگ گئی اور وہ ساکت ہو گئی۔ نواب صاحب کو ذرا تاخیر سے پتا چلا مگر وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے، وہ نہتے تھے۔ رائفل بردار وہی تھا جس کے ساتھی کو تیمور نے زخمی کیا تھا۔ نہ جانے کیسے وہ یہاں ان کی موجودگی بھانپ گیا تھا اور بالکل خاموشی سے آیا تھا۔ انہیں اس کی آمد کا قطعی پتا نہیں چلا تھا۔

''باہر آؤ... دونوں ہاتھ اوپر۔'' اس نے صاف انگریزی میں کہا۔

دوسرا آدمی پیچھے سے آیا تھا۔ یہ کارل تھا۔ سامنے والا مائیکل تھا اور ریش زخمی تھا۔ گولی اس کے شانے پر لگی تھی۔ وہ تینوں کمانڈوز جیسے لباس میں تھے اور پوری طرح مسلح تھے۔ ان کے پاس ہینڈ گرینیڈ اور اسموک گرینیڈ تک تھے۔ مائیکل نے پوچھا۔ ''تمہارے ساتھ اور کون ہے؟''

''بس ہم دو ہیں۔'' نواب صاحب نے جواب دیا۔ ان کا اندازہ اس بار بھی درست نکلا تھا۔ وہ تینوں امریکی لہجے میں بات کر رہے تھے اور ان کے خدوخال بھی اس بات کی گواہی دے رہے تھے۔ مگر وہ انجان بن کر بولے۔ ''تم کون ہو... انگریز؟''

''وہ چاروں کہاں ہیں؟'' مائیکل نے سوال نظر انداز کر کے پوچھا۔

''وہ ہمارے سامنے دریا سے گزرے ہیں۔'' اس بار نوشی بولی۔ اس پر تینوں نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔ ان کا انداز ایسا تھا کہ نوشی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''آگے آبشار ہے۔'' کارل نے کہا۔ ''اس میں بہت بڑے پتھر ہیں۔ ان پر گرنے والا بچتا نہیں ہے۔''

''وہ چاروں مارے گئے ہوں گے۔'' مائیکل نے سر ہلایا۔

''میری خواہش ہے، وہ بچ جائیں اور میں انہیں اپنے ہاتھ سے ماروں۔'' ریش نے کہا۔ وہ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ ''خیر یہ دونوں بھی ہاتھ آئے ہیں۔''

مائیکل ذرا دور جا کر واکی ٹاکی پر رپورٹ کرنے لگا۔ نواب صاحب اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ چند منٹ بعد واپس آیا اور بولا۔ ''ان کو لے چلو، تم دونوں جاؤ گے... میں ان چاروں کو دیکھوں گا۔ ناؤ گو۔''

☆☆☆

''اب کیا کریں؟'' تیمور نے پوچھا۔

''ہمیں یہاں سے فوراً چلے جانا چاہیے۔'' جوجی نے تجویز دی۔

شامی نے اسے گھورا۔ ''دادا جان اور نوشی کو چھوڑ کر؟''

''اچھی بات ہے، آپ ان سے ویسے ہی بیزار ہیں۔'' جوجی نے روانی سے کہا اور جب تیمور اور شامی نے اسے گھورا تو وہ بوکھلا کر بولا۔ ''میرا مطلب ہے، وہ بھی ہماری طرح بچ کر نکل گئے ہوں گے۔''

فولاد خان جو ایک طرف بلند چٹان پر چڑھ کر لیٹا ہوا تھا، اس نے آواز دے کر ان کو بلایا۔ ''تیمور صیب... شامی صیب! ادرا آ کر دیکو۔''

انہوں نے چٹان پر چڑھ کر دیکھا تو تقریباً نصف کلومیٹر دور انہیں چند افراد دکھائی دیے۔ وہ واضح نہیں تھے مگر ایک نے بلیو جینز کے ساتھ پنک شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ یہ نوشی کا لباس تھا۔ اسی طرح نواب صاحب کی شیروانی بھی واضح تھی۔ ان کے پاس تین افراد اور تھے۔ تیمور نے فکر مندی سے کہا۔ ''انہوں نے دادا جان اور نوشی کو پکڑ لیا ہے۔''

''وہ انہیں لے جا رہے ہیں۔'' شامی نے اشارہ کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ دو افراد نوشی اور نواب صاحب کو گن

پوائنٹ پر لے جا رہے تھے جبکہ تیسرا وہیں تھا اور پھر وہ جھاڑیوں میں گھس گیا جبکہ باقی دو نواب صاحب اور نوشی کو لے کر ڈھلان والی طرف غائب ہو گئے۔ فولاد خان نے یقین سے کہا۔ ”یہ خنزیر امارے واسطے رکا اے۔“

”فولاد خان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ چھپ کر ہمارا انتظار کرے گا اور جیسے ہی ہم سامنے آئیں گے یا تو شوٹ کر دے گا یا پھر ہینڈز اپ کر کے ہمیں بھی لے جائے گا۔“ تیمور نے کہا۔

”آپ بولے تو ام اس کو قبائلی طریقے سے جہنم رسید فرما دے۔“ فولاد خان نے پوچھا۔ نواب صاحب کی موجودگی میں وہ اکثر فرمانے لگ جاتا تھا۔ یعنی اس گفتگو میں لفظ فرمانا بہت آتا تھا۔

”ہمیں اس کو ٹریپ کرنا ہوگا۔“ شامی نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ”کیونکہ یہی بتا سکتا ہے کہ اس کے ساتھی دادا حضور اور نوشی کو کہاں لے گئے ہیں۔“

”لازمی بات ہے یہیں ہی ان کا کوئی ٹھکانا ہوگا۔“ تیمور نے کہا۔ ”لیکن وہ پوری طرح مسلح ہے اور ہمارے پاس صرف دو پستول ہیں جو بھیگ بھی گئے ہیں۔“

”رسک لینا ہوگا۔“ شامی نے کہا۔

”میری ایک تجویز ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”ہم میں سے دو دادا حضور والی پارٹی کے پیچھے جائیں اور دو اسے قابو کرنے کے لیے یہاں رکیں۔“

”وہ تو خاصا اوپر جا چکے ہوں گے۔“

”نہیں، ان کے ساتھ دادا جان ہیں وہ تیز نہیں چل سکتے۔ ہم تیز چلیں تو ان تک پہنچ سکتے ہیں۔“

”اس طرف سے ممکن نہیں ہے۔“ تیمور نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ گھات لگائے بیٹھا ہے۔“

”ہم اسی جگہ سے اوپر جائیں گے۔“ شامی نے کہا۔ ”میرا خیال ہے میں جوجی کو لے جاتا ہوں۔ تم فولاد خان کے ساتھ اسے قابو کرو۔ ایک ہتھیار مجھے دے دو۔“

تیمور نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ اپنا کولٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”کیا یہ مناسب ہوگا؟“

شامی نے اپنی تجویز کی وضاحت کی۔ ”ہم اس شخص پر بھروسا نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے وہ بتانے سے انکار کر دے یا سرے سے ہاتھ ہی نہ آئے تب ہم ان لوگوں کو کہاں تلاش کریں گے۔ یہاں پولیس تو دور رہی، عام آبادی تک نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ تیمور نے سر ہلایا۔ ”میں اور فولاد خان اسے قابو کرتے ہیں۔“

”مجھے آپ کے ساتھ جانا ہوگا؟“ جوجی نے مرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تم اپنے باپ کا نام بدنام کر رہے ہو۔“ شامی نے ملامت کی۔ ”وہ شہر کا اتنا بڑا بدمعاش ہے اور اس کا اکلوتا بیٹا اتنا بزدل۔“

”اباجی کا نام پہلے ہی بدنام ہے اور میں بزدل ہی بھلا۔“ جوجی نے کہا لیکن شامی اس کی بات پر توجہ دیے بغیر اسے کھینچ کر لے گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ڈھلان پر چڑھ رہے تھے۔ شامی آگے تھا اور جوجی پیچھے۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”شامی بھائی، یہ کون ہو سکتے ہیں؟“

”مجھے تو غیر ملکی ایجنٹ لگ رہے ہیں جن کی ہمارے ملک میں تعداد اتنی ہو گئی ہے کہ ہر شخص کے حصے میں کم سے کم ایک ایجنٹ تو آئے گا۔“

”اباجی کہہ رہے تھے کہ اب غیر ملکی اسلحہ اتنا ہو گیا ہے کہ دیسی اسلحے میں مزہ ہی نہیں آتا۔“

”تمہیں پستول چلانا آتا ہے؟“

”ویڈیو گیم کی حد تک۔“ جوجی نے فخر سے کہا۔ ”میرا نشانہ کبھی خالی نہیں جاتا۔“

”یہ ویڈیو گیم نہیں ہے، زندگی اور موت کی اصلی جنگ ہے۔“

”میں نے کبھی اصلی گن نہیں پکڑی۔ اس پر ایک بار اباجی نے بہت مارا تھا۔ وہ تو ماں جی درمیان میں آ گئیں ورنہ انہوں نے ڈنڈے کے بعد پستول بھی اٹھا لیا تھا۔“

”وہ جو ہمارے ساتھ شکار پر گن چلاتے رہے ہو؟“

”وہ دوسری بات ہے۔ انسانوں پر ہتھیار اٹھانے کے خیال سے ہول آتا ہے۔ اسی بات پر تو اباجی کو تاؤ آتا ہے اور وہ ڈنڈا اٹھا لیتے ہیں۔“

”ادھر دادا جان بھی کم نہیں ہیں۔“ شامی نے سرد آہ بھری۔ ”زبان سے ایسا تشدد کرتے ہیں کہ انسان کی روح بلبلا جاتی ہے اس اور تھرڈ ڈگری پر۔“

گفتگو کے دوران وہ اوپر پہنچ گئے۔ شامی بھی یہی چاہتا تھا کہ جوجی کے قدم نہ رکیں ورنہ وہ ایک نمبر کا ہڈ حرام بھی تھا۔ وہ اسے باتوں میں لگا کر اوپر لے آیا تھا۔ یہاں سڑک ذرا نیچی تھی اس لیے وہ جلدی پہنچ گئے۔ پہاڑی ڈھلان کے بعد یہ ٹوٹی پھوٹی اور گڑھوں سے بھری سڑک ان کے لیے ریڈ کارپٹ بن گئی تھی۔ شامی نے گاڑیوں کی طرف دوڑنا شروع کیا تو جوجی نے بادل ناخواستہ اس کا

ساتھ دیا۔ پونے پانچ ہو رہے تھے اور ابھی سورج ڈوبنے میں خاصا وقت تھا مگر پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ پانچ بجے وہ گاڑیوں کے پاس پہنچے لیکن ان کے نزدیک جانے کے بجائے شامی نے جوجی سمیت اوپری ڈھلان کی راہ لی جس طرف سے وہ آدمی آیا تھا جس کی جلی لاش اب سڑک پر پڑی تھی۔ شعلے بجھ گئے تھے مگر ابھی سے دھواں اٹھ رہا تھا اور فضا میں جلنے کی چراند پھیلی ہوئی تھی۔ شامی کو خطرہ تھا کہ گاڑیوں کے پاس بھی کوئی گھات لگائے نہ بیٹھا ہو۔ جوجی نے پوچھا۔ ''اب کہاں جا رہے ہیں؟''

''وہ اس طرف سے آئے تھے تو لازمی بات ہے ان کا ٹھکانا اسی طرف کہیں ہوگا۔''

''اتنے خطرناک لوگوں کا ٹھکانا۔'' جوجی پریشان ہو گیا۔ ''کیا ہمیں وہاں گھسنا ہوگا؟''

''اگر ضرورت پڑی تو ایسا بھی کرنا ہوگا۔'' شامی نے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ پتھر پھینک کر مار سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں جی، بچپن میں ہمیشہ جیت جاتا تھا جب پتھر پھینکنے کا مقابلہ ہوتا تھا۔'' جوجی نے سینہ تان کر کہا۔

''بس تو دشمن کا سامنا ہو تو پتھر سے کام چلانا۔''

جوجی کا سینہ واپس اندر چلا گیا۔ ''وہ جواب میں پتھر نہیں مارے گا، گولی مارے گا۔''

''اب خاموشی سے چلو، کسی وقت بھی دشمن سے سامنا ہو سکتا ہے۔'' شامی نے کہا۔ وہ اس نسبتاً ہموار ڈھلان پر اوپر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہاں درخت بہت اونچے تھے مگر ذرا فاصلے پر تھے اس لیے ان کے درمیان راستہ تھا۔ شامی سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ ان کے دشمن ہو رہے تھے ان کو دیکھتے ہی فائر کھول دیتے تھے، تب وہ دادا جان اور نوشی کو زندہ کیوں لے گئے تھے؟ اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی تھی کہ وہ ان سے ان چاروں کے بارے میں پوچھنا چاہتے تھے۔ وہ سب کو ایک ساتھ دنیا سے رخصت کرنا چاہتے تھے۔ پندرہ منٹ بعد وہ ڈھلان کے اوپری حصے میں پہنچ گئے۔ وہ درختوں کے ایک جھنڈ سے نکلے تھے کہ انہیں سامنے ریسٹ ہاؤس کی خستہ حال عمارت دکھائی دی اور پھر نواب صاحب، نوشی اور دونوں مسلح افراد زمین میں غائب ہوتے نظر آئے۔ جوجی دنگ رہ گیا۔

''یہ کہاں چلے گئے؟''

''کوئی خفیہ راستہ ہے۔'' شامی نے کہا۔ ''عمارت کا داخلی دروازہ دیکھو، اس کے آگے کتنا ملبا پڑا ہے۔ یہاں سے گزر کر کون جا سکتا ہے۔ اس لیے آنے جانے کے لیے خفیہ راستہ رکھا ہوا ہے۔''

وہ جگہ ان سے کوئی سو گز کے فاصلے پر تھی اس لیے وہ یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ راستہ کس نوعیت کا تھا۔ شامی سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے جوجی سے کہا۔ ''تم یہیں رکو اور اگر میں واپس نہ آؤں تو جا کر تیمور اور فولاد خان کو تلاش کر کے اس عمارت کے بارے میں بتانا اور اگر وہ بھی نہ ملیں تو ہائی وے تک جا کر مدد لانا۔''

''اگر وہاں بھی کوئی نہ ملا تو کیا میں گھر چلا جاؤں؟'' جوجی نے سادگی سے سوال کیا۔

''لگتا ہے تمہیں ساتھ لے جانا پڑے گا۔''

''نہیں... نہیں، میں سمجھ گیا۔'' جوجی نے جلدی سے کہا۔ ''جیسا آپ کہیں گے، میں ویسا ہی کروں گا۔ آپ جائیں جی۔''

''گڈ بوائے۔'' شامی نے اس کا شانہ تھپکا اور آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

نواب صاحب اور نوشی اس خفیہ راستے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ریسٹ ہاؤس کے چار فٹ اونچے پتھر سے بنے چبوترے کے سامنے زمین سے ایک تختہ مع گھاس اور پودوں کے اوپر اٹھا تھا اور اس کے نیچے سیڑھیاں اندر جا رہی تھی۔ وہ انہیں اس مشکل ترین راستے پر ہانکتے ہوئے لائے تھے اور ان کا انداز اہانت آمیز تھا جیسے وہ انہیں بہت حقیر خیال کر رہے ہوں۔ ساتھ ہی فحش بکواس بھی کر رہے تھے۔ نواب صاحب اور نوشی سن اور سمجھ رہے تھے مگر صبر کرنے پر مجبور تھے۔ نوشی کی فکر بڑھ رہی تھی۔ وہ لڑکی تھی اور اسے جان کے ساتھ عزت کا خطرہ بھی لاحق ہو سکتا تھا۔ یہ لوگ اپنے انداز سے پیشہ ور قاتل اور باتوں سے اوباش لگ رہے تھے۔ نواب صاحب پہلے ہی خاصی بھاگ دوڑ کر چکے تھے اور اس پر انہیں یہ مشکل ڈھلان سر کرنی پڑی تھی مگر جب ان کے قدم سست ہوتے تو کارل انہیں دھکا دیتا۔ نوشی ایک بار اس سے الجھ گئی مگر نواب صاحب نے اسے روکا۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

''ان کے منہ مت لگو، ابھی ہمیں صبر سے کام لینا ہو گا۔''

کارل نے نواب صاحب اور نوشی کی تلاشی لے کر ان کے پاس سے نکلنے والی تمام چیزیں اپنے قبضے میں کر لی

تھیں۔ انہوں نے ریش کے اندر جانے کے بعد انہیں اشارہ کیا اور وہ بادل ناخواستہ سیڑھیاں اترنے لگے۔ دروازہ خود بہ خود کھلا تھا۔ نواب صاحب دیکھ رہے تھے، ان دونوں نے کچھ نہیں کیا تھا۔ ان کے نیچے آتے ہی دروازہ خود بہ خود بند ہو گیا۔ اس راستے کو کہیں اور سے کھولا اور بند کیا جا رہا تھا۔ نیچے کسی فائبر قسم کے مادے کی بنی ہوئی صاف ستھری سی سرنگ تھی جس میں ہر ایک گز کے فاصلے پر ایک پینل لائٹ روشن تھی۔ کچھ دور ایسی ہی سیڑھیاں دوبارہ اوپر جا رہی تھیں مگر یہاں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے۔ یہ گول کمرا تھا جو مکمل طور پر بند تھا۔ جیسے ہی وہ اندر آئے، اوپر لگے شاورز سے اوزون برسنے لگی۔ اس کی پھوار ایک منٹ تک جاری رہی اور پھر رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلا اور وہ ایک بڑے ہال میں آئے۔ نواب صاحب کا اندازہ تھا کہ وہ ریسٹ ہاؤس کی عمارت کے اندر پہنچ چکے ہیں۔ مگر اندر سے اس کی حالت بالکل ہی بدلی ہوئی تھی۔ یہاں دیواروں پر چمکیلی ایلومینیم فوائل کی شیٹ چڑھی ہوئی تھی اور بہت بڑا ہال جو تقریباً پورے ریسٹ ہاؤس کی عمارت پر مشتمل تھا اس میں دھات، شیشے اور فائبر سے بنے ہوئے کمرے اور دوسری جگہیں تھیں۔ یہ سب آسانی سے استعمال ہونے والا میٹریل تھا۔ انہیں جوناتھن کے سامنے پیش کیا گیا۔

''تم لوگ کون ہو اور ہمیں کیوں پکڑا ہے؟'' نواب صاحب نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''ہم عام مسافر ہیں اور سڑک سے گزر رہے تھے۔''

''تم نے ٹھیک کہا۔'' جوناتھن مسکرایا۔ ''لیکن بدقسمتی سے تم نے ایک ایسے شخص کو چھو لیا یا اس کے پاس گئے جو مہلک حد تک بیمار تھا۔ اب یہاں تم دونوں کا معائنہ ہوگا کہ کہیں تمہیں بھی تو وہ وائرل نہیں لگ گیا ہے۔''

''میرا خیال ہے تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ کوئی علاج گاہ ہے جہاں بہت متعدی بیماریوں کا شکار ہونے والے رکھے جاتے ہیں؟''

نواب صاحب کی صاف گوئی کا جوناتھن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے سکون سے کہا۔ ''بالکل... وہ ہمارا ایک مریض تھا جو کسی طرح یہاں سے نکل گیا اور تم نے اسے دیکھا۔''

''ہم میں سے کسی نے اسے نہیں چھوا تھا۔ وہ ہمارے سامنے مر گیا تھا اور تمہارے آدمیوں نے اس کی لاش جلا دی تھی۔''

جوناتھن نے شانے اچکائے۔ ''یہ ضروری تھا کیونکہ اسے بہت مہلک وائرس لگا ہوا تھا۔ اگر یہ وائرس پھیل جائے تو بہت تباہی مچا سکتا ہے کیونکہ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔''

نواب صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میری معلومات کے مطابق ایسا کوئی قدرتی وائرس نہیں ہے جو بالکل لاعلاج ہو۔''

جوناتھن کی آنکھوں میں چمک آئی۔ ''اولڈ مین! تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''مجھے لگ رہا ہے کہ یہ جگہ کوئی تجربہ گاہ ہے اور تم اس پر کوئی تجربہ کر رہے تھے جو یہاں سے نکل بھاگا۔'' نواب صاحب نے مزید صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ''تمہارے آدمیوں نے ہمیں مارنے کی پوری کوشش کی لیکن پھر ہمیں گرفتار کر کے یہاں لے آئے۔''

''کیونکہ انہیں میں نے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔''

''تم یہاں کے انچارج ہو؟'' نوشی بولی۔ ''کیا تم ہم پر بھی تجربہ کرنا چاہتے ہو؟''

''تم کچھ بھی سمجھنے کے لیے آزاد ہو۔'' جوناتھن نے کہا اور کارل کو اشارہ کیا۔ ''انہیں دو نمبر میں بند کر دو۔''

کارل ان کے عقب میں کھڑا تھا۔ اس نے گن کی نال سے اشارہ کیا۔ ''چلو۔''

نواب صاحب اور نوشی حرکت میں آئے اور انہیں ہال کے اوپر ایک کونے میں بنے شیشے کے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ وہاں ایک دھاتی میز کے گرد دھات اور فوم کی بنی چار کرسیاں رکھی تھیں۔ نوشی اوپر سے حوصلہ دکھا رہی تھی لیکن اندر سے پریشان تھی۔ اس نے دروازہ بند ہوتے ہی کہا۔ ''انکل! مجھے یہ لوگ بہت خطرناک لگ رہے ہیں۔ شاید یہ ہمیں بھی اپنے تجربوں کی بھینٹ...''

''تم فکر مت کرو یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

''وہ چاروں...''

''شش۔'' نواب صاحب نے آہستہ سے کہا۔ ''اس بارے میں بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

نوشی خاموش ہو گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اب وہ چاروں ہی ان کی امید تھے۔ وہی انہیں یہاں سے نکال سکتے تھے۔ اگر وہ بھی پکڑے جاتے تو ان کی رہائی کی امید ختم ہو جاتی۔

☆☆☆

فولاد خان اور تیمور ان جھاڑیوں سے کچھ دور موجود تھے جن میں مسلح شخص موجود تھا۔ فولاد خان نے یقین سے کہا کہ وہ جھاڑیوں میں ہے کیونکہ وہ بہت معمولی سی حرکت کر رہا

تھا جس سے جھاڑیاں غیر فطری انداز میں ہل رہی تھیں۔ تیمور کو کیونکہ کسی قسم کا قبائلی تجربہ نہیں تھا اس لیے وہ دیکھنے سے قاصر رہا تھا۔ فولاد خان نے مزید دعویٰ کیا کہ وہ جھاڑیوں کے وسطی حصے میں ہے۔ اگر وہ اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتے تو جھاڑیاں ہلنے سے وہ چوکنا ہو جاتا۔ تیمور نے کہا۔ ''اب اسے اپنے قبائلی طریقے سے قابو میں کرو۔''

فولاد خان سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے سر ہلایا۔ ''ام کرسکتا اے پر خطرہ اے۔''

''وہ کیا؟''

جب فولاد خان نے قبائلی طریقہ بتایا تو تیمور نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس میں بہت خطرہ ہے۔''

''پر اس داؤس کو سامنے لانے کا یہ ای طریکا اے۔''

تیمور نے سوچا اور بادل ناخواستہ منظوری دے دی۔ وہ دونوں اوپر کی طرف بڑھے جہاں موٹے تنوں والے درخت تھے اور تیمور نے ایک مناسب جگہ پوزیشن لی۔ فولاد خان مزید آگے بڑھ گیا۔ وہ بڑی چٹان کے دوسری طرف گیا تھا۔ وہ بہت احتیاط سے حرکت کر رہے تھے کیونکہ ایک چھوٹا سا پتھر بھی سرک کر ان کی حرکت کا بھانڈا پھوڑ سکتا تھا۔ اس معاملے میں فولاد خان کسی چیتے کی طرح بے آواز تھا البتہ تیمور کو بہت سنبھل کر حرکت کرنا پڑ رہی تھی۔ فولاد خان نے چٹان کے عقب میں جا کر زمین سے مناسب سائز کے پتھر جمع کیے اور اس کے بعد انہیں یکے بعد دیگرے نیچے جھاڑیوں میں چھپے شخص پر برسانا شروع کر دیا۔ اس کا نشانہ بہت اچھا تو نہیں تھا مگر چند ایک پتھر اس شخص تک پہنچ گئے اور وہ بوکھلا کر آڑ تلاش کرنے لگا۔ تقریباً سیر وزنی پتھر خاصی رفتار سے آ رہے تھے اور اسے لگتے تو وہ اچھا خاصا زخمی ہوسکتا تھا۔ پھر ایک پتھر اسے لگا بھی اور اس نے چلا کر گالی دی اور اس کے بعد اوپر کی طرف ایک برسٹ مارا لیکن تیمور اپنی جگہ اور فولاد خان پتھر کے پیچھے محفوظ تھے۔

برسٹ کے بعد فولاد خان کچھ دیر رکا۔ اس دوران میں وہ پتھر جمع کرتا رہا تھا جن کی یہاں کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ قدرتی طور پر گول اور بڑے آلو کے سائز کے پتھر اس کام کے لیے نہایت موزوں تھے۔ تیمور مسلح شخص کی حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اوپر کی طرف بڑھا مگر وہ اب بھی جھاڑیوں میں تھا اس لیے جب فولاد خان نے سنگ باری کا اگلا راؤنڈ شروع کیا تو اس نے بوکھلا کر درختوں تک آنے کی کوشش کی مگر وہ ابھی خاصا دور تھا۔ ایک بار پھر اسے پتھر لگا اور اس نے فولاد خان کی شان میں انگلش کے دریا بہا دیے۔ جواب آں غزل کے طور پر فولاد خان نے پشتو کا سہارا لیا اور اسے ان کلاسیک گالیوں سے نوازا جو صرف ایسے مواقع کے لیے مخصوص تھیں۔

اتنا تو وہ سمجھ گیا تھا کہ گورا اسے انگریزی میں نواز رہا ہے۔ فولاد خان چٹان کے پیچھے محفوظ تھا۔ اس لیے اس کا ہاتھ چلتا رہا۔ دوسرا پتھر کھا کر اس نے رائفل استعمال نہیں کی تھی بلکہ اب وہ چٹان پر نظر رکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ پتھر اسی سمت سے آ رہے تھے اس لیے اسے بچنے میں آسانی ہو رہی تھی۔ یقیناً وہ فولاد خان کے سر میں سوراخ کرنے کا عزم لیے پیش قدمی کر رہا تھا اور اسی چکر میں وہ فراموش کر بیٹھا کہ یہاں اور لوگ بھی ہوسکتے ہیں۔ فولاد خان کا قبائلی منصوبہ یہی تھا۔ اسے ایک طرف لگا کر دوسری طرف سے غافل کیا جاتا اور پھر قابو کر لیا جاتا۔ اس لیے جیسے ہی وہ تیمور کی کمین گاہ تک پہنچا، اس نے کہا۔ ''ہالٹ۔''

مائیکل تربیت یافتہ شخص تھا اور لہجہ پہچانتا تھا اس لیے ساکت ہوگیا۔ تیمور نے اگلا حکم دیا۔ ''رائفل آگے پھینک دو۔''

اس نے اس بار بھی حکم کی تعمیل کی۔ تیمور اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے آیا تھا کہ مائیکل نے نہایت پھرتی سے بیٹھتے ہوئے لات گھمائی اور تیمور کوشش کے باوجود نہ بچ سکا۔ وہ گرا تو اس کے ہاتھ سے پستول نکل گیا اور مائیکل کا ہاتھ اپنی بیلٹ میں لگے پستول کی طرف گیا اور اس نے پستول نکال بھی لیا تھا مگر اسے استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ فولاد خان کی طرف سے چلایا ہوا پتھر اس کے سر پر لگا اور وہ تیورا کر گر گیا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ گرنے سے پہلے ہی بے ہوش ہوگیا تھا۔ تیمور اٹھا تو اوپر سے ہانپتا ہوا فولاد خان آیا۔ اس نے تیزی سے بے ہوش مائیکل کی تلاشی لی اور اس کے سارے ہتھیار اپنے قبضے میں کر لیے۔ ان میں ایک عدد فوجی خنجر بھی تھا۔ پھر اس نے تیمور سے پوچھا۔

''آپ ٹیک اے... ام نے اندادند مارا ہے؟''

''تم نے بروقت پتھر مارا ورنہ یہ مجھے گولی مار دیتا۔'' تیمور نے کہا اور اپنا پستول اٹھا لیا۔ فولاد خان نے مائیکل کی پشت پر موجود بیک پیک کی تلاشی لی اور اس میں موجود رسی نکال کر مائیکل کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ پتھر کی ضرب نے اس کا سر پھاڑ دیا تھا اور اس کے جلد ہوش میں آنے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ تیمور نے تشویش سے

کہا۔ ''اسے ہوش نہیں آیا تو پھر ہم کس سے پوچھیں گے؟''

''اسی سے۔'' فولاد خان نے کہا۔ ''ام اس کو قبائلی طریقے سے بیدار کرتا اے۔''

اس بار تیمور اس کا قبائلی طریقہ دیکھ کر دنگ رہ گیا جب اس نے بے ہوش کے نتھنوں میں ایک ایک چٹکی نسوار ڈالی اور اس کا ردعمل بھی ہوا۔ ایک منٹ بعد اس نے حرکت شروع کی اور پھر چھینکیں مارتا ہوا ہوش میں آگیا۔ اس نے کراہ کر اور بلبلا کر کہا۔ ''اوہ مائی گاڈ... واٹ از دس؟''

تیمور مسکرانے لگا۔ ''اسے قبائلی طریقہ کہتے ہیں۔''

مائیکل بیک وقت چھینک رہا تھا اور سر بھی جھٹک رہا تھا۔ بالآخر اس کی ناک سے نسوار خارج ہوئی تو اس کے حواس ٹھکانے آئے۔ وہ خاصا بوکھلایا ہوا تھا۔ اس نے پھر پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

فولاد خان نے اسے نسوار کی ڈبیا ملاحظے کے لیے پیش کی جس پر شیشہ بھی لگا ہوا تھا۔ تیمور نے اسے آگاہ کیا۔ ''کچھ بائیولوجیکل تجربات ہم بھی کرتے ہیں اور یہ اسی کا نتیجہ ہے۔''

مائیکل اچھل پڑا۔ ''بائیولوجیکل... تم نے مجھے انفیکٹ کر دیا ہے؟''

''بالکل... اگر تم نے نہیں بتایا کہ ہمارے ساتھی کہاں لے جائے گئے ہیں تو تم اس آدمی سے بھی زیادہ اذیت ناک موت مرو گے۔ تمہاری لاش جلانے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ مرنے کے بعد تم خود بہ خود جل کر راکھ ہو جاؤ گے۔''

نسوار نے مائیکل کی ناک کے اندرونی سسٹم کی جو حالت کی تھی اور وہ جیسی جلن محسوس کر رہا تھا، اس نے تیمور کی بے سروپا بات کا یقین کر لیا۔ فولاد خان کسی حد تک انگریزی سمجھ لیتا تھا، اس نے سر ہلایا۔ ''بس تم کو ایک خوراک اور دے گا۔''

تیمور نے ترجمہ کر کے دھمکی اس تک پہنچائی تو وہ بلبلا گیا۔ ''پلیز نہیں... خدا کے لیے۔''

''اس لیے پوچھے گئے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ تمہارے دونوں ساتھی میرے ساتھیوں کو کہاں لے گئے ہیں؟'' تیمور نے پوچھا۔ ''یاد رکھو، انہیں کچھ ہوا تو تم میں سے کوئی نہیں بچے گا۔''

''وہ انہیں سائٹ پر لے گئے ہیں۔''

''سائٹ؟... کون سی سائٹ؟''

''اوپر ایک پرانی عمارت ہے۔'' مائیکل نے بتایا۔ ''ہم اسے سائٹ کہتے ہیں۔''

''تم تینوں اور مرنے والا شخص اسی عمارت سے آئے تھے؟''

''ہاں، وہ وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ ہمیں ہر صورت اسے مارنے اور اس کی لاش جلانے کا حکم ملا۔ وہ کسی مہلک وائرس سے انفیکٹ ہے جو کسی کو لگ جائے تو اسے موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ وہ بھی بس مرنے والا تھا، نہ جانے کیسے وہاں سے بھاگ نکلا۔''

''اسے یہ وائرس کیسے لگا؟'' تیمور نے اگلا سوال کیا تو وہ خاموش ہوگیا۔ فولاد خان مائیکل کے پاس سے برآمد ہونے والا واکی ٹاکی الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس سے آواز آئی۔ ''مائیکل تم کہاں ہو؟''

☆☆☆

کرنل سوین جو کنٹرول روم میں ریسٹ ہاؤس کے چاروں طرف لگے کیمروں اور سینسرز پر نظر رکھتا تھا، اس نے جوناتھن کے کمرے میں جھانکا اور اطلاع دی۔ ''ایک اجنبی ریڈ ایریا میں ہے۔''

جوناتھن نے اپنے سامنے موجود کی بورڈ کا ایک بٹن دبایا اور کمپیوٹر مانیٹر پر سرویلنس کیمروں کی ویڈیو آنے لگی۔ ریسٹ ہاؤس کے عقبی حصے میں ایک شخص دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پستول سے مسلح تھا اور بہت چوکنے انداز میں آس پاس دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ شامی تھا۔ اسے دیکھتے ہی جوناتھن کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور اس نے کرنل سوین سے کہا۔ ''مائیکل کا معلوم کرو اور شکاری پھندے ایکٹو کر دو۔''

ریسٹ ہاؤس کے چاروں طرف زمین میں ایسے دھاتی شکنجے لگائے گئے تھے جو عام حالات میں بے ضرر ہوتے تھے اور کوئی ان پر پاؤں رکھ بھی دیتا تو اسے کچھ نہیں ہوتا تھا لیکن ایکٹو کیے جانے کے بعد جیسے ہی ان پھندوں پر کسی کا پاؤں آتا، یہ اس کا پیر پکڑ لیتے تھے۔ وہ دو اجنبیوں کو جو اتفاق سے وہاں آ نکلے تھے اسی طرح پکڑ کر اپنے تجربات کا نشانہ بنا چکے تھے۔ شامی بے خبری میں ایسے ہی ایک شکنجے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جوناتھن دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس دوران میں کرنل سوین نے ایک اور تشویشناک اطلاع دی۔ ''میں مائیکل کو پکار رہا ہوں لیکن وہ جواب نہیں دے رہا۔''

''کارل اور جیسن کو بھیجو۔'' جوناتھن نے حکم دیا۔ ''لیکن ان سے کہو کہ اس شخص کو نہ چھیڑیں۔''

''میں سمجھ گیا۔'' کرنل سوین نے کہا۔ جوناتھن کی نظر

شامی پر مرکوز تھی۔ وہ شکنجے کے بالکل پاس پہنچ گیا تھا اور بس ایک قدم اور بڑھاتا تو اس کا پاؤں شکنجے میں ہوتا اور جکڑا جاتا۔ جوناتھن کو یقین تھا، یہ انہی چھ افراد میں سے ایک تھا جن میں سے دو پہلے ہی اس کے قبضے میں آچکے تھے۔ تیسرا یہ تھا اور باقی تین بھی جلد یا بدیر ان کے قبضے میں آجاتے۔ مگر اس مسلح شخص اور مائیکل کی خاموشی نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ ابتدائی اطلاعات یہ تھیں کہ ان میں سے کوئی مسلح نہیں ہے۔ اس پریشانی کے باوجود اسے یقین تھا کہ باقی تین بھی جلد یہاں آئیں گے یا مارے جائیں گے اور اس کا پروجیکٹ ناکامی سے بچ جائے گا۔ اس کے بعد بہت سی دولت اس کی منتظر ہوگی۔ یہی نہیں وہ اس سے مزید پروجیکٹ حاصل کر سکے گا۔ اسے غرض نہیں تھی کہ ایسے پروجیکٹ میں انسانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ اسے ملنے والے رتبے اور دولت سے غرض تھی۔ آگے بڑھتا شامی رک گیا تو جوناتھن بے چین ہوگیا۔ اس نے زیرِ لب کہا۔ ''کم آن۔''

شامی نے پاؤں آگے بڑھایا اور شکنجے والی جگہ رکھ دیا۔

☆☆☆

کارل اور جیسن باہر آئے۔ شام کے چھ بج رہے تھے اور روشنی خاصی حد تک کم ہوگئی تھی مگر اتنی تھی کہ فی الحال سب نظر آرہا تھا۔ ویسے ان کے پاس تیز روشنی والی ٹارچ بھی تھیں۔ اگر ضرورت پڑتی تو وہ ان سے کام لے سکتے تھے۔ انہوں نے عقبی حصے سے کوئی تعرض نہیں کیا اور سیدھے ڈھلان پر نکل گئے۔ ریسٹ ہاؤس سے آگے نکلنے کے بعد انہوں نے ایک آلہ نکالا۔ یہ موبائل جیسا آلہ تھا جس کی چار انچ کی اسکرین پر تین نقطے نظر آرہے تھے۔ دو نقطے پاس پاس تھے۔ یہ کارل اور جیسن تھے۔ آلہ اصل میں واکی ٹاکی کی نشان دہی کر رہا تھا۔ تیسرا نقطہ جو ان سے خاصا دور تھا، وہ مائیکل تھا۔ کارل نے کہا۔ ''وہ تقریباً ایک کلومیٹر دور ہے۔''

جیسن نے منہ بنایا۔ ''اس پہاڑی علاقے میں اسے چار کلومیٹرز سمجھو۔''

''جانا تو ہے۔'' کارل نے کہا۔ ''ویسے میں اسی جاب سے تنگ آگیا ہوں۔ یہ میرا آخری سال ہے، اس کے بعد میں ریٹائر ہوجاؤں گا۔''

''پھر کیا کرو گے؟''

''میں نے خاصا کما لیا ہے۔ میں ایک موبائل ہوم خرید کر پورے ملک میں اور شاید ملک سے باہر بھی گھوموں گا۔''

''ہم خاندانی طور پر گھوڑوں کی پرورش کے ماہر ہیں۔ میں ایک فارم کھولوں گا۔ اس کام میں بہت دولت ہے۔''

وہ آنے والے حالات سے بے خبر مستقبل کے منصوبے بناتے ہوئے ڈھلان اترنے لگے۔ فاصلے سے لگ رہا تھا کہ انہیں سڑک کے پار دریا تک جانا پڑے گا۔ سڑک تک انہیں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ کارل جانتا تھا کہ اس علاقے میں کم سے کم تین افراد اور تھے۔ تیسرا فرد جو ریسٹ ہاؤس کے پاس پہنچ گیا تھا، انہیں اس سے تعرض نہ کرنے کا حکم ملا تھا۔ کرنل سوین کا کہنا تھا کہ اسے شکنجے کی مدد سے قابو کرلیا جائے گا۔ دریا کی طرف جاتے ہوئے جیسن نے کہا۔ ''ممکن ہے انہوں نے مائیکل کو قابو کرلیا ہو۔''

''ایک بار ہم پاس پہنچ جائیں تو پھر سب دیکھ لیں گے۔'' کارل نے آلے پر دیکھا۔ ''اب وہ چار سو گز کے فاصلے پر ہے۔''

اسی لمحے کارل کے کان میں لگے ہیڈ سیٹ میں مائیکل کی تکلیف زدہ آواز آئی۔ ''ہیلو، کوئی مجھے سن رہا ہے؟''

''مائیکل! تم کہاں ہو؟ جواب کیوں نہیں دے رہے تھے؟'' کارل نے پوچھا۔ ''ہم تمہاری تلاش میں نکلے ہیں۔''

''میں دریا کے پاس ہوں، ایک گڑھے میں گر گیا ہوں۔ میری ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔''

''میرے خدا۔'' جیسن نے کہا۔ ''ہم آرہے ہیں۔ تم فکر مت کرو۔ ہمارے پاس لوکیٹر ہیں، تم کو تلاش کرلیں گے۔''

''اس طرف۔'' کارل نے لوکیٹر پر دیکھ کر ایک طرف اشارہ کیا۔ یہاں ڈھلان کم تھی اور درخت بھی کم ہونا شروع ہوگئے تھے۔ یہاں زمین پر جھاڑیاں اور بڑے پتوں والے پودے تھے۔ اب وہ مائیکل سے تین سو گز کے فاصلے پر تھے۔ کارل اور جیسن پوری طرح ہوشیار تھے۔ انہوں نے اپنی رائفلیں تھام لی تھیں۔ اگرچہ مائیکل نے انہیں اپنے بارے میں بتایا تھا مگر وہ طریقۂ کار کے مطابق آگے بڑھ رہے تھے۔ انہیں تربیت دی گئی تھی کہ ہنگامی حالات میں صرف اپنی آنکھوں اور کانوں پر اعتبار کریں۔ کارل نے مائیکل سے پوچھا۔ ''ان لوگوں کا کوئی سراغ ملا؟''

''نہیں، میں تو تمہارے جانے کے بعد اس مصیبت

میں پڑ گیا۔''

''تیسرا بھی پکڑا گیا ہے۔'' کارل نے اسے آگاہ کیا۔ ''وہ خود آفس تک پہنچ گیا۔ اب تین باقی ہیں۔''

''جلدی آؤ، میں بہت تکلیف میں ہوں۔''

''ہم بس پہنچ گئے ہیں۔''

☆☆☆

جوجی ایک درخت کے تنے کے ساتھ دبکا ہوا تھا۔ اس نے شامی کو ریسٹ ہاؤس کے عقبی حصے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اسے ڈر لگ رہا تھا مگر وہ ہمت کرکے اپنی جگہ ڈٹا ہوا تھا۔ اچانک ہی زمین نے اسی جگہ سے اسے دو افراد نکلتے دکھائی دیے۔ ان میں سے ایک تو وہی تھا جو نواب صاحب اور نوشی کو ہینڈز اپ کرا کے لایا تھا، دوسرا جوجی نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس پراسرار جگہ اور کتنے غیر ملکی ہیں۔ انہوں نے فلمی اسٹائل کا کمانڈو لباس پہن رکھا تھا جس کا زیادہ تر حصہ سیاہ تھا۔ باہر آکر وہ نیچے کی طرف روانہ ہوئے۔ نیچے جاتے ہوئے وہ آپس میں بات کرتے ہوئے جوجی کے بالکل پاس سے ہی گزر رہے تھے۔ وہ چیڑ کے اس بڑے تنے سے چپکا کھڑا تھا اور اس خوف سے حرکت بھی نہیں کی کہ وہ آہٹ نہ سن لیں۔ اگر وہ پلٹ کر دیکھتے تو جوجی سامنے ہی تھا مگر اس کی قسمت کہ انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

جب وہ خاصے آگے نکل گئے تو جوجی نے رکا ہوا سانس لیا۔ جب وہ اس کے پاس سے گزرے تو ان کی گفتگو سے لگا کہ وہ اپنے ساتھی کو تلاش کرنے جارہے تھے۔ یہ یقیناً وہی تھا جسے وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ جوجی کو امید ہوئی کہ تیمور اور فولاد خان نے اسے قابو کرلیا ہوگا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ ان لوگوں نے اس ایک آدمی کو قابو کرلیا ہوگا مگر وہ ان دو کی آمد سے بے خبر رہیں گے اور ایسا نہ ہو بے خبری میں مارے جائیں۔ جوجی مضطرب ہوگیا۔ اس نے پلٹ کر ریسٹ ہاؤس کی عمارت کی طرف دیکھا۔ شامی نظر نہیں آرہا تھا اور اس کے پاس وقت بھی نہیں تھا۔ ویسے بھی شامی نے اسے اپنے پیچھے آنے سے منع کیا تھا۔ اس لیے جوجی ان کے پیچھے چل پڑا۔ وہ ان سے تقریباً سو گز پیچھے تھا اور بہت احتیاط سے چل رہا تھا کہ کوئی ایسی آہٹ یا آواز نہ ہو جو وہ سن لیں۔ اگر وہ اسے دیکھ لیتے تو آرام سے پکڑ لیتے یا مار دیتے۔ کچھ دیر میں انہوں نے سڑک کراس کی اور ڈھلان کے دوسری طرف قدم رکھا۔

نازک اندام جوجی کے لیے آج کا دن زیادہ ہی سخت ثابت ہوا تھا۔ ڈھلانوں پر چڑھ اور اتر کر اس کی ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہیں کہیں لیٹ جائے۔ بلندی کی وجہ سے آکسیجن کم ہونے سے بھی تھکن زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اس وقت رکنے کا مطلب تھا کہ اس سمیت سب مارے جاتے یا پکڑے جاتے۔ جوجی کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کون لوگ تھے مگر وہ اس شخص کا حشر دیکھ چکا تھا جو سڑک پر اچانک ان کے سامنے آیا تھا اور کتنے اذیت ناک انداز میں مرا تھا۔ وہ دونوں رک رک کر چل رہے تھے اس لیے جوجی ان کے پاس ہوتا جارہا تھا۔ اس نے پہلے سے دیکھے شخص کو کسی سے بات کرتے سنا۔ اس کا مخاطب اس کا ساتھی نہیں تھا بلکہ وہ واکی ٹاکی سے منسلک ہیڈ سیٹ پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

اچانک جوجی کو ایک خیال آیا اور اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اگر وہ اس آدمی سے بات کر رہا تھا جو پیچھے رہ گیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ ٹھیک تھا۔ البتہ تیمور اور فولاد خان کی خیریت مشکوک ہوگئی تھی۔ بات کرکے وہ نیچے کی طرف روانہ ہوئے اور اب انہوں نے اپنی گنیں بہت چوکنا انداز میں تھام رکھی تھیں۔ جوجی خاموشی سے ان کے پیچھے تھا۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھا۔ پھر اسے شامی کی بات یاد آئی تو اس نے زمین سے مناسب سائز کے پتھر اٹھا لیے۔ کچھ ہاتھ میں پکڑے اور کچھ ٹراؤزر کی جیبوں میں ڈال لیے۔ ان دونوں کے انداز سے لگا جیسے وہ کسی خاص جگہ کے پاس ہوں۔ جوجی کی نظریں بے تابی سے تیمور یا فولاد خان کو کھوج رہی تھیں مگر وہ سامنے کہیں نہیں تھے۔ وہ دونوں اب جھاڑیوں میں تھے۔ ان میں نیا والا آگے تھا اور پہلے والا پیچھے۔ اچانک آگے والا الٹ کر گرا اور پھر الٹا ہوا میں بلند ہوتا چلا گیا۔ پیچھے والے نے بوکھلا کر سامنے کی طرف جھاڑیوں میں برسٹ مارا۔

☆☆☆

فولاد خان نے عقل مندی کی اور واکی ٹاکی کا کوئی بٹن دبانے کے بجائے اسے تیمور کی طرف بڑھا دیا۔ تیمور نے اس کا معائنہ کیا۔ جواب دینے کے لیے ایک بٹن دبانا پڑتا۔ اس نے فولاد خان کی طرف دیکھا اور فکرمندی سے بولا۔ ''اب وہ لوگ اس کی تلاش کریں گے۔''

فولاد خان خوش ہوگیا۔ ''یہ تو اچا اے۔ ادر قبائلی جنگ میں دشمن کو ادر بلاتا اے جدر ام اس پر کابو پا لے۔ اب ام کو دشمن کے پاس نئیں جانا پڑے گا۔''

"فرض کرو کہ دشمن ادھر آگیا... مطلب اسے تلاش کرتے ہوئے تین چار بندے اور آگئے تو... تمہارے پاس ان سے نمٹنے کا کوئی قبائلی طریقہ ہے؟"
فولاد خان نے سر کھجایا۔ "قبائلی طریقہ اے پر وہ امارا نہیں اے۔"
"مطلب؟"
"ریڈ انڈین قبائل کا اے۔ پر ام کو آتا اے۔"
"تو یارا استعمال کرو نا، اب سمجھو تمہارا طریقہ ہے۔"
فولاد خان فوری حرکت میں آگیا۔ رسی کا بنڈل انہیں مائیکل کے پاس سے مل گیا تھا۔ اس کی بیک کٹ میں بہت سی کام کی چیزیں تھیں۔ فولاد خان نے اسی سے کام لیا۔ بیس منٹ سے بھی کم وقت میں اس نے کام مکمل کرلیا اور تیمور سے کہا۔ "اب دشمن کو بلاؤ۔"

تیمور مائیکل کے پاس آیا، اس کی حالت بہتر ہوئی تھی۔ اس لیے جب تیمور نے اسے بتایا کہ اسے کیا کرنا ہے تو وہ ہچکچایا مگر فولاد خان نے ڈبیا کھول کر اسے نسوار کا دیدار کرایا تو وہ فوراً راضی ہوگیا۔ تیمور نے واکی ٹاکی اس کے منہ کے پاس کیا اور وائس کا بٹن دبایا۔ اس نے پہلے ہی اسے سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا کہنا تھا اور کیا نہیں کہنا تھا۔ جو بات نہیں کہنی تھی اگر وہ کہتا تو فوراً فوت ہو جاتا۔ مائیکل اپنے ساتھیوں کو پکارنے لگا۔ فوراً جواب ملا اور تیمور نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے بروقت قدم اٹھالیا۔ اسے پتا چل گیا کہ آنے والوں کے پاس لوکیٹر ہے۔ اس نے فوری فولاد خان سے مشورہ کیا اور ایک حکمت عملی طے کرلی۔ فولاد خان ایک طرف چھپ گیا اور تیمور مائیکل کے ساتھ تھا۔ واکی ٹاکی اس نے اپنے قبضے میں رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد اوپر سے دو مسلح افراد برآمد ہوئے۔ وہ ان کی طرف ہی آرہے تھے۔ لوکیٹر کی وجہ سے انہیں آسانی ہوئی تھی اور اب وہ ان کی مرضی کے مطابق اسی طرف آتے جہاں فولاد خان نے جال بچھایا تھا۔ ایک جانا پہچانا تھا اور وہ پیچھے تھے۔ دوسرا پہلی بار نظر آیا تھا اور وہ آگے تھا۔ اس نے اپنی رائفل یوں تھام رکھی تھی کہ ایک سیکنڈ کے نوٹس پر فائر کرسکے۔

پھر آگے والے کا پاؤں ٹریپ سے ٹکرایا۔ وہ اپنی جگہ سے ہلا تو اوپر قوت سے کھنچی ہوئی شاخ آزاد ہوگئی۔ وہ سیدھی ہوکر فضا میں بلند ہوئی تو اس سے بندھی رسی کا پھندا کھنچا۔ وہ آگے والے کے پاؤں میں آیا اور پھر کھنچتا ہوا اور سمٹتا ہوا اسے بھی اٹھا کر لے گیا۔ وہ الٹ کر گرا تو اس کی اپنی رائفل کا دستہ اس کے منہ پر لگا۔ پیچھے والے نے منطقی طور پر سامنے کی سمت برسٹ مارا۔ اسے عقب کا خیال نہیں رہا تھا۔ فولاد خان نے پیچھے سے اس کا سر پتھر سے بجایا۔ وہ چوٹ کھا کر گرا۔ فولاد خان نے دوسری ضرب لگائی تو وہ بے ہوش ہوگیا۔ اس دوران میں الٹے لٹکے جیسن نے کسی طرح اپنی رائفل پکڑ لی تھی اور اس کا رخ فولاد خان کی طرف کیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا جوجی فولاد خان کو لیتا ہوا نیچے گرا اور وہ دونوں ایک درخت کی آڑ میں چلے گئے۔ جیسن نے برسٹ مارا مگر گولیاں عقب میں زمین اور درختوں کو لگیں۔

"بس۔" عقب سے تیمور نے اسے للکارا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ فولاد خان اور جوجی محفوظ رہے تھے۔ "رائفل پھینک دو ورنہ تمہارے سر میں سوراخ کردوں گا۔"
جیسن نے صورت حال محسوس کرتے ہوئے رائفل پھینک دی۔ فولاد خان نے اپنی جگہ سے اٹھ کر فوری طور پر جیسن اور کارل کی تلاشی لی اور ان کا تمام اسلحہ اپنے قبضے میں کرلیا۔ اس دوران میں تیمور جوجی سے اس کی آمد کی وجہ پوچھ رہا تھا۔ "تم کیسے اچانک آگئے اور شامی کہاں ہے؟"
"وہ اوپر اس جگہ ہیں جہاں ان لوگوں کا ٹھکانا ہے۔ میں ذرا پیچھے تھا اور میں نے ان لوگوں کو نکل کر نیچے آتے دیکھا۔ مجھے لگا کہ یہ آپ کی تلاش میں ہیں۔ میں آپ لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے ان کے پیچھے آیا تھا۔"
تیمور نے جوجی کا شانہ تھپکا۔ وہ یہ سن کر پریشان ہوگیا تھا کہ نواب صاحب اور نوشی کو اس تجربہ گاہ میں لے جایا گیا تھا جہاں سے مرنے والا شخص نکل بھاگا تھا۔ تلاشی لے کر فولاد خان نے ان دونوں کو بھی باندھ دیا اور ذرا دیر بعد وہ تینوں ایک ہی صف میں پڑے ہوئے تھے۔ کارل کو ہوش میں لانے کا قبائلی طریقہ اس بار بھی موثر رہا تھا۔ البتہ کارل کی ناک زیادہ نازک ثابت ہوئی تھی۔ وہ سرخ ہوگئی تھی اور اس سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا۔ ان کی رسی سے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے تھے اور ان کی ساری چیزیں انہوں نے قبضے میں لے لی تھیں۔ خاصے اسلحے کے ساتھ ان کے پاس سے واکی ٹاکی اور ان کے ہیڈسیٹ بھی ملے تھے۔ تیمور نے تینوں واکی ٹاکی آف کردیے ورنہ وہ لوکیٹر پر آسکتے تھے۔ تیمور نے ان کی طرف دیکھا۔ "اب ذرا بات کرلی جائے اور مجھے اپنے ہر سوال کا جواب چاہیے۔"
فولاد خان نے خوفناک انداز میں نسوار کی ڈبیا لہرائی۔ "ورنہ امارے پاس یہ اے، تو مارا باپ بھی بولے گا۔"

☆☆☆

شامی نے زمین پر پاؤں رکھا اور [illegible] اٹھاتا ہوا ریسٹ ہاؤس کی عمارت کے عقب میں واقع اس دروازے تک آیا۔ زمین سے چار فٹ او[illegible] پر چھوٹا سا چھجا بنا ہوا تھا اور اس کے نیچے دروازہ تھا مگر اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے کھلے شاید نصف صدی گزر چکی تھی۔ بارش اور نمی کی وجہ سے پھول جانے والا دروازہ اب چوکھٹ کا ایک حصہ بن گیا تھا اور اسے نارمل طریقے سے کسی صورت نہیں کھولا جاسکتا تھا۔ صرف توڑا جاسکتا تھا۔ شامی کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ خطرہ بہت بڑا ہے اور وہ اکیلا اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا لیکن وہ واپس نہیں جاسکتا تھا۔ اسے نواب صاحب اور نوشی کی فکر تھی۔ وہ اندر تھے اور نہ جانے ان پر کیا گزر رہی تھی۔ شامی کو رہ رہ کر اس شخص کا خیال آرہا تھا جو گاڑی کے سامنے آیا تھا اور بہت اذیت ناک انداز میں مرا تھا۔

اندر جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا اور وہ خفیہ راستے سے اندر جا نہیں سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس راستے کی نگرانی کی جاتی ہوگی اور جیسے ہی کوئی یہاں آتا ہوگا، اندر والوں کو اس کا پتا چل جاتا ہوگا۔ تبھی خفیہ راستہ خود بہ خود کھل گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اندر نہیں جاسکتا تو اندر والوں کو باہر نکالا جاسکتا ہے... مگر کیسے؟ یہاں ریسٹ ہاؤس کی عمارت کے ساتھ اگ آنے والی بے شمار جھاڑیاں جو اپنی عمر پوری کرکے ..... سوکھ گئی تھیں، ان کا ڈھیر موجود تھا۔ عمارت پتھر کی بنی تھی۔ اچانک شامی کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اگرچہ اس میں رسک تھا لیکن وہ اندر جائے بغیر بھی اندر والوں کو باہر آنے پر مجبور کرسکتا تھا۔ اس نے آس پاس سے سوکھی گھاس دیوار کے ساتھ موجود جھاڑیوں تلے جمع کی اور لائٹر نکال کر اسے آگ دکھا دی۔ سوکھی گھاس جلی اور اس نے جھاڑیوں کو آگ لگا دی۔ ایک منٹ سے بھی پہلے خشک جھاڑیاں دھڑا دھڑ جلنے لگیں اور آگ شامی کے اندازے سے بھی زیادہ تیزی سے پھیل رہی تھی۔

☆☆☆

جوناتھن نے بے یقینی سے اسکرین کی طرف دیکھا۔ کچھ نہیں ہوا تھا۔ شکنجے نے اپنا کام نہیں کیا تھا اور آنے والے کا پاؤں صحیح سلامت تھا۔ اس نے فوری کرتل سوین کو کال کی۔ "شکنجے نے کام نہیں کیا ہے۔ فوراً اپنے آدمی بھیجو۔ لیکن خیال رہے، وہ مسلح ہے۔"

’’ممکن ہے کوئی مسئلہ ہوا ہو۔‘‘ کرنل سوین نے جواب دیا۔ ’’اب میرے پاس صرف رائے ہے۔‘‘

’’تم دونوں باہر جاؤ۔‘‘ جوناتھن نے کہتے ہوئے اسکرین کی طرف دیکھا اور چلّایا۔ ’’جلدی کرو، وہ جھاڑیوں کو آگ لگا رہا ہے۔‘‘

دیکھتے ہی دیکھتے اسکرین پر شعلے نظر آنے لگے۔ بدقسمتی سے ریسٹ ہاؤس کے ساتھ ان جھاڑیوں کا ڈھیر تھا جنہیں صرف اس لیے صاف نہیں کیا گیا تھا کہ اس طرح یہ عمارت فطری طور پر غیر آباد نظر آئے گی مگر یہی جھاڑیاں اب ان کے گلے پڑنے والی تھیں۔ کرنل سوین اور رائے مسلح ہو کر تیزی سے باہر نکلے۔ جوناتھن کی پریشانی اب چہرے سے جھلک رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس معاملے کو اس نے کچھ زیادہ ہی ہلکا لیا تھا اور نتیجہ یہ نکلا تھا۔ اگرچہ ان لوگوں سے نمٹ کر آگ بجھائی جا سکتی تھی۔ ان کے پاس انتظام تھا مگر اسے خدشہ تھا کہ اٹھنے والا دھواں کسی کو متوجہ نہ کر لے۔ ابھی ان چھ کو ٹھکانے لگانا تھا اور پھر ان کی گاڑیوں کو بھی غائب کرنا تھا۔ کام بہت زیادہ تھا۔ اسے کارل اور جیسن کا خیال آیا۔ خاصی دیر سے ان کی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ اس نے واکی ٹاکی پر انہیں پکارا۔

’’کارل... جیسن! کہاں ہو تم؟‘‘

مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ جوناتھن کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ایسا لگ رہا تھا، اس طرف بھی کوئی مسئلہ ہو گیا تھا۔ شاید آج اس کے لیے مسائل کا دن تھا۔ اس نے اپنی میز کی دراز کھولی اور اس میں موجود پستول نکال لیا۔ اسکرین پر اب شعلے ہی شعلے نظر آ رہے تھے اور آگ لگانے والا غائب ہو گیا تھا۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور اس کے ایک ماتحت نے بدحواسی میں اطلاع دی۔ ’’سر! ایک طرف کا فائبر پگھل رہا ہے اور دھواں اندر آ رہا ہے۔‘‘

جوناتھن اٹھ کر دوڑا۔ جس طرح باہر آگ لگی ہوئی تھی، اس طرف کی فائبر دیوار اور ایلومینیم شیٹ جل گئی تھی اور دھواں اندر آ رہا تھا۔ جوناتھن نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔ ’’یہاں کچھ لگاؤ، دھواں اندر آنے سے روکو۔‘‘

ان کو حکم دے کر وہ ایک لیب جیسے حصے میں آیا۔ یہاں اس نے شیشے کے دروازے کے ساتھ لگے پینل پر نمبر دبائے تو دروازہ کھل گیا۔ اندر ایک درمیانے سائز کا فریج رکھا ہوا تھا۔ اس نے اسے کھولا اور اندر موجود نیلے اور سبز انجکشنز کے سیٹ نکال کر ایک مخصوص بریف کیس میں رکھنے لگا۔ یہ بریف کیس خاص طور سے ان کو رکھنے کے لیے ہی بنا تھا۔ پھر اس نے آفس میں آ کر اپنے کمپیوٹر سے ایک یو ایس بی لگائی اور کمپیوٹر میں موجود ڈیٹا اس میں منتقل کرنے لگا۔ یہ ڈیٹا اس سارے پروجیکٹ کا نچوڑ تھا۔ تجربات کا آخری دور چل رہا تھا اور ان تجربات کا نشانہ چھ افراد تھے۔ یہ سب مقامی تھے اور ان میں سے ایک فرار میں کامیاب رہا تھا مگر وہ موت سے نہیں بچ سکا تھا۔ باقی پانچ بھی مر چکے تھے۔ اگر یہ آگ بجھائی نہیں جاتی تو یہ عمارت اور اس میں موجود تجربہ گاہ خود بہ خود جل کر تباہ ہو جاتی۔ پھر اس میں ایسے آتش گیر مادے موجود تھے جو تمام عمارت کو پوری طرح بھسم کر دیتے اور یہاں سے وائرس پھیلنے کا کوئی امکان باقی نہ رہتا۔ ان لوگوں سے نمٹ کر وہ یہاں سے چلے جاتے۔ جیسے ہی ڈیٹا منتقل ہوا، اس نے یو ایس بی نکال لی اور پھر واکی ٹاکی پر رائنا کو پکارا۔ دوسری بار پکارنے پر بھی کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

رائنا اس وقت باورچی عبدل کے ساتھ تھی۔ عبدل سانولے رنگ کا اور کسی قدر چھوٹے منہ والا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ بہ ظاہر وہ سست اور عام سا باورچی نظر آتا تھا مگر درحقیقت وہ نہ سست تھا اور نہ باورچی تھا۔ اسے رائنا یہاں لائی تھی۔ اس کا اصل نام سریش گریشور تھا۔ جیسے رائنا کا اصل نام رینا تھا۔ وہ اس جنگ زدہ ملک میں اپنے ملک کے خاص نمائندے تھے اور انہیں اسی پروجیکٹ کے لیے بھیجا گیا تھا۔ رینا نے کامیابی سے جوناتھن کو اپنی مٹھی میں کیا تھا۔ اس نے خود کو اسی جنگ زدہ ملک کا ظاہر کیا تھا۔ پھر وہ سریش کو عبدل بنا کر لے آئی۔ اس نے اسے اپنا رشتے دار ظاہر کیا تھا۔ اس نے جوناتھن کو یہی بتایا تھا کہ اس کا پورا خاندان گاؤں پر ہونے والی بمباری میں مارا گیا تھا۔ یوں اس کی کہانی کی تردید کرنے والا کوئی باقی نہیں رہا تھا۔ ویسے بھی جوناتھن باس تھا اور وہ اس سے مطمئن تھا اس لیے کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ اگرچہ یہ سیکیورٹی کے حوالے سے غیر ذمے داری تھی۔ شاید پروجیکٹ کی نوعیت کی وجہ سے اس کی معمول کی سیکیورٹی انسپکشن نہیں ہوئی تھی۔

سریش بائیولوجی میں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور وہ یہاں ہونے والے کاموں کی سمجھ بوجھ رکھتا تھا۔ اس جگہ دواؤں یا بائیولوجیکل مواد کا تجربہ نہیں ہوتا تھا بلکہ پہلے سے تیار مواد آتا تھا اور اس کے انسانوں پر تجربات کیے جاتے تھے۔ گزشتہ تین سال کے عرصے میں جوناتھن اور اس کی ٹیم نے تقریباً سو انسانوں کو اپنے تجربات کا نشانہ بنایا تھا۔ ان میں سے

اکثر تو اسی جنگ زدہ ملک سے تعلق رکھتے تھے جہاں سے جوناتھن رینا کو ساتھ لایا تھا۔ رینا یہاں کی زبان روانی سے بولتی تھی اور مقامی رسم و رواج سے اچھی طرح واقف تھی اس لیے اسے اپنا کام کرنے میں دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ جن لوگوں پر بائیولوجیکل ہتھیاروں کا تجربہ کیا جاتا تھا، جب وہ مر جاتے تو ان کی لاشیں اسی عمارت میں موجود ایک جدید ترین کیمیائی بھٹی میں ڈال کر اس طرح جلائی جاتی تھیں کہ ان کی راکھ بھی بہت کم بچتی تھی اور اس راکھ کو بہ آسانی جنگل میں ٹھکانے لگا دیا جاتا تھا۔

رینا اور سریش جانتے تھے کہ مخصوص کیمیائی اور بائیولوجیکل مواد کے تجربات تقریباً مکمل ہو گئے تھے۔ مواد بائیولوجیکل اور کیمیاوی دونوں خصوصیات رکھتا تھا۔ بائیولوجیکل ہتھیار بہت مہلک ہوتے ہیں مگر ایک بار کھلی فضا میں آنے کے بعد اگر ان کو نشانہ بنانے کے لیے انسان نہ ملیں تو یہ کچھ ہی دیر میں بیکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں کیمیاوی ہتھیار مہلک ہوتے ہیں اور بہت دنوں تک اپنی ہلاکت خیزی بھی برقرار رکھتے ہیں مگر یہ پھیلنے کی صلاحیت نہیں رکھتے جو بائیولوجیکل ہتھیاروں میں ہوتی ہے کیونکہ یہ اصل میں مہلک وائرس ہوتے ہیں۔ اس نئے ہتھیار میں دونوں خصوصیات شامل کر دی گئی تھیں۔ مہلک جرثوموں کو ایسی خصوصیات دی گئی تھیں کہ وہ بہت عرصے تک کارآمد رہتے اور ان کا توڑ مشکل تھا۔ مگر جس ملک نے انہیں تیار کیا تھا، اس نے ان کا توڑ بھی کر لیا تھا۔ جوناتھن نے فریج سے انجکشنوں کے جو سیٹ نکالے تھے، ان میں نیلا مواد ہلاکت خیز وائرس پر مشتمل تھا جبکہ سبز مواد اس کا توڑ تھا۔

رینا اور عبدل اس بات سے واقف تھے۔ وہ بہت سکون سے کام کر رہے تھے اور انہوں نے کسی کو شک کا موقع دیے بغیر اس پروجیکٹ کی تقریباً تمام اہم معلومات حاصل کر لی تھیں مگر وہ اس مخصوص مواد تک رسائی حاصل نہیں کر سکے تھے کیونکہ وہ صرف جوناتھن کی رسائی میں تھا۔ آخری بار جب رینا نے باہر جانے پر اپنے اوپر والوں سے رابطہ کیا تھا تو انہوں نے اسے حکم دیا کہ وہ بہر صورت یہ مواد اور اس کا توڑ حاصل کرے۔ یہاں موجود تمام افراد کو اس کے توڑ کے انجکشن پہلے ہی لگا دیے گئے تھے۔ ایک بار لگانے کے بعد یہ انجکشن ایک سال تک موثر رہتا تھا۔ جب رینا کو حکم ملا تو اس نے سریش کے ساتھ مل کر پلان بنایا۔ انہیں بہر صورت یہ مواد حاصل کرنا تھا۔ انہیں معلوم تھا، عام حالات میں یہ کام نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے انہوں نے تہ خانے میں موجود تجربے کے شکار افراد میں سے ایک نوجوان کو وہاں سے فرار کرا دیا۔ اس دوران میں رینا نے سیکیورٹی سسٹم آف کر دیا اور کسی کو پتا نہیں چلا کہ ایک آدمی فرار ہو گیا ہے۔

رینا اور سریش کا خیال تھا کہ ایک آدمی کے فرار سے وہاں افراتفری پھیلے گی اور وہ اس کا فائدہ اٹھا کر اپنے مطلب کی چیز حاصل کریں گے اور یہاں سے فرار ہو جائیں گے۔ ان کے لوگ باہر مدد کے لیے موجود ہوتے اور وہ بہ آسانی واپس اپنے ملک پہنچ جاتے۔ دوسرے رینا اور سریش کے ذہن میں یہ شیطانی خیال آیا تھا کہ ایک متاثرہ آدمی آزاد ہو گا اور وہ دوسروں کو بھی یہ وائرس لگا دے گا۔ اس ملک میں کیا، ساری دنیا میں اس کا کوئی توڑ نہیں تھا، سوائے اس سبز مواد کے جو اسی ملک نے بنایا تھا جس نے یہ مہلک ہتھیار تیار کیا تھا۔ رینا اور سریش کا ملک اس ملک کا دشمن تھا اور وہ اسے تباہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ اسی مقصد کے تحت وہ اپنے ہاں ہتھیاروں کا انبار لگا رہا تھا اور ساری دنیا سے جدید جنگی اسلحہ خریدنے کے ساتھ ساتھ وہ چوری چھپے کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیار بھی تیار کر رہا تھا۔ اس کے ایجنٹ ساری دنیا میں ایسے خفیہ پروجیکٹس تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے جہاں مہلک کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیار تیار ہوتے تھے۔ اس کے لیے اس ملک نے اپنی خفیہ ایجنسی کا ایک خصوصی شعبہ بنایا تھا۔ رینا اور سریش اسی شعبے کے ایجنٹس تھے۔

مگر ان کی سازش اس حد تک ناکام رہی کہ جوناتھن کو جلد پتا چل گیا کہ ایک وائرس زدہ شخص باہر نکل گیا ہے۔ پھر باہر نکلنے والا مر گیا اور اس کے پیچھے جانے والوں نے اس کی لاش جلا دی۔ البتہ اس وجہ سے یہاں افراتفری ضرور پھیل رہی تھی۔ باہر جانے والے ان کے تین اہم افراد غائب تھے۔ ایک زخمی تھا اور اب ریسٹ ہاؤس کے پاس آگ بھی لگ گئی تھی۔ رینا کے خیال میں یہی موقع تھا حرکت میں آنے کا۔ وہ جوناتھن کی نگرانی کر رہی تھی۔ جیسے ہی جوناتھن گلاس روم سے سامان لے کر کمرے میں گیا، رینا حرکت میں آ گئی۔ پہلے وہ سریش کے پاس گئی اور اسے سمجھا کر جوناتھن کے پاس آئی۔ وہ اس وقت بریف کیس کھول کر اسے دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ رینا کی آمد پر اس نے ناگواری سے کہا۔

’’پوچھے بغیر کیوں آئی ہو...‘‘ وہ کہتے ہوئے رک گیا اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک عجیب وضع کا پستول نما آلہ تھا مگر یہ پستول نہیں تھا۔ رینا نے

اس کا ٹریگر دبایا تو اس سے دھواں سا نکل کر بہت سرعت سے جوناتھن کے چہرے سے ٹکرایا اور اسے شدید جھٹکا لگا۔ اسی لمحے باہر سے خودکار رائفل کی آواز آئی۔ یہ سریش تھا جو باقی سب کو ختم کر رہا تھا۔ دھواں لگتے ہی جوناتھن نے چیخ مار کر دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے تھے اور اب بھی مسلسل چیخ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے منہ پر دھواں نہیں بلکہ تیزاب لگا ہو۔ رینا نے اطمینان سے بریف کیس بند کیا اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ مگر وہ دیکھ نہیں سکی تھی کہ جوناتھن کے ہاتھ میں نیلے مواد والی شیشی تھی اور وہ اس کے ہاتھ سے نیچے گر کر ٹوٹ گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے کمرے میں بزر گونجنے لگا۔ رینا چونکی۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکی اور اسے کھولنے کی کوشش کی مگر وہ لاک تھا۔ بزر مسلسل گونج رہا تھا۔ رینا واپس آئی اور جوناتھن کے سامنے رکھا ہوا کی بورڈ اپنی طرف کر کے اس پر انگلیاں چلانے لگی۔ وہ خطرے کے الارم کو ڈی ایکٹی ویٹ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ الارم بجتے ہی متعلقہ حصہ سیل ہو جاتا۔ وہ اس نظام سے اچھی طرح واقف تھی اور جانتی تھی کہ دروازہ کھلوانے کے لیے ضروری تھا کہ الارم بند کیا جائے۔ جوناتھن اب گالیاں دے رہا تھا۔ رینا نے چلا کر کہا۔

''شٹ اپ... الارم ڈی ایکٹی ویٹ کرو۔''

جوناتھن رونے کے انداز میں کراہا۔ ''یہ نہیں ہوگا کیونکہ یہاں وائرس موجود ہے۔''

''ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' رینا بولی۔ ''ہم نے اس کا توڑ لیا ہوا ہے۔''

''مجھے نہیں پڑے گا۔'' جوناتھن اب خاموش تھا۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا لیا تھا۔ اس کے چہرے پر آبلے سے ابھر آئے تھے اور سوجن کی وجہ سے آنکھیں بند تھیں۔ ذرا سی دیر میں اس کا چہرہ بھیانک ہو گیا تھا۔ بظاہر معمولی سے نظر آنے والے دھوئیں نے اس کا یہ حال کیا تھا، یقیناً یہ بھی کوئی کیمیائی ہتھیار تھا۔ یعنی اس کا جوتا اسی کے سر پر پڑا تھا۔

رینا چونکی۔ ''کیا مطلب؟''

''تمہیں جو توڑ دیا گیا تھا، وہ چھ مہینے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے تم اب محفوظ نہیں ہو۔ جو توڑ ہم نے لیا ہے، وہ ایک سال کا ہے۔''

رینا نے گھبرا کر اپنا معائنہ کیا۔ مگر فی الحال کوئی علامت نہیں تھی۔ ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

مگر رینا نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر پستول نما آلہ اٹھایا اور سفاک لہجے میں بولی۔ ''اسے ڈی ایکٹی ویٹ کر دو یا اذیت ناک موت مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس بار تم بچو گے نہیں۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہم میں سے کوئی نہیں بچے گا۔ باہر آگ لگی ہے اور یہاں اندر الارم بج گیا ہے اس لیے سب سیل ہو گیا ہوگا۔ اب کوئی باہر نہیں جا سکے گا اور نہ کوئی اندر آ سکے گا۔''

''ذلیل کتے۔'' رینا نے غصے سے کہا اور پھر ٹریگر دبایا۔ ایک بار پھر اس سے دھواں نکل کر جوناتھن سے ٹکرایا اور اس کے حلق سے اذیت بھری چیخ نکلی۔ اسی لمحے رینا نے دیکھا، اس کے ہاتھ پر زخم نمودار ہو رہے تھے۔ اس نے متوحش ہو کر مانیٹر کو آف کر کے اس کی چمک دار اسکرین پر اپنی صورت دیکھی اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کے منہ پر چھوٹے چھوٹے چھالے نمودار ہو رہے تھے۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی۔ جوناتھن نے سچ کہا تھا۔ ان لوگوں کو چھ مہینے بچانے والا انجکشن دیا گیا تھا۔ پھر اس نے چلا کر سریش کو آواز دی اور دروازے کا شیشہ بجانے لگی۔ اس کی آواز باہر نہیں گئی تھی مگر جب اس نے شیشہ بجایا تو فوراً ہی سریش نمودار ہوا۔ اس نے تشویش سے رینا کو دیکھا اور اشارے سے پیچھے ہٹنے کو کہا۔ وہ پیچھے ہٹی تو سریش نے خودکار رائفل کا رخ دروازے کی طرف کیا۔ اس نے برسٹ مارا اور پھر خود نیچے گر گیا۔ اسے یا رینا کو علم نہیں تھا کہ یہ بلٹ پروف شیشہ ہے۔ گولیاں پلٹ کر سریش کے پیٹ میں گھس گئی تھیں۔ اب وہ جاں کنی کی کیفیت میں ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ رینا کے عقب میں جوناتھن رونے کے انداز میں ہنس رہا تھا۔ اس کی آواز میں دیوانگی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے تکلیف نے اسے پاگل کر دیا ہے۔ رینا دانت پیستی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور پستول نما آلہ اس کی طرف کر دیا۔

☆☆☆

شامی آگ لگاتے ہی تیزی سے واپس آیا۔ مگر جہاں اس نے جوجی کو چھوڑا تھا وہ وہاں نہیں تھا بلکہ آس پاس کہیں بھی نہیں تھا۔ اس نے دبی زبان میں جوجی کو آواز دی اور جب کوئی جواب نہیں ملا تو شامی کی زبان سے بے شمار ناگفتنی نکل گئیں کہ جوجی عین موقع پر بزدل ثابت ہوا تھا اور اسے چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ وہ اس لیے آیا تھا کہ جوجی کو ان لوگوں کے پاس بھیجے اور انہیں یہاں بلوائے۔ ایک یا دو کے مقابلے میں چار افراد یقیناً زیادہ طاقتور ثابت ہوتے۔ شامی

واپس ریسٹ ہاؤس کی طرف پلٹ رہا تھا [illegible] خفیہ راستے سے دو افراد کو برآمد ہوتے دیکھا۔ وہ [illegible] اور ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ [illegible] کے لیے نکلے تھے۔ وہ نہایت چوکنا نظروں سے آس پاس دیکھ رہے تھے۔ شامی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اسے تلاش کر رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا یہاں نگرانی کے آلات بھی لگے تھے۔

ان میں سے ایک نے دوسرے کو عقب میں جانے کا اشارہ کیا اور خود اس طرف آیا جہاں شامی درختوں میں چھپا ہوا تھا۔ یہاں درختوں کے تنے چوڑے تھے لیکن وہ نزدیک آنے پر اسے چھپا نہیں سکتے تھے۔ شامی نے سوچا اور ایک درخت کی دائیں بائیں نکلی شاخوں کی مدد سے اوپر چڑھنے لگا۔ شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے اور درختوں تلے تقریباً اندھیرا چھا گیا تھا اس لیے اسے امید تھی کہ وہ اوپر چڑھتا ہوا نظر نہیں آئے گا۔ ذرا سی دیر میں وہ زمین سے دس بارہ فٹ اونچی ایک بڑی شاخ تک پہنچنے میں کامیاب رہا اور اس پر اس طرح بیٹھ گیا کہ نیچے سے نظر نہ آئے۔ جب تک شامی درخت پر چڑھا، آنے والے کا دوسرا ساتھی ریسٹ ہاؤس کی عمارت کے پیچھے چلا گیا تھا جہاں اب آگ اتنی پھیل گئی تھی کہ اس کی روشنی یہاں تک آ رہی تھی۔ شامی کو اب اندر موجود نواب صاحب اور نوشی کی فکر بھی لاحق ہو گئی تھی۔

آنے والا کرنل سوین تھا۔ وہ نام نہاد کرنل تھا کیونکہ وہ کبھی فوج میں شامل نہیں رہا۔ اس کا تعلق ایک ایسی پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی سے تھا جو دنیا کے کئی ممالک میں بے گناہ افراد کے قتلِ عام میں ملوث رہی تھی مگر اسے بین الاقوامی سطح پر بھی دہشت گرد تنظیموں کی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا بلکہ وہ بین الاقوامی سیکیورٹی بزنس کا بہت بڑا حصہ حاصل کر کے سالانہ اربوں ڈالرز کما رہی تھی۔ یہ ایجنسی جرائم پیشہ افراد اور نفسیاتی مریضوں کو بھرتی کر کے ان کو قتل و غارت گری کی ترتیب دیتی تھی اور پھر مغربی ممالک کے مخصوص مفادات کی حفاظت کے لیے ان کو ان علاقوں میں بھیجا جاتا جہاں مغرب کے مفادات ہوتے تھے۔ کرنل سوین مجرم آدمی تھا۔ اس ایجنسی میں آنے سے پہلے وہ تین سال کی جیل کاٹ چکا تھا کیونکہ اس نے ایک کمسن لڑکی کو زیادتی کے بعد شدید زخمی کر دیا تھا۔ وہ صرف اس لیے بچ گیا تھا کہ اس کے وکیل نے ثابت کیا تھا کہ اس فعل میں لڑکی کی مرضی بھی شامل تھی۔

وہ اُن کے پاس آتے ہوئے کرنل سوین کا انداز بہت [illegible] تھا۔ اس نے گن سامنے کی ہوئی تھی اور سیکنڈ کے نوٹس پر فائر کھولنے کے لیے تیار تھا۔ شامی اسے نزدیک آتا دیکھ رہا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے پستول مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اصولاً شامی کو اسے موقع نہیں دینا چاہیے تھا مگر اس کا دل نہیں مانا کہ وہ ایک شخص کو بے خبری میں قتل کر دے۔ اگرچہ اسے یقین تھا کہ اس شخص نے اسے دیکھ لیا تو اسے بالکل موقع نہیں دے گا اور شوٹ کر دے گا۔ کرنل سوین نزدیک آیا اور اس نے اپنے ہیڈ سیٹ پر رائے سے پوچھا۔ ''کوئی نظر آیا؟''

''وہ اس طرف نہیں ہے۔'' رائے نے جواب دیا۔

''پیچھے کے درختوں میں دیکھو اور جیسے ہی دکھائی دے، اسے شوٹ کر دو۔''

شامی کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اسے فوت کرنے کا حکم دے رہا تھا اور اس کی بات سن کر شامی میں جو رہی سہی جھجک تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ اس بدبخت شخص کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرے گا جو اسے قتل کرنے کے درپے تھا۔ وہ آگے آ رہا تھا۔ اس کی محتاط نظریں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں، بس اسے اوپر کا خیال نہیں آ رہا تھا۔ یہ خیال اسے بالکل آخری لمحے میں آیا۔ اس نے اوپر دیکھا اور شامی کو آتے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس نے رائفل اوپر کرنا چاہی مگر اتنا وقت ہی نہیں تھا۔ شامی کے ہاتھ میں موجود پستول کا دستہ پوری قوت سے اس کے ماتھے پر لگا اور پھر شامی اس کے اوپر ہی گرا۔ اس نے سنبھل کر پھر وار کے لیے ہاتھ بلند کیا مگر اسے ساکت دیکھ کر رک گیا۔ ایک ہی وار کافی ہوا تھا اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

وار اتنا کاری تھا کہ ذرا سی دیر میں اس کا ماتھا سوج کر باہر نکل آیا تھا۔ شامی نے اس کی رائفل اٹھائی۔ یہ جدید ترین رائفل تھی۔ پھر اسے گھسیٹ کر درختوں میں اس طرح ڈال دیا کہ وہ فوری نظر نہ آئے۔ اس وقت بھی وہ جوجی کو سنا رہا تھا، وہ ہوتا تو وہ تیمور اور فولاد خان کو بلوا سکتا تھا۔ اس کامیابی کے بعد اس بات کے امکانات روشن ہو گئے تھے کہ وہ ان لوگوں پر قابو پا کر نواب صاحب اور نوشی کو چھڑوا لے گا۔ مگر اب بھی وہ اکیلا یہ سب نہیں کر سکتا تھا۔ مگر ایسا لگ رہا تھا کہ اسے جو کرنا تھا، خود کرنا تھا۔ پہلے سے نمٹ کر اب اسے دوسرے سے نمٹنا تھا مگر وہ اس جھنڈ سے باہر نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ اب اسے علم ہو گیا تھا کہ یہاں کیمرے لگے

ہوئے تھے۔ اس لیے وہ ریسٹ ہاؤس کے گرد پھیلنے والی آگ کے باوجود وہیں رک کر دوسرے کا انتظار کرنے پر مجبور تھا۔ اسے یقین تھا کہ جلد وہ یہاں آئے گا جب اسے اپنے ساتھی کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملے گا۔ شامی نے رائفل کو سنگل موڈ پر کرلیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آنے والے کو بناوارننگ شوٹ کردے ورنہ وہ مشکل میں بھی پڑسکتا تھا۔

☆☆☆

نواب صاحب اور نوشی اس قید خانے کے باہر کے مناظر دیکھ سکتے تھے۔ کیونکہ تقریباً ساری دیواریں شیشے کی تھیں۔ اس بڑے سے ہال کو چاروں طرف سے اور چھت اور فرش کو بھی ایلومینیم فوائل نما کسی چیز سے ڈھکا گیا تھا۔ شاید اس کا مقصد یہاں موجود وائرس کو حادثاتی طور پر پھیلنے سے روکنا تھا۔ تین قطاروں میں شیشے اور دھات کے بنے کیبن تھے۔ کچھ کا شیشہ واضح تھا اور کچھ کا نیم شفاف شیشہ تھا جس کے دوسری طرف کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک طرف نیم شفاف پلاسٹک کا پردہ تھا اور اس کے دوسری طرف سیڑھیاں نیچے جارہی تھیں۔ ان کے کیبن کا شیشہ شفاف تھا اور انہیں وہاں لوگ آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ ان میں اکثر غیر ملکی سفید فام تھے البتہ ایک لڑکی اور ایک ملازم نما مرد مقامی لگ رہے تھے۔ لڑکی جو شکل صورت کی خاص نہیں تھی مگر اس نے لباس بہت واہیات پہنا ہوا تھا جس میں اس کا جسم بہت نمایاں تھا۔ اس نے نوشی کو خاص طور سے عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔ نوشی پریشان تھی مگر نواب صاحب پرسکون تھے۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ جگہ بھی کسی حیاتیاتی تجربہ گاہ جیسی ہے۔''

''یہ لوگ ہماری سرزمین پر بیٹھے ہیں اور ہماری حکومت کو علم ہی نہیں ہے۔''

''اس بے چاری کو تو اپنے لوگوں کے کارناموں کا پتا نہیں ہوتا ہے یہ تو پھر بھی غیر ملکی اور سپر پاور ہیں۔''

''آپ کے خیال میں یہ کون ہوسکتے ہیں؟''

''وہی جو اپنے طور پر دنیا کے ٹھیکے دار بنے ہوئے ہیں۔'' نواب صاحب کے لہجے میں ہلکی سی تلخی آگئی۔ ''یہ وہ لوگ ہیں جو ترقی کا پہلا مصرف جنگ میں تلاش کرتے ہیں، چاہے وہ اسپرین کی ایجاد کیوں نہ ہو۔ یہاں یہ انسانوں کو جلد از جلد موت کے گھاٹ اتارنے کے طریقے تلاش کررہے ہوں گے۔''

''انکل! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''اللہ پر بھروسا رکھو میری بچی... وہ ہمارے لیے بہتر کرے گا۔'' نواب صاحب نے کہا۔ ان لوگوں نے ان کی تلاشی لی تھی اور تمام چیزیں اپنے قبضے میں کرلی تھیں مگر وہ نواب صاحب کے سینے پر بندھا ہوا چھوٹا سا باریک خنجر تلاش نہیں کرسکے تھے اور وہ سوچ رہے تھے کہ کیا ضرورت پڑنے پر وہ اس خنجر سے کام لے سکیں گے؟ وہ بوڑھے اور کمزور ہوگئے تھے جبکہ ان کے مدمقابل پوری طرح مسلح اور طاقتور تھے۔ پھر انہوں نے فیصلہ کیا کہ اگر مرنے کا مرحلہ آیا تو وہ لڑکر مریں گے۔ خود کو آسانی سے موت کے حوالے نہیں کریں گے۔ نواب صاحب اور نوشی میز کے گرد بیٹھے تھے کہ اچانک ہی ہال میں افراتفری نظر آنے لگی اور پھر انہیں ہال میں بھرتا دھواں دکھائی دیا۔ وہ تشویش زدہ ہوگئے۔ کیا یہاں آگ لگ گئی تھی؟ مگر شعلے نظر نہیں آرہے تھے۔ اس کے کچھ دیر بعد ایک عجیب سا سائرن سنائی دینے لگا۔ نواب صاحب مضطرب ہوگئے۔

''یہ انتہائی خطرے کا سائرن ہے۔ یہاں کچھ ہوا ہے۔''

''کیا ہوا ہے؟ اور ہم تو یہاں قید ہیں۔''

نواب صاحب نے قید خانے میں رکھی دھاتی کرسی اٹھا کر شیشے پر ماری مگر وہ اس سے اچٹ کر آگئی اور شیشے پر خراش تک نہیں آئی۔ ''بلٹ پروف۔'' نواب صاحب نے زیرلب کہا اور کرسی رکھ دی۔ ''یہ قید خانہ ناقابل شکست ہے۔''

اسی لمحے باہر سے خودکار فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں اور پھر انہیں مقامی نقوش والا ملازم نما شخص وہاں موجود لوگوں پر گولیاں برساتا نظر آیا۔ اس کے پاس خودکار رائفل تھی اور وہ چن چن کر ایک ایک فرد کو ماررہا تھا اور جو چھپ رہے تھے ان کو تلاش کرکے قتل کررہا تھا۔ نواب صاحب اور نوشی حیران تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کیا یہ ان کا کوئی مددگار تھا؟ یا ان لوگوں کا آپس کا کوئی چکر تھا؟ پھر وہ شخص ایک طرف چلا گیا اور کچھ دیر بعد ایک برسٹ اور چلا اور اس کے بعد خاموشی چھاگئی۔ نوشی نے آہستہ سے کہا۔

''انکل! یہ کیا ہورہا ہے؟''

''پتا نہیں میری بچی لیکن مجھے لگ رہا ہے جو ہورہا ہے ہمارے لیے اچھا ہورہا ہے۔''

مگر اسی لمحے ان کے کیبن کے ساتھ والے کیبن کی فائبر سے بنی دیوار پگھلنے لگی اور پھر اس سے شعلے اور دھواں اندر گھس آئے۔ یہ صورت حال بہت خوفناک تھی مگر وہ اس قید میں بے بس تھے، کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے۔

☆☆☆

تیمور نے ان تینوں سے جو ابتدائی پوچھ گچھ کی تھی اس سے اسے اندازہ ہوا کہ ان غیر ملکیوں نے یہاں ویرانے میں مقامی افراد پر کسی مہلک حیاتیاتی کیمیائی ہتھیار کے تجربات جاری رکھے ہوئے تھے اور وہ کم سے کم تین سال سے یہ کام کررہے تھے۔ فولاد خان سمجھ رہا تھا اور مشتعل تھا۔ اس نے ان تینوں کو ٹھوکریں ماریں۔ ''خنزیر کا بچہ... ام کو خوب صورت والا چوہا سمجھتا اے... ام تم کو کتے کا ماف مارے گا۔''

تیمور کو اس صورتِ حال میں بھی ہنسی آئی۔ فولاد خان یقیناً گنی پگ کا حوالہ دے رہا تھا جو تجربہ گاہوں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ فولاد خان اور تیمور نے جوجی کو داد دی۔ اس نے جرأت کا مظاہرہ کرکے فولاد خان کو بچالیا تھا۔ اگر وہ ایک لمحے کی دیر کرتا تو گولیاں فولاد خان کو لگتیں۔ جوجی نے انہیں ریسٹ ہاؤس کے بارے میں بتایا۔ ''میں ان دونوں کا پیچھا کرتا ہوا یہاں آیا ہوں۔ شامی بھائی وہیں ہیں اور پتا نہیں کیا کررہے ہیں۔''

تیمور نے فولاد خان اور جوجی سے کہا۔ ''ہمیں فوراً وہاں پہنچنا ہوگا، یہ دادا جان اور نوشی کو وہیں لے گئے ہیں۔''

جوجی نے تائید کی۔ ''شامی بھائی اکیلے ہیں اور مجھے غائب پاکر کوس رہے ہوں گے۔ ہمیں فوراً جانا ہوگا جی۔''

فولاد خان نے ان تینوں کو کھڑا کیا اور پھر ان کو ایک ہی رسی سے منسلک کردیا۔ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ جب تیمور نے انہیں چلنے کا حکم دیا تو انہوں نے احتجاج کیا کہ وہ اس حالت میں نہیں چل سکتے۔ اس پر فولاد خان نے ان پر پستول تان لیا۔ ''تیمور صیب! ان سے پوچھو یہ چلے گا یا ادراِی مرے گا۔''

تیمور نے انہیں آگاہ کیا کہ اگر انہوں نے حرکت نہیں کی تو یہیں مریں گے۔ یہ خان ان سے ویسے ہی خفا تھا اور انہیں جہنم رسید کرکے اسے دلی خوشی ہوگی۔ بادل ناخواستہ وہ حرکت میں آگئے۔ تیمور اور فولاد خان انہیں تیز چلنے پر مجبور کررہے تھے۔ انہیں دوسروں کی فکر تھی۔ کچھ دیر بعد وہ سڑک تک پہنچے۔ یہاں ان کی گاڑیاں موجود تھیں۔ آدمی کی جلی لاش بھی تھی جو بالکل راکھ جیسی ہوگئی تھی اور صرف ہڈیاں بچی تھیں۔ جوجی اس سے دور سے گزرا تھا اور فولاد خان نے چند لمحے کے لیے رک کر اس کے لیے دعا کی تھی۔ پھر وہ اوپری ڈھلان کی طرف بڑھے۔ پونے سات کے قریب اندھیرا تیزی سے چھا رہا تھا۔ کچھ دیر میں وہ ریسٹ ہاؤس کے پاس پہنچ گئے اور تب انہیں اس طرف سے شعلے دکھائی دیے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہاں آگ لگ گئی تھی اور ان کی معلومات کے مطابق نواب صاحب اور نوشی اس عمارت کے اندر موجود تھے۔

☆☆☆

شعلے بہت تیزی سے ہال کے دوسرے حصوں میں پھیل رہے تھے اور اسی رفتار سے اندر دھواں بھی بھر رہا تھا مگر فی الحال نہیں۔ وہاں نہ تو کوئی زندہ انسان نظر آرہا تھا اور نہ ہی کوئی آواز آرہی تھی۔ سوائے ایک الارم کی آواز کے۔ نوشی نے ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر کیبن کی دیواریں ٹٹولنے لگی۔ نواب صاحب خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ کیبن کی عقبی دیوار اسی فائبر نما مادے کی تھی اور یہ ہاتھ لگانے پر دبیز پلاسٹک کا تاثر دیتا تھا۔ نوشی کو خیال آیا اور اس نے دھاتی کرسی اٹھا کر اس کے پائے تلے لگا پلاسٹک کا خول اتارا تو اندر سے گول دھاتی پائپ نکل آیا۔ نوشی نے اسے دیوار پر مارا تو وہ کسی قدر اندر دھنسا تھا۔ اس نے جوش سے کہا۔ ''انکل! ہم اسے توڑ سکتے ہیں۔''

''فائدہ... اس کے دوسری طرف بھی دیوار ہوگی۔'' نواب صاحب نے کہا تو نوشی نے برابر والے کیبن کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ دیکھیں، اس کی جل جانے والی دیوار کے پیچھے خلا ہے تو اس کے پیچھے بھی ہوگا... اور میں نے آتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس عمارت میں بہت سی کھڑکیاں ہیں جو ان دیواروں کے پیچھے ہوں گی۔ شاید ہم اس میں سے کسی کھڑکی سے نکل سکیں۔''

اس بار نواب صاحب قائل ہوگئے اور انہوں نے دوسری کرسی اٹھائی اور پھر وہ نوشی کے ساتھ شامل ہوگئے۔ انہوں نے ایک ہی جگہ طبع آزمائی کی اور کچھ دیر میں فائبر شیٹ پھٹنے لگی۔ اس کے پیچھے خلا تھا۔ اب وہ اس خلا کو اتنا بڑا کررہے تھے کہ اس سے باہر نکل سکیں۔ مگر اس خلا سے یہ نقصان ہوا کہ اب دھواں براہِ راست کیبن میں آرہا تھا۔ وہ سوراخ بڑا کرنے کے ساتھ کھانس بھی رہے تھے۔ پھر نواب صاحب نے نوشی کو پیچھے ہونے کو کہا اور اپنا پتلا خنجر نکال لیا۔ وہ اس سے شیٹ کاٹ رہے تھے۔ یہ کام بہت آسان ثابت ہوا تھا اور شیٹ تیزی سے کٹنے لگی۔ مگر اس وقت تک نصف ہال میں آگ نے اپنا تسلط قائم کرلیا تھا۔ پھر شیٹ اتنی کٹ گئی کہ اس سے ایک آدمی باہر نکل سکتا تھا۔ نوشی نے اپنا دوپٹا پھاڑ کر دو ٹکڑے کیے۔ ایک اپنے منہ پر باندھا تاکہ دھواں کم سے کم اندر جائے اور دوسرا نواب

صاحب کے منہ پر باندھ دیا۔ اب وہ خلا میں جانے کے لیے تیار تھے۔

پہلے نواب صاحب گئے اور پھر انہوں نے سہارا دے کر نوشی کو بھی اس خلا میں کرلیا۔ یہاں فائبر شیٹ اور ریسٹ ہاؤس کی دیوار کے درمیان دو ڈھائی فٹ کا خلا تھا مگر اس میں بے پناہ گرد، مکڑیوں کے جالے اور کاٹھ کباڑ بھی بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے اس طرف کا رخ کیا جہاں ابھی آگ نہیں پہنچی تھی مگر انہیں آگے بڑھنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ یہاں ان تمام حشرات الارض اور چھوٹے جانداروں کی بہتات تھی جن سے خواتین کی جان جاتی ہے۔ نوشی بھی ایک خاتون تھی۔ اس لیے جب اس کے اردگرد ان نظر نہ آنے والوں جانداروں نے بھاگ دوڑ شروع کی تو اس کی جان پر بن آئی حالانکہ وہ بے چارے خود اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ نواب صاحب اس کی چیخوں پر تسلی دے رہے تھے کہ صرف چھپکلی ہے یا موٹا چوہا ہے جسے عرفِ عام میں گھوس کہتے ہیں۔ اس تسلی پر نوشی کی حالت مزید خراب ہو رہی تھی۔

بالآخر وہ ایک کھڑکی کے سامنے پہنچے جس کے پٹوں میں کبھی شیشے لگے ہوں گے۔ مگر بعد میں ان کی جگہ لکڑی کے مضبوط تختے لگا دیے گئے تھے اور یہ تختے اندر کی طرف سے لگے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے پہلے طبع آزمائی کی اور پھر ان دونوں نے مل کر اپنا سارا زور لگایا مگر تختے بہت مضبوطی سے کھڑکی کی چوکھٹ میں لگے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''اسے توڑنا ہمارے بس سے باہر ہے۔''

وہاں دھواں بھر رہا تھا اور اب ان کی بچت کی ایک ہی صورت تھی کہ باہر سے مدد آئے۔ اس لیے نوشی نے مدد کے لیے چلانا شروع کر دیا۔

☆☆☆

شامی بے چینی سے اس دوسرے آدمی کا انتظار کر رہا تھا۔ ویسے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر اس خفیہ دروازے تک پہنچ جائے مگر اسے صبر سے انتظار کرنا تھا۔ جلد بازی نہ صرف اسے پھنسا دیتی بلکہ پھر نواب صاحب اور نوشی کا بچنا بھی ممکن نہ رہتا۔ یہی شخص اسے اندر لے جاسکتا تھا۔ رائے چند منٹ بعد عقبی سمت سے نمودار ہوا اور وہ ہیڈ سیٹ پر ہاتھ رکھے ہوئے کرنل سوین کو پکار رہا تھا۔ مگر کرنل سوین دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔ جب رائے کو کرنل کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تو وہ چوکنا ہو گیا اور اس نے رائفل تان لی۔ شامی نے اس کے انداز سے محسوس کیا کہ اسے قابو میں کرنا اب آسان نہیں ہوگا۔ اس لیے اس نے رائفل استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ گولی نشانے پر لگی اور رائے چیخ مار کر نیچے گرا۔ اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی تھی مگر وہ بیلٹ کی وجہ سے اس کے جسم سے لگی رہی۔ گولی اس کے پاؤں میں لگی تھی اور وہ اسے پکڑ کر کراہ رہا تھا۔ شامی نے للکار کر کہا۔

''رائفل پھینک دو ورنہ دوسری گولی سر میں اترے گی۔''

اس نے حکم کی تعمیل کی اور رائفل دور پھینک دی۔ پھر وہ شامی کے حکم پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ شامی محتاط قدموں سے اس کی طرف بڑھا لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ رائے نے ایک چھوٹا سا پستول نکال لیا تھا اور اس کے نزدیک آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

☆☆☆

تیمور اور فولاد خان فائر کی آواز پر چونکے اور جوجی کا رنگ سفید پڑ گیا کیونکہ وہ نیم تاریکی میں مزید صاف نظر آنے لگا تھا۔ تیمور فکر مند ہو گیا۔ اس نے فولاد خان سے کہا۔ ''یہ رائفل کا فائر ہے۔ شامی کے پاس کولٹ ہے۔ تم ان لوگوں کی نگرانی کرو اور اگر کوئی گڑبڑ کرے تو بے دریغ اس کا سر اڑا دینا۔''

تیمور تیزی سے درختوں میں آگے بڑھا اور کچھ دیر بعد وہ اس طرف نکلا جہاں شامی نے رائے کو قابو کیا ہوا تھا اور اس کی طرف بڑھ رہا تھا مگر وہ اس کے ہاتھ میں دبے چھوٹے پستول سے بے خبر تھا۔ تیمور نے پستول دیکھ لیا۔ اس نے چلا کر شامی کو خبردار کیا۔ اس کے ساتھ ہی رائے نے کروٹ لیتے ہوئے پستول والا ہاتھ سیدھا کیا۔ تیمور نے عجلت میں فائر کیا اور اس کے ساتھ ہی رائے کے پستول سے بھی فائر ہوا۔ تیمور کی چلائی ہوئی گولی رائے کے شانے میں اتر گئی اور اس کی چلائی گولی نہ جانے کہاں گئی تھی۔ شامی بالکل ساکت کھڑا تھا۔ تیمور نے ڈرتے ڈرتے شامی کے پاس جا کر اسے ہلایا تو وہ چونکا۔ ''شکر ہے تو نے بروقت فائر کیا۔''

''تو کہاں گم ہو گیا تھا؟''

''یار! مجھے لگا جیسے نوشی کے چلانے کی آواز آرہی ہے، وہ مجھے پکار رہی ہے۔''

تیمور نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''ذرا سی دیر کی جدائی میں تیرا یہ حال ہو گیا ہے۔ پھر اس سے بھاگتا کیوں ہے؟''

شامی بھنا گیا۔ ''تجھے شاعری کی سوجھ رہی ہے، میں مصیبت کی بات کر رہا ہوں۔''

''بھائی ہر عورت مصیبت [illegible] لیے۔'' تیمور نے کہا اور اچھل [illegible] آئی تھی۔ وہ اور شامی [illegible] قریب پہنچنے پر انہیں کھڑکیوں [illegible] گاڑھا دھواں نظر آیا۔ شامی فکر مند ہو گیا۔

''آگ اندر تک پہنچ گئی۔''

''آگ؟'' تیمور چونکا۔ ''وہ کیسے لگی؟''

''میں نے لگائی تھی۔'' شامی نے [illegible] لہا اور چلا کر بولا۔ ''نوشی... دادا حضور...''

''وہ لوگ اندر ہیں اور تو نے آگ لگا دی؟'' تیمور بھی چلایا۔

''شامی... تیمور۔'' انہیں نوشی کی آواز آئی اور مزے کی بات ہے یہ آواز انہیں کونے والی کھڑکی سے آرہی تھی جس کے شیشے کب کے ٹوٹ گئے تھے اور اس پر اندر سے تختے جڑے ہوئے تھے۔ شامی اور تیمور اس طرف بھاگے۔ شامی نوشی کو پکار رہا تھا۔ چند لمحے بعد کھڑکی کے پیچھے سے نوشی نے تصدیق کی۔ ''ہم اس کے پیچھے ہیں... جلدی کھولو۔ یہاں دھواں بھر رہا ہے اور آگ بھی لگی ہوئی ہے۔ ہماری حالت خراب ہو رہی ہے۔''

''پیچھے ہٹو۔'' شامی نے کھڑکی کی تقریباً دو فٹ چوڑی چوکھٹ پر چڑھتے ہوئے کہا۔ اس نے دونوں ہاتھ دائیں بائیں ٹکائے اور تختوں پر لاتیں مارنے لگا۔ یہ اندر سے لگے تھے اس لیے اندر کی طرف ہی ٹوٹ سکتے تھے۔ کوئی ایک درجن لاتیں کھانے کے بعد تختے جواب دے گئے اور بالآخر کھڑکی سمیت اندر جا گرے۔ فوراً ہی اندر سے نواب صاحب اور نوشی نمودار ہوئے۔ پہلے نوشی نے نواب صاحب کو سہارا دے کر کھڑکی پر چڑھایا اور پھر شامی کا ہاتھ نظر انداز کر کے خود اچک کر چڑھی اور باہر آگئی۔ وہ دونوں گرد، مٹی اور مکڑیوں کے جالوں میں اٹے ہوئے تھے۔ کھڑکی ٹوٹتے ہی اندر سے گہرا دھواں نکلنے لگا۔ جبکہ اندر شعلے اتنے بڑھ گئے تھے کہ اب وہ کھڑکیاں اور دروازے جلانے لگے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اندر کسی کا بچنا ممکن نہیں تھا۔ وہ سب عمارت سے دور چلے گئے۔ جوجی کو دیکھ کر شامی جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا تھا کہ وہ بھاگ کر تیمور کے پیچھے ہو گیا اور چلایا۔ ''تیمور بھائی، انہیں بتائیں کہ کیوں آپ کی طرف گیا تھا۔''

''یہ بھگوڑا ہے۔''

''جوجی صیب دلیر آدمی اے۔'' فولاد خان نے اس

افسوس

دو ادبی اُجرت پر خط لکھنے کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ دونوں اس [illegible] تھے کہ اپنا لکھا خود ہی پڑھ سکتے تھے۔ ایک دن دونوں کی سرِراہ ملاقات ہو گئی۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ ''کہو بھائی! کیسی کٹ رہی ہے؟''

دوسرے نے بشاش لہجے میں جواب دیا۔ ''بڑی اچھی گزر رہی ہے۔ چونکہ میرا لکھا کوئی اور نہیں پڑھ سکتا اس لیے خط پڑھنے کے لیے بھی مجھ ہی کو جانا پڑتا ہے جس سے مجھے اجرت دگنی مل جاتی ہے۔''

پہلے نے ٹھنڈی سانس بھری۔ دوسرے نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تم نے سرد آہ کیوں بھری؟''

پہلے نے جواب دیا۔ ''افسوس کہ میں اب اس نوبت کو پہنچ چکا ہوں کہ اپنا لکھا خود بھی نہیں پڑھ سکتا، چنانچہ میں بدقسمتی سے اس دوسری اُجرت سے محروم ہو گیا ہوں۔''

حبّ الوطن

نواب مشتاق احمد خان ایجنٹ جنرل حیدرآباد دکن کا بیان ہے کہ ایک بڑھیا اپنی گٹھری لیے ہوئے بڑی مشکل سے ان کے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں داخل ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک ٹکٹ چیکر نے آکر سب کے ٹکٹ دیکھے۔

قیامِ پاکستان کے ابتدائی دن تھے۔ ان دنوں اول درجے اور تیسرے درجے میں کوئی تمیز باقی نہیں رہی تھی لیکن بلاٹکٹ سفر کرنے پر ضرور پوچھ گچھ ہوتی تھی۔ بڑھیا کی باری آئی تو اس نے ٹکٹ چیکر سے التجا کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا! میں اپنا سب کچھ کھو کر آئی ہوں۔ میری کل کائنات یہی گٹھری ہے۔ مجھ پر رحم کرو۔''

نواب صاحب خود ایک ریلوے افسر رہ چکے تھے۔ وہ خاموشی سے مشاہدہ کرتے رہے کہ دیکھیں چیکر کیا کرتا ہے؟ چیکر نے جو کچھ کیا عام حالات میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس نے اپنی کاپی سے رسید کاٹی اور رندھی ہوئی آواز میں بڑھیا کو جواب دیا۔

''اماں! مجھے معلوم ہے کہ تم کتنی مظلوم ہو۔ تم ہی بتاؤ کہ ٹکٹ کے بغیر ریل میں سفر کرنے سے پاکستان کیسے چلے گا؟ جس کے لیے تم نے اور میں نے بڑی قربانیاں دی ہیں اس لیے رسید تو بنے گی تاکہ ملک کا نقصان نہ ہو۔ البتہ اس کی رقم میں اپنی جیب سے ادا کروں گا۔''

مرسلہ: عبدالغفار کوثر، اورنگی کراچی

کی حمایت کی۔ ’’اس نے امارا جان بچایا۔‘‘

تیمور نے تفصیل سے بتایا کہ جوجی کس طرح ان دو افراد کے پیچھے آیا اور اس نے بروقت کارروائی کر کے فولاد خان کی جان بچائی تھی۔ اس پر شامی نے بادل ناخواستہ اسے معاف کیا۔ نوشی اور نواب صاحب کی سانس بحال ہوئی تو انہوں نے اندر کا حال بتایا۔ تیمور اور شامی سن کر حیران رہ گئے۔ تیمور نے کہا۔ ’’یہ تو اللہ کی مدد ہوئی کہ اندر والے خود لڑ مرے۔ یہاں بھی ہم نے چھ بندے پکڑ لیے ہیں۔‘‘

نواب صاحب چونکے۔ ’’زندہ؟‘‘

’’ہاں، کوئی اتنا غیرت مند تھا کہ پاؤں پر گولی اور سر پر ضرب کھا کر مر جاتا۔‘‘ تیمور نے کہا تو شامی آہستہ سے بولا۔

’’دادا حضور! یہ سب غیر ملکی ہیں۔‘‘

انہوں نے سر ہلایا۔ وہ سب درختوں کے پاس آئے۔ فولاد خان نے سب کو ایک جگہ جمع کر لیا تھا اور ان کی ایک بار پھر تلاشی لی تھی۔ وہ سب کرنل سوین سمیت ایک قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تیمور نے فولاد خان کو روانہ کیا کہ وہ جا کر گاڑی سے پانی اور نواب صاحب کی دوائیں لے آئے کیونکہ ان کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ کرنل سوین انہیں دھمکیاں دے رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ ان کا تعلق ایک بین الاقوامی آرگنائزیشن سے ہے۔ اگر انہیں کچھ ہوا تو ان کے ملک کے لیے مسئلہ ہو جائے گا۔ شامی اور تیمور انہیں سنانا چاہتے تھے مگر نواب صاحب نے انہیں ان کے منہ لگنے سے روک دیا۔ ’’کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ شرمندہ ہونے والے لوگ نہیں ہیں اور نہ ہی انہیں اپنے جرائم کا احساس ہے۔‘‘

’’ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔‘‘ کرنل سوین اردو میں بولا۔

’’خوب... تمہیں ہماری زبان بھی آتی ہے۔‘‘ شامی نے کہا۔ ’’یہاں جو انسانوں پر تجربات ہو رہے تھے ان کے بارے میں کیا کہو گے؟‘‘

’’ان تجربات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔‘‘ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ ’’ہم یہاں صرف سیکیورٹی فراہم کر رہے ہیں۔‘‘

فولاد خان پندرہ منٹ میں ٹارچ سمیت یہ چیزیں لے آیا تھا۔ اس وقت تک ریسٹ ہاؤس کی عمارت مکمل طور پر آگ کی لپیٹ میں آ گئی تھی اور اس کی پرانی کھپریل کی چھت بھی جل کر اندر اور باہر گر رہی تھی۔ مگر یہ جگہ ایسی تھی کہ چاروں طرف بہت دور سے یہ آگ نظر نہیں آتی۔ وہ مطمئن تھے کہ آس پاس کا جنگل اس سے محفوظ تھا اور یہاں ہوا بھی نہیں چل رہی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے حفظِ ماتقدم ریسٹ ہاؤس کے چاروں طرف سے ایسا ملبا ہٹا دیا جو آگ کو درختوں تک لا سکتا تھا۔ پانی اور دوائیں لے کر نواب صاحب کی حالت بہتر ہوئی اور انہوں نے ان چھ افراد سے پوچھ گچھ کی۔ بہت کچھ ان کو پہلے ہی معلوم تھا۔ باقی ان لوگوں نے بتایا اور یہ خاصی سنگین صورت حال تھی۔ وہ کسی بات کا اقرار کرنے سے نہیں جھجک رہے تھے اور انہیں اس کا خوف بھی نہیں تھا کہ انہیں یہاں قانون کے حوالے کر دیا جائے گا۔ نواب صاحب شامی، تیمور اور نوشی کو ایک طرف لے گئے۔

’’ایسا لگ رہا ہے ان لوگوں کو کوئی چھتری حاصل ہے۔‘‘

’’مقامی؟‘‘ شامی نے پوچھا۔

’’نہیں، ہمارا اندازہ ہے یہ کوئی بین الاقوامی معاملہ ہے۔‘‘

’’وہ تو بالکل صاف ہے دادا جان۔‘‘ تیمور نے کہا۔ ’’اب سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کا کیا کرنا ہے؟‘‘

نواب صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ شامی اور تیمور پیچھے ہو گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب نواب صاحب اس طرح سوچتے تھے تو وہ کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے۔ تاریکی مکمل طور پر چھا چکی تھی۔ نوشی اپنے ٹخنے کا معائنہ کر رہی تھی۔ نواب صاحب کی دواؤں کی کٹ میں سوجن کے لیے ایک موثر لگانے والی دوا تھی، اسے لگانے سے ٹخنے کی سوجن کم ہوئی اور اب اسے پاؤں رکھتے ہوئے تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ پھر اس نے ایک پین کلر بھی لی تھی۔ پینے کے بعد بچ جانے والے پانی سے اس نے ممکنہ حد تک خود کو صاف کر لیا۔ اس حالت میں بھی اسے یہ فکر زیادہ تھی کہ وہ بدہیئت تو نہیں لگ رہی تھی۔ شامی اس کے پاس آیا۔ ’’پاؤں میں کیا ہوا؟‘‘

’’موچ آئی ہے۔‘‘ وہ منہ بنا کر بولی۔

شامی نے سادگی سے پوچھا۔ ’’منہ میں آئی ہے؟‘‘

’’تم بات مت کرو مجھ سے۔‘‘ وہ غرائی۔ ’’آوازیں دے دے کر میرا گلا بیٹھ گیا تھا۔‘‘

’’کہاں بیٹھا ابھی تک عمدگی سے کام کر رہا ہے۔‘‘ شامی بولا۔ ’’ابھی تو مجھ پر غرا رہی ہو۔‘‘

’’تمہیں میری قطعی فکر نہیں ہے۔‘‘ نوشی نے الزام لگایا۔

’’تبھی جان ہتھیلی پر رکھ کر یہاں چلا آیا۔‘‘ شامی کا

موڈ خراب ہو گیا۔

''وہ تم نواب انکل کی وجہ سے آئے تھے۔'' نوشی نے کہا تو شامی کا موڈ مزید خراب ہو گیا اور وہ اٹھ کر تیمور کے پاس آیا جو فولاد خان سے پوچھ رہا تھا کہ ان لوگوں سے چھٹکارے کا کوئی قبائلی طریقہ ہے۔ اس پر فولاد خان نے کہا۔

''بالکل اے تیمور صیب... پر وہ ام آپ کو بتا نہیں سکتا۔''

''کیوں؟''

''خوفیہ اے۔'' فولاد خان نے قطعی سنجیدگی سے کہا۔ ''ام آپ کو نہیں بتا سکتا۔ اگر بتا دیا تو ام بعد میں خود بھی مارا جا سکتا اے۔''

شامی اسے یقین دلانا چاہ رہا تھا کہ وہ انہیں بتا دے تو ہرگز کسی کو نہیں بتائیں گے مگر اسی دوران میں نواب صاحب نے انہیں آواز دی۔ ''برخوردارو! تشریف لائیے۔''

وہ دونوں نواب صاحب کے سامنے باادب حاضر ہوئے۔ ''جی دادا جان۔''

نواب صاحب نے حکم صادر فرمایا۔ ''تم دونوں نوشی اور جوجی کو لے کر روانہ ہو جاؤ۔ اب واپس جانا اور اسی راستے سے گزرنا۔ ہمارا اندازہ ہے سڑک کھل گئی ہوگی۔''

''اور آپ؟''

''ہم واپس جائیں گے اس مسئلے کو حل کر کے۔'' انہوں نے چھ گرفتار شدگان کی طرف اشارہ کیا۔ ''جو آدمی باہر آئے اور تمہارے ہاتھ لگے، ان کا سامان کہاں ہے؟''

تیمور نے بتایا کہ انہوں نے ان تینوں کا سامان کہاں چھوڑا تھا۔ نواب صاحب نے اس کے ساتھ شامی اور جوجی کو روانہ کیا۔ انہوں نے وارننگ دی تھی کہ ایک چیز بھی کم نہ ہو۔ اگر انہیں شبہ ہو کہ کوئی چیز کم ہے تو آس پاس تلاش کریں۔ خاص طور سے انہوں نے نواب صاحب اور نوشی کی تلاشی لے کر جو سامان قبضے میں کیا تھا، اسے لازمی تلاش کیا جائے۔ ایک گھنٹے میں انہوں نے تمام سامان جمع کر لیا۔ اس میں کارل کے پاس سے برآمد ہونے والا نواب صاحب اور نوشی کا سامان بھی تھا۔ اسے پا کر نواب صاحب نے سکون کا سانس لیا۔ وہ یہاں ایسی کوئی چیز چھوڑنا نہیں چاہتے تھے جو بعد میں ان کی نشان دہی کرے۔ انہوں نے تیمور اور شامی سے کہا۔ ''اب تم لوگ جاؤ اور بالکل نارمل رہنا۔ کسی سے رابطے کی ضرورت نہیں ہے۔ کل صبح دس بجے کے بعد ہمیں کال کرنا۔''

اس کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اگرچہ شامی اور تیمور آمادہ نہیں تھے، وہ فکرمند تھے مگر نواب صاحب نے جب انہیں مخصوص انداز میں حکم دیا تو انہیں جانا ہی پڑا۔ وہ روانہ ہوئے اور واپس ہائی وے پر پہنچے۔ نواب صاحب کا کہنا درست ثابت ہوا تھا کہ سڑک کھل گئی تھی اور اس پر ٹریفک رواں تھا۔ وہ سب متجسس تھے کہ نواب صاحب ان چھ گرفتار شدگان کا کیا کریں گے۔ تیمور نے کہا۔ ''میرا خیال ہے دادا جان انہیں کسی ایجنسی کے حوالے کریں گے جو اس قسم کے معاملات دیکھتی ہے۔ وہ غیر ملکی ہیں۔''

شامی اس سے اختلاف کرنا چاہتا تھا مگر ڈرائیونگ کرتے تیمور نے اسے آنکھ سے اشارہ کیا تو وہ چپ ہو گیا۔ تھکن اور شاک سے بے حال نوشی اور جوجی پیچھے خاموش بیٹھے تھے۔ وہ رات تقریباً ایک بجے ریسورٹس پہنچے تو سب کا تھکن سے برا حال تھا۔ ان کے لیے کمرے بک تھے، اس میں سے انہوں نے نواب صاحب والا کمرا کینسل کرا دیا کیونکہ وہ واپس جاتے۔ اپنی مرسیڈیز کی باڈی پر گولیوں کے نشانات کے ساتھ وہ یہاں کیسے آ سکتے تھے۔ شامی پہلے اداس تھا مگر اب خوش تھا کہ اب نواب صاحب نہیں تھے۔ ہوٹل کے ڈائننگ روم میں بچا کھچا ڈنر کرتے ہوئے وہ چہک رہا تھا۔ کمرے میں آنے کے بعد تیمور نے اسے یاد دلایا کہ نوشی تھی دادا جان کے قائم مقام کے طور پر۔ مگر نواب صاحب کے نہ ہونے سے اب شامی نوشی سے ڈرنے پر بالکل تیار نہیں تھا۔ اس نے دلیری سے کہا۔

''مجھے نوشی کی ذرا پروا نہیں ہے۔''

بدقسمتی سے اسی وقت دروازہ کھلا اور اندر آتی نوشی نے اس کا جملہ سن لیا۔ وہ پھٹ پڑی۔ ''مجھے پہلے ہی پتا تھا، تمہیں میری کوئی پروا نہیں ہے۔ میں ہی پاگل ہوں جو تمہارے پیچھے لگی رہتی ہوں۔''

شامی بوکھلا گیا۔ ''اف، تم نے غلط سنا ہے۔''

''غلط سنا ہے۔'' نوشی نے چبا کر کہا اور پھر شامی کا جملہ لفظ بہ لفظ دہرایا بالکل اسی کے لہجے میں۔

''میرا مطلب ہے تم نے غلط سمجھا ہے۔''

''نہیں میں پہلے غلط سمجھتی تھی اب میری ساری غلط فہمی دور ہو گئی ہے۔ میں کل صبح یہاں سے واپس جا رہی ہوں۔'' نوشی جھٹکے سے مڑی اور کمرے سے نکل گئی۔ شامی اس کے پیچھے لپکا۔

''نوشی یار! میری بات تو سنو... خدا کی قسم میرا یہ مطلب نہیں تھا... اف رکو تو کیا ہوٹل والوں کو تماشا دکھاؤ گی۔''

تیمور اپنے بیڈ پر دراز ہو کر مسکرانے اور گنگنانے لگا۔

اسے معلوم تھا کہ شامی نوشی کو منا لے گا۔ وہ اس کام میں ماہر تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کل ہی ان کا پھر آپس میں جھگڑا ہو رہا ہوگا۔ اس کا اندازہ درست نکلا جب شامی ایک گھنٹے بعد مسکراتا ہوا واپس آیا۔ تیمور نے غور سے اسے دیکھا۔ ''یہ تیرا دایاں گال بائیں کے مقابلے میں زیادہ سرخ کیوں ہو رہا ہے؟''

''شاید چوٹ لگی ہوگی۔'' شامی نے بے دھیانی میں ہاتھ پھیرا اور پھر گھور کر تیمور کو دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ہم دو دن یہاں رکیں گے اور پھر کم سے کم دو ہفتے کے ٹریک پر جائیں گے۔''

''میں بھی نوشی سے یہی کہہ رہا تھا۔'' شامی نے سر ہلایا۔ ''اسی بات پر تو وہ مانی ہے۔''

تیمور اچھل پڑا۔ ''اب وہ ہمارے ساتھ جائے گی؟''

''بالکل! جوجی بھی جائے گا۔''

''اور وہ جو تیرا غیر ملکی خواتین سے میل ملاقات کا پروگرام تھا؟''

''اس بار تو مل لینا۔''

''شامی نے کہا اس سال نہ سہی اگلے سال سہی۔''

''بیٹے، یہ تیری جان نہیں چھوڑے گی۔'' تیمور نے کہا۔

''جان چھڑانا بھی کون چاہتا ہے۔'' شامی بستر پر گرا۔ کھا پی کر اور گرم پانی سے غسل کر کے تھکن تو اتر گئی تھی مگر اب نیند کا خمار چڑھ رہا تھا۔ ''مگر یار! یہ جو ابھی سے بیوی بنتی ہے نا اس سے غصہ آتا ہے۔''

اگلے دن انہوں نے سب سے پہلے نواب صاحب کو کال کی اور یہ جان کر سکون کا سانس لیا کہ وہ مع فولاد خان واپس پیلس پہنچ گئے تھے اور ان کی مرسیڈیز فوری مرمت کے لیے مخصوص ورکشاپ جا چکی تھی۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے ان چھ گوروں کا کیا کیا تھا۔ صرف اتنا کہا کہ مسئلہ حل ہو گیا ہے اور یہ کہہ کر انہوں نے کال کاٹ دی۔ یہاں موبائل سگنل نہیں تھے اور وہ ایک لینڈ لائن فون سے بات کر رہے تھے۔ شامی ریسیور تھامے رہ گیا اور تیمور اس کے کان سے کان لگائے ہوئے تھا۔ وہ بھی متجسس تھا کہ نواب صاحب نے ان چھ مصیبتوں کا کیا کیا ہوگا۔ اس دن وہ یہیں ریسورٹس کے آس پاس گھومتے رہے۔ میگزین کی اسٹوری سچ ثابت ہوئی تھی۔ وہاں درجنوں کے حساب سے غیر ملکی خواتین آئی ہوئی تھیں اور ان میں اکثریت مغربی ممالک سے تعلق رکھنے والی خواتین کی تھی۔

تیمور بہت خوش تھا کیونکہ اس نے ایک سوئس خاتون سیاح کو اپنے ہمراہ ٹریک پر چلنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ وہ ایک بیک پیک اٹھا کر اکیلی ہی ہمالیہ اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی سیر کے لیے نکل آئی تھی۔ جوجی نے اس کا نام سوئس مس رکھا اور سب اسے یہی کہنے لگے۔ وہ بھی اس نام پر خوش تھی۔ اگلے دن انہوں نے ٹریک کے لیے کچھ سامان لیا۔ اکثر سامان جیسے خیمے، خاص کپڑے، جوتے اور ہائکنگ کے لیے درکار اشیا وہ ساتھ لائے تھے۔ اسی طرح ڈبا بند خوراک بھی ساتھ لائے تھے۔ یہاں سے انہوں نے اپنے لیے دو عدد پورٹرز کا بندوبست کیا جو ان کا سامان اٹھاتے اور منزل پر پہنچ کر ان کے لیے خیمے لگاتے اور کھانا وغیرہ بناتے۔ وہ خود ساری ذمے داریوں سے آزاد ہو کر صحیح معنوں میں اس سفر سے لطف اٹھاتے۔ سوئس خاتون حیران تھی۔ اس نے ان سے کہا۔

''ہمارے ہاں تو سب ٹریک پر اپنا سارا کام خود کرتے ہیں۔ وہاں پورٹر رکھنے کا کوئی تصور نہیں ہے۔''

شامی نے کہا۔ ''ہم پاکستانی نواب ہوتے ہیں۔ کچھ پیدائشی ہوتے ہیں اور باقی بعد میں بن جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو فقیر بھی نوکر رکھتے ہیں۔''

سوئس مس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''فقیر بھی... میں نے کبھی ایسا نہیں سنا۔''

''ہمارے ہاں مانگنا نفع بخش پیشہ ہے۔ ایک فقیر آسانی سے دو تین نوکروں کا خرچ برداشت کر سکتا ہے۔''

''تب تم کیا ہو؟'' سوئس مس نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

''بیڑا غرق۔'' ذرا دور بیٹھے تیمور نے کہا۔ ''اب تو اپنی نوابی جتائے گا تب بھی یہ یقین نہیں کرے گی۔''

ایسا ہی ہوا۔ اس پورے سفر کے دوران میں اس نے یہی خیال کیا کہ وہ لوگ بھی فقیر تھے۔ تیمور شامی کو برا بھلا کہتا رہا جس نے اس کا سارا چانس غارت کر دیا تھا۔ مگر نوشی اور شامی نے پہلی بار کسی کام کو مل کر انجوائے کیا اور جوجی ان کی خوشی میں خوش تھا۔ مگر اسے درمیان سے واپس جانا پڑا تھا کیونکہ اس کے باپ کی جانب سے طلبی آ گئی تھی اور دو خوفناک قسم کے مشٹنڈے جوجی کو عین ٹریک کے درمیان سے تقریباً اٹھا کر لے گئے تھے۔ دو ہفتے کے ٹریک نے انہیں تھکا دیا تھا۔ سوئس خاتون نے آگے جانا تھا اس لیے وہ اس کے ساتھ چند دن کے لیے اسکردو میں رک گئے اور جب وہ چلی گئی تو انہوں نے بھی واپسی کا سفر شروع کیا۔ ایک کرائے کی جیپ نے انہیں اسی ریسورٹس میں چھوڑا جہاں ان کی لینڈ کروزر موجود تھی اور وہ اس پر واپس آئے۔ اس سفر کے سنسنی خیز آغاز سے قطع نظر وہ سفر کے اختتام پر

افسردہ تھے۔ نوشی نے شامی سے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے تم واپس جاتے ہی پھر مجھ سے بھاگے بھاگے پھرو گے اس لیے میری خواہش ہے کہ ہم واپس ہی نہ جائیں۔''

''تاکہ گردیزی صاحب ہمارے خلاف اغوا کا پرچہ کٹوادیں۔''

''اس کے لیے پاپا کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر اب تم مجھ سے بھاگے تو میں ہی یہ کام کرجاؤں گی۔''

وہ دونوں اکیلے تھے، شامی نے کہا۔ ''شکر ہے وہ میرا نہ ہونے والا سالا نہیں ہے ورنہ وہ پہلے سے میرے خلاف وعدہ معاف گواہ بن جاتا۔''

واپسی پر انہوں نے موسم اور نواب صاحب کو پُرسکون اور سرد پایا۔ موسم تو بارشوں کی وجہ سے اچھا تھا مگر نواب صاحب کا خوشگوار موڈ سمجھ سے باہر تھا۔ شامی کو یقینِ واثق تھا کہ واپسی میں یہ واقعہ بھی ان کے کھاتے میں ڈال کر داداجان کم سے کم ایک مہینا ان کی زندگی عذاب میں رکھیں گے مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ نواب صاحب کے خوشگوار موڈ کے باوجود شامی اور تیمور پوچھنے کی ہمت نہیں کر سکے تھے کہ انہوں نے ان چھ افراد کا کیا کیا؟ البتہ نوشی اور جوجی کو یہی بتایا تھا کہ ان چھ افراد کو خفیہ ایجنسی کے سپرد کردیا ہے اور ان کے بارے میں سختی سے زبان بند رکھنے کا حکم ملا ہے۔ اس ریسٹ ہاؤس کے جلنے یا وہاں سے لاشیں ملنے کے بارے میں اخبارات یا میڈیا میں کچھ نہیں آیا تھا۔ اگر یہ معاملہ حکامِ بالا کے علم میں آیا بھی تھا تو اسے عوام کے سامنے پیش نہیں کیا گیا تھا۔ وہ لوگ مطمئن تھے کہ وہاں لگنے والی خوفناک آگ نے اس حیاتیاتی کیمیائی ہتھیار کو بھی ختم کردیا ہوگا۔

شامی کو زمین اور فصل کے بعض معاملات کے سلسلے میں چمن پور بلایا گیا۔ زندگی میں پہلی بار وہ چمن پور سے خوش خوش واپس آیا تھا ورنہ روتے ہوئے جاتا تھا اور روتے ہوئے واپس آتا۔ اس بار والد بزرگوار نوابزادہ عامر نے اسے جاگیر کی آمدنی سے حصہ دینا شروع کردیا تھا کیونکہ اب وہ تعلیم مکمل کرچکا تھا۔ ملنے والے حصے سے شامی نے تیمور، نوشی اور جوجی کو ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں پارٹی دی اور پھر بچ جانے والی رقم سے فولاد خان کا قرض مع سود ادا کیا۔ وہ پہلے خوش ہوا اور پھر اداس ہوگیا۔ شامی نے وجہ پوچھی تو بولا۔ ''شامی صیب خدا کا قسم اے، ام آپ کو قرض کاروبار کے لیے نہیں دیتا۔ یہ تو آپ سے موحابت کا تعلق اے۔ خدا کرے آپ کو جلد قرض کا ضرورت پڑے اور آپ ام سے رجوع فرمائے۔''

شامی نے اعتراض کیا۔ ''یہ کیسی محبت ہے جس میں تم سود کا پورا حساب لگاتے ہو... سود پر بھی سود وصول کرتے ہو۔''

اس پر فولاد خان نے چالاکی سے کہا۔ ''شامی صیب موحابت اپنی جاگا اور سود اپنی جاگا۔''

''ٹھیک کہا تم نے۔'' شامی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''پہلے محبت آدم خور ہوتی تھی پھر رشوت خور ہوئی اور اب سود خور بھی ہوگئی ہے۔''

فولاد خان نے دانت نکالے۔ ''ام جائل آدمی اے، ام کو یہ بوت پڑا لکا بات سمج نئیں آتا۔''

''فولاد خان تم بہت ہوشیار ہوگئے ہو، اب ہم سے بھی باتیں چھپانے لگے ہو۔'' شامی نے شکوہ کیا۔

''کون سا بات؟'' اس نے انجان بن کر پوچھا۔

''یہی کہ ان چھ گوروں کا کیا کیا؟''

''ام بتادیتا پر نواب صیب نے منا فرمایا اے۔ ام مر سکتا اے پر نواب صیب سے نافرمانی نئیں کرسکتا۔''

''اچھا چلو تم یہ بتاؤ کہ ایسے چھ بندے تمہارے ہاتھ لگتے تو تم ان سے کیسے نمٹتے؟ ان کے ساتھ کیا کرتے؟''

''ام ان کو قبائلی طریقے سے ٹھکانے لگاتا۔''

''اور وہ قبائلی طریقہ کیا ہوتا؟''

فولاد خان نے پہلے سر اور پھر گردن کھجائی اور بولا۔ ''ادر امارا قبیلہ میں رواج اے اگر ایسا دشمن مل جائے جسے خود نہ مارنا او تو ادر زمین میں گڑا کرکے ان کو ڈال کر اوپر سے پتھر مٹی ڈال دیتا اے۔''

شامی دم بہ خود رہ گیا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ زندہ دفن کردیتے ہیں؟''

''بالکل... پھر وہ دفن او کر مرتا اے۔ امارے اوپر خون نئیں آتا۔''

''لیکن اگر وہ گڑھے سے نکل آئے یا ان کے لوگوں کو پتا چل جائے؟''

''کیسے پتا چلے گا؟ ام بوت گہرا گڑا کھودتا اے اور فیر اس پر خاردار خارش والا پودا لگاتا اے، جانور بھی پاس نئیں جاتا۔ چھوئے تو خارش ہوجاتا اے۔ کتا بی دور رہتا اے۔''

شامی سوچ رہا تھا کہ یہ کتنا خوفناک طریقہ ہے۔ کسی انسان کے لیے اس سے زیادہ اذیت ناک موت کیا ہوگی کہ اسے زندہ دفن کردیا جائے۔ مگر اس دنیا میں بہت سے لوگ اس سے بھی زیادہ سخت سزا کے قابل ہوتے ہیں کیونکہ وہ انسانیت کے مجرم ہوتے ہیں۔